مناهل العرفان
في
علوم القرآن (اردو)

جلد دوم

مؤلف

شیخ محمد عبد العظیم زرقانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۹۴۸ء

مترجمین

مولانا ڈاکٹر خالد محمود صاحب
استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور

مولانا ابو محمد عبد الوہاب صاحب
فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

مناہل العرفان

فی

علوم القرآن اردو

جلد دوم

علوم القرآن کے حساس موضوع پر تحریر کردہ بنیادی اور حوالہ جاتی کتاب جس میں ملحدین اور مستشرقین کے شبہات
کے تشفی بخش جوابات بھی دیئے گئے ہیں اہل علم کے لئے ایک بیش بہا کتاب پہلی بار اردو کے پیرہن میں

مؤلف

شیخ محمد عبد العظیم زرقانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۹۴۸ء

مترجمین

مولانا ڈاکٹر خالد محمود صاحب — اُستاذ جامعہ اشرفیہ لاہور

مولانا ابو محمد عبد الوھاب صاحب — فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون: 042-37224228-37355743

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جملہ حقوق ملکیت بحق ناشر محفوظ ہیں

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

نام کتاب

مناہل العرفان

مؤلف

شیخ محمد عبد العظیم زرقانی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)

مطبع

خضر جاوید پرنٹرز لاہور

اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور
فون: 042-37224228-37355743

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دیگر دینی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور کسی بھی کتاب کی طباعت کے دوران اغلاط کی تصحیح پر سب سے زیادہ توجہ اور عرق ریزی کی جاتی ہے۔ تاہم چونکہ یہ سب کام انسانوں کے ہاتھوں ہوتا ہے اس لیے پھر بھی غلطی کے رہ جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اگر ایسی کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں آپ کا تعاون صدقہ جاریہ ہوگا۔ (ادارہ)

تنبیہ

ہمارے ادارے کا نام بغیر ہماری تحریری اجازت بطور ملنے کا پتہ، ڈسٹری بیوٹر، ناشر یا تقسیم کنندگان وغیرہ میں نہ لکھا جائے۔ بصورت دیگر اس کی تمام تر ذمہ داری کتاب طبع کروانے والے پر ہوگی۔ ادارہ ہذا اس کا جواب دہ نہ ہوگا اور ایسا کرنے والے کے خلاف ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
مقدمہ	۷
قرآن کا ترجمہ اور اس کا تفصیلی حکم	۸
اہمیتِ مبحث	۸
"ترجمہ" کا لغوی معنی	۱۰
"ترجمہ" کا عرفی معنی	۱۰
"ترجمہ" کی تقسیم	۱۱
مطلق ترجمہ میں قابلِ لحاظ امور	۱۲
لفظی ترجمہ میں قابلِ لحاظ امور	۱۲
ترجمہ اور تفسیر میں فرق	۱۳
ترجمہ اور لغتِ اصل کے بغیر اجمالی تفسیر	۱۵
دو اہم امور	۱۶
ترجمہ سے منطقی تعریف مراد نہیں	۱۷
قرآن، معانی و مقاصد	۱۷
"قرآن" سے مراد	۱۷
معانی قرآن کی دو انواع	۱۸
مقاصدِ قرآن	۲۰
ہدایتِ قرآن	۲۰
اعجازِ قرآن	۲۵
تلاوتِ قرآن	۲۵
قرآن کے ترجمہ کا تفصیلی حکم	۲۷
ترجمۃ القرآن بمعنی تبلیغ الفاظ	۲۷
ترجمۃ القرآن بمعنی تفسیر بزبانِ عربی	۲۸
ترجمۃ القرآن بمعنی تفسیر بزبان اجنبی	۲۹
اہم امور	۲۹
ترجمہ کے فوائد	۳۲
شبہات کے جوابات	۳۴
ترجمۃ القرآن بمعنی دیگر زبان میں نقل کرنا	۳۷
اس ترجمہ کا حکم "عادۃً محال ہونا"	۳۷
طریق استدلال	۳۷
طریق استدلال	۳۸
اس ترجمہ کا حکم "شرعاً محال ہونا"	۴۰
ترجمہ کے عدمِ جواز پر ہونے والے شبہات اور اُن کے جوابات	۴۶
ترجمہ قرآن کے پڑھنے کا حکم	۵۱
مذہب شافعیہ	۵۱
مذہب مالکیہ	۵۲
مذہب حنابلہ	۵۲
مذہب حنفیہ	۵۳
چند قابلِ توجہ اُمور	۵۴
امام شافعی رحمہ اللہ کا قول	۵۴
محققِ شاطبی کا قول	۵۵
حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ کا قول	۵۸
ترجمۃ القرآن کے بارے میں جامعہ ازہر کا مؤقف	۵۸
طریقہ تفسیر	۶۰
خلاصہ بحث	۶۰
نسخ کی بحث	۶۲

موضوع کی اہمیت ۶۲
نسخ کیا ہے؟ ۶۳
لغوی مفہوم ۶۳
اصطلاحی مفہوم ۶۴
چار توجیہات ۶۵
نسخ کے لیے چند ضروری امور ۶۷
نسخ اور بدا میں فرق ۶۷
نسخ اور تخصیص میں فرق ۷۱
نسخ کے قائلین اور منکرین ۷۳
نسخ پر عقلی و نقلی دلائل ۷۴
(ا) جوازِ نسخ پر عقلی دلائل ۷۴
وقوعِ نسخ پر نقلی دلائل ۷۶
نسخ کی حکمت ۷۹
منکرینِ نسخ کے شبہات اور ان کے جوابات ۸۱
(ا) عقلاً جوازِ نسخ کے منکرین کے شبہات ۸۲
(ب) نقلاً جوازِ نسخ کے منکرین کے شبہات ۸۵
فرقہ عنانیہ اور شمعونیہ کا شبہ ۸۵
نصاریٰ کا شبہ ۸۷
فرقہ عیسویہ کا شبہ ۸۸
ابو مسلم اصفہانی کا شبہ ۸۹
معرفتِ نسخ کے طریقے ۹۰
قانونِ تعارض ۹۲
نسخ کن امور کو شامل ہوتا ہے؟ ۹۲
نسخ فی القرآن کی انواع ۹۵
مانعینِ نسخ کے شبہات اور ان کے جوابات ۹۸
نسخ بہ بدل اور بغیر بدل ۱۰۰
ایک شبہ اور اس کا جواب ۱۰۲
نسخ بہ بدل کی اقسام ۱۰۲
مانعین کے شبہات اور ان کے جوابات ۱۰۴
امتثالِ امر سے پہلے حکم کو منسوخ کرنا ۱۰۷
قائلین کے دلائل ۱۰۷
منکرین کے شبہات اور ان کے جوابات ۱۰۹
کتاب و سنت میں پائے جانے والا نسخ ۱۱۴
نسخ القرآن بالقرآن ۱۱۴
نسخ القرآن بالسنۃ ۱۱۵
دو شبہات اور ان کے جوابات ۱۱۸
نسخ السنۃ بالقرآن ۱۲۱
وقوع اور جواز کے دلائل ۱۲۲
مانعین کا شبہ اور اس کا جواب ۱۲۳
مانعین کے دلائل اور ان کا رد ۱۲۳
نسخ السنۃ بالسنۃ ۱۲۴
اہم بات ۱۲۴
اہلِ ظواہر کے دلائل ۱۲۵
قیاس کا ناسخ اور منسوخ ہونا ۱۲۶
مانعین کے دلائل ۱۲۶
مجوّزین کی دلیل ۱۲۷
جمہور کی دلیل ۱۲۷
اجماع کا ناسخ اور منسوخ ہونا ۱۲۸
مجوّزین کے مذہب پر بحث اور گفتگو ۱۲۹
ناسخ و منسوخ کے بارے میں علماء کا مؤقف ۱۲۹
زیادہ نسخ ماننے والوں کی غلطی اور اس کے اسباب ۱۳۰
جن آیات کا منسوخ ہونا مشہور ہے ۱۳۱
قرآن کا محکم اور متشابہ ۱۴۳
لغوی مفہوم ۱۴۳

قرآن محکم بھی ہے اور متشابہ بھی ۱۴۳
اصطلاحی مفہوم ۱۴۴
محکم اور متشابہ کے مفہوم میں علماء کی آراء ۱۴۵
مذکورہ آراء پر ایک نظر ۱۴۷
مزید دیگر آراء ۱۴۸
تشابہ کا سبب، اقسام اور امثلہ ۱۴۹
متشابہات کی اقسام ۱۵۲
متشابہات کے ذکر کرنے کی حکمتیں ۱۵۲
اہم بات ۱۵۵
متشابہ صفات ۱۵۵
متشابہ صفات میں درست رائے ۱۵۶
مذہب اوّل ۱۵۶
مذہب ثانی ۱۵۸
مذہب ثالث ۱۵۸
تطبیق وتمثیل ۱۵۸
چند شبہات اور ان کے جوابات ۱۶۱
قرآنِ کریم کا اسلوب ۱۷۰
اسلوب کا لغوی معنی ۱۷۰
اسلوب کا اصطلاحی معنی ۱۷۰
اسلوبِ قرآن کا معنی ۱۷۰
دو حسی مثالیں ۱۷۱
عربی زبان میں اس کی توضیح ۱۷۲
انسانی قوتوں کا متفاوت ہونا ۱۷۴
اسلوبِ قرآن کے خصائص ۱۷۵
توضیح وتمثیل ۱۹۲
اسلوبِ قرآن پر ہونے والے شبہات ۱۹۶
اعجاز قرآن اور اس سے متعلقہ مسائل ۱۹۷
وجوہِ اعجاز قرآن ۱۹۸
پہلی وجہ: زبان واسلوب ۱۹۸
قرآن کی معجزانہ مقدرا ۱۹۹
معارضۂ قرآن ۲۰۰
قرآن میں ہزارہا معجزات ہیں ۲۰۱
قرآن کے معجزات لازوال ہیں ۲۰۲
اس انتخاب کی وجہ حکمت ۲۰۳
قرآن اور حدیث کا اسلوب ۲۰۴
دوسری وجہ: طرزِ تالیف ۲۰۵
تیسری وجہ: علوم ومعارف ۲۰۷
عقیدہ ایمان باللہ کی چند مثالیں ۲۰۸
(ب) عقیدہ بعث وجزا کی چند مثالیں ۲۱۳
چوتھی وجہ: انسانی حاجات کی تکمیل ۲۲۱
پانچویں وجہ: کائناتی علوم کے بارے قرآن کا مؤقف .. ۲۲۳
موضوع سے متعلق ایک اہم بات ۲۲۸
چھٹی وجہ: طریقِ اصلاح وتربیت ۲۳۰
ساتویں وجہ: انبائے غیب ۲۳۸
زمانہ ماضی سے متعلق غیبی خبریں ۲۳۸
امورِ حاضر سے متعلق غیبی خبریں ۲۳۹
زمانہ مستقبل سے متعلق غیبی خبریں ۲۴۰
جدید سائنس نے چند معجزات کو آشکارا کیا ہے ۲۵۴
معجزہ، جسے جدید تاریخ نے آشکار کیا ۲۵۵
معجزہ، جسے جدید میڈیکل سائنس نے آشکار کیا ۲۵۶
معجزہ، جسے علم معاشرت نے آشکار کیا ۲۵۸
آٹھویں وجہ: آیاتِ عتاب ۲۶۰
اجتہادی خطا معصیت نہیں ۲۶۱
آیاتِ عتاب کی انواع ۲۶۴

نویں وجہ: انتظارِ طویل کے بعد نازل شدہ آیات ۲۶۷
دسویں وجہ: نزولِ وحی کے وقت حضور ﷺ کی کیفیت ۲۷۱
گیارہویں وجہ: آیت مباہلہ ۲۷۳
بارہویں وجہ: پیغمبر ﷺ کا قرآن کا متبادل لانے سے قاصر ہونا ۲۷۵
تیرہویں وجہ: وہ آیات جن سے کلام اللہ کی پیغمبر ﷺ کی طرف نسبت کی نفی ہوتی ہے ۲۷۶
چودھویں وجہ: قرآن کی اثر آفرینی ۲۷۸
دشمنوں پر اس کا اثر ۲۸۰
دوستوں کے دلوں پر اس کا اثر ۲۸۲
اعجاز کی وجوہ ضعیفہ ۲۸۶
قول بالصرفہ کا شبہ ۲۸۷
قولِ ہذا کی تغلیط ۲۸۸
اس موقع پر پیش آمدہ شبہات کا جواب ۲۹۲
اختتامی بات ۳۰۶
برائے ضروری یادداشت ۳۰۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدمہ

نحمدہ سبحانہ علی ھذہ النعم المترادفۃ، و نصلی و نسلم علی من نشر فی العالم ھدایتہ و عوارفہ، سیدنا و مولانا محمد شارح الکتاب الحکیم بسنتہ، و مفسر القرآن الکریم برسالتہ ﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۝﴾(النحل:٤٤) و شمل اللہ برضوانہ و احسانہ، آل الرسول و اصحابہ، و اتباعہ و احبابہ، والعلماء العاملین، و اصحاب الحقوق علینا اجمعین۔

امابعد! یہ کتاب "مناہل العرفان فی علوم القرآن" کا دوسرا حصہ ہے، میں نے اسے بھی اپنے معزز قارئین کے لئے اسی طرح لکھا ہے جس طرح اس کا پہلا حصہ لکھا تھا، اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہوں کہ وہ ہم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتوں کا فیضان فرمائے، اور اس کے لیے ہمیں اخلاص اور توفیق عطا فرمائے، تا کہ اس کی بارگاہ میں کارآمد ذخیرہ بن سکے، نیز اس ذات عالی سے دُعا ہے کہ تمام بلاد و عباد کو اپنی عنایات و الطاف سے نوازے، بلاشبہ وہ ذات بڑی کریم اور سخاوت والی ہے، وہی فتاح اور وہاب ہے، اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں، اسی سے خیر و بھلائی کی امیدیں وابستہ ہیں، وہی ہمیں کافی اور وہ بہترین کارساز ہے، بہترین مولیٰ اور مددگار ہے۔ اس کتاب کے جزو دوم میں بھی میں نے وہی اسلوب و منہج اختیار کیا ہے جو اس سے قبل اس کے جزو اوّل میں کیا ہے۔ اس کے مباحث بھی اسی طریقہ پر مرتب کئے گئے ہیں۔ چناں چہ علوم قرآن سے متعلق بارہ مباحث بیان ہو چکے ہیں۔ اب ہم اس کے بعد تیرہویں بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

بحث ⑬

قرآن کا ترجمہ اور اس کا تفصیلی حکم

اہمیتِ مبحث ہم اس مبحث کے آغاز میں تین پہلوؤں سے اس کی اہمیت کی جانب توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں:۔

① یہ مبحث اس قدر دقیق اور غامض ہے کہ علماء اس کے بارے میں اختلاف کرتے چلے آئے ہیں، خواہ وہ دورِ اوّل کے علماء ہوں یا دورِ حاضر کے، حتیٰ کہ کئی سالوں سے ہمارا وطن عزیز "مصر" مختلف افکار و آراء کا میدان بنا ہوا ہے، کوئی ترجمہ قرآن کے جواز کا قائل ہے اور کوئی عدمِ جواز کا۔

② بہت سے لوگوں نے اپنے زعم کے مطابق متعدد زبانوں میں نقل قرآن کا کام سرانجام دیا ہے، ان کی تعداد بعض محققین کی تحقیق کے مطابق ایک سو بیس زبانوں تک پہنچ چکی ہے کہ اس قدر زبانوں میں قرآن پاک کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ جن میں پینتیس زبانیں وہ ہیں جو مشرق و مغرب میں بولی جاتی ہیں۔ اور پھر قرآن کے یہ ترجمے کئی بار طبع ہو چکے ہیں، حتیٰ کہ جارج سیل (George Sale) (۱۶۹۷ء-۱۷۳۶ء) کا ترجمہ قرآن چونتیس بار طبع ہو چکا ہے۔

قرآن مجید کے جو ترجمے سب سے زیادہ طبع ہوئے، ان میں انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور اٹلی زبان کے ترجمے سرفہرست ہیں۔ اس کے بعد فارسی اور ترکی زبانوں میں پانچ ترجمے، چار ترجمے چینی زبان میں، تین لاطینی میں اور دو افغانی زبان میں اور ایک جاوی میں اور دیگر اُردو زبان میں ہوئے۔

قرآن کے ان مترجمین میں کچھ لوگ وہ ہیں جو اسلام سے کھلی عداوت رکھتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو اس سے محبت تو رکھتے ہیں، لیکن اس سے ناواقف ہیں۔ (عقلمند دشمن، جاہل دوست سے بہتر ہوتا ہے)

③ ان تراجم میں فحش اغلاط کا واقع ہونا درحقیقت اسلام کی شاندار عمارت اور اس کی عظمت کو منہدم کرنے اور امتِ اسلامیہ کی اجتماعی، لسانی اور دینی وحدت کو متزلزل کرنے کی ناپاک کوشش ہے۔ (اللہ محفوظ رکھے)۔

ان پُرخطر حقائق و واقعات کے ہوتے ہوئے ہمارے لیے قطعاً مناسب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں یا اپنا منہ بند کیے رکھیں، جیسے ہمیں اس کی طرف کوئی التفات ہی نہیں۔ پھر اس کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جائے کہ ترجمہ قرآن کا خیال جس نے وضع کیا اور اس سازش کو تیار کیا وہ کوئی عام آدمی نہیں، بلکہ ان کے مذہب کا بڑا پادری تھا جس کا نام یعقوب بن الصلیبی ہے۔

اس نے اپنی قوم کے ذہن میں یہ ڈالا کہ اس نے قرآن کی بہت سی آیات کا بارھویں صدی عیسوی میں سریانی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ پھر اس کا خلاصہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا، جو درحقیقت لندن کے برطانوی میوزیم میں موجود خطی نسخہ سے نقل کردہ تھا جس میں انگریزی ترجمہ بھی ملحق تھا۔ اس کے بعد بہت سے علماء نصاریٰ اس پادری کی پیروی میں لگے اور اس میدان میں دوسروں سے سبقت لے گئے۔

اس سلسلہ میں فیکنت دی طرازی (Philippe de Tarrazi) (۱۸۶۵ء-۱۹۵۶ء) کے لیکچرز دیکھ لئے جائیں، نیز علامہ ابوعبداللہ الزنجانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "تاریخ القرآن" میں جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی غور کرلیا جائے، وہ لکھتے ہیں "شاید قرآن کا اوّل ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا جو یورپ کی علمی زبان تھی، اور یہ ترجمہ ۱۱۴۳ء میں فیکنت کے قلم سے ہوا، جس نے اس کام کے لیے بطرس طلیطلی اور ایک دوسرے عربی عالم سے مدد لی تھی، چنانچہ قرآن، یورپ میں اندلس کے راستے سے داخل ہوا اس کی غرض ترجمہ قرآن سے یہ تھی کہ اسے رد و قدح کی خاطر دی کلونی کے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد قرآن کا ترجمہ ہوا اور ۱۵۰۹ء میں اسے شائع بھی کیا گیا، لیکن پڑھنے والوں کو اس کے استعمال میں لانے کی اجازت نہ تھی، کیونکہ اس ترجمہ میں رد واعتراض کا حصّہ نہ تھا، پھر ۱۵۹۴ء میں ہکلمان نے اس کا ترجمہ شائع کیا اور ۱۵۹۸ء کے بعد اس کا وہ نسخہ طبع ہوا جس میں اعترافات بھی ساتھ مذکور تھے۔"

کیا ان حقائق کی موجودگی میں ہمارے لیے لازم نہیں کہ اس عظیم معاملہ میں درست رائے کو بیان کیا جائے، تا کہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ ہمارے ساتھ اور ہمارے قرآن کے ساتھ کیا کیا منصوبے بنائے گئے اور ہم کس راہ کی طرف گامزن ہیں!؟

اُمید ہے کہ ہم اپنی کوشش و تحقیق میں حق اور باطل کو الگ الگ کرنے میں کامیاب ہوں گے اور اس کے ذریعہ اسلام اور قرآن کی ہدایت کو کامل بصیرت کے ساتھ پورے عالم میں پہنچا سکیں گے۔

نیز ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس بحث و تحقیق میں تعصب اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر وسعت مطالعہ اور فراخ دلی کے ساتھ ادب و انصاف کا دامن تھامے ہوئے چلیں، اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو اپنی تمام تر کوششوں کا مدار و محور بنائیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ﴾ (الاحزاب: ۴)

"اور اللہ حق بات کہتا ہے اور وہی راہِ راست دکھاتا ہے۔"

اب ہم اپنی بحث کا آغاز "ترجمہ" کے لغوی و عرفی معنی سے کرتے ہیں، اس کے بعد "ترجمہ" کی لفظی اور تفسیری دو اقسام میں تقسیم کریں گے۔ پھر ترجمہ اور تفسیر میں فرق ذکر کریں گے، وجہ اس کی یہ ہے کہ الفاظ کے معانی کی تعیین اور مراد کی تحقیق ایک اہم اور مفید کوشش ہے۔ خصوصاً جب کہ اس میں اختلافی مباحث بھی موجود ہوں، جیسا کہ زیر بحث مسئلہ میں ہیں۔

تحقیق اور جستجو سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بسا اوقات اختلافی امور کے معانی کی تعیین اور فنی عبارت میں محلِ نزاع کو رقم کرنا مختلف نقطہائے نظر کو قریب کرتا ہے، اور عموماً اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اختلاف کرنے والوں کا اختلاف حقیقی نہیں بلکہ محض لفظی اختلاف ہوتا ہے، کیونکہ ان کے ہاں نفی اور اثبات ایک امر پر وارد نہیں ہوتا، بلکہ جو لوگ ایک بات کا اثبات کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں دوسرے حضرات اس سے اختلاف نہیں رکھتے، اس معنی کو لے کر جو ان کی مراد ہوتی ہے اور جس کی نفی کرتے ہیں اس سے دوسرے اس معنی کو لے کر اختلاف نہیں کرتے جو ان کے ہاں مراد ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا اختلاف تعبیر کا ہوتا ہے، حقیقت کا نہیں ہوتا۔ اگر وہ علماء ابتداء ہی میں ایک تعبیر پر متفق ہو جاتے تو ان کی عبارتیں مختلف نہ ہوتیں اور ان میں اختلاف بالکل نہ

قارئین کرام سے معذرت! موضوع کلام کی وضاحت کرتے ہوئے بات طویل ہوگئی، جب ہم نے اشتباہ کی حقیقت بیان کردی اور باہمی نزاع واختلاف کا سبب ذکر کردیا۔ تو اب ہم بتاتے ہیں کہ لفظ "ترجمہ" کے متعدد معانی آتے ہیں، کچھ لغوی ہیں اور کچھ عرفی ہیں۔

"ترجمہ" کا لغوی معنی

عربی زبان میں لفظ "ترجمہ" چار معانی کے لیے آتا ہے:۔

① کلام پہنچانا اس شخص کو جس کو کلام نہ پہنچا ہو۔ جیسا کہ ایک شاعر کا قول ہے:

((ان الثمانین ۔ وبلغتھا ۔ قد احوجت سمعی الی ترجمان)).[1]

"بے شک اسی سال کی عمر (خدا کرے تو اس عمر کو پہنچے) نے میرے کانوں کو ترجمان کا محتاج بنا دیا ہے۔"

② کلام کی تفسیر اسی زبان میں کرنا جسے وہ لایا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ "ترجمان القرآن" ہیں۔ علامہ زمخشری نے اپنی کتاب "اساس البلاغۃ" میں شاید اسی معنی کو لیا ہے، وہ کہتے ہیں "کسی بھی چیز کی حالت کے ترجمے سے مراد اس کی تفسیر ہوتا ہے۔"

③ کلام کی تفسیر کسی دوسری زبان میں کرنا۔ لسان العرب اور قاموس میں ہے۔ "ترجمان سے مراد کلام کی تفسیر کرنے والا ہے"۔ قاموس کے شارح لکھتے ہیں: "ترجمہ وترجم عنہ" اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی شخص دوسری زبان میں اس کی تفسیر کرے۔ (قالہ الجوھری)

تفسیر ابن کثیر اور تفسیر بغوی میں ہے کہ لفظ "ترجمہ" لغتِ عرب میں مطلقاً تبیین وتوضیح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، خواہ زبان ایک ہو یا الگ الگ۔

④ کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کرنا۔ "لسان العرب" میں ہے کہ ترجمان (ضمہ اور فتحہ کے ساتھ) اس شخص کو کہتے ہیں جو کلام کا ترجمہ کرتا ہے، یعنی کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کرتا ہے اور اس کی جمع تراجم آتی ہے۔

"القاموس" کے شارح نے ترجمہ کے سابق معنی ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: "بعض کہتے ہیں کہ ترجمہ کے معنی ہیں، کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کرنا۔"

چوں کہ "ترجمہ" کے ان چاروں معانی پر بیان اور توضیح کا اطلاق ہوتا ہے، اس لیے ان معانی کے سوا ہر ایسا امر جس میں بیان ووضاحت کا معنی پایا جاتا ہو اس پر بھی بطور مجاز "ترجمہ" کا اطلاق کرنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: "ترجم لھذا الباب ھکذا" یعنی اس نے اس باب کا عنوان قائم کیا، اور "ترجم لفلان" یعنی اس نے فلاں شخص کی تاریخ بیان کی، اس طرح "ترجم حیاتہ" یعنی اس نے اس کی زندگی کے حالات بیان کیے۔ اور "ترجمۃ ھذا الباب کذا" یعنی اس باب کا مقصد یہ ہے۔ وغیرہ۔

"ترجمہ" کا عرفی معنی

یہاں پر عرفی معنی سے مراد عوام الناس کے ہاں معروف معنی ہے، کسی مخصوص جماعت وگروہ کا عرفی معنی نہیں ہے۔ یعنی عرف عام مراد ہے، عرف خاص مراد نہیں ہے۔ اس بناء پر "ترجمہ" کا چوتھا لغوی معنی، کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کرنا، خاص ہوگا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کلام کے تمام معانی اور مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک زبان کے کلام کو دوسری زبان کے کلام سے تعبیر کرنا۔ گویا آپ نے نفسِ کلام کو ایک زبان سے

[1] یہ ابو المنہال عوف بن محلم الخزاعی الشیبانی کا شعر ہے۔

دوسری زبان میں نقل کر دیا۔ یہ وہ راز ہے جو نقلِ کلام سے تعبیر کیا جاتا ہے، جبکہ یہ بات معلوم ہے کہ نفس کلام کو نقل کرنا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

ہم "ترجمہ" کے اس عرفی معنی کو اس سادہ عبارت میں بیان کر سکتے ہیں کہ "التعبیر عن معنی کلام فی لغة بکلام آخر من لغة اخری مع الوفاء بجمیع معانیه ومقاصده" ایک زبان کے کلام کے معنی کو دوسری زبان کے کلام سے اس طرح تعبیر کرنا کہ اس کلام کے تمام معانی ومقاصد اس میں شامل ہو جائیں۔

اس تعریف میں لفظ "تعبیر" بمنزلہ جنس کے ہے اور مابعد کی قیود بمنزلہ فصل کے ہیں۔ چنانچہ "عن معنی کلام" سے ایسا معنی تعریف سے خارج ہو جائے گا جو قائم بنفسہ ہو، جس وقت وہ کلام پہلی بار لفظ کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور "بکلام آخر" سے معنی و کلامِ اوّل سے تعبیر کرنا خارج ہو جائے گا، خواہ ہزار بار مکرر ہو۔ اور "من لغة اخری" سے ایک تو اصل زبان سے کلام کی تفسیر کرنا تعریف سے خارج ہو جائے گا اسی طرح اس قید سے مرادف یا مساوی کلام سے تعبیر کرنا خارج ہو جائے گا، جبکہ وہ تعبیر اس طریقہ پر ہو کہ اس میں تفسیر کا پہلو نہ ہو۔ حالانکہ زبان سب میں ایک ہے۔ اور "مع الوفاء بجمیع معانیه ومقاصده" کی قید سے کلام کی غیر زبان میں تفسیر کرنا خارج از تعریف ہو جائے گا۔ کیونکہ تفسیر میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اصل کلام کے تمام معانی ومقاصد کا بھی احاطہ کرتا ہو، بلکہ اس کے لیے صرف وضاحت کافی ہوتی ہے، خواہ کسی بھی طریقہ سے ہو۔ اس کی مزید تفصیل عنقریب آ رہی ہے۔

"ترجمہ" کی تقسیم

اس معنی عرفی کے اعتبار سے "ترجمہ" کی دو قسمیں ہیں۔ ① لفظی ② تفسیری۔

لفظی ترجمہ تو وہ ہوگا جس میں اصل کلام کو اس کے نظم وترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے نقل کیا جائے۔ چنانچہ یہ ایک مرادف معنی کو دوسرے مرادف معنی کی جگہ میں رکھنے کے مشابہ ہوگا۔ بعض لوگ۔ اس ترجمہ کو ترجمہ لفظی کہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ اس کو ترجمہ مساوی بھی کہتے ہیں۔

اور تفسیری ترجمہ میں اصل کلام کے نظم وترتیب کی رعایت نہیں ہوتی، بلکہ اس میں اصل مقصد معانی واغراض کی مکمل طور منظر کشی کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اس ترجمہ کو ترجمہ معنوی بھی کہتے ہیں، اسے تفسیری ترجمہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں معانی واغراض کی منظر کشی کرنا اس کو تفسیر کے مشابہ بنا دیتا ہے، حالانکہ وہ تفسیر نہیں ہوتا، جیسا کہ بعد میں اس کی وضاحت ہوگی۔

لہٰذا جو شخص کلام کا لفظی ترجمہ کرتا ہے وہ حقیقت میں ہر لفظ کا اصل معنی سمجھنے کا قصد کرتا ہے اور پھر اس کو ایسے لفظ سے بدلتا ہے جو دوسری زبان میں اس کے مساوی ہوتا ہے اور وہ اس میں اصل وضع اور موقع واستعمال سب چیزوں کا خیال رکھتا ہے۔ اگرچہ کلام کے موقع استعمال کے سلسلہ میں دو زبانوں کے مختلف ہونے کے سبب اصل مراد اس ترجمہ سے مخفی اور پوشیدہ رہ جائے۔

جبکہ اس کے بالمقابل جو شخص کلام کا تفسیری ترجمہ کرتا ہے، وہ اس مفہوم کو پیش نظر رکھتا ہے جو کلام کا اصل مطلوب ہے وہ اصل مراد کو سمجھ کر اس کو دوسری زبان کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ جو متکلم کی اصل مراد کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ ہر ہر لفظ کے اصل معنی سمجھنے یا ایک لفظ کی جگہ دوسرے لفظ لانے کی مشقت میں نہیں پڑتا۔

اب ہم یہاں پر ترجمہ کے امکان کو فرض کرتے ہوئے قرآن مجید کی ایک آیت ترجمہ کی ان دونوں قسموں کی مثال میں بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾ (بنی اسرائیل:۲۹)

اس آیت کا جب لفظی ترجمہ کریں گے تو ترجمہ میں اصل کلام کے نظم وترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسا کلام لائیں گے جس سے معلوم ہو کہ ہاتھوں کو گردن سے باندھنا اور ان کو خوب دراز کرنا ممنوع ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ پہلے حرف نہی لائیں گے۔ اس کے بعد فعل منہی عنہ ہوگا، جس سے متصل اس کا مفعول ہوگا اور اس میں ضمیر اس کا فاعل ہوگا، لیکن کلام کی یہ تعبیر مخاطب کو سمجھانے کے اعتبار سے نامانوس ہے، کیونکہ کلام الٰہی کا اصل مقصد تو خرچ کرنے میں میانہ روی اختیار کرنا اور افراط وتفریط سے منع کرنا ہے۔ بلکہ بسااوقات مخاطب اس طرز سے ناگواری محسوس کرتے ہیں کہ اس ممانعت کا مفہوم کیا ہے کہ ہاتھوں کو گردن سے نہ باندھو اور ان کو زیادہ مت کھولو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس عیب کو اصل کلام پر چسپاں کر دیتے ہیں حالانکہ عیب تو ان کے اس زعم میں ہے کہ یہ ترجمہ قرآن ہے۔

لیکن مذکورہ آیت کریمہ کا تفسیری ترجمہ کیا جائے گا تو کلام کی اصل مراد کو پہلے سمجھا جائے گا کہ مراد اس سے یہ ہے کہ انتہائی نفرت انگیز صورت میں مال کو بے جا اور فضول خرچ کرنا ممنوع ہے۔ اس کے بعد ترجمہ کیا جائے گا، اس کے لیے ایسی عبارت لائی جائے گی جس سے ممانعت سے اصل مقصد معلوم ہوتا ہو، اس کے لیے ایسا اسلوب اختیار کیا جائے گا جو دوسروں کے قلوب واذہان پر اپنا اثر چھوڑتا ہو اور اس سے فضول خرچی کی شناعت کا بدرجۂ کمال احساس پیدا ہو۔

اس ترجمہ میں اصل کلام کے نظم وترتیب کی یا اس کی لفظی ترتیب کی رعایت رکھنا لازم نہیں ہوتا۔

ہم نے اس سے پہلے یہ کہا تھا کہ "ترجمہ کے امکان کو فرض کرتے ہوئے" اس کی وجہ عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ قرآن کریم کا اس معنی عرفی کے ساتھ ترجمہ کرنا محال ہے، اور یہ بات معلوم ہے مثال میں اس کا درست ہونا شرط نہیں ہوتا۔

مطلق ترجمہ میں قابل لحاظ امور

ترجمہ خواہ لفظی ہو یا تفسیری اس میں چار امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

① مترجم کا لغتِ اصل اور لغتِ ترجمہ دونوں زبانوں کی اوضاع سے واقف ہونا ضروری ہے۔

② دونوں زبانوں کے اسالیب وخصائص سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

③ ترجمہ تسلی بخش طریقہ پر اصل کلام کے معانی ومقاصد کو سموئے ہوئے ہو۔

④ ترجمے کے الفاظ ایسے ہونا ضروری ہیں جو اصل کلام کے قائم مقام ہوسکیں اور اس سے مستغنی کرنے والے ہوں، بالکل مستقل کلام معلوم ہو۔ اس کی مزید وضاحت ترجمہ وتفسیر میں فرق کے ذیل میں آئے گی۔

لفظی ترجمہ میں قابلِ لحاظ امور

لفظی ترجمہ ان مذکور چار امور کے ساتھ ساتھ مزید دو امور پر موقوف ہوتا ہے:-

① لغتِ اصل اور لغتِ ترجمہ کے مفردات باہم مساوی ہوں، تاکہ لغتِ ترجمہ کا ہر لفظ لغتِ اصل کے ہر لفظ کے قائم مقام ہوسکے۔ لفظی ترجمہ میں اس امر کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

② ضمائر مستترہ اور حروفِ ربط کے سلسلہ میں دونوں زبانوں میں مشابہت ویکسانیت پائی جاتی ہو جو مفردات کو جملوں سے مربوط کرتے ہیں، اور وہ مشابہت عام ہے۔ کسی بھی قسم کی ہو۔ یہ شرط ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ ترجمہ کی ترتیب اس کی متقاضی

ہے۔ پھر یہ دو شرطیں دشوار ہیں، دوسری شرط تو پہلی سے زیادہ دشوار ہے۔ کیونکہ ایسا ہونا بہت بعید ہے کہ لغتِ ترجمہ میں ایسے مفردات پائے جائیں جو لغتِ اصل کے تمام مفردات کے مساوی ہوں، اور ضمائرِ مستترہ اور حروفِ ربط میں دونوں زبانوں کا باہم مشابہ ہونا تو انتہائی بعید معلوم ہوتا ہے۔

اس نادر الوجود امر کی بناء پر بعض حضرات اس بات کے قائل ہو گئے کہ لفظی ترجمہ ناممکن ہے۔ جبکہ دیگر حضرات کا کہنا یہ ہے کہ کسی کلام میں تو ایسا ترجمہ ممکن ہے اور کسی میں ممکن نہیں۔

آپ اس بات سے خوب واقف ہیں کہ ان مشکلات کی وجہ سے کلام کی اصل مراد مستور ہو جاتی ہے۔ (جیسا کہ سابقہ مثال میں گزر چکا۔)

البتہ تفسیری ترجمہ آسان ہے، اس سے انسان عاجز نہیں ہے۔ اس ترجمہ میں کلام کی اصل مراد عام طور پر واضح ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس پر اعتماد کیا جاتا ہے، ترجمہ کرنے والے حضرات تفسیری ترجمہ کو لفظی ترجمہ پر ترجیح دیتے ہیں۔

ترجمہ اور تفسیر میں فرق

ترجمہ خواہ لفظی ہو یا تفسیری وہ بہرحال تفسیر کے مغائر ہوتا ہے، خواہ وہ لغتِ اصل میں ہو یا کسی اور لغت میں۔

ہم نے ابھی ترجمہ کی تعریف میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن بہت سے مصنفین پر یہ امر مشتبہ ہو گیا ہے، انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ تفسیری ترجمہ ہی لغتِ اصل کی یا غیر لغتِ اصل کی تفسیر ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے اس پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس پر اصل کلام کے ترجمہ کا حکم لگا دیا۔ دراصل یہ وہ التباس واشتباہ ہے جو ان کے مابین وجہ نزاع اور سبب اختلاف بنا ہے۔ اب ہم ترجمہ اور تفسیر میں چار فرق ذکر کرتے ہیں، جبکہ ان کی نظر میں ان میں ایک ہی فرق ہے۔

فرقِ اوّل

"ترجمہ" ایک مستقل صیغہ ولفظ ہے، اس میں اصل کلام سے استغناء ملحوظ ہوتا ہے اور وہ اصل کے قائم مقام بھی نہیں ہوتا۔ جبکہ "تفسیر" کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ "تفسیر" ہمیشہ اپنے اصل سے مربوط ہوتی ہے کہ مثلاً اسے مفرد یا مرکب صورت میں لاتے ہیں، پھر اس کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس سے وہ اصل سے مربوط نظر آتی ہے، اور وہ ربط واتصال ایسا ہوتا ہے جیسے مبتداء کا اپنی خبر سے ہوتا ہے، پھر کلام کے دوسرے جزو کی طرف جاتے ہیں، خواہ مفرد ہو یا مرکب، پھر اس کی بھی ایسی شرح کرتے ہیں، یوں "تفسیر" اپنے آغاز سے انتہاء تک اس طرح ہوتی ہے کہ اسے اپنے اصل سے منقطع کرنا بالکل ممکن نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ وہ اپنے جملہ اور تفصیل میں اپنے اصل کے قائم مقام ہو جائے۔

فرقِ دوم

"ترجمہ" میں اضافہ کرنا درست نہیں، جبکہ "تفسیر" میں درست ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس میں اضافہ ناگزیر ہوتا ہے، کیونکہ "ترجمہ" میں اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ وہ اصل کلام کے عین مطابق ہو، اس کو نقل کرنے والا ہو۔ امانت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس میں انتہائی احتیاط سے کام لیا جائے، اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔ حتیٰ کہ اگر اصل کلام میں کوئی غلطی پائی جاتی ہو تو ترجمہ میں بھی وہی غلطی لازم پائی جائے۔ جبکہ "تفسیر" کا حال اس کے برخلاف ہے، کیونکہ "تفسیر" میں یہ امر لازم ہے کہ اس سے اصل کلام کی توضیح ہوتی ہو، اور کبھی یہ بیان وتوضیح اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مفسر کلام کا اضافہ کرنے میں مختلف طریقے اختیار کرے، تاکہ اس شرح کی توجیہ ہو یا بقدرِ ضرورت مخاطب کے لیے کلام کو مزید نکھارا جا سکے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے

کہ وہ لغوی الفاظ کی شرح کرتا ہے۔ بالخصوص جب ان کلمات سے متکلم کی مراد وہ معانی نہ ہوں جن کے لیے وہ کلمات وضع کیے گئے ہوں یا جن الفاظ کا سمجھنا خاص اصطلاحات کے ذکر کرنے پر موقوف ہو یا دلائل بیان کرنے یا کوئی حکمت بیان کرنے کے لیے اپنے کلام کا سلسلہ طویل کرتا ہے۔

اس استطراد کی ایک نوع یہ ہوتی ہے کہ وہ اصل کلام میں پائی جانے والی غلطی پر متنبہ کرتا ہے، جبکہ اس میں غلطی کی گئی ہو۔ جیسا کہ علمی کتابوں کی شروحات میں ہم اس امر کو دیکھتے ہیں۔

اور یہ بات محال ہے کہ آپ کو "ترجمہ" کے سلسلہ میں اس طرح کی باتیں دستیاب ہو جائیں، بصورتِ دیگر یہ امانت کی ذمہ داری اور اس کی احتیاط سے عہدہ برا ہونا ہوگا۔

فرقِ سوم "ترجمہ" میں عرفی اعتبار سے یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ اصل کلام کے تمام معانی اور مقاصد کو محیط ہے، جبکہ "تفسیر" میں ایسا نہیں ہوتا، "تفسیر" حقیقت میں کلام کی توضیح کو متضمن ہوتی ہے۔ خواہ وہ اجمالی طور پر توضیح ہو یا تفصیلی طریقہ سے اس میں اصل کلام کے تمام معانی و مقاصد شامل ہوتے ہیں یا بعض مقاصد پر اکتفاء ہوتا ہے ان مواقع واحوال کے پیش نظر جو ایک مفسر کو درپیش ہوتے ہیں۔

اس فرق کی دلیل عرف عام کا وہ حکم ہے جسے ہم ایک مثال سے بیان کرتے ہیں:۔

ایک شخص کو اپنے والد کے مترکہ سامان میں دو کاغذ ہاتھ کے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن وہ ایسی اجنبی زبان میں ہوں جس کو وہ جانتا نہ ہو، چنانچہ وہ شخص ان کو ایسے آدمی کے حوالہ کرے جو اس زبان کو جانتا ہو تا کہ اس سے اس کی وضاحت معلوم کرے، پھر وہ واقف شخص اسے بتائے کہ ایک کاغذ پر معمولی بات رقم ہے جو ایک فقیر اجنبی شخص کی طرف سے ہے، جو آپ کے والد سے مدد کا خواستگار ہے۔ جبکہ دوسرے کاغذ پر یہ ایک معاہدہ لکھا ہے کہ فلاں شخص کے ذمہ آپ کے والد کا بہت بڑا قرض ہے۔ اب اس موقع پر وہ شخص پہلے کاغذ کو تو پھاڑ ڈالے گا جس میں مدد کی درخواست کی گئی تھی اور اس کو خاطر میں بھی نہیں لائے گا۔ جبکہ دوسرا کاغذ جس میں معاہدہ لکھا ہے اس پر خاص توجہ دے گا، اور زبان سے واقف کار شخص سے مطالبہ کرے گا کہ وہ اس کا ترجمہ کرے، تا کہ عدالت میں اس مقروض پر دعویٰ کر کے فیصلہ لے سکے، اور عدالت کی زبان بھی ترجمہ کی زبان ہے، کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس شخص کے لیے تفسیر کافی نہیں ہے؟ جس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے مترجم سے اس کے ترجمہ کا مطالبہ کیا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ معاہدہ نامہ جن امور کو مشتمل ہے وہ ترجمہ اس کو کفایت کرے گا اور اس کے مقصد کے حصول کے لیے کافی ہے، اس کی نہ کوئی حجت و دلیل اس کی وجہ سے کمزور پڑے گی اور نہ کوئی حق اس کا ضائع ہوگا؟

نیز اس میں یہ امر بھی غور طلب ہے یہ بات بحکم عرف معلوم ہوتی ہے کہ "تفسیر" میں یہ شرط نہیں کہ وہ تمام تفاصیل کو محیط ہو، بلکہ اس میں مضمون کی وضاحت کافی ہوتی ہے، جبکہ "ترجمہ" میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ اصل کلام کے مطابق اور اس کے معانی و مقاصد کو حاوی ہے یا نہیں؟

فرقِ چہارم "ترجمہ" عرفی لحاظ سے اس دعویٰ کو متضمن ہوتا ہے کہ مترجم نے جن معانی و مقاصد کو نقل کیا ہے وہی اصل کلام کا مدلول اور اصل متکلم کی مراد ہے۔ اس پر وہ مطمئن ہوتا ہے۔ جبکہ "تفسیر" ایسی نہیں، کیونکہ "تفسیر" میں کبھی تو

مفسر اطمینان کا دعویٰ کرتا ہے اور کبھی اس کا دعویدار نہیں ہوتا۔ دعوی اس وقت کرتا ہے جب اس کے پاس دلائل وشواہد موجود ہوتے ہیں۔ اور اطمینان کا دعویٰ اس وقت نہیں کرتا جب وہ دلائل کے اعتبار سے تہی دامن ہوتا ہے۔ پھر وہ کبھی تو درجہ احتمال میں صراحت کرتا ہے اور چند محتمل المعانی وجوہات ذکر کرتا ہے جن میں بعض وجوہ دوسری پر راجح ہوتی ہیں اور کبھی صراحت کرنے یا ترجیح دینے سے سکوت اختیار کرتا ہے۔ کبھی بات اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ اسے لِمَ کلمہ یا جملہ سے اپنی عاجزی کا اظہار کرنا پڑتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ متکلم اپنے کلام کی مراد سے زیادہ واقف ہے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے مفسرین کرام، قرآن کے متشابہات اور سورتوں کے فواتح سے اپنی لاعلمی کا صاف اظہار کر دیتے ہیں۔

ہم نے اس سے پہلے جو بات کہی کہ "ترجمہ" میں بیان کردہ معانی ومقاصد اطمینان کے دعوی کے ساتھ مذکور ہوتے ہیں، اس کی دلیل بھی عرف عام کی شہادت ہے، نیز تمام لوگ ترجمہ میں اس کو معتبر مانتے آئے ہیں کہ جب چاہتے ہیں تو ترجمہ کو اصل کلام کے قائم مقام کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان اصول سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ بلکہ ان اصول کو فراموش ہی کر دیتے ہیں اور ان کی نظروں سے یہ بات اوجھل ہو جاتی ہے کہ "ترجمہ" تو صرف ترجمہ ہوتا ہے، وہ لفظِ ترجمہ کو حذف کر کے اس پر لفظِ اصل کا اطلاق کرتے ہیں، گویا کہ "ترجمہ" اصل ہے یا جیسے یہاں صرف اصل موجود ہے فرع سرے سے ہے ہی نہیں۔ اگر آپ کو میری بات میں کوئی تردّد ہو تو جن لوگوں نے اپنی مقدس کتب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے، وہ ملاحظہ کر لیجئے، ان مترجم کتابوں پر تورات اور انجیل کا اطلاق کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ نہ تورات ہے اور نہ انجیل بلکہ وہ صرف عربی ترجمے ہیں، ان کتابوں کے جن کی اصل زبان عبرانی ہے، اس بات کے وہ خود معترف ہیں۔ لیکن دیکھیے! خود انہوں نے اور عرفِ عام نے لفظِ ترجمہ کو حذف کر دیا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دلوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ ترجمہ بھی اصل کے مطابق ایک صورت ہے جو اصل کے پوری طرح قائم مقام ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر ہے تو صرف ظاہری فرق ہے۔ جبکہ ذاتی اور ملکی معاہدات وقوانین اور علمی، فنی اور ادبی کتابوں کے تراجم میں اس طرح کی بات بہت کم پائی جاتی ہے اور ایسی کتابیں بہت زیادہ اور تشبیہ وتمثیل سے بے نیاز ہیں۔ یہ تمام باتیں تراجم کے بارے میں کہنا ممکن ہیں، لیکن تفسیر میں ایسا کہنا ممکن نہیں۔ کہیں سے بھی یہ بات سننے میں نہیں آئی کہ لفظِ تفسیر کسی کتاب کے عنوان سے حذف کر دیا گیا ہو۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس معروف ہے۔ بسا اوقات اصل لفظ کو استعمال میں حذف کر دیتے ہیں، جبکہ تفسیر کا لفظ کسی بھی صورت میں حذف اور ساقط نہیں ہوتا، جیسا کہ تفسیر البیضاوی، تفسیر النسفی اور تفسیر الجلالین اور دیگر تفاسیر قرآن کہ ان پر لفظِ تفسیر کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

کیا یہ بات بطورِ دلیل کے کافی نہیں ہے کہ تفسیر میں اس کا لحاظ ہوتا ہے کہ یہ اصل کلام کا بیان اور اس کی توضیح ہے، بیان اپنے مبین کے قائم مقام نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس کے متعلق یہ دعویٰ کرنا درست ہے کہ وہ اس کے تمام اغراض ومقاصد کو حاوی اور محیط ہے۔

ترجمہ اور لغتِ اصل کے بغیر اجمالی تفسیر

علاوہ ازیں یہاں ایک اور امر کی طرف راہنمائی کی ضرورت ہے کہ جو تفسیر، لغتِ اصل کے بغیر ہوتی ہے وہ تفسیری ترجمہ کے بہت مشابہ ہوتی ہے۔ جبکہ وہ تفسیر اجمالی ہو اور اس میں معانی محتملہ میں سے کسی ایک معنی کو منتخب کر لیا گیا ہو۔ شاید دونوں کی اس اس

مشابہت کی وجہ سے بعض لوگوں کو اشتباہ ہوا اور تفسیری ترجمہ اور لغتِ اصل کے بغیر تفسیر کرنے کو امر واحد خیال کرنے لگے۔ حالانکہ درست بات وہ ہے جو پہلے گزر چکی کہ ان دو انواع میں بھی چار فروق ہیں۔

لہٰذا مفسر کے لیے لازم ہے کہ وہ متعدد محتمل معانی میں سے منتخب کردہ اجمالی معنی اس وقت تک بیان نہ کرے جب تک کہ اس کے انتخاب کی وجہ نہ ذکر کر دے۔ اور یہ توجیہ اس اضافہ کو بھی ثابت کرتی ہے جو اصل کے مدلول پر زائد ہوتا ہے۔ پھر مفسر کا یہ طرز ایسا ہے کہ اس سے قاری کو محسوس ہو جاتا ہے کہ اصل لفظ چند معانی رکھتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان معانی میں سے منتخب کردہ معنی درست نہیں ہوتا اور بعض اوقات مفسر رک جاتا ہے اور اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے کہ اس کے لیے معنی کا مفہوم سمجھنا دشوار ہو رہا ہے۔ اور وہ خاموشی کو ہی اختیار کرتا ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسی تفسیر اصل کلام کے تمام معانی کا احاطہ نہیں کرتی اور نہ ہی اس سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ پھر یہ بات بھی ضروری ہے کہ تفسیر کا صیغہ اپنے اصل سے مربوط ہو، خواہ اشارۃً ہو۔ چنانچہ یوں کہا جائے گا کہ اس آیت یا جملہ کا معنی اس طرح سے ہے، یا یوں کہا جائے گا کہ فلاں سورت کی آیت نمبر فلاں کا معنی اس طرح سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کے لیے کوئی صیغہ متعین طور پر نہیں ہے، جب کہ ترجمہ کا معاملہ اس کے برخلاف ہے۔

اگر آپ سوال کریں کہ مفسر جب انتخاب معنی کی وجہ ذکر نہ کرے اور تفسیر اور اصل کے درمیان ربط و تعلق کے سلسلہ کو منقطع کر دے تو پھر کیا حکم ہے؟

ہم جواب میں کہیں گے کہ ایسا کرنا حقیقت میں نہ تفسیر کہلائے گا اور نہ ترجمہ۔ بلکہ یہ ایک ایسا طریقہ ہے کہ اس سے کلام ان امور سے خارج ہو جائے گا کہ جن امور کا ترجمہ اور تفسیر دونوں میں پاس ضروری ہے۔ کیونکہ اس نے اصل کلام کی نہ شرح کی اور نہ توضیح، جس سے وہ کلام مفسر بنتا، اور نہ ہی اس نے اصل کلام کے معانی و مقاصد کو پیش کیا تاکہ وہ کلام مترجم کہلاتا۔ ایسی صورت میں اگر اس نے لوگوں تک اس کو اس عنوان سے پہنچایا کہ وہ اصل کا ترجمہ ہے تو یا تو وہ اس معاملہ میں کمی کرنے والا ہوگا یا کوتاہی کا مرتکب ہوگا۔ اگر تو کمی کرنے والا ہو تو اس سے اس کا عجز اور جہالت ثابت ہوگا اور اگر کوتاہی کا مرتکب ہو تو یہ لوگوں کو گمراہ کرنا ہے اور ان کے خیال میں یہ ڈالنا ہے کہ یہ ترجمہ ہے، حالانکہ وہ ترجمہ نہیں، بلکہ ان کے ساتھ خیانت ہے۔ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو چلنے نہیں دیتا۔

دو اہم امور

① لفظی ترجمہ اور تفسیری ترجمہ کے درمیان حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک تعبیر ہے جو دوسری زبان کے کلام میں کی گئی ہے، اور اس میں اصل کلام کے تمام معانی و مقاصد کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔

ان دونوں میں محض شکل و صورت کا فرق ہے، اور وہ یہ ہے کہ لفظی ترجمہ میں ہر مفرد اپنے اصل کلام کے ہر مفرد کے مقابلہ میں ہوتا ہے، تفسیری ترجمہ اس کے خلاف ہوتا ہے، جیسا کہ ہم نے وضاحت کر دی ہے۔

اس کے بعد یہ خیال کرنا چاہیے کہ لفظِ ترجمہ، تفسیری کی بجائے لفظی پر زیادہ دلالت کرتا ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تفسیری ترجمہ، زیادہ ذہن کے قریب اور واضح ہوتا ہے، کیونکہ وہ سہل اور عام فہم ہوتا ہے، مترجمین اور قارئین اس کو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ لفظی ترجمہ تو بعض اوقات مشکل اور دشوار ہوتا ہے، مترجمین اور قارئین کی اس پر توجہ بھی بہت کم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے لفظی ترجمہ ایک نظری چیز بنتا جا رہا ہے۔

② اصل کلام کی تفسیر اسی زبان میں کرنا یا کسی دوسری زبان میں اس کی تفسیر کرنا یکساں شان رکھتا ہے، سوائے اس کے کہ الفاظ کا

ظاہری فرق نظر آئے گا۔ جیسا کہ آپ خواص کے تفسیری درس کا مطالعہ کریں جس میں عربی زبان میں متعین معانی کی وضاحت کی گئی ہو، پھر اسی درس کو عام لوگوں کی زبان میں پڑھیں اور اس میں بھی ان ہی معانی کا ذکر ہو مگر مخاطب کی زبان میں ہو تو کیا اصل کلام سے مفہوم ان متعین معانی میں بیان کی گئی تفسیر اور اس دوسری زبان میں ان ہی معانی میں کی گئی تفسیر میں کوئی فرق نظر آئے گا؟ صرف ظاہری الفاظ اور تعبیر کا اختلاف نظر آئے گا۔ اگر ہم اس بات کو ملحوظ رکھیں تو اس اشتباہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور ہمیں پھر مزید بحث کی ضرورت بھی نہ رہے گی (کہ حقیقت میں لفظی اور تفسیری دونوں ترجمے بھی ایک ہی ہوتے ہیں ان میں کوئی فرق نہیں، نیز کلام اصل کی اسی زبان میں تفسیر کی جائے یا کسی دوسری زبان میں تفسیر کی جائے، سب یکساں ہے)

اس امر پر آگاہ رہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی توفیق عطا فرمائے۔

ترجمہ سے منطقی تعریف مراد نہیں

بعض محققین کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کوئی شخص یہ سمجھنے لگے کہ "ترجمہ" سے مراد اس کی لفظی تعریف ہے، یہ اس کے قبیل سے ہے، جب کہ غور و فکر کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ "ترجمہ" کو معنی عرفی کے اعتبار سے نہ تو لفظی تعریف کہنا ممکن ہے اور نہ حقیقی تعریف، اس کی دو وجہیں ہیں:۔

① تمام تعریفات دراصل تصورات کے قبیل سے ہیں، جبکہ "ترجمہ" کلام تام اور قضیہ تامہ ہونے کی وجہ سے تصدیقات کے زمرہ میں آتا ہے۔

② صیغہ تعریف دائمی طور پر معرف سے مربوط ہوتا ہے، کیونکہ وہ قولِ شارح ہوتا ہے۔ اور شرح و بیان اپنے صیغہ میں مشروح اور مبین سے مربوط و متعلق ہوتا ہے۔ جبکہ "ترجمہ" ایک ایسا صیغہ ہے جو اصل مترجم سے مستقل ہوتا ہے، کیونکہ "ترجمہ" کی اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ اصل کے قائم مقام بنے اور اس سے مستغنی اور بے نیاز ہو۔ لہٰذا ایسا ممکن نہیں کہ بدل اور مبدل منہ دونوں جمع ہو جائیں۔

ہاں البتہ مفرد کی تفسیر کسی دوسری زبان میں کرنا تعریف حقیقی کے قبیل سے ہوگا، جبکہ مفسر لہ کے ذہن میں اس کی صورت کے حصول کا فائدہ دے، اور اگر پہلے سے حاصل صورت کے حضور کا فائدہ دے تو پھر یہ تعریف لفظی کے قبیل سے ہوگا۔

جس طرح کہ کوئی شخص انسان کی حقیقت سے آشنا نہ ہو تو اس کے سامنے انسان کی تعریف اس طریقہ سے کی جائے کہ "الانسان حیوان ناطق" اور جو انسان کی حقیقت سے واقف ہو، لیکن اس پر لفظِ بشر کے اطلاق سے ناواقف ہو تو اس کے سامنے یوں تعریف کرنا کہ "البشر هو الانسان" بہر حال! یہاں پر ہمارا مقصد مفردات اور اس کی تفسیر کرنا نہیں ہے، کیونکہ ہماری بحث "ترجمہ" اور کلام مفید کے بارے میں ہے "تفسیر" اور کلمات مفردہ کے بارے میں نہیں ہے۔

قرآن، معانی و مقاصد

ہم "ترجمۃ القرآن" کے پہلے حصہ (ترجمہ) سے فارغ ہو کر اب اس کے دوسرے حصہ (قرآن) کو بیان کرتے ہیں، تاکہ اس کی مراد بھی واضح ہو اور قرآن کے معانی و مقاصد کے انواع بھی معلوم ہوں، اس سے بجا طور پر معلوم ہو سکے گا کہ اس کا ترجمہ ممکن ہے یا نہیں۔

"قرآن" سے مراد

اس کتاب کے جزو اول میں مبحثِ اوّل کے ذیل میں مدلول قرآن سے متعلق علماء کے مختلف مذاہب و آراء تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔

اب ہم آپ کی توجہ اس طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ یہاں مبحثِ ترجمہ میں مراد وہ لفظ ہے جو اعجاز کی شان رکھتا ہے۔

اس سے وہ صفتِ قدیمہ مراد نہیں ہے جو کلام کی صفت ہے، اور نہ کلمات نفسیہ حکمیہ مراد ہے اور نہ ہی نقوشِ مکتوبہ اس سے مراد ہے۔ جیسا کہ اپنے مقام پر اس بات کو ہم بیان کر چکے ہیں۔

یہاں "قرآن" سے خاص لفظِ معجز مراد ہے، کیونکہ "ترجمہ" کی اس کی طرف اضافت کی گئی ہے، اور یہ بات واضح ہے کہ "ترجمہ" صرف لفظِ حقیقی پر مشتمل ہوتا ہے جس میں حروف واصوات شامل ہوتے ہیں، صفتِ قدیمہ، کلمات حکمیہ اور نقوش مکتوبہ کو مشتمل نہیں ہوتا۔ ہاں اگر بصورتِ تاویل کہا جائے تو ممکن ہے۔

معانی قرآن کی دو انواع

جبکہ "ترجمہ" میں کلام اصل کے معانی کا احاطہ ملحوظ ہوتا ہے، اس لیے ہم آپ کے علم میں یہ بات لاتے ہیں کہ قرآن کریم بلکہ ہر کلام بلیغ لازماً دو قسم کے معانی کو شامل ہوتا ہے، ایک معانی اوّلیہ، دوسرے معانی ثانویہ یا معانی تابعہ۔ کسی کلامِ بلیغ کے "معانی اولیہ" وہ ہوتے ہیں جو کلام سے یا کسی بھی زبان کے صیغہ والفاظ سے مستفاد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ محکوم بہ کی محکوم علیہ کی طرف محض اسناد کرنا۔ اس کا نام معنی اوّلی ہوتا ہے، کیونکہ یہ لفظ سے اوّل بار مفہوم ہوتا ہے، اس کو معنی اصلی بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ اصول کی طرح ثابت ہوتا ہے۔ متکلم ومخاطب کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف یا تبدیلی رونما نہیں ہوتی، نہ ہی انداز مخاطب سے اس پر کوئی اثر پڑتا ہے، بلکہ اس میں عربی، عجمی، شہری، دیہاتی، ذہین اور کند ذہن سب برابر ہوتے ہیں۔

اور "معانی ثانویہ" وہ ہوتے ہیں جو لفظ کے معنی اوّلی سے زائد اس کلام سے مستفاد ہوتے ہیں، ان کو "ثانوی" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مفہوم کے اعتبار سے متاخر ہوتے ہیں۔ ان کو "تابعہ" اس لیے کہتے ہیں کہ یہ قید کے مشابہ ہوتے ہیں، اور قید، مقید کے تابع ہوتی ہے، یا اس وجہ سے کہ توابع کی تبدیلی سے اس میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے، چنانچہ مخاطب اور متکلم کے احوال کے اختلاف سے اور زبانوں کے مختلف اور متنوع ہونے سے اس میں پہلے کے برعکس بھی اختلاف آ جاتا ہے۔

اس کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں تاکہ ان دو انواع کی مزید توضیح ہو جائے:

جب آپ خالی الذہن مخاطب سے ہمکلام ہوتے ہیں اور اسے حاتم کی سخاوت بتانا چاہتے ہیں تو کہیں گے کہ "جاد حاتم۔" حاتم نے سخاوت کی اور اگر آپ کا مخاطب خبر کے بارہ میں متردد اور شک کرنے والا ہے تو پھر اس سے یوں خطاب کریں گے "حاتم جواد۔" اور اگر آپ کا مخاطب حکم کا منکر ہے، لیکن انکار میں شدت نہیں رکھتا تو پھر یوں کہیں گے "اِنّ حاتمًا جواد" یعنی بلاشبہ حاتم سخی ہے۔ اور اگر آپ کا مخاطب ایسا منکر حکم ہے کہ اس کا انکار حد سے بڑھا ہوا ہے تو پھر اس سے یوں مخاطب ہوں گے: "واللہ اِنّ حاتما لجواد" یعنی بخدا! یقیناً حاتم سخی ہے۔ اور اسی طرح اگر موقع ومقام مدح کا ہو تو یوں کہیں گے، "حاتم سخی جواد کریم معطاء" یعنی حاتم بڑا فیاض، کریم سخی اور بخششیں کرنے والا ہے۔ اور اگر آپ کا مخاطب اس کے برعکس حاتم کے علاوہ کسی اور کے فیاض اور سخی ہونے کا معتقد ہو تو یوں کہیں گے: "حاتم ممدود السماط" یا یوں کہیں گے: کان فی بنی طئ بحر کثیر الفیضان۔ اور جب آپ کا مخاطب کند ذہن ہو تو حاتم کی سخاوت اس کے سامنے یوں بیان کریں گے: حاتم مهزول الفصیل، اور اگر مخاطب بلا کا ذہین ہو تو پھر یوں کہیں گے: غمر حاتم بانعامه الانام۔

اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان تمام امثلہ میں ایک ہی بات بیان کی گئی ہے، سب سے ایک ہی بات مراد ہے کہ حاتم کی

جانب جود وسخا کی نسبت کی گئی ہے۔اسے معنی اوّلی یا معنی اصلی کہتے ہیں۔ پھر آپ نے دیکھا کہ اس معنی اصلی پر کچھ مختلف خصوصیات کا اضافہ کیا گیا جو امثلہ کے تغایر کی وجہ سے متغایر ومختلف ہیں۔ چنانچہ پہلی مثال میں حکم کو مؤکدات سے خالی لایا گیا ہے۔ کیونکہ مخاطب خالی الذہن ہے، دوسری مثال میں جملہ کو اسمیہ لاکر بطورِ استحسان تاکید لائی گئی، کیونکہ مخاطب کا حال تردّد اور شک والا ہے۔ اور تیسری مثال میں دو طرح کی تاکیدات لائی گئی ہیں، ایک تو جملہ کو اسمیہ لایا گیا اور دوسرا "اِنّ" سے کلام کو مؤکد لایا گیا ہے، کیونکہ مخاطب کا حال انکار کا ہے اور اس کا انکار ان تاکیدات کا متقاضی ہے۔ چوتھی مثال میں آپ دیکھتے ہیں کہ چار طرح کی تاکیدات لائی گئی ہیں۔ ① جملہ کو اسمیہ لایا گیا۔ ② اِنّ کے ساتھ لایا گیا۔ ③ لام تاکید لایا گیا۔ ④ قسم لائی گئی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مخاطب کا حال شدتِ انکار کا ہے اور وہ اس کا تقاضا کرتا ہے کہ کلام میں مؤکدات زیادہ لائی جائیں۔

پھر پانچویں مثال میں کلام میں اطناب ہے، کیونکہ مقام، مقامِ مدح ہے۔ جو اطناب کا تقاضا کرتا ہے۔ چھٹی مثال میں حاتم کے لیے جود کا قصر وحصر ہے، کیونکہ مخالف اس کے خلاف کا معتقد ہے۔ اس بناء پر قصرِ قلب کیا گیا ہے، ساتویں مثال میں تعبیر میں مجاز کا طریق اختیار کیا گیا، جس پر کنایہ قریبہ دلالت کرتا ہے اور استعارہ تصریحیہ موجود ہے۔ کیونکہ مخاطب قدرے ذکی اور ذہین ہے۔ اور آٹھویں مثال میں تعبیر میں مجاز کا طریق کنایہ بعیدہ کی بنیاد پر اختیار کیا گیا ہے اور استعارہ مکنیہ موجود ہے۔ کیونکہ مخاطب کا حال یہ ہے کہ وہ ذکاوت وذہانت میں اعلیٰ درجہ رکھتا ہے کہ اس کے لیے مخفی اشارہ ہی کافی ہے۔

فصاحتِ مفردات کے ساتھ یہ زائد خصوصیات ہی بلاغتِ کلام ومتکلم کا مرجع و مدار ہوتی ہیں، بلکہ یہی تمام علومِ بلاغت کا باوجود کثرت مباحث کے مدار ہوتی ہیں۔ پھر صرف یہ چیز طالب تحقیق کو بلغاء اور اہل لسان وبیان کے مقام تک نہیں پہنچا دیتی، بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے ذریعہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ مثلاً یہ حال، اس اعتبار اور خصوصیت کا تقاضا کرتا ہے اور یہ حال اس کا متقاضی ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ کلام بلیغ بنانے پر قدرت حاصل ہو جانا اور اس کو بنانے کا ملکہ پیدا ہو جانا تو یہ کچھ آسان امر نہیں ہے، بلکہ بہت سے امور پر موقوف ہے۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ظروفِ کلام اور احوالِ مخاطب سے خوب واقف ہو۔ دوسرا یہ کہ قوت وضعف کے اعتبار سے ان احوال کے مرتبہ ودرجہ کا احاطہ کیے ہوئے ہو، تیسرا یہ کہ ان احوال ومقامات کے مناسب خصوصیات کا لحاظ رکھے، چوتھا یہ کہ بلاغت کا ذوق اور حسنِ بیانی رکھتا ہو جو بلغاء کلام اور اسالیب کی ممارست اور ان کی پیروی میں اپنے ذہن کو لگانے رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

اگر یہ امور نہ پائے جائیں تو ہم نے بہت سے ماہرین علوم لسانی دیکھے ہیں جو عمدہ کلام نہیں بنا سکتے، اس میدانِ بلاغت کا شہسوار ہونا تو دُور کی بات ہے اس بلاغت وبیان کے ادنیٰ درجہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

مذکورہ امور جس کلام میں کلی طور پر پائے جائیں گے وہ اعلیٰ درجہ کا کلام بلیغ ہوگا اور جس میں مذکورہ امور جزوی طور پر پائے جائیں گے وہ اسی درجہ کا کلام بلیغ ہوگا۔ قرآن کریم کے علاوہ دنیا کوئی ایسا کلام نہیں جانتی اور نہ آئندہ کبھی جانے گی جو تمام خواص بلاغت کا احاطہ کرنے کے اعتبار سے بلاغت کے درجہ اعلیٰ اور مرتبہ عظمیٰ پر فائز ہو کہ اس کلام کے آگے بڑوں بڑوں کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں اور بڑے بڑے نامور فصحاء وبلغاء اس کے میدان بلاغت میں حیران سرگردان کھڑے ہیں۔ بلکہ قرآن کے شان دار وجوہ اعجاز کو دیکھ کر اپنی عاجزی وبے بسی کی خود گواہی دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان کا کلام، بلاغت میں کتنا ہی عالی اور بلند ہو جائے مگر وہ مخلوق کا

ہی بنایا ہوا ہے، جبکہ قرآن، خالق کا کلام ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۳۸)

"ہم پر تو اللہ نے اپنا رنگ چڑھا دیا ہے اور کون ہے جو اللہ سے بہتر رنگ چڑھائے، اور ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں۔"

مقاصدِ قرآن

جب کہ عرفی اعتبار سے "ترجمہ" لازمی طور پر کلامِ اصل کے تمام مقاصد کو حاوی ہوتا ہے، اس لیے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزولِ کتاب عزیز سے تین بنیادی مقاصد ہیں۔ ① قرآن کا جن وانس کے لیے ہدایت ہونا۔ ② قرآن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تائید وتصدیق ہونا۔ ③ مخلوق خدا کا کلام مقدس کی تلاوت کرنا اور اس طریقہ سے اللہ کی عبادت کرنا۔

① ہدایتِ قرآن

قرآن کریم کی ہدایت اپنے عموم، تمامیت اور وضوح کے اعتبار سے امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس کا عموم تو اس طرح سے ہے کہ یہ "ہدایت" تمام جن وانس کو ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر دور میں حاصل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ﴾ (الانعام: ۱۹)

"اور مجھ پر یہ قرآن وحی کے طور پر اس لیے نازل کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے میں تمہیں بھی ڈراؤں اور ان سب کو بھی جنہیں یہ قرآن پہنچے۔"

ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰي وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ﴾ (الانعام: ۹۲)

"اور یہ بڑی برکت والی کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، پچھلی آسمانی ہدایات کی تصدیق کرنے والی ہے، تاکہ تم اس کے ذریعے بستیوں کے مرکز اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو خبردار کرو۔"

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

"کہو کہ: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔"

نیز ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ

ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝﴾ (الاحقاف:۲۹-۳۲)

"اور یاد کرو جب ہم نے جنات میں سے ایک گروہ کو تمہاری طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں، چنانچہ جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے کہا کہ! خاموش ہو جاؤ، پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ اپنی قوم کے پاس اُنہیں خبردار کرتے ہوئے واپس پہنچے۔ انہوں نے کہا: اے ہماری قوم کے لوگو! یقین جانو ہم ایک ایسی کتاب سن ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، حق بات اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اے ہماری قوم کے لوگو! اللہ کے داعی کی بات مان لو، اور اس پر ایمان لے آؤ، اللہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا، اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دیدے گا، اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے تو وہ ساری زمین میں کہیں بھی جا کہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتا، اور اللہ کے سوا اس کو کسی قسم کے رکھوالے بھی نہیں ملیں گے۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔"

باقی اس ہدایت کی تمامیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہدایت، بدرجہ کمال ان ہدایات کو حاوی ہے جن کو انسانیت اور تاریخ جانتی ہے، نیز ان عقائد، اخلاق، عادات و معاملات کو بھی اختلاف انواع کے مطابق منتظم ہے جن کی مخلوق کو احتیاج ہوتی ہے، اور انسان کی دنیا و آخرت کے مصالح کو جامع ہے، اور انسان کا اپنے رب تعالیٰ کے ساتھ اور اس کائنات کے ساتھ تعلق کو استوار کرتی ہے جہاں وہ رہتا بستا ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں کس طرح روح اور جسم کے مقاصد کو جمع کر دیا گیا ہے:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآىِٕلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝﴾ (البقرۃ:۱۷۷)

"نیکی بس یہی تو نہیں ہے کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں، اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیں، اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں، اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں، اور جب کوئی عہد کر لیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں، اور تنگی اور تکلیف میں، نیز جنگ کے وقت، صبر و استقلال کے خوگر ہوں۔ ایسے لوگ ہیں جو سچے ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۝﴾ (الحجرات:۱۳)

"اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔"

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ (البقرۃ:۱۷۲)

"اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں رزق کے طور پر عطا کی ہیں، ان میں سے کھاؤ، اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر واقعی تم صرف اسی کی بندگی کرتے ہو۔"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (الجمعۃ:۱۰)

"اور پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ۔ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تا کہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔"

اس طرح کی بہت سی قرآنی آیات ہیں، جن سے کتاب اللہ کا کامل طور پر کتابِ ہدایت ہونا معلوم ہوتا ہے۔

باقی اس ہدایت کے وضوح کا سبب یہ ہے کہ اسے اس طرح مؤثر پیرایہ میں شاندار طریقہ سے لوگوں کے روبرو پیش کیا گیا ہے کہ وضاحت وتفہیم کا کوئی ذریعہ نہیں چھوڑا گیا، تمام وسائل توضیح بروئے کار لائے گئے، اسلوب ایسا جامع کہ بیان وبلاغت میں شانِ اعجاز لیے ہوئے ہے۔ اور استدلال ایسا سادہ اور عمیق ہے کہ اس کی سادگی اور گہرائی، کتاب کائنات سے مستفاد ہے، اور ایسی دل کش مثالیں ہیں جس میں دقیق عقلی امور کو محسوس ترین طریقوں سے اجاگر کیا گیا ہے، اور ایسی اعلیٰ درجہ کی حکمتیں مذکور ہیں جو اسلام کے محاسن اور شریعت کی عظمت کو بیان کرنے میں انسانی عقول کو متحیر کر دینے والی ہیں، نیز ایسے حکیمانہ پسندیدہ قصص اور واقعات اس میں موجود ہیں جو انسان کے ایمان ویقین کو مستحکم کرتے ہیں، انسانی نفوس کو مہذب اور افکار وجذبات کو صیقل کرتے ہیں، اور انسان کے اندر جذبہ قربانی پیدا کرتے ہیں، نیز ان قرآنی واقعات سے نیک وبد کے حال ومآل کا ایسا نقشہ سامنے آتا ہے کہ مخاطب اس کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کی بہت مثالیں موجود ہیں۔ جو عنقریب بیان ہوں گی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس مقام پر ہمیں معلوم ہو کہ بعض قرآنی ہدایات تو قرآن کی معانی اصلیہ سے معلوم ہوتی ہیں، اور بعض اس کے معانی تبعیہ سے۔

قسم اوّل تو واضح ہے، اس کے لیے کسی مثال کی ضرورت نہیں اور اس پر سب کا اتفاق ہے۔ باقی رہی قسم دوم تو اس میں کچھ بحث ہے، لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں۔ ہم اس کی وضاحت سورۃ الفاتحہ کی چند مثالوں سے کرتے ہیں:

① اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور سورۃ توبہ کے سوا ہر سورت کا آغاز تسمیہ سے کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ذی شان امر کی ابتداء بسم اللہ سے کرنی چاہیے۔

② اللہ تعالیٰ نے لفظ اللہ جو رحمان اور رحیم کی صفات سے موصوف ہے، اس کی طرف "اسم" کی اضافت کی ہے، نیز جار ومجرور کے

عامل کو مقدر کر کے اسے مقصور ومحصور کیا ہے۔ اس سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ ہر چیز میں استعانت صرف اللہ وحدہ کی ذات سے ہی ہونی چاہیے۔ اور عامل کی تقدیر بھی عام ہے، خاص نہیں ہے۔

③ پھر اللہ تعالیٰ نے مقامِ حمد میں ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝﴾ کے فرمان کے ذریعہ اس لفظ جلالہ (اللہ) کی مذکورہ صفات بیان کیں، اس سے یہ بات مستفاد ہوئی کہ اللہ تعالیٰ مستحق حمد تین امور کی وجہ سے ہے۔ ایک اس کا تمام عالم کو پالنا، دوسرا اس کی رحمت واسعہ، جس کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ متصف ہے، تیسرا اس کا یوم جزا کو جزاء عادل کے ساتھ اکیلا اور تنہا متصرف ہونا۔

④ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾ سے جو حصر وقصر کا مفہوم نکل رہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ توحید اپنی دونوں انواع، توحید الوہیت اور توحید ربوبیت اس ذات کے ساتھ خاص ہے۔

⑤ سابقہ آیات کے ذکر کرنے کے بعد مذکورہ آیت لانا ایسا ہے جیسے چند مقامات کے بعد اس کا نتیجہ ذکر کیا جائے۔

⑥ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝﴾ سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے لیے اصل اور بنیادی چیز جس پر ایک دوسرے سے مسابقت اور مفاخرت ہونی چاہیے۔ وہ ﴿الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ کی ہدایت ہے۔ جیسا کہ اس کی طلب اور دعا کو اختیار کرنے اور اس پر اکتفاء کرنے کا کہا گیا ہے۔

پھر اس پر سورۃ الفاتحہ کی انتہاء ایسی ہی ہے جیسے اس کے مقاصد کی انتہاء ہے۔

⑦ اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کی امید صرف اللہ سے ہی کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ہدایت، مذکورہ آیات توحید سے ایک ہر طرز پر منسلک ہے۔

⑧ اس سورت کی آیات کریمہ کی ترتیب سے یہ ادب معلوم ہوا کہ دعا کرنے والے شخص کو چاہیے کہ وہ کچھ مانگنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے، یعنی اپنی دعا میں پہلے ان کلمات تحمید وتمجید کا ذکر کرے جن کا اس کی دعا اور طلب ہدایت سے تعلق ہو۔

یہ چند مثالیں ہیں جو ہم نے سورۃ الفاتحہ سے اخذ کی ہیں، ہمارا نہیں خیال کہ کسی کو ان میں کوئی اختلاف ہوگا۔

اب دو مزید مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں علماء کا اختلاف ہے۔ پہلی مثال: آیتِ وضو سے معلوم ہوتا ہے کہ اعضاء وضو کے درمیان ترتیب کا خیال رکھنا واجب ہے، کیونکہ آیت وضو میں ان اعضاء کا ذکر اسی ترتیب سے ہے، جو ظاہر نص کا تقاضا ہے، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ﴾ (المائدہ:٦)

"اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنے چہرے کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو۔"

آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سر کا ذکر جو کہ عضو ممسوح ہے، اعضاء مغسولہ کے درمیان کیا ہے، جو کہ مقتضی ظاہر کے خلاف

ہے، حالانکہ ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ اعضاء مغسولہ کا ذکر ایک دوسرے سے متصل ہونا چاہیے، اس عضو ممسوح سے یا تو پہلے ذکر کیا جائے یا اس کے بعد کیونکہ اعضاء مغسولہ ایک دوسرے کے مماثل ہیں، اہل عرب، مماثل چیزوں میں فصل نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ کوئی حکمت ہو! اب یہاں حکمت یہی ہے کہ وضو میں اعضاءِ وضو کے درمیان ترتیب کا خیال رکھنا واجب ہے۔ جیسا کہ مذکورہ آیت میں ترتیب کا طرز اس پر دلالت کرتا ہے۔

اس جگہ اس حکم ترتیب کے استعارہ پر ایک اور توجیہ بھی ہے۔

وہ یہ کہ آیت مذکورہ میں نہ تو ترتیب صعودی ہے اور نہ ترتیب نزولی، چنانچہ اس طرح آغاز نہیں کیا کہ پہلے عالی کا ذکر ہو پھر سافل یا پہلے سافل کا ہو پھر ترتیب سے عالی کا، بلکہ آیت میں عالی کا ذکر کیا پھر سافل کا پھر اعلیٰ کا پھر اسفل کا، اور یہ مقتضی ظاہر کے خلاف ہے، اس طرح کا کلام عرب کے اندر کسی حکمت کی بناء پر ہی ہوتا ہے، اور ہماری فہم کے مطابق اس کی حکمت یہاں پر وضو میں وجوب ترتیب کا بتانا ہے۔ شافعیہ اور حنابلہ اس کے قائل ہیں، اگرچہ حنفیہ اور مالکیہ اس کے خلاف ہیں۔

دوسری مثال: ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ سے وضو میں ربع راس کے مسح کا وجوب معلوم ہوتا ہے، حالانکہ مقتضی ظاہر اس کے خلاف ہے۔ وہ اس طرح سے کہ "راس" عضو ممسوح ہے اور اس پر حرفِ جار "باء" داخل ہے۔ حالانکہ ظاہر کا تقاضا یہ تھا کہ حرف جار "باء" آلہ مسح یعنی ہاتھ کی ہتھیلی پر داخل ہو، لیکن کلام عربی میں ظاہر کے خلاف کلام لانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں "راس" کو آلہ مسح کے بمنزلہ قرار دیا گیا ہے، اس بات کی طرف راہنمائی کرنے کے لیے کہ ہاتھوں کو سر پر رکھ کر حرکت دی جائے، گویا کہ ہم نے سر کے ساتھ ہاتھوں کا مسح کیا۔ اور اس طرح مقدارِ ناصیہ پر عموماً مسح ہو جاتا ہے جو کہ ربع راس کی مقدار ہے۔ اس طرح مسح ربع راس کا وجوب معلوم ہوا۔ حنفیہ اس کو اختیار کرتے ہیں اور باقی ائمہ ثلاثہ اس کے خلاف کے قائل ہیں۔

ہمیں فقہی تقابل یا مذہبی موازنت بیان نہیں کرنا کہ ایک رائے کو دوسری رائے پر یا ایک فہم کو دوسرے فہم پر ترجیح یا تقویت دیں، بلکہ صرف یہ بیان کرنا کہ نظم قرآن کی اپنے ثانوی معانی کے اعتبار سے عقائد، احکام، آداب اور ادلہ ولطائف وغیرہ متنوع ہدایات پر بھی دلالت ہوتی ہے۔

اگرچہ لوگ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق ان کا ادراک کرنے میں مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ معانی ثانویہ انتہائی دقیق ولطیف ہوتے ہیں، ان دقائق کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے فہم وادراک میں بھی لوگوں کا اختلاف ہو۔ جب کہ نظم قرآن کی اپنے معانی اصلیہ واوّلیہ کے اعتبار سے ہدایات پر دلالت اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ وہ بالکل واضح ہوتی ہے، بہت کم اس میں کوئی اختلاف یا تفاوت ہوتا ہے۔ کیونکہ ان معانی میں عربی عجمی شہری، دیہاتی ذہین اور کند ذہن سب برابر ہوتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ قرآن کی قرآنیت اور اس کا امتیاز اپنے معانی ثانویہ اور اس سے مستفاد امور سے زیادہ مربط ہوتا ہے، بہ نسبت اس کے معانی اصلیہ اور اس سے استفادہ کردہ امور سے۔ جس کی خصوصیات اور اعتبارات آئندہ ذکر ہوں گی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ معانی اصلیہ کا دائرہ تنگ اور اس کے افق محدود ہیں، جبکہ معانی ثانویہ ایک تلاطم خیز سمندر ہے جس سے علوم الٰہیہ اور حکمت وعظمت الٰہیہ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اور ان معانی ثانویہ سے ان لوگوں پر فیوضاتِ الٰہیہ اور الہامات علویہ کا ظہور ہوتا ہے جن کو اللہ نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا ہوتا ہے، جو اس کے مقرب وچنیدہ ہوتے ہیں اور علماء عاملین میں سے اہل ذوق

وصفا ہوتے ہیں۔ (اللہ اپنے کرم سے ان میں سے بنادے۔)

اعجازِ قرآن نزولِ قرآن کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ اہل دنیا پر رسالتِ محمدی ﷺ کی شہادت قائم ہو اور رہتی دنیا تک ایک لازوال معجزہ باقی رہے جو ہدایت اور دینِ حق کی آواز بلند کرتا رہے، اور جس کے ذریعہ دینِ حق دیگر تمام مذاہب پر غالب رہے۔

قرآن کے وجوہِ اعجاز تو بے شمار ہیں، ہم تفصیل سے اپنی جگہ ان شاءاللہ ان کا ذکر کریں گے۔ ہم یہاں صرف آپ کو یہ بتانا چاہیں گے کہ قرآن کی اعلیٰ بلاغت، وجوہِ اعجاز میں سے ایک ممتاز اور نمایاں وجہ اعجاز ہے، بلکہ یہ وجہ وجود کے اعتبار سے نمایاں ترین اور افراد کے اعتبار سے عظیم ترین ہے۔ اس لیے کہ قرآن کی تین چھوٹی آیات یا ایک طویل آیت معجزانہ انداز رکھتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے بلاغت کے سورماؤں کو چیلنج کیا کہ اس جیسی سورت لاکر دکھائی، سورۃ الکوثر سب سے چھوٹی سورت ہے۔ جس کی تین چھوٹی چھوٹی آیات ہیں، لیکن بلاغت کے ائمہ اس وقت جبکہ بلاغت اپنے عروج و ترقی پر تھی، عاجز آ گئے، بلکہ تمام مخلوق اس سے بہت ہی عاجز آ گئی۔

یہ بات ہم بتا چکے ہیں کہ قرآن کی بلاغت کا اصل مدار ان خصوصیات اور اعتبارات پر ہے جو اصل کلام سے زائد ہوتی ہیں، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ خصوصیات قرآن میں اس طرح جاری و ساری ہیں جس طرح سبز لکڑی میں پانی یا زندہ جسم میں روح، نیز یہ کہ نظم قرآن ہی تمام ہدایات کا مصدر و سرچشمہ ہے۔ خواہ اس کا طریق نظم قرآنی ہو یا اس کا طریق وہ خصوصیات ہوں جو اصل نظم قرآنی سے زائد ہوتی ہیں۔

اس وقت آپ حیران رہ جائیں گے جب قرآن کی ہدایت کی سچی دلیل سے آپ واقف ہوں گے اور قرآن کی بلندی سے آشنا ہوں گے۔

تلاوتِ قرآن نزولِ قرآن کا تیسرا مقصد یہ ہے کہ خلق خدا قرآن کی تلاوت اس کی عبدیت و بندگی اختیار کرے، نیز اللہ تعالیٰ ان کو محض اس کے الفاظ کے دھرانے پر خواہ سمجھ کر نہ ہوں، اجر عطا فرمائے، اور اگر تلاوت کے ساتھ فہم بھی حاصل کریں تو انہی زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب سے نوازے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً یَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۝ لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ یَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝﴾ (الفاطر: ۲۹-۳۰)

"جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، اور جنہوں نے نماز کی پابندی کر رکھی ہے، اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے اُس میں سے وہ خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی نقصان نہیں اُٹھائے گی، تاکہ اللہ اُن کے پورے اجر ان کو دیدے، اور اپنے فضل سے اور زیادہ بھی دے، یقیناً وہ بہت بخشنے والا، بڑا قدردان ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھتا ہے اس کو ایک نیکی ملتی ہے اور ایک نیکی دس گنا کے برابر ہے، میں نہیں کہتا کہ الٓمٓ

ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔"[۱]

حاکم نے بھی اس طرح کی حدیث مرفوعاً نقل کی ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ آیا ہے کہ فرمایا: میری امت کی افضل عبادت قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے لیکن دیگر احادیث سے تقویت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ بھی اس قرآن کی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے قرآن امتیازی شان رکھتا ہے۔ قرآن کے علاوہ اور کوئی چیز ایسی نہیں کہ اس کے محض تلاوت پر اجر سکتا ہو، بلکہ اس کے لیے غور وفکر ضروری ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نماز جو دین کا ستون ہے، لیکن اس پر ثواب صرف اس قدر ملتا ہے جس قدر اس کو سمجھا ہو۔

قرآن کی یہ امتیازی شان درج ذیل بلند حکمتوں اور فوائد کی بنیاد پر ہے:

① قرآن کریم کی حفاظت وبقاء کا ضروری انتظام کرنا، اور اسے تغیر وتبدل سے محفوظ رکھنا، جیسا کہ سابقہ کتب اس سے محفوظ نہ رہیں۔ لہٰذا جو شخص محض اس کتاب مقدس کی تلاوت کرتا ہے، خواہ اس کے معانی کو نہ سمجھتا ہو اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کو اجر عظیم دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پھر لوگوں کے دلوں میں قرآن پڑھنے کی محبت ڈال دی جس کے سبب یہ ہوا کہ لوگ اس قرآن کو زبانی یاد کرے، زیادہ سے زیادہ اسے پڑھنے میں لگ گئے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب قرآن کی قرأت، اس کے قراء اور حفاظ کی کثرت ہوگی تو قرآن زبانوں پر زیادہ دہرایا جائے گا، ہر طبقہ میں نمایاں ہوگا، اس طرح کسی کو اس کا کچھ حصہ بھی بدلنے کی جرأت نہ ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس قرآن میں عیب جوئی کرتے ہیں ان کو سخت دشواری پیش آئی ہے، جیسا کہ اس جرم کا ارتکاب کرنے کی بعض اعدائے اسلام کی کوشش کی ہے۔

② مسلمانوں کی زبان کی وحدت کو پیدا کرنا، جس سے ان کی دینی وحدت فروغ پائے گی، نیز اس طرح افہام وتفہیم کے ذرائع کو آسان کرنا اور باہمی تعاون کو پیدا کرنا۔ اس سے مسلمانوں کی صفوں میں قوت آئے گی اور شان وشوکت میں اضافہ ہوگا اور ان کا بول بالا ہوگا۔

یہ ہے اللہ کی حکمت عالیہ، اسلام اس سے روشناس ہوا ہے، اس نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ روزِ اوّل سے اور یہ حکمت وسیاست پوری طرح کامیاب نظر آتی ہے کہ قرآن نے اپنی اس عربی زبان کے ذریعہ بہت سی مختلف زبانیں بولنے والی اُمتوں کو اپنی آغوش میں لے لیا، جو علومِ قرآن اور علوم لغتِ قرآن میں اتنے ماہر ہو گئے کہ بہت سے اہل عرب پر سبقت لے گئے۔ جبکہ اس دور جدید میں بھی جسے علم ونور کا دور کہا جاتا ہے، بڑی بڑی امتوں نے اس طرح کی کوشش کی ہے کہ ایک ہی مشترک زبان مقرر کر لی جائے جس کا نام انہوں نے اسپرانٹو (Esperanto) رکھا ہے۔ مگر وہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، سبقت لے جانا تو دور کی بات ہے۔

③ قرآن پڑھنے والے قاری کو اس دلچسپ ترغیبی انداز اور حکیمانہ اسلوب کے ذریعہ غور وتدبر اور ہدایت قرآن کے قریب کرنا۔

---

[۱] سنن الترمذی، فضائل القرآن، باب: (۶۱) حدیث: ۲۹۱۰۔ وقال حسن صحیح

کیوں کہ جو شخص قرآن کو آج اس طرح پڑھتا ہے کہ اس کے معانی سے غافل ہو تو وہ کل کو اس طرح پڑھے گا کہ اس میں غور کرے گا اور جو کل کو غور کے ساتھ قرآن پڑھے گا توقع ہے کہ وہ اگلے روز اس کی ہدایت پر بھی عمل کرے گا۔ اس طرح قرآن کا قاری اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچے گا، یہاں تک کی اصل غرض وغایت تک پہنچ جائے گا۔ (راستہ پر چلنے والا ایک دن منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے)۔

اللہ رحم فرمائے ابن عطاء اللہ الاسکندری پر، وہ اپنی کتاب "الحکم" میں فرماتے ہیں "ذکر اس لیے نہ چھوڑ کہ تجھے اس میں اللہ کے ساتھ حضوری کی کیفیت حاصل نہیں ہے، اس لیے کہ وجودِ ذکر کی غفلت زیادہ سخت ہے بہ نسبت اس کے کہ تجھے اس کی حضوری کیفیت سے غفلت ہو، اُمید ہے کہ وہ تجھے اس ذکر کی وجہ سے جس میں غفلت موجود ہے، اس ذکر کے بلند درجہ تک پہنچا دے جس میں بیداری پائی جائے، اور پھر اس ذکر سے جس میں بیداری ہو تجھے اس ذکر تک پہنچا دے جس میں حضوری کیفیت پائی جائے اور پھر اس درجہ سے مذکور کے ماسوا سے غیبت کے مقام تک پہنچا دے، اور یہ بات اللہ پر کچھ دشوار نہیں۔

قرآن کے ترجمہ کا تفصیلی حکم

لفظ ترجمہ کی اس وضاحت اور تشریح کے ضمن میں جو معلومات ہم نے فراہم کی ہیں، اس کی روشنی میں ہمارے لیے آسان ہوگا کہ ہم اس بات کا ادراک کریں کہ اس مرکب اضافی کے چار بنیادی معانی ہیں، جن میں سے تین معانی تو وہ ہیں جن کا تعلق صرف لغت وزبان سے ہے اور چوتھا معنی ایسا ہے جس میں لغت اور عرف عام دونوں کا اشتراک ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترجمہ کا چوتھا معنی ہی لائق توجہ واہتمام ہے۔ کیونکہ یہی معنی متبادر الی الفہم بھی ہے اور عام گفتگو میں بھی یہی مقصود ہوتا ہے۔

اب ہم یہاں پر پہلے ترجمہ کے چار معانی پیش کرتے ہیں، ہر معنی کا حکم مناسب بھی اس کے ساتھ ذکر کریں گے، امید کرتے ہیں کہ یہ طریقہ خطا ولغزش سے دور اور صواب واعتدال کے زیادہ قریب ہوگا۔

① ترجمۃ القرآن بمعنی تبلیغ الفاظ

ترجمۃ القرآن کا لغوی اعتبار سے کبھی تبلیغِ الفاظ کے معنی پر اطلاق کیا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے ترجمہ شرعاً جائز ہے، اور یہاں جواز سے مراد وہ ہے جو ممانعت کے مقابل ہو، لہٰذا یہ وجوب اور ندب پر بھی صادق آئے گا۔

اگر آپ کو اس پر دلیل چاہیے تو لیجیے سنو! آں حضرت ﷺ قرآن مجید پڑھتے اور اس کو آپ کے اولیاء اور اعداء سب سنتے تھے، نیز آنحضور ﷺ اس قرآن کے ذریعہ اپنی جائے ولادت (مکہ مکرمہ) جائے ہجرت (مدینہ منورہ) اور سفر وحضر میں دعوت الی اللہ دیتے تھے، آپ ﷺ کی امت بھی آپ ﷺ ہی کے نہج پر چلی اور اس نے بھی قرآن کے الفاظ کی تبلیغ کی اور لوگوں نے فرداً فرداً بھی اور جماعت کی شکل میں بھی اس کو حاصل کیا اور اس طرح نسل در نسل ہوتا ہوا ہم تک تسلسل کے ساتھ پہنچا۔

پھر یہ قرآن خود ان لوگوں کو وعید سناتا ہے جو اس کے الفاظ کو چھپاتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَٰتِ وَالْهُدَىٰ مِنۢ بَعْدِ مَا بَيَّنَّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتَٰبِ ۙ أُولَٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّٰعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰٓئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾﴾

"بے شک وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی روشن دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں، باوجود یکہ ہم انہیں کتاب میں کھول کھول کر لوگوں کے لیے بیان کر چکے ہیں تو ایسے لوگوں پر اللہ بھی لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں، ہاں وہ لوگ جنہوں نے توبہ کر لی ہو اور اپنی اصلاح کر لی ہو اور کھول کھول کر بیان کر دیا ہو تو میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کر لیتا ہوں، اور میں توبہ قبول کرنے کا خوگر ہوں، بڑا رحمت والا۔" (البقرۃ:۱۵۹-۱۶۰)

آنحضرت ﷺ نے بھی فرمایا: "میری طرف سے پہنچاؤ، خواہ ایک آیت ہو اور بنی اسرائیل کے حوالہ سے بیان کرو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی نسبت کرے گا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں ڈھونڈے۔"[1]

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تم میں بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھتا ہے اور اسے سکھاتا ہے۔[2]

۲ ترجمۃ القرآن بمعنی تفسیر بزبانِ عربی

لغت کے اعتبار سے ترجمۃ القرآن کا یہ دوسرا اطلاق ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر عربی زبان میں کی جائے کسی دوسری زبان میں نہ کی جائے۔ اس کے حکم جواز کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

اگر آپ کسی شک میں ہوں تو لیجیے قرآن میں خود اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ سے مخاطب ہے کہ: ﴿وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) "اور ہم نے تم پر یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُن باتوں کی واضح تشریح کر دو جو اُن کے لیے اتاری گئی ہے۔"

چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے قرآن کی توضیح و تشریح عربی زبان میں بخوبی انجام دی، حتیٰ کہ سنتِ نبویہ کو شارح قرآن کی حیثیت حاصل ہوئی اور تفسیر بالماثور میں اس کا کثیر حصہ نقل ہوا، علماء نے بھی دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے آج تک اس بارے میں رسول اکرم ﷺ کی سنت کی پیروی کی ہے۔ قرآن کریم کی عربی تفاسیر سے بھرے ہوئے عام و خاص مکتبے اس کی نشاندہی کرتے ہیں، باوجویکہ ان کا ایک حصہ ناپید ہو گیا، آئندہ زمانہ میں بھی ایسے لوگ ایسی تفاسیر تالیف کرتے رہیں گے جو قدیم تفاسیر پر قانع نہیں ہوتے اور پھر ان سے وہ لوگ تفاسیر کو حاصل کریں گے جو قرآن اور دین کے علوم کو نئے انداز میں پیش کرنے کی ضرورت اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن، اللہ کا ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اور قدیم اور جدید علماء سب کے سب اس کے ساحل پر ہمیشہ کھڑے رہیں گے اور اس سے اپنی فہم اور استعداد کے مطابق استفادہ کرتے رہیں گے، اس کے باوجود قرآن ایک ایسا بحر ہے جس کا فیضان جاری رہے گا، قرآن اپنے علوم و اسرار کی وجہ سے اپنی ثروت و دولت سے مالا مال ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری: انبیاء: ۵۰ وسنن الترمذی: علم: ۱۳ ومسند الامام احمد ۳/ ۳۹، ۴۶

(۲) رواہ البخاری فی فضائل القرآن، باب: ۲۱، وابوداؤد فی الوتر: ۱۴، والترمذی فی ثواب القرآن: ۱۵، وابن ماجہ فی المقدمۃ ۱۶، والدارمی فی فضائل القرآن ۲، واحمد فی مسندہ ۱/ ۵۷

ارشاد خداوندی ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾

(الکہف:۱۰۹)

"کہہ دو کہ: اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے، تو میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی کہ اس سے پہلے سمندر ختم ہو چکا ہوگا، چاہے اس سمندر کی کمی پوری کرنے کے لیے ہم ویسا ہی ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔"

③ ترجمۃ القرآن بمعنی تفسیر بزبان اجنبی: یہ بھی از روئے لغت ترجمۃ القرآن کا تیسرا اطلاق ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر ایسی زبان میں کی جائے جو اس کی زبان نہیں ہے۔ یعنی کسی عجمی زبان میں کی جائے، عربی میں نہ کی جائے۔ ہماری نظر میں اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ جو شخص عربی زبان سے اچھی طرح واقف نہیں ہے اس کے لیے قرآن کے لیے قرآن کی تفسیر عجمی زبان میں کرنا حکم کے اعتبار سے ایسا ہی ہے جیسے عربی زبان سے واقف شخص کے لیے قرآن کی تفسیر عربی زبان میں کرنا، دونوں صورتیں درحقیقت اس معنی کو پیش کرنا ہے جسے مفسر کتاب اللہ میں سے اس زبان میں سمجھتا ہے جس کو اس کا مخاطب سمجھتا ہے، نہ کہ نفس قرآن کا ترجمہ اس کے سامنے پیش کرنا ہے۔ بلکہ دونوں صورتیں ان معانی اور مقاصد کی حکایت ہے، جو اس کی وسعت وطاقت میں ہوتے ہیں، یہ تمام مقاصد کی حکایت نہیں ہوتی، تفسیر قرآن کے تحقق کے لیے اتنا کافی ہوتا ہے کہ وہ بشری طاقت کے مطابق مراد خداوندی کا بیان ہو۔ اگرچہ وہ ایک ہی احتمال کے مطابق ہو۔ اس لیے کہ تفسیر لغت میں ایضاح اور بیان کا نام ہے۔ اور وہ معنی کی وضاحت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ خواہ کسی بھی طریقہ سے ہو، نیز تفسیر کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسا علم ہے جس میں قرآنِ کریم کے بارے میں اس حیثیت سے بحث ہوتی ہے کہ بشری طاقت کے مطابق اس سے اللہ کی مراد معلوم ہو۔ اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو قرآن جن معانی کا محتمل ہے، اگر ان میں سے کسی ایک معنی کو بھی پیش کر دیا جائے تو مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ جب تفسیر قرآن نام ہے بشری طاقت کے بقدر اللہ کی مراد کو بیان کرنا تو اس کے لیے برابر ہے کہ وہ عرب کی زبان میں ہو یا کسی اور زبان میں ہو۔ کیونکہ دونوں میں بشر کی قدرت وطاقت پائی جاتی ہے اور دونوں کی نوع بشر حاجت بھی رکھتی ہے۔ ہاں البتہ دو امر لازمی ہیں: ایک یہ کہ یہ نوع بھی شروطِ تفسیر کو باعتبار تفسیر حاوی ہو، اور دوسرا یہ کہ اس میں ترجمہ کی شرائط اس اعتبار سے پوری کی پوری پائی جانی چاہئیں کہ یہ درحقیقت حتی الامکان عربی الفاظ کے معانی کو غیر عربی زبان میں نقل کرنا ہے۔ تفسیر کی شرائط ہم نے اس کتاب کی جلد اول کی بارہویں بحث میں ذکر کر دی ہیں اور ترجمہ کی شرائط ہم نے اسی زیرِ نظر بحث میں ذکر کی ہیں۔

اہم امور: اب ہم ذیل میں آپ کی توجہ چند اہم امور کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں:

① ہمارے علماء نے قرآن مجید کی کتابت غیر عربی حروف میں ممنوع قرار دی ہے، بنا بریں ترجمہ قرآن کرتے وقت واجب ہوگا کہ جب بھی کسی بھی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا جائے تو قرآنی آیات کو عربی حروف کے ساتھ لکھا جائے، تا کہ الفاظ قرآن میں کوئی خلل یا تحریف پیدا نہ ہو، جس کے نتیجہ میں معنی ومفہوم میں کوئی تغیر یا فساد لازم آئے۔

جامع ازہر میں فتویٰ کمیٹی سے سوال کیا گیا کہ آیا لاطینی حروف میں قرآن کی کتابت جائز ہے؟ انہوں نے حمد وصلوۃ کے بعد

اس کا جو جواب دیا، اس کا مضمون اس طرح سے ہے۔" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لاطینی زبان کے معروف حروف ایسے بہت سے حروف سے خالی ہیں جو عربی حروف کے مطابق ہوں، لہٰذا وہ ان تمام معانی کو ادا نہیں کرتے جن کو عربی حروف ادا کرتے ہیں، اگر قرآن کریم کو عربی نظم کے طریقہ پر ان حروف میں لکھا جائے (جیسا کہ استفتاء سے معلوم ہو رہا ہے) تو قرآن کے الفاظ میں خلل اور تحریف واقع ہوگی اور اس کے نتیجہ میں معنی میں تغیر اور فساد آئے گا، جب کہ شریعت کی نصوص اس بات کی متقاضی ہیں کہ قرآن کریم کی ہر قسم کی تحریف و تبدیلی سے حفاظت ممکن بنائی جائے نیز علماء اسلام کا سلفاً وخلفاً اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن مجید میں ہر ایسا تصرف جو تحریفِ لفظی یا معنوی تغیر کا ذریعہ بنتا ہو وہ قطعاً ممنوع اور قطعی طور پر حرام ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے لوگوں سے لے کر آج تک کے تمام حضرات نے قرآن کی کتابت عربی حروف سے کرنے کا التزام کیا ہے۔

۲ ہمارے پیش نظر جو متداول تفاسیر ہیں ان کا طرز یہ ہے کہ اصل کلام سے ایک لفظ لے کر اس کی شرح اس کے ساتھ کرتے ہیں، پھر ایک جملہ یا آیت لے کر اسی کے متصل اس کی شرح ہوتی ہے، عموماً اسی طرح ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ کہ قرآن کے الفاظ، تفسیر کے اندر ہی منتشر ہوتے ہیں، لیکن اس طرح سے مربوط و متصل ہوتے ہیں کہ اگر ہم تفاسیر کے حصہ کو اصل کلام کے الفاظ سے الگ کریں تو تفاسیر ایک لغو اور نامعقول قسم کی بات بن جاتی ہیں۔ یہاں پر قرآن کی تفسیر اجنبی زبان میں سے مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کے مفردات اور اجنبی زبان یا ترجمہ شدہ زبان میں کوئی جملہ لکھا ہوا ہو اور پھر ان کی تفسیر اس کے ساتھ ذکر ہو، کیونکہ یہ بات پہلے ہی کر چکے ہیں کہ قرآن کی کتابت غیر عربی زبان میں ممنوع ہے۔ اور ہم عنقریب یہ بات بھی ثابت کریں گے کہ قرآن کا ترجمہ معنی عرفی میں کرنا محال ہے، بلکہ ہماری مراد اس سے تفسیر کی ایک ایسی نوع ہے جس میں اصل کلام کے الفاظ کا حصہ رسماً اور لفظاً اپنی عربیت پر قائم رہتا ہو، جس کی صورت یہ ہے کہ الفاظ کا حصہ لکھا جائے پھر اس کے بعد وہ معنی لکھے جو مفسر کو سمجھ میں آتا ہے لیکن اس طرح سے کہ اصل کے الفاظ سے بھی وہ خلط ملط نہ ہو اور اس کے ترجمہ سے بھی نہ ہو۔ بلکہ وہ سارا معنی مفسر کے کلام میں سے معلوم ہوتا ہو، اور اس کو اس طریقہ سے وضع کیا جائے کہ وہ تفسیر معلوم ہوتا ہو، نہ کہ ترجمہ، مثلاً یوں کہا جائے کہ یہ فلاں سورت کی فلاں نمبر آیات کا مفہوم ہے یا آیات کی تفسیر کے موقع پر ہی شروع میں ہی کہہ دیا جائے کہ اس جملہ یا اس آیت کا معنی یہ ہے۔ پھر ان دونوں طریقوں میں یہ بھی واضح کر دے کہ یہ معنی قطعی ہے یا احتمالی درجہ کا ہے، اور اگر مفسر یہ سمجھتا ہو کہ اس موقع پر مخاطب کو اسلامی اصطلاحات کی تعریف، حکم کے اسرار و حکم جاننا ضروری ہے یا ترجمہ میں کوئی غلطی ہو تو اس سے آگاہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہو یا اس طرح کی کوئی بات جو قاری کے دل میں جاگزیں کرنا ضروری ہو کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے۔ وہ اصل کلام کا ایسا ترجمہ نہیں ہے جو اس کے تمام معانی و مقاصد کو محیط اور حاوی ہو بلکہ دریا کا ایک قطرہ یا کثیر کلام کا ایک قلیل حصہ ہے تو ان صورتوں میں مفسر کو چاہیے کہ اپنی بات کو تفصیل سے بیان کرے قاری کو بتائے کہ خود قرآن تو اس کی تفسیر سے بہت زیادہ عظمت رکھتا ہے، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ قرآن، علیم و خبیر ذات کا کلام ہے جو اپنے الفاظ اور معانی دونوں اعتبار سے کلام معجز ہے۔

۳ مذکورہ معنی کے اعتبار سے قرآن کا ترجمہ کرنا اس کے عربی زبان میں تفسیر کرنے کے مساوی ہے، کیونکہ ایسا ترجمہ درحقیقت مفسر کی رائے ہے اور اپنی طاقت کے مطابق مرادِ الٰہی کا سمجھنا ہے۔ خواہ اس کا فہم درست ہو یا اس میں غلطی ہو۔ اللہ کی کلام سے

ساری مراد کو قطعاً شامل نہیں ہے۔ گویا کہ ایسا مفسر پہلے عربی تفسیر وضع کرتا ہے پھر اس وضع کردہ تفسیر کا ترجمہ کر دیتا ہے۔ آپ اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے قرآن کی ایک تفسیر کا ترجمہ کیا ہے، خواہ اس کے صاحب نے اسے مدوّن کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

④ بعض حضرات اس طرح کے ترجمہ کا نام، "قرآن کا معنی عربی میں تفسیری ترجمہ" رکھتے ہیں۔ اور ہم (باوجود یہ کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس وجہ تسمیہ میں اختلاف معمولی ہے) ان حضرات کی رائے کو باوزن نہیں دیکھتے، اس کی وجہ عرف کی وہ شہادت ہے جس پر ہم نے ترجمہ اور تفسیر کے مابین چار فرق کے ضمن میں اعتماد کیا ہے۔ چنانچہ ترجمۃ القرآن (بفرض امکان) دراصل وہ تمام معانی ومقاصد جو کلام منزل کی اصل مراد ہوں، ان کی تصویر کشی کرنا ہے۔ اور ترجمۃ التفسیر ان معانی ومقاصد کی منظر کشی کرنا جو مفسر کی مراد ہوں۔ اور قرآن ایسی کتاب ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ اس کے ان معانی میں کبھی بھی خطا واقع ہو جو اللہ کی مراد ہیں۔ لہٰذا جب بفرض امکان اس کا ترجمہ درست ہوگا تو اس کے خطا ہونے کا کوئی تصور واحتمال نہ ہوگا۔ لیکن تفسیر میں امکان ہے کہ مفسر نے جو معانی مراد لیے ہیں ان میں کوئی خطا واقع ہو جائے۔ اس بناء پر اس تفسیر کا ترجمہ تو درست ہوگا لیکن اس خطا کو مفسر پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ ترجمہ تو اصل کے مطابق ایک صورت ہوتی ہے، ایک آئینہ ہوتا ہے جو اصل کلام کی حکایت کرتا ہے خواہ وہ درست ہو یا غلط، ایمان پر مبنی ہو یا کفر پر، حق ہو یا باطل۔

قرآن حکیم اس درجہ معانی اور جلی وخفی اسرار سے لبریز ہے کہ مخلوق ان کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے، ان کی منظر کشی اور ان کو نقل کرنا تو دور کی بات ہے۔ خواہ عربی زبان میں ہو یا کسی اور عجمی زبان میں۔

اس کے بالمقابل تفسیر کے معانی محدود ہوتے ہیں، اس لیے کہ صاحب تفسیر کی قدرت محدود ہوتی ہے، خواہ وہ علم وبلاغت کی جس بلندی کو پہنچ جائے۔ بناء بریں ہر تصویر کشی کرنے والے کا کیمرہ کسی بھی زبان میں ترجمہ کر کے اس کی تصویر کشی کر سکتا ہے۔

⑤ اس طرح کے ترجمہ کا نام ترجمۃ تفسیر القرآن یا فلاں زبان میں تفسیر القرآن رکھنا ضروری ہے۔ اس کو محض لغوی اطلاق کی بناء پر ترجمۃ القرآن کا نام دینا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ترجمۃ القرآن کا لفظ چار معانی میں مشترک ہے۔ اور اطلاق لفظ کے وقت متبادر الی الذہن چوتھا معنی ہی ہوتا ہے اس امر کو دیکھتے ہوئے کہ عرفِ عام کیں یہی معنی معروف ہوتا ہے، ایسے ترجمہ کو ترجمۃ معانی القرآن کا نام بھی دیا جا سکتا، اس لیے کہ ترجمہ کی اضافت صرف الفاظ کی طرف ہوتی ہے۔ نیز اس نام کے رکھنے سے یہ وہم ہو سکتا ہے کہ یہ نفس قرآن کا ترجمہ ہے، بالخصوص جب ہم یہ لحاظ کریں کہ ہر ترجمہ میں معانی نقل ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ۔

⑥ مستحسن یہ ہے کہ عربی تفسیر کی تدوین ہو اور اس کے ساتھ اس کا ترجمہ ملحق ہو، تاکہ کوئی شک وشبہ ہی نہ رہے، اور یہ طریقہ حق وصواب کے زیادہ قریب بھی ہے اور اس امر پر واضح طور پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تفسیر کا ترجمہ ہے، قرآن کا ترجمہ نہیں، جو لوگ قرآن کے قدر شناس ہیں وہ اس احتیاط کو اپنانے میں بخل سے کام نہیں لیں گے، خصوصاً آج کے اس دور میں کہ جب کہ اسلام کے دشمن دانت پیس رہے ہیں اور ہر جگہ کے مسموم اسلحہ سے برسر پیکار ہیں۔

⑦ ضروری ہے کہ ایسی مترجم تفسیر کے آغاز میں ایک مقدمہ بھی ہو جس میں صراحت کے ساتھ اس بات کا ذکر ہو کہ یہ نفس قرآن کا ترجمہ نہیں ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہو کہ نفس قرآن کا معنی معروف کے ساتھ ترجمہ کرنا ایک امر محال ہے، اس لیے کہ

کتاب اللہ کی تالیف وترتیب کچھ اس شان کی ہے کہ اس کی نظیر پیش کرنا ممکن نہیں۔ نہ اس کی زبان سے اور نہ کسی اور زبان سے۔ اور یہ ہی اس کے بلاغتی اعجاز کا مفہوم ہے، جو شخص اس کتاب کے الوانِ اعجاز کا تصور کرنا چاہتا ہو اسے چاہیے کہ اس کتاب کی زبان کو ذرا ملاحظہ کرے، وہ ضرور اس کی زبان اور اسالیب سے لطف اندوز ہوگا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ اس کتاب عزیز کی وہ وجاہت جو اللہ نے اسے عطا کی ہے، یعنی عربی زبان کی وجاہت وہ اس کے سامنے نہ آئے، جب بادشاہ اپنی بادشاہت اور تخت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو کیا اس کی کوئی عزت وسلطنت باقی رہ جاتی ہے؟! اس قرآن کو اللہ نے کلاموں کا بادشاہ بنایا اور اس کے سر پر اعجاز کا تاج رکھا اور اس اعجاز اور افتخار کے اظہار کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۝ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ ۝﴾

(فصلت: ۴۱-۴۲)

"اور بے شک یہ بڑی عزت والی کتاب ہے جس تک باطل کی کوئی رسائی نہیں ہے نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے یہ اس ذات کی طرف سے اتاری جارہی ہے جو حکمت کا مالک ہے تمام تعریفیں اسی کی طرف لوٹتی ہیں۔"

ترجمہ کے فوائد

اس معنی کے لحاظ سے ترجمہ قرآن کے چند فوائد ہیں: ہم اس سے پہلے اس بات کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ایسا ترجمہ اس عربی تفسیر کی طرح ہے کہ جس کے جواز پر چند شرائط کے ساتھ سب متفق ہیں، اس لیے ہمیں اس کے فوائد بیان کرنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ لیکن بعض محققین کو ایسے ترجمہ کے جواز میں بھی توقف تھا، جس طرح انہیں معنی مراد کے ساتھ ترجمہ کے جواز میں توقف ہے، حالانکہ دونوں میں بہت فرق ہے، علاوہ ازیں انہوں نے بات کو طول دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ایسے ترجمہ کا کوئی امید افزا فائدہ بھی نہیں، پھر انہوں نے اس کے متعلق شبہات بھی کر ڈالے، ان وجوہات کی بناء پر ہم اس ترجمہ کے فوائد بسط وشرح کے ساتھ بیان کرتے ہیں، اس کے بعد اس کے متعلق کیے گئے شبہات کا جواب بھی دیا جائے گا۔

اب ہم اس ترجمہ کے فوائد ذرا وضاحت سے ذکر کرتے ہیں:

پہلا فائدہ

قرآن کے حسن وجمال کو بے نقاب کرنا، ایسے عجمی مسلمانوں کے لیے جو اس کے محاسن کو عربی زبان کے آئینہ میں دیکھنے سے قاصر ہوں، اس قسم کے ترجمہ سے قرآن کا فہم ان کے لیے آسان بھی ہوگا، اس طرح ان کے ایمان میں مزید اضافہ بھی ہوگا، قرآن کی قدر اور اس کا شوق بھی بڑھے گا، اس کے نتیجہ میں وہ اس سے ہدایت حاصل کریں گے، اس کے سمندر سے فیض یاب ہوں گے، اس ترجمہ کی وجہ سے ایسے لوگ، قرآن کے بلند مقاصد، دلائل کی قوت، ہدایات کی بلندی، عقائد کی گہرائی اور گہرائی، عبادات کی رشد وطہارت، عمدہ اخلاق سے سنورنے، گناہوں اور رذائل کی ممانعت، فرد اور معاشرہ کی معجزانہ صلاح، بہترین قصہ کے انتخاب، انباء الغیب میں سے بہت سے اخبار واقعات اور ان معجزات کو سن کر لطف اندوز اور بہرہ یاب ہوں گے جن سے اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کو نوازا ہے۔ جس قرآن کی شان یہ ہے کہ انسانی نفوس اس کی وجہ سے بلند مقام حاصل کرتے ہیں اور جو سارے عالم کو ایک درست تہذیب وتمدن سے معمور کرتا ہے۔

آپ اس فائدہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکتے ہیں، جب آپ ایک ممتاز استاد کو دیکھتے ہیں کہ جب وہ لوگوں کے

سامنے درسِ تفسیر دے رہا ہوتا ہے، وہ اپنی مہارت سے قرآن کے معانی واضح کر رہا ہوتا ہے۔ اور ان کی ذہنی سطح کو دیکھ کر ان سے ان کی زبان میں بات کرتا ہے، اور ان معانی کا انتخاب کرتا جو سب سے زیادہ صحیح ہوں اور جن کی لوگوں کو زیادہ خاصیت ہو، اور موقع کی مناسبت سے لوگوں کے شبہات اور جہالت کا مداوا بھی کرتا ہے، خدا جانتا ہے کہ اس ماہرانہ درس سے لوگوں میں گویا قرآن کی روح پھونک دی جاتی ہے، جس سے وہ مردہ لوگوں کو زندہ کر دیتا ہے، اور ان کے امراض کا مداوا کرتا ہے، اور ان میں تحریک عمل کا جذبہ پیدا کرتا ہے، اور ان کو ایسا بنا دیتا ہے کہ وہ پھر اپنے علم و ذوق اور شعور و وجدان سے اس کتاب اللہ پر ایمان لاتے ہیں، اس سے پہلے وہ اس پر ایسا ایمان رکھتے تھے کہ جو اندھی تقلید یا بچوں کے نقل اتارنے کے بہت مشابہ تھی۔ تجربات اس بات پر شاہد ہیں کہ بہت سے ایسے لوگ جو تفسیر کے ذریعہ قرآن کی جلالت و عظمت کو محسوس کرتے ہیں وہ قرآن کے حفظ کرنے اور ان کی زبان اور علوم کے مطالعہ کرنے کا سوچتے ہیں، تا کہ قرآن کے فیضیاب چشمہ سے خود کو سیراب کر سکیں اور اس کی خوشگوار غذا سے سیر ہو سکیں، جب تک کہ یہ تفسیر وغیرہ اصل کلام کے تمام معانی کو حائل نہ ہو اور جب تک کہ اللہ کا عطا کردہ اجر و ثواب ہر اس شخص کے لیے جاری ہے جو اصل کلام میں غور کرتا ہے یا اس کے نفس کلام کی تلاوت کرتا ہے۔

دوسرا فائدہ اعداء اسلام کے پیش کردہ شبہات اور اعتراضات دور کرنا جو انہوں نے کذب و افترا کے ارادہ سے قرآن اور اس کی تفسیر پر چسپاں کئے ہیں، پھر ان کے ذریعہ وہ ایسے مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں جو عربی زبان میں مہارت نہیں رکھتے، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ قرآن کے مزعومہ ترجمے کرتے ہیں یا طلباء کے لیے علمی اور تاریخی کتابیں تالیف کرتے ہیں یا قارئین کے لیے انسائیکلوپیڈیا تحریر کرتے ہیں یا عوام کے لیے لیکچرز وغیرہ دیتے ہیں یا عوام اور خواص کے لیے مجلات و رسائل لکھتے ہیں۔

تیسرا فائدہ غیر مسلموں کی رہنمائی کرنا اور ان کے سامنے اسلام کے حقائق اور تعلیمات کو پیش کرنا، خصوصاً دورِ حاضر میں جو کہ پروپیگنڈہ کا دور ہے۔ اور دیگر اہل مذاہب نے آتش حرب بھی روشن کر رکھی ہے کہ حق بھی باطل کی کثرت و بہتات میں مستور ہونے کے قریب ہے، اسلام کی آواز پست ہو گئی ہے یا قریب ہے کہ ان منحرف مذاہب کے شور و غوغا میں اسلام کی صدا سنائی نہ دے۔

چوتھا فائدہ اسلام اور عاشقانِ حق کے درمیان ان موانع اور حوارج کو دُور کرنا جو ان مکاروں اور خبیثوں نے دیگر اقوام کو روکنے کے لیے قائم کیے ہیں، یہ موانع اور رکاوٹیں عام طور پر ان جھوٹی باتوں پر مبنی ہیں جو انہوں نے یا تو اسلام کے خلاف بنائی ہیں یا پیغمبر اسلام کے خلاف گھڑی ہیں۔

وہ لوگ زیادہ تر جھوٹی باتوں کو قرآن اور اس کی تفاسیر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح رسول اکرم ﷺ کی سیرت اور تاریخ کی طرف بھی، پھر ان کو اپنے خیال کے مطابق ترجمہ قرآن قرار دیتے ہیں اور دیگر مختلف وسائل جو لوگ پڑھتے اور سنتے ہیں ان کو بنا لیتے ہیں، لہٰذا جب ہم قرآن کی تفسیر کا ترجمہ یا کسی دوسری زبان میں قرآن کی تفسیر ترجمہ و تفسیر کے تمام شرائط ملحوظ رکھتے ہوئے کریں گے اور ہر موقع پر پائے جانے والے معروف شبہات و اعتراضات کے جوابات کا بھی پورا اہتمام کریں گے تو یقیناً ان کے قائم کردہ بے بنیاد اور جھوٹے محلات متزلزل ہو جائیں گے اور طالبانِ حق اور عاشقانِ اسلام کے راستہ کی تمام رکاوٹیں دُور ہو جائیں گی۔

ہماری اس بات کی تائید مشہور انگریز مصنف برنارڈ شو کے قول سے ہوتی ہے، وہ رکھتا ہے، "قرونِ وسطیٰ میں کنیسا کے لوگوں نے نادانی یا تعصب کی وجہ سے دینِ اسلام کے چہرہ کو نہایت مکروہ شکل میں پیش کیا، درحقیقت وہ لوگ محمد (ﷺ) اور اس کے دین سے بغض کے سبب اس کام پر آمادہ ہوئے، اس لیے کہ ان کی نظر میں محمد (ﷺ) مسیح علیہ السلام کے دشمن تھے، میں نے اس عجیب شخص کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے، میری رائے میں وہ مسیح علیہ السلام کے کسی صورت میں دشمن نہ تھے، بلکہ چاہیے تو یہ کہ انھیں انسانیت کے لیے نجات دہندہ کہا جائے۔"①

پانچواں فائدہ قرآن کے لفظ و معنی کے ابلاغ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا، اس لیے کہ اس نوع کے ترجمہ میں قرآن کے عربی الفاظ اور رسم الخط کے ساتھ قرآن کے معانی بھی جمع ہوتے ہیں۔ جیسا کہ مفسر اس کو سمجھتا اور اجنبی زبان میں اس کی شرح کرتا ہے۔

امام سیوطی ابن بطال اور حافظ ابن حجر رحمہما اللہ اور دیگر علماء کہتے ہیں کہ وحی کی تبلیغ واجب ہے، لیکن اس کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم یہ ہے کہ قرآن کے نظم اور معنی دونوں کی تبلیغ کرنا، یہ امر واجب ہے، دوسری قسم یہ کہ معنی وحی کی تبلیغ کرنا، الفاظ ذکر نہ کیے جائیں، جو کہ قرآن کے ماسوا ہیں، اور اسی سے امر تبلیغ مکمل ہوتا ہے۔"

شبہات کے جوابات

پہلا شبہ اور اس کا جواب وہ کہتے ہیں کہ تفسیر کا مترجم، ترجمہ عرفی کرنے پر مجبور ہوتا ہے جو کہ ممنوع شمار کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تفسیر، بیان سے عبارت ہے۔ بناء بریں مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے امر مبین کو معلوم کرے پھر بیان کو پہنچانے، نیز اس لیے کہ جب وہ تفسیر کا ترجمہ بغیر آیت کے کرے گا تو اس کا ترجمہ امر مقصود کو ادا کرنے والا نہ ہوگا، کیونکہ اس کا ماقبل سے ربط نہ ہوگا؟

اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ ہم نے یہ شرط لگائی ہے کہ اصل کلام کے الفاظ بھی اور اس کا ترجمہ عرفی بھی کسی اجنبی زبان میں تفسیر کے اندر مذکور نہ ہو، بلکہ ہم نے تو یہاں تک کہا ہے کہ تفسیر کے چند اجزاء کر لیے جائیں اور ہر جزو میں آیت یا آیات کو عربی لفظ اور عربی رسم الخط میں ذکر کیا جائے۔ ہم اس طرح کا ترجمہ اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے کریں پھر اس کی تفسیر میں اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ اس آیت یا ان آیات کا معنی یہ ہے، یا کہا جائے کہ فلاں سورت کی فلاں نمبر آیت اور اس کا معنی اس طرح سے ہے۔ یعنی اصل کلام کے الفاظ سے اسے الگ کر کے لکھا جائے اور اس کا ترجمہ بھی عرفی کیا جائے۔ اور بیان کے ساتھ مبین کے مربوط ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ ربط و تعلق کی کسی بھی صورت کے ساتھ مربوط ہو اور وہ اس جگہ موجود ہے کہ پہلے قرآن کے عربی الفاظ عربی رسم الخط میں ذکر کیے جائیں پھر اسم اشارہ یا سورت نمبر اور قرآن کی سورت کے نام سے اس کی طرف

① The Muslim Review) لکھنو، ہندوستان، شمارہ مارچ ۱۹۳۳ء)۔

اشارہ کیا جائے۔ باقی رہا کلام کا باہمی ربط تو ہر مرحلہ میں تفسیر کے جملوں کا ایک دوسرے سے ربط کا لحاظ رکھنا سہل امر ہے لیکن تمام مراحل میں ایک دوسرے سے اس طرح کلام کا مربوط ہونا کہ اس سے ایک کلام مرکب ہوجائے گویا کہ وہ ایک ہی ڈھلا ہوا کلام ہے تو یہ ایسی بات ہے کہ جس کی تفسیر میں کسی نے شرط نہیں لگائی۔ اس طرح کلام کا نہ ہونا کوئی معیوب نہیں جبکہ تفسیر مختلف مراحل کے ساتھ متفرق کلام کی صورت میں ہو، ایک ہی مرحلہ میں کلام واحد نہ ہو۔

باقی آیات کا باہمی مربوط ہونا تو وہ لامحالہ موجود ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی کوئی تفسیر بھی بیان کی جائے۔

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

معترضین کہتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر عموماً ادائیگی الفاظ کی کیفیت، مفردات کے مدلولات، اس کے افرادی اور ترکیبی احکامات اور ان پر محمول ہونے والے معانی، بعض کلمات قرآنی پر وقف کرنے اور مابعد سے ابتداء کرنے اور پہلی آیت کو دوسری سے ملانے کی صورتوں میں معانی کے اختلاف پر مشتمل ہوتی ہے، نیز قرآنی تفسیر، سنت کی معرفت پر بھی مشتمل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سنت، قرآن کا بیان ہے، اس طرح تفسیر قرآن، اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین کی آراء پر بھی مشتمل ہوتی ہے۔ جب کہ ان امور کا ترجمہ میں احاطہ کرنا امر محال ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ان امور مذکورہ کا اصل تفسیر عربی میں احاطہ کرنا، کسی نے بھی اس کی شرط نہیں لگائی ہے، جب اصل عربی میں یہ امر مشروط نہیں تو ترجمہ میں بھی نہیں ہوگا کیونکہ ترجمہ اس کی ایک صورت تو ہوتی ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے، ہم اس بات سے واقف ہیں کہ تفسیر تو نام ہے بیان اور وضاحت کا، خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو۔ ایک مفسر کے لیے لازم ہے کہ وہ صاحبِ دانش ہو اپنی طاقت کے مطابق ان لوگوں کے حال کی رعایت اور مدنظر رکھے جن کے لیے وہ تفسیر کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر میں قارئین کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی تفسیر میں امر ضروری کو شامل کرے گا اور ان امور سے احتراز کرے گا جو ان کی عقل میں سمانے والی نہیں ہیں۔ ورنہ ان کے لیے فتنہ کا باعث بنے گا۔ شاید عربی تفاسیر میں جو تنوع دکھنے میں آتا ہے اس میں یہی راز ہو کہ کوئی تفسیر مختصر ہے، کوئی متوسط درجہ کی ہے اور کوئی طویل! اسی طرح بعض تفاسیر، تفسیر بالماثور کے قبیل سے ہیں اور بعض تفسیر بالمعقول کی قسم میں سے ہیں، کسی تفسیر میں بلاغت کے پہلو کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اور کسی میں نحو کے پہلو کو اور کسی میں کلامی پہلو کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور کسی میں فقہی پہلو ملحوظ ہے۔ جب عربی تفاسیر میں یہ چیزیں ہماری نظروں میں مثالی اور شاندار شمار ہوتی ہیں تو کسی دوسری زبان میں اس طرح کی چیزیں پائی جائیں تو انکار کیوں کیا جاتا ہے؟۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ جب اسلام کی تعلیمات وہدایات کا دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے تو نہ غیر عربی میں تفسیر قرآن کی کوئی ضرورت رہی ہے اور نہ ہی کسی تفسیر کا کسی زبان میں ترجمہ کرنے کی کوئی حاجت باقی رہی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے ترجمہ کی ضرورت کو فوائد ترجمہ کے ضمن میں بیان کر دیا ہے۔ باقی رہا قرآن کی تفسیر کا اجنبی زبان میں ترجمہ کرنا یا کسی اجنبی زبان میں قرآن کی تفسیر کرنا دونوں امور ایسے ہیں جیسے اسلام کی تعلیمات وہدایات کا ترجمہ کرنا۔ لہٰذا تمام امور دینی معارف اور کلام بشر میں سے ہیں، اللہ کے کلام معجز میں سے نہیں ہیں، جب تم تعلیمات وہدایاتِ اسلام کا ترجمہ کرنا جائز قرار دیتے ہو تو تمہیں تفسیر کا ترجمہ کرنا بھی اجنبی زبان میں جائز قرار دینا چاہیے۔ کیونکہ جب دو مماثل چیزوں میں سے ایک جائز

ہے تو لازماً دوسری چیز بھی جائز ہوگی۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ وہ رسائل جو اجنبی زبانوں میں اسلام کی تعلیمات کے متعلق لکھے جاتے ہیں کبھی ان کی بہت ضرورت ہوتی ہے، بلکہ بعض حالات اور مواقع پر ان کا لکھا جانا ضروری ہو جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس تفسیر سے وہ بے نیاز نہیں کر دیتے جس کا اس وقت ہم ذکر کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ابھی کچھ پہلے ہم نے اس کے فوائد وضاحت سے ذکر کیے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تعلیمات وہدایات کا ترجمہ خود ان غلط ترجموں کے بے بنیاد ہونے پر شاہد عدل ہے، مصنفین اور طالبانِ حق کو چاہیے کہ ایسی تفسیر میں موجود ان ترجموں کا محاکمہ کریں۔ خصوصاً جب کہ وہ کسی بااعتماد اسلامی ادارے سے شائع کردہ ہو۔ اور ہر موقع پر جسے پیش کیا جاتا ہو، کیونکہ ان غلط ترجموں کی وجہ سے ہونے والے شبہات ہی مخدوش ثابت ہوئے ہیں۔

مزید برآں یہ کہ غیر عربی مسلمان ایسی تفسیر کو کتاب اللہ کے فہم وتدبر کے لیے معاون بناتا ہے اس کے ذریعہ وہ کسی سورت کی آیت کا فہم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ ایسے تجویز کردہ رسائل اس کے لیے ناکافی ہیں۔

اس پر ایک مثال پیش کرتا ہوں جو ہمارے علماء نے اس بارہ میں دی ہے۔ علامہ جار اللہ الزمخشری نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (ابراہیم: ۴) کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: اگر آپ یہ سوال کریں کہ رسول اللہ ﷺ صرف عرب کی طرف مبعوث نہیں ہوئے بلکہ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

بلکہ آنحضور ﷺ تو جن وانس کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، ان کی زبانیں تو مختلف ہیں تو اہل عرب کے لیے اگر کوئی حجت نہ ہوتو دوسروں کے لیے تو محبت ہوگی۔

میں جواب میں کہتا ہوں کہ قرآن دو حال سے خالی نہیں، یا تو تمام زبانوں میں نازل ہوگا یا کسی ایک زبان میں، اب تمام زبانوں میں نازل ہونے کی کوئی حاجت نہیں ہے، کیونکہ ترجمہ سے اس کی نیابت ہو جاتی ہے، وہ طویل کلام کو بھی کافی ہو جاتا ہے، اب رہا یہ کہ کسی ایک زبان میں نازل ہو، چنانچہ زبانوں میں سب سے اولیٰ قوم رسول کی زبان ہے، کیونکہ قوم اس کے زیادہ قریب ہے، جب اس کو سمجھ کر اس کو بیان کریں گے آگے ان سے وہ نقل ہوگا اور پھیلے گا، اسی طرح تراجم اس کے بیان اور فہم کے فریضہ کو انجام دیں گے، جیسا کہ تم عجمی امتوں میں سے ہر امت میں تراجم کی نیابت کو دیکھتے ہو اور اس کا مشاہدہ کرتے ہو۔ اس کے باوجود دور دراز ممالک اور مختلف اطراف واکناف میں بسنے والے اور متفرق قوموں اور نسلوں کا ایک کتاب پر اتفاق ہے اور اس کے الفاظ اور معانی کے سیکھنے میں ان سب کی جدوجہد جاری ہے اور اس پر جو عظیم فوائد برآمد ہو رہے ہیں، ثواب جزیل حاصل کرنے کی خاطر اور قرب وطاعات کے حصول کے لیے اپنے نفوس اور طبائع کو مشقت میں اور تکان میں ڈال رہے ہیں۔ نیز اس لیے کہ یہ زبان تحریف وتبدل سے بہت بعید اور نزاع واختلاف سے بہت محفوظ ہے، نیز اس لیے کہ اگر قرآن اختلاف اور کثرت کے باوجود ثقلین کی تمام زبانوں میں نازل ہوتا اور ہر زبان میں قرآن صفت اعجاز پر ہوتا اور رسول عربی ﷺ ہر امت سے اس کی زبان میں کلام کرتے جس طرح اپنی امت سے اس کی زبان میں کلام کیا۔ ان پر بھی معجزانہ طور پر قرآن پڑھتے تو یہ امر، اضطرار کے قریب ہوتا۔

زمخشری کا یہ قول کہ "تراجم اس کے فہم وبیان کو انجام دیں" اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی مراد قرآن کی

اجنبی زبانوں میں تفسیریں ہیں، نہ کہ خود قرآن کا معنی عرفی کے لحاظ سے ترجمے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تفسیر ہی میں قرآن کے معانی بیان ہوتے ہیں اور ان کی تفہیم ہوتی ہے، ترجمہ تو کلامِ اصل کی تصویر محض ہوتا ہے، اس میں بیان وتفہیم سے کوئی غرض نہیں ہوتی، اگر "تراجم" سے ان کی مراد خود قرآن کے تراجم ہوں تو ان کلام درست نہیں ہوتا، کیونکہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے قرآن کا فہم حاصل کیا اور پھر جن لوگوں نے ان سے آگے نقل کیا، انہوں نے مختلف قوموں کے لیے قرآن کا ترجمہ نہیں کیا، بلکہ قرآن کے عربی الفاظ پہنچائے اور پھر اس کے بعد ان الفاظ کی تشریح ان کے سامنے بیان کی۔

اسی طرح زمخشری کا یہ قول "اس کے باوجود دور دراز ممالک کے بسنے والے لوگوں کا اتفاق ......" بھی اس بات کی تائید کرتا ہے، کیونکہ تمام لوگوں کا کتاب واحد پر جمع ہو جانا اس کتاب کے ترجموں کی موجودگی میں ممکن نہیں ہے۔ بلکہ ترجموں پر اکتفاء کرنا کلام اصل سے انحراف وانصراف پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے ہو چکی ہے۔ غور کر لیجیے۔

۲ ترجمۃ القرآن بمعنی دیگر زبان میں نقل کرنا

یہ لغوی اعتبار سے ترجمہ کا چوتھا اطلاق ہے نیز یہ عرف عام اور تخاطب عام کے لحاظ سے اس کا واحد اطلاق ہے، ہم اس اطلاق کے مطابق ترجمۃ القرآن کی مختصر تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں کہ ترجمہ نام ہے قرآن کو عربی زبان سے کسی دوسری زبان میں نقل کرنا۔ اور ہم اس کی مبسوط تعریف بھی کر سکتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن نام ہے عربی الفاظ کے معانی اور مقاصد کو غیر عربی الفاظ سے تعبیر کرنا جبکہ ان تمام معانی ومقاصد کا احاطہ کر لیا گیا ہو۔

جو شخص گزشتہ کلام میں ترجمہ کے معنی اس کی تقسیم اور ترجمہ وتفسیر میں فرق کو مدنظر رکھتا ہے اسے یہاں ضرورت نہیں کہ ترجمہ کی تعریف وتمثیل کی شرح اس کے سامنے کی جائے، اسی طرح اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ترجمہ کا صرف یہی معنی وہ تنہا اصطلاحی معنی ہے جو لوگوں میں تخاطب کے طور پر مراد لیا جاتا ہے۔ ایسا شخص جانتا ہے کہ ترجمۃ القرآن کا یہ معنی تفسیر قرآن بزبان عربی، تفسیر قرآن بغیر زبان عربی اور قرآن کی عربی تفسیر کا ترجمہ لفظی یا ترجمہ تفسیری ان سب کے خلاف اور علاوہ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس کلام کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اس ترجمہ کا حکم "عادۃً محال ہونا"

اس معنی کے ساتھ ترجمۃ القرآن کا حکم استحالہ عادیہ اور استحالہ شرعیہ دونوں طرح سے ہے۔ مطلب یہ کہ اس کا وقوع عادۃً ممکن نہیں اور شرعاً بھی اس کی کوشش کرنا حرام ہے۔

ہم "استحالہ عادیہ" میں دو طرح سے استدلال کرتے ہیں:

طریقِ استدلال ①

بایں معنی قرآن کا ترجمہ کرنا امر محال کو مستلزم ہے۔ اور جو چیز امر محال کو مستلزم ہو وہ بھی محال ہوتی ہے، اس کے امر محال کو مستلزم ہونے پر دلیل یہ ہے کہ اس کے حصول کے لیے قرآن کے تمام اولی اور ثانوی معانی کے ساتھ اس کے تینوں مقاصد کا پایا جانا ضروری ہے۔ حالاں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک محال ہے۔ پہلا اس لیے محال ہے کہ قرآن کے ثانوی معانی ہی اس کے بلند خصائص پر دلالت کرتے ہیں جو کہ اس کی بلاغت واعجاز کا آئینہ دار ہیں، جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں۔ کسی بشر کے بس میں نہیں کہ وہ ان سب کا احاطہ کر سکے، اپنے کلام میں سکو نقل کرنا تو دور کی بات

ہے۔ ورنہ قرآن کا یہ اعجاز حاصل نہ ہوتا۔

دوسرا اس لیے محال ہے، قرآن کا پہلا مقصد یعنی اس کا ہدایت ہونا، اگر اس کا حصول قرآن کے معانی اولیہ واصلیہ کے مفہوم کے اعتبار سے ترجمہ سے ممکن ہو تو قرآن کے ثانوی معانی کے مفہوم کے اعتبار سے اس کا حصول ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قرآن کے ان بلند خصائص کا مدلول ہیں جو بلاغتی اعجاز کا اصل مدار ہیں۔

اسی طرح قرآن کا دوسرا مقصد یعنی اس کا معجزہ ہونا، اس کا حصول بھی قرآن کے سوا کسی اور کلام بشر میں ممکن نہیں ہے خواہ وہ کلام عربی ہو یا عجمی، ورنہ یہ امر صادق نہ آئے گا کہ قرآن خارق عادت ایک ایسا معجزہ ہے جو کسی بشر کی قدرت سے باہر ہے۔ اللہ عزوجل کے سوا کوئی اس پر قدررت نہیں رکھتا۔

قرآن کا تیسرا مقصد یعنی اس کی تلاوت کا امر تعبدی ہونا، یہ بھی دیگر مقاصد کی طرح ہے، قرآن کے ترجمہ میں اس کا تحقق ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کا ترجمہ یقیناً غیر قرآن ہے۔ اور اس کی تلاوت کا امر تعبدی ہونا، خاص قرآن کے الفاظ اور اس کے اسالیب اور ترتیبات کے ساتھ وارد ہے، کسی اور الفاظ اور اسالیب میں ایسا نہیں ہے، خواہ وہ الفاظ عربی ہوں اور کلام اصل کے الفاظ واسالیب کے مترادف ہوں!

طریق استدلال ۲

بایں معنی قرآن کا ترجمہ، مثل قرآن ہے، قرآن کا ہر مثل امر محال ہے، ترجمہ کا قرآن کے مثل ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس میں قرآن کے معانی ومقاصد جمع ہوتے ہیں، کوئی چیز متروک نہیں ہوتی۔ جو چیز قرآن کے معانی ومقاصد جامع ہو وہ اس کے مثل ہوتی ہے، باقی رہی یہ بات کہ قرآن کا ہر مثل امر محال ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے سارے عرب کو چیلنج دیا کہ سب سے چھوٹی سورت پیش کرو، لیکن وہ اس کا معارضہ ومقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے، حالاں کہ وہ ان دنوں بلاغت وبیان کے شہسوار تھے اور میدانِ بلاغت میں دوسروں سے سبقت لے جانے اور کامیابی حاصل کرنے کے حریص تھے۔ جب ایسے مردِ میدان مقابلہ سے عاجز اور بے بس ہو گئے تو جو لوگ بلاغت وبیان میں ان سے کم درجہ کے ہیں وہ کس قدر عاجز اور لاچار ہوں گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ۝﴾ (البقرۃ: ۲۳-۲۴)

”اور اگر تم اس کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اُتارا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ۔ اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بُلالو، پھر بھی اگر تم یہ کام نہ کرسکو، اور یقیناً کبھی نہیں کرسکو گے، تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔“

جب جن وانس عربی زبان میں مختصر ترین سورت پیش کرنے سے عاجز آ گئے تو غیر عربی زبان میں اس کا معارضہ کرنے کی کوشش کرنا ان کے عجز ودرماندگی کے ظہور کے زیادہ لائق ہے۔ اس لیے کہ دو کلاموں میں مقابلہ کی صورت میں زبان کی یکسانیت کا

تقاضا یہ ہے کہ وہ تشابہ وتماثل میں قریب قریب ہوں، جبکہ وہ دونوں کلام ممکن ہوں، اس لحاظ سے کہ تحدی اور معارضہ کے امور میں بلاغت کی خصوصیات ایک ہی ہوتی ہیں، لیکن اگر تحدی اور معارضہ کی زبان ایک نہ ہوتو دونوں میں تشابہ وتماثل پایا جانا ناممکن ہے۔ کیونکہ ایک زبان میں پائی جانے والی خصوصیات دوسری زبان میں پائی جانے والی خصوصیات سے مختلف ہوتی ہیں۔ جو خصوصیت ایک میں موجود ہوتی ہے وہ دوسری میں موجود نہیں ہوتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ دو کلاموں میں مماثلت قطعی طور پر ناممکن ہوتی ہے بلکہ تفادت ہوتا ہے۔

اسی لیے بہت سے ماہرینِ لسانیات نے تصریح کی ہے کہ ادبی نصوص کا کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنا امر محال ہے۔ لوگ عام طور پر جن بعض ادبی کتابوں کو ترجمہ خیال کرتے ہیں تو وہ ایک گونہ تسامح پر مبنی ہے، کیونکہ ان میں اصل کلام کے معانی واغراض تحقیق سے نہیں بلکہ تقریب کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں۔

اب ہم بایں معنی ترجمہ قرآن کی مثلیت کے محال ہونے کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس ترجمہ کا تحقق چند امور سے ہی ہوتا ہے، ان میں کچھ امور محال ہیں اور کچھ ممکن۔ جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا کہ ترجمہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے اصلی اور ثانوی معانی کو اطمینان بخش طریقہ سے حاوی ہو، اسی طرح وہ ترجمہ، قرآن کے تین بنیادی مقاصد کو بھی محیط ہو، یہ وہ امور ہیں جن کا تحقق محال ہے، جیسا کہ اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں ترجمہ کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ میں استقلال ہو، طوالت وزیادتی نہ ہو، یہ ایسے امور ہیں جو اپنی ذات میں ممکن تو ہیں، لیکن جب اس کی اضافت ماقبل کی طرف کی جائے تو مجموعی اعتبار سے محال ہو جاتا ہے، اس لیے کہ جو کلام ممکن اور محال سے مرکب ہو وہ محال ہوتا ہے۔

پھر جب اس کے بعد یہ ارادہ ہو کہ قرآن کا یہ ترجمہ لفظی ہو تو اس میں مزید دو امور کا لحاظ ضروری ہوگا۔ ایک یہ کہ ترجمہ کی زبان کے مفردات، قرآن کے مفردات کے مساوی ہوں، دوسرا یہ کہ ترجمہ کی زبان میں پائی جانے والی ضمائر اور روابط بھی قرآن کے روابط کے مساوی ہوں، تاکہ ترجمہ کا ہر مفرد، اصل کلام کے ہر مفرد کے قائم مقام ہو جائے، جیسا کہ لفظی ترجمہ میں یہ شرط رکھی گئی ہے۔ اور ایسا ہونا بہت متعذر اور محال ہے۔ اس ترجمہ کو قرآن کا مثل شبیہ اور ایسا معارض قرار دینا کہ اس پر کوئی دوسرا غالب نہ ہو، اس کی برابری نہ کرتا ہو، یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ اس کے ابطال پر دلیل موجود ہے، اس کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۝۸۸﴾ (الاسراء:۸۸)

"آپ کہہ دیں کہ اگر سارے انسان اور جن اس پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن کا مثل لائیں تو اس کا مثل نہیں لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔"

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرآنی کی مثلیت کی نفی کی ہے، جیسا کہ اللہ نے اپنے اس فرمان ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱) میں اپنی ذات سے مثلیت کی نفی کی ہے، بلکہ اس نفی اور تحدی میں مبالغہ کیا کہ سارے انسان اور جن جمع ہو جائیں پھر بھی عاجز رہیں گے، اس کے بعد دوبارہ اس مثلیت سے ثقلین کی عاجزی کو مؤکد کرتے ہوئے فرمایا کہ بالفرض وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی ہو جائیں اور اس کے لیے اپنی علمی اور بیانی تمام تر توتیں مجتمع بھی کر لیں تب بھی عاجز رہیں گے۔

اس ترجمہ کا حکم "شرعاً محال ہونا"

اب یہ بات طے ہوگئی کہ اس معنی عرفی کے اعتبار سے قرآن کا ترجمہ کرنا عادۃً محال ہے، اسی طرح ہمیں اس بات میں بھی کوئی تردّد نہیں کہ ایسا کرنا شرعاً بھی محال ہے، یعنی ممنوع ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اس کی آٹھ وجوہات ہیں:

پہلی وجہ

جو امر عادۃً محال ہو اس کی طلب وفرمائش کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ خواہ یہ طلب بطورِ دعا ہو اور وہ امر محال، ترجمہ ہو یا غیر ترجمہ، کیونکہ یہ عبث کی ایک نوع ہے اور بے فائدہ کام میں وقت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ (البقرۃ: ۱۹۵)

"خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

نیز فرمان رسول ﷺ ہے:

((لا ضرر ولا ضرار)). ①

"نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ دوسروں کو نقصان پہنچاؤ۔"

علاوہ ازیں یہ بات بھی ہے کہ عادۃً امر محال کی طلب، اللہ کی کائناتی عادات سے غفلت وجہالت اور اسباب کا اپنے عادیہ مسبّبات سے ربط کی حکمت سے غفلت اور ناواقفیت ہے جو مخلوق اور بندوں کے اطمینان ورحمت کی خاطر ہیں۔

جیسا کہ فرمان خدواندی ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (البقرۃ: ۱۴۳)

"بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑے مہربان اور رحم کرنے والے ہیں۔"

چند ناواقف لوگ بعض محال امور کو ممکن خیال کرتے ہوئے ان کی فرمائش کرتے ہیں، لیکن جو شخص اس معنی میں ترجمہ قرآن کی کوشش کرتا ہے وہ کسی صورت میں معذور نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن نے خود ڈراتے وقت اس بات کو ناممکن قرار دیا ہے کہ جن وانس اس قرآن کے مثل پیش کر سکے۔ اگرچہ وہ سب اکٹھے ہو جائیں اور ایک دوسرے کے معاون ومددگار ہو جائیں۔ جیسا کہ محاورہ ہے: "قطعت جهيزة قول كل خطيب" مطلب یہ ہے کہ قرآن نے یہ بات کہہ کر بات ہی ختم کر دی ہے۔

دوسری وجہ

اس ترجمہ کی کوشش کرنا دراصل اس بات کا دعویٰ کرنا ہے کہ قرآن کا مثل پیش کرنا ممکن ہے۔ اور یہ سابقہ آیت کی صراحتاً تکذیب ہے۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ

---

① رواہ الحاکم فی المستدرک ۲/ ۵۸ وقال صحیح علی شرط مسلم.

عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿ (یونس:۱۵-۱۶)

"اور وہ لوگ جو ہم سے آ ملنے کی توقع نہیں رکھتے وہ یہ کہتے ہیں کہ کوئی اور قرآن لے کر آؤ، یا اس میں تبدیلی کرو، ان سے کہدو کہ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں۔ میں تو کسی اور چیز کی نہیں، صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔ اگر کبھی میں اپنے رب کی نافرمانی کر بیٹھوں تو مجھے ایک زبردست دن کے عذاب کا خوف ہے۔ کہہ دو کہ اگر اللہ چاہتا تو میں اس قرآن کو تمہارے سامنے نہ پڑھتا، اور نہ اللہ تمہیں اس سے واقف کراتا، آخر اس سے پہلے بھی تو میں ایک عمر تمہارے درمیان بسر کر چکا ہوں، کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے۔"

ان مذکورہ دو آیات میں غور کرنے والے شخص کو ایسی وجوہ معلوم ہوں گی جو حرمت پر دلالت کرتی ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تبدیلی کے خواہش مندوں کو اس بات کا عنوان دیا کہ وہ اللہ سے آ ملنے کی توقع نہیں رکھتے، اور یہ اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ وہ عمومی نفی کریں کہ وہ خود اپنی طرف سے تبدیلی نہیں کر سکتے، اسی طرح حکم دیا کہ وہ اعلان کریں کہ ان کی اتباع وحی الٰہی پر موقوف ہے، خواہ احکام کے اعتبار سے ہو یا نسخ کے اعتبار سے۔

اس کا معنی یہ ہوا کہ تبدیلی ایک ناجائز خواہش ہے، اور پیغمبر ﷺ، لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہیں کیا کرتا، اور نہ اپنی خواہش کی اور نہ کسی اور کی خواہش کی۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ﴾ (النجم:۳-۴)

"وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتے، وہ صرف وحی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔"

پہلی آیت کے اختتام ہیں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کی کوشش کرنا درحقیقت، خدا کی نافرمانی ہے اور اس پر ایک زبردست دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ اور دوسری آیت میں اس بات کا ذکر ہے کہ قرآن خاص اللہ کا فضل ہے، پیغمبر ﷺ بھی خود اس کی تلاوت نہیں کر سکتے، جب تک کہ اللہ کی مشیت نہ ہو اور اس کی وحی نازل نہ ہو وہ اپنے پیغمبر ﷺ کی زبانی لوگوں کو اس کا علم نہیں دیتا، اس کے بعد اس امر واقع پر لوگوں کو متوجہ کیا کہ یہ پیغمبر ﷺ ایسے ہیں کہ ان ہی کے درمیان انہوں نے زندگی بسر کی ہے، ایک طویل عمر ان میں رہے ہیں، لوگ ان کی بات اور اس کا اسلوب خوب جانتے ہیں نیز یہ کہ جب بھی وہ پیغمبر ﷺ بلاغت کی بلندی پر پرواز کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو فرق خالق کے اور افضل الخلق ﷺ کے درمیان ہے وہی اس پیغمبر ﷺ کے کلام اور قرآن اور اس کے اسلوب کے درمیان ہے۔ نیز اس سے وہ لوگ بآسانی جان لیں گے کہ ایسے پیغمبر ﷺ کی شان نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا پر جھوٹ باندھے اور اس کا دعویٰ کرے کہ ان پر وحی آتی ہے، حالانکہ ان پر وحی نہیں آئی۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی ہے کہ وہ پیغمبر ﷺ ان لوگوں میں صادق اور امین کے وصف سے معروف و مشہور ہیں۔ لہٰذا وہ ایسے نہیں ہو سکتے کہ لوگوں سے جھوٹ بولیں اور خدا پر جھوٹی بات باندھیں۔

پھر قرآن نے آخر میں اعلان کیا کہ ایسا مطالبہ از روئے عقل و نظر عبث و بیکار ہے اور حیوانات و جمادات کے درجہ تک پہنچنے کے مترادف ہے۔

جیسا کہ فرمایا: ﴿اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴾ "یعنی کیا تم میں اتنی بھی عقل نہیں ہے۔"

مقامِ غور ہے کہ جب پیغمبر اعظم ﷺ سے قرآن کا مثل یا اس میں تبدیلی کے مطالبہ پر قرآن نے کس قدر واشگاف اعلان کیا، حالانکہ آنحضور ﷺ زبان و بیان میں سب سے فصیح، قرآن کے معانی و مقاصد اور اسلام کے اسرار اور شریعت کی روح سے سب سے زیادہ واقف ہیں تو جو لوگ پیغمبر ﷺ سے بہت کم درجہ کے حامل ہوں، خواہ علم و فضل اور قدر و عظمت میں معروف ہوں، ان کا ترجمہ قرآن کا مطالبہ کرنا اور اس کے لیے سعی و کوشش کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟۔

تیسری وجہ ترجمہ کی کوشش کرنا، لوگوں کو کتاب اللہ سے انصراف و انحراف پر آمادہ کرتا ہے، اس طرح لوگ اس کے بدل پر اکتفاء کرتے ہوئے اسی کو اس کا ترجمہ خیال کرنے لگیں گے۔ پھر مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ترجمہ کا لفظ ختم ہو کر اس پر صرف لفظ قرآن باقی رہ جائے گا اور کہیں گے کہ یہ قرآن انگریزی میں ہے، اور یہ قرآن فرانسیسی میں ہے۔ اور یہ اس میں ہے وغیرہ ذالک۔ پھر اس متعلق کو بھی حذف کر دیں گے اور ترجمہ پر لفظ قرآن کا اطلاق کرنے کی جسارت کرنے لگیں گے۔

اگر کسی کو کوئی شبہ ہو تو اسے چاہیے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں جو ترجمے ہیں ان کو دیکھ لے، دور جانے کی ضرورت نہیں، ہمیں خود اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ ہم منہ بھر کے ایسا کیوں کہتے ہیں کہ یہ ماجدولین کی روایت ہے، جو عربی میں ترجمہ شدہ ہے جبکہ اصل فرانسیسی میں ہے، اور یہ انجیل برناباس ہے یا یہ یوحنا کی ہے، کیونکہ ان کے عربی میں ترجمے ہوئے ہیں، اصل میں غیر عربی زبان میں ہے، اس کے علاوہ بہت سے امور ایسے ہیں جن کا تعلق علم و دین اور ادب اور دیگر وثائق و قوانین سے ہے کہ جن کے ترجموں پر ہم اصل کا اطلاق بکثرت کرتے ہیں۔

اس پر ایک اور شاہد موجود ہے جو مذکورہ امر سے بھی زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ مجلہ ازھر کے ضمیمہ میں یہ مذکور ہے کہ:

"جاوا کے مسلمان باشندے، قرآن کا انگریزی ترجمہ پڑھتے ہیں اور اپنی اولاد کو پڑھاتے ہیں اور جو کچھ پڑھتے ہیں اسے ہی صحیح قرآن خیال کرتے ہیں۔"

اب آپ ہی خدا کو حاضر جان کر بتائیں کہ اگر ہم اس ترجمہ کے جواز کے قائل ہو جائیں تو اس صورت میں اسلامی بلاد کو اس طرز کا قرآن ماننے سے کیا چیز مانع ہو سکتی ہے!۔

کیا اب بھی آپ کو ہر اس چیز کی حرمت میں شک ہو سکتا ہے جو لوگوں کو کتاب اللہ سے منحرف کرنے کا سبب بننے اور قرآن کے نام پر قرآن سے دوری اور گمراہی کا ذریعہ بنتی ہو؟۔

چوتھی وجہ اگر ہم اس ترجمہ کے جواز کے قائل ہو جائیں اور امر اس حد تک پہنچ جائے کہ لوگ، ترجمہ کی وجہ سے قرآن سے مستغنی ہو جائیں تو اصل عربی زبان کے ضائع ہونے کا خدشہ ہے جیسا کہ تورات و انجیل کی اصل عبرانی زبان ضائع ہو گئی۔

اور اصل عربی زبان کا ضیاع بہت بڑا المیہ ہے، اس طرح لوگ اللہ کے دین کو کھلواڑ بنا کر اس میں تبدیلی کرنے لگیں گے، جب خدانخواستہ شاہد عدل اور نورِ خداوندی اور ان ترجموں سے اعلیٰ و برتر چیز زوال کا شکار ہو گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو امر بھی دین میں تبدیلی اور قرآن مجید سے تغافل اور اس کے ضیاع کا سبب بنتی ہو وہ تمام

مسلمان کے اجتماعی فیصلہ کے مطابق حرام ہے۔

پانچویں وجہ اگر ہم ان گمراہ ترجموں کا دروازہ کھول دیں گے تو لوگ باہم مقابلہ کریں گے، ہر قوم اور گروہ اپنے اپنے زعم کے مطابق اپنی رسمی اور عوامی زبان میں ترجمے کرے گی اور اس طرح بے شمار ترجمے منظر عام پر آ جائیں گے، جو یقیناً ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترجموں کے اختلاف سے مسلمانوں کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگیں گے، جیسا کہ توراۃ وانجیل میں یہود ونصاریٰ کے باہمی اختلاف ہوئے، پھر یہ اختلاف مسلمانوں کی عمارت کو منہدم کرے گا ان کی اجتماعیت کو افتراق میں بدل دے گا۔ اور دشمنوں کو موقع فراہم کرے گا کہ ان مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکیں۔ اور شب تاریک کے ٹکڑوں کی طرح ان مسلمانوں میں اندھا فتنہ برپا کرے گا، لوگ ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ہمارا قرآن تمہارے قرآن سے بہتر ہے، وہ جواب کبھی تو زبان سے دیں گے اور کبھی تیز تلوار کی دھار سے، ان ترجموں سے باہم کشت وخون کریں گے، حالانکہ اس سے پہلے وہ آپس میں بھائی بھائی تھے، قرآن نے ان میں وحدت پیدا کر رکھی تھی، اسلام نے ان میں الفت پیدا کی تھی۔

ترجمہ کا یہ فتنہ (خدانہ کرے) اس فتنہ سے بڑی مشابہت رکھتا ہے بلکہ اس فتنہ سے زیادہ سنگین ہے جس کا اندیشہ امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ رکھا کرتے تھے، اس کے سبب انہوں نے تمام انفرادی مصاحف جلا دینے کا حکم صادر کیا تھا، تاکہ مسلمان اجتماعی اور عثمانی مصاحف پر جمع ہو جائیں۔

چھٹی وجہ ایسے مجرمانہ ترجموں سے مسلمانوں کے وجود کے اجتماعی عناصر ختم ہو کر رہ جائیں گے جس طرح کہ وہ اب ایک قابل قدر امت اور قوی اسناد کی حیثیت کے حامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان ان ترجموں پر کلی طور پر قناعت کر بیٹھیں گے، پھر لامحالہ وہ اصل کلام کی زبان، علوم اور آداب سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اصل زبان وغیرہ امت کے درمیان ایک قوی ربط کا ذریعہ ہے۔ اس ربط کا امت کی تعمیر و وحدت میں بڑا اثر اور کردار ہے، وہ خود قرآن کو پڑھا کرتے تھے، اس کی وجہ سے اس کی عربی زبان کے علوم و آداب سیکھتے تھے، عمدہ ادائیگی اور فہم کے ساتھ ساتھ یہاں تک کہ مسلمانوں نے ان علوم میں مہارت حاصل کی اور ان کی خوب خدمت کی، بہت سے عجمی لوگ عرب کے بہت سے علماء پر کتاب اللہ اور اس کے علوم کی خدمت بجالانے میں سبقت لے گئے۔ اس طرح عربی زبان مسلمانوں کی عام زبان بن گئی، اقوام کے اور علاقائی زبانوں کے مختلف ہونے کے باوجود رابطہ کی مشترک زبان بن گئی۔ بلکہ اس نئی زبان یعنی قرآن کی زبان کی وجہ سے بہت سی علاقائی زبانیں ناپید ہو گئیں۔

اگر آپ کو کچھ تردد ہو تو تاریخ سے مسلمانوں کی وحدت وعزت کی بابت پوچھئے کہ جب عربی زبان، مشرق ومغرب، عرب و عجم کی اسلامی اطراف واکناف میں دولت وسلطنت والی زبان تھی، لوگوں کی باہمی گفتگو، مراسلات، اذان واقامت، نماز، جمعہ و عیدین اور محافل ولشکروں میں عربی زبان ہی بولی جاتی تھی، حتیٰ کہ مسلمانوں کے خلفاء وامراء، قائدین اور افسران کے درمیان رسمی خط وکتابت اسی زبان میں ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح مسلمانوں کے مدارس، مساجد، ان کی کتابیں اور دیوان سب عربی زبان میں ہوتے تھے۔

ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں ہمیں اجنبی زبانوں سے واسطہ اور مقابلہ درپیش ہے، یہ زبانیں، ہماری عربی زبان کے خلاف جنگ کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں، یہاں تک کہ ہماری اور ہمارے آباء واجداد اور خواص وعوام کی زبانیں ابتری کا شکار ہو گئی

ہیں، اس لسانی یلغار کے آگے ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی زبان کی حمایت اور اس کی بقاء و اشاعت کے ذرائع کی خاطر اپنی تمام تر قوتیں مجتمع کر لیں۔ ان وسائل و ذرائع کے سرفہرست یہ ہے کہ ہم قرآن کو اپنی عربیت پر قائم رکھیں، اس کا ترجمہ کرنے والوں کے ہاتھوں پر ضرب لگائیں۔ ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم ان کو ان کے کام میں مدد دیں، یا قرآن کے ترجمہ کو کسی دوسرے ترجمہ پر قیاس کر کے اس کے جواز و امکان کو مان کر ان کے ہم قدم بنیں، کہاں ثریٰ اور کہاں ثریا؟ کہاں عاجز بندے کا کلام اور کہاں اللہ کا کلامِ معجز؟!

ایسے لوگ قومِ موسیٰ سے بہت ملتے جلتے ہیں جو فتنہ میں مبتلا ہو گئے تھے کہ جب اللہ نے انہیں سمندر سے پار لگایا تھا اور وہ ایک قوم کے پاس پہنچے جو بتوں کی پرستش کرتی تھی تو قرآن نے اسے یوں بیان کیا ہے:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۚ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾﴾ (الاعراف: ۱۳۸-۱۳۹)

"وہ کہنے لگے کہ اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی دیوتا بنا دو جیسے ان لوگوں کے دیوتا ہیں، موسیٰ نے کہا: تم ایسے لوگ ہو جو جہالت کی باتیں کرتے ہو، ارے یہ لوگ تو وہ ہیں کہ جس دھندے میں لگے ہوئے ہیں، سب برباد ہونے والا ہے، اور جو کچھ کرتے آ رہے ہیں، سب باطل ہے۔"

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الرسالۃ" میں ایک مضمون ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"غیر عرب پر لازم ہے کہ وہ عرب کی زبان کے تابع ہوں، عربی زبان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہے، جیسا کہ ان کے لئے لازم ہے کہ وہ احکام دین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہوں، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ لوگ صرف زبانِ عرب میں نذر مانیں۔"

پھر فرماتے ہیں کہ:

"چناں چہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ حتی المقدور عرب کی زبان سیکھے، یہاں تک وہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور اس کے رسولؐ ہیں، اسی زبان میں کتاب اللہ کی تلاوت کرے اور جو تکبیر، تسبیح اور تشہد وغیرہ اس پر فرض ہے اور جس کا اسے حکم دیا گیا ہے ان کو بھی اسی زبان میں ادا کرے، جس قدر بھی اس زبان کی شناسائی میں اضافہ ہوگا جو خاتم النبیین علیہ السلام کی زبان ہے اور جس زبان میں خدا کی آخری کتاب اُتری ہے، اسی قدر اس کے لیے بہتر ہوگا۔"

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اسی کتاب "الرسالۃ" میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ نے ایک عجمی زبان کے آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز کے لئے آگے بڑھنا چاہتا ہے، تو آپ نے اس کو روک دیا اور کسی دوسرے کو آگے کر دیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو حضرت مسور رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ وہ عجمی زبان کا آدمی تھا اور موقع حج کا تھا، مجھے اندیشہ ہوا کہ کوئی حاجی اس کی قراءت سن کر اس کی عجمی زبان کو اختیار نہ کر لے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ "تم نے درست کام کیا" امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔

"الکشاف" میں ہے کہ "عجمی" وہ شخص ہے جس کی بات لکنت کی وجہ سے یا زبان کی نامانوسیت کی وجہ سے سمجھ نہ آتی ہو۔ اس

لئے ہوسکتا ہے کہ اس کی زبان میں ہکلاپن ہو یا اس کی زبان ہی نامانوس ہو۔

ساتویں وجہ اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآنِ مجید کی روایت بالمعنی جائز نہیں ہے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ اس معنی عرفی کے اعتبار سے قرآن کا ترجمہ کرنا روایت بالمعنی ہی کے مترادف ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں، صرف لفظی فرق ہے، کیونکہ دونوں میں کلامِ اصل کے معانی و مقاصد کا احاطہ ہوتا ہے۔ روایت بالمعنی میں جو زبان ہوتی ہے وہ اصل کلام ہی کی زبان ہوتی ہے، جبکہ اس ترجمہ کی زبان، اصل کلام کی زبان کے خلاف ہوتی ہے۔ بناء بریں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب کلام عربی میں قرآن کی روایت بالمعنی اجماعاً ممنوع ہے تو ایسا ترجمہ بھی اس متفقہ امر پر قیاس کرتے ہوئے ممنوع ہوگا، بلکہ اصل زبان سے اختلاف کی وجہ سے ممانعت کے زیادہ لائق ہے۔

آٹھویں وجہ تمام لوگ خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، اس امر پر متفق ہیں کہ اعلام کا ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے، خواہ وہ (اعلام) بنی نوع انسان کے اشخاص کے لئے وضع کئے گئے ہوں یا افرادِ حیوان کے لئے وضع کردہ ہوں یا کسی بلاد و اقالیم یا کتب و مؤلفات کے لئے وضع کئے گئے ہوں، یہاں تک کہ جب دُوران ترجمہ ان اعلام کا ذکر آتا ہے تو ان کو آپ اپنی جگہ قائم و ثابت پاتے ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، ایسے معزز ہوتے ہیں کہ ان میں دست بُردی نہیں کی جاسکتی اور اپنے علمی استحکام سے متمتع ہوتے ہیں کہ ترجمہ اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس میں کچھ دست بُردی کرسکتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان اعلام کے واضعین نے خود ان کے الفاظ کا قصد کیا ہے، ان ہی کو اختیار کیا ہے، تاکہ وہ اعلام اپنے مسمیات پر دلالت کریں۔ اسی طرح قرآنِ مجید علم ربانی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان ہی الفاظ اور اسالیب کا قصد کیا ہے، کسی اور کا نہیں کیا۔ تاکہ وہ الفاظ اس کی ہدایات پر دلالت کریں، اور ان کے ذریعہ اللہ اپنے پیغمبر ﷺ کی تائید کرے اور اس کے بندے اس کی تلاوت کرکے اس کی بندگی اختیار کریں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ایسے عمدہ اسالیب اور چنیدہ الفاظ کو اختیار کرکے حکیم بھی ہے۔

جو شخص عربی زبان کے اسالیب کو سمجھتا ہوگا اور اس بات سے واقف ہوگا کہ قرآن کے الفاظ کا حُسن اور ان کی خفت کا کلام کی فصاحت و بلاغت میں کس قدر اثر ہے اسے یقین آئے گا کہ قرآن اپنے باب میں بے مثل اور اپنے بیان میں ایک علَم کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس میں ایسے بلاغتی اسالیب اور لفظی ترنم ہیں جو ہر بلندی سے بلند اور ہر ایک طاقت سے بالاتر ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۗ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا ۗ﴾ (الرعد: ۳۱)

"اور اگر کوئی قرآن ایسا بھی اُترتا جس کے ذریعہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹادیے جاتے یا اس کی بدولت زمین شق کردی جاتی یا اس کے نتیجے میں مُردوں سے بات کرلی جاتی، حقیقت تو یہ ہے کہ تمام تر اختیار اللہ ہی کا ہے۔"

مخلوق ان امور کو مساوی یا مماثل ترجمہ سے کہاں بیان کرسکتی ہے؟

﴿سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ ۝﴾ (النور: ۱۶)

"تیری ذات پاک ہے، یہ بہت بھاری بہتان ہے۔"

ترجمہ کے عدمِ جواز پر ہونے والے شبہات اور اُن کے جوابات

پہلا شبہ اور اس کا جواب

کہا جاتا ہے کہ دیگر اقوام تک قرآنِ حکیم کی ہدایت کا پہنچانا لازمی ہے، کیونکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اسلام کی دعوت میں عموم ہے جو کہ کسی قوم وقبیلہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اور یہ واجب دعوت وتبلیغ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ غیر عرب کے لیے ان کی زبانوں میں اس قرآنِ کریم کا ترجمہ نہ کر دیا جائے۔ اس لیے کہ قرآن مجید عربی زبان میں ہونے کی وجہ سے اس کا سمجھنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے اور اصول ہے کہ:

"مالا یتم الواجب الّا بہ فھو واجب"

"یعنی جس کے بغیر واجب تام نہ ہوتا ہو وہ بھی واجب ہوتا ہے۔"

ہم اس شبہ کے چند جوابات دیتے ہیں:

① ایسا نہیں ہے کہ قرآن کا عرفی ترجمہ کرنے پر اسلام کی دعوت وتبلیغ موقوف ہو، بلکہ یہ مقصد اس کا ترجمہ لغوی کرنے سے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت اس سے قبل ہم کر چکے ہیں۔ نیز یہ مقصد اس طرح بھی حاصل ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم کی ہدایات اور اسلام کے محاسن وصفات کی ان کو تبلیغ کر دی جائے۔ اور اس سلسلہ میں انہیں جو شبہات پیش آئیں ان کا جواب دے دیا جائے، جو زبانی گفتگو کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے اور کتب ورسائل اور مختلف مجلات وغیرہ کی شکل میں بھی ممکن ہے کہ ان کی عمومی طریقہ سے نشرواشاعت کر دی جائے۔ جو بھی طریقہ ان میں سے زیادہ موزوں ہو داعی اسے اختیار کرسکتا ہے۔ داعی دیکھے کہ دوسرے کے لئے کون سا طریقہ زیادہ مفید، سہل اور کامیاب ہوسکتا ہے اسے اختیار کرے۔

② اللہ تعالیٰ نے ہمیں امر ناممکن کا مکلف نہیں بنایا، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶)
ہم اس سے پہلے سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں کہ قرآن حکیم کا عرفی ترجمہ کرنا عادۃً محال ہے، جس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں امرِ محال کا مکلف ہی نہیں بنایا ہے۔

③ ترجمہ قرآن کے وجوب کا قول، مستلزمِ محال ہے اور وہ احکام الٰہی میں تعارض کا پیدا ہونا ہے۔ اور اس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ اس ذات نے ترجمہ کو واجب قرار دیا ہے۔ حالاں کہ حاکم ایک ہے اور حکم کا محل (یعنی ترجمہ) وہ بھی ایک ہے اور محکوم علیہ یعنی ہر زبان ومکان کے مکلفین بھی ایک ہیں۔

④ رسولِ اکرم ﷺ نے احکامِ خداوندی سے سب سے زیادہ واقف ہونے اور دعوت الی اللہ کے فریضہ میں سب زیادہ سرگرم ہونے کے باوجود کبھی بھی اس کے ترجمہ کو دیگر اقوام کی تبلیغ ودعوت میں وسیلہ اور ذریعہ نہیں بنایا۔ حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے عرب وعجم کو اسلام کی طرف دعوت دی ہے۔ حضور ﷺ نے قیصر وکسریٰ اور مقوقس اور نجاشی کو بھی دعوتِ توحید دی اور ان کے ساتھ خط وکتابت کی، مگر تمام خطوط ومراسلات عربی زبان میں تھے۔ ان میں ایک آیت بھی ترجمہ شدہ نہ تھی، پورے قرآن کا ترجمہ تو دُور کی بات ہے۔ اور ان تمام دعوتی خطوط میں جرأت مندانہ اور صریح انداز میں یہ موجود تھا کہ

شرک چھوڑ دو، توحید کو گلے لگاؤ اور میری رسالت کا اعتراف کرو اور تم پر میری اطاعت و اتباع واجب اور لازم ہے۔ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ ﷺ اپنے اصحاب ﷢ میں سے چند لوگوں کو سفیر منتخب کر کے وہ دعوتی خطوط ان کے حوالے کر دیتے، پھر وہ سفراء پوری دیانت داری سے آگے پہنچاتے تھے۔ پھر وہ بادشاہ اور حکام بعض اوقات مترجمین کو بلا کر ان خطوط کی وضاحت طلب کرتے تھے اور ان سفراء سے اسلام کی تعلیمات، پیغمبر اسلام ﷺ کی عادات و اطوار اور پیروکاروں کی بھی صفات معلوم کرتے تھے، تاکہ اس دعوت و پیغام کی کامیابی کی حد معلوم ہو اور اس طرح داعی کی دعوت و حقیقت آشکار ہو سکے۔ اس کے لئے صحیح بخاری میں حدیث ہرقل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

⑤ صحابہ کرام ﷡ نے کبھی قرآن کے دیگر زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش ہی نہیں، اس پر سوچا تک نہیں، حالاں کہ وہ ہدایت کے چراغ اور امتِ محمدیہ کے افضل و اعلیٰ طبقہ میں شمار ہوتے ہیں، نیز اللہ اور رسول کی مرضیات کے سب سے زیادہ حریص و خواہش مند رہنے والے، اسلام اور شریعت کی روح اور اسرار و رموز کے سب سے زیادہ واقف کار تھے، بلکہ صحابہ ﷢ کا حال بھی رسولِ اعظم ﷺ جیسا تھا، صحابہ کرام ﷢ نے بھی ان ہی وسائلِ دعوت کو اختیار کیا تھا جنہیں آنحضور ﷺ نے اختیار کیا، بلکہ ان وسائل کو دین کی نشر دعوت کے سلسلہ میں شاندار اور نہایت سرگرمی سے اختیار کیا۔ اگر قرآن کا یہ ترجمہ عرفی واجباتِ اسلام میں سے ہوتا تو بلاشبہ صحابہ کرام ﷢ بھی بلکہ آنحضرت ﷺ اس کو سب سے پہلے اختیار کرتے، اور اگر انہوں نے ایسا کوئی عمل کیا ہوتا تو ضرور ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچتا، کیونکہ اس طرح کے امور کے نقل و تواتر پر اسباب و دواعی کثرت سے موجود ہوا کرتے ہیں۔

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے دعوتِ اسلام کے جو خطوط غیر عرب کے بادشاہوں کے نام لکھے تھے وہ چونکہ قرآن پر مشتمل ہوتے تھے اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ آنحضور ﷺ نے اس کے ترجمہ کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ صحیح روایات سے یہ بات صراحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ ہرقل، جو کہ ان بادشاہوں میں سے ایک تھا جسے اسلام کی دعوت دی گئی تھی، اس نے اپنے ترجمان کو بلایا اور اس نے اس کے سامنے اس نبوی مکتوب کا ترجمہ کیا، حالانکہ اس میں قرآن کا حصہ موجود تھا۔

جواب یہ ہے کہ ان نبوی مکاتیب سے یہ بات بالکل لازم نہیں آتی کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اس کے ترجمہ عرفی کو برقرار رکھا یا اس کی اجازت دی۔ اگر یہ مکاتیب کسی ترجمہ کو مستلزم ہیں تو وہ صرف جائز قسم کے ترجمہ کو مستلزم ہو سکتے ہیں، یعنی غیر عربی میں تفسیر وتوضیح کرنا، اس لئے کہ تفسیر جس طرح بھی ہو وہ ارسال کردہ خطوط کے مضامین کے سمجھنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں یہ مبارک خطوط، مکمل قرآن پر مشتمل نہ تھے اور نہ ہی قرآن کی مکمل آیات پر، بلکہ ان خطوط میں بہت ہی کم آیات کا اقتباس ہوتا تھا۔ اور ظاہری بات ہے کہ قرآن سے اخذ کردہ اقتباسات پر قرآن کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

اب ہم مکاتیب نبوی ﷺ کے چند نمونے پیش کرتے ہیں اس سے اس امر کی ساری حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی:۔

① آنحضرت ﷺ کا وہ مکتوب گرامی جو آپ ﷺ نے دحیہ بن خلیفہ الکلبی کے ہاتھ ہرقل کو ارسال کیا۔ اس کی عبارت یہ ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد (ﷺ) کی جانب سے جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ہرقل کے نام جو عظیم روم ہے۔

سلام علی من اتبع الھدی، اما بعد! میں تمہیں اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں، اسلام قبول کرو، سلامتی میں رہو گے، اللہ تمہیں دوہرا اجر دے گا، اور اگر تم نے اعراض کیا تو تم پر اریسین (عوام الناس) کا گناہ ہوگا، اور اے اہل کتاب آؤ ایسے کلمہ کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم اللہ ہی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں اور ہم اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں، اگر تم نے اعراض کیا تو کہو کہ گواہ رہو کہ ہم تو فرماں بردار ہیں۔"[1]

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اس مبارک خط میں قرآنِ مجید کی ایک مکمل آیت بھی نہیں ہے، کیونکہ آیت کی ابتداء تو ﴿قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ (آل عمران: ۶۴) سے ہوتی ہے، مگر اس مکتوب سے ﴿قُلْ﴾ کا لفظ مذکور نہیں ہے۔ نیز اس مکتوبِ گرامی میں "واؤ" کا اضافہ ہے، یہ حذف وزیادتی اس بات پر دلیل مادی ہے کہ یہ سب اقتباس ہے۔

② نیز آنحضور ﷺ کا وہ مکتوبِ گرامی جسے آپ ﷺ نے عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کسریٰ کو بھیجا۔ اس میں یہ درج تھا:
"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے عظیم فارس کسریٰ کے نام۔
سلام علی من اتبع الھدی، جو ہدایت کی اتباع کرے اور خدا ورسول ﷺ پر ایمان لائے اسے سلام، میں تمہیں اللہ کی (توحید) کی طرف دعوت دیتا ہوں، بلاشبہ میں تمام لوگوں کی طرف اللہ کا رسولؐ بنا کر بھیجا گیا ہوں، تاکہ جو زندہ ہیں ان کو ڈراؤں، اور کافروں پر بات ثابت ہو، اسلام قبول کرو، سلامت رہو گے، اگر تم نے اعراض کیا تو تم پر مجوسیوں کا گناہ ہوگا۔"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس مبارک مکتوب میں یہ کلمات موجود ہیں۔ (لأنذر من کان حیا و یحق القول علی الکافرین) جبکہ قرآن کریم میں آیت اس طرح سے ہے: ﴿لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا﴾ (یٰس: ۷۰) یہ بھی اقتباس کی دلیل ہے۔

③ آنحضور ﷺ کے تمام مکتوبات میں اسی طرح ہے، مقوقس (اسکندریہ کا حاکم) کو جو دعوت نامہ لکھا وہ بھی ویسی ہی عبارت پر مشتمل تھا جیسی عبارت ہرقل کے نام مکتوبِ گرامی کی تھی۔ دونوں میں بس یہ فرق ہے کہ ہرقل کے خط میں "اریسین" اور مقوقس کے خط میں "القبط" کے الفاظ ہیں۔ یا پھر مرسل الیہ اور جگہ کا فرق ہے۔

④ اسی طرح عمان کے بادشاہ جیفر اور عبد کے نام جو مکتوبِ گرامی لکھا گیا اس میں بھی کسریٰ کی طرح "لِأُنذر من کان حیًا و یحق القول علی الکافرین" کے الفاظ ہیں۔[2]

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

معترض لوگ کہتے ہیں کہ قرآنِ پاک کے ترجمہ کے متعلق آپ کے تمام خدشات اور ممنوعات تو خود عربی لفظ کے تفسیری ترجمہ میں بھی پائے جاتے ہیں اور اُمت کا اجماع ہے کہ ایسے ممنوع امور سے پرہیز نہ کیا جائے، لہٰذا ترجمہ قرآن میں بھی ان ممنوعات سے پرہیز نہ کرنا ضروری ہے، کیونکہ اس میں کوئی فرق نہیں کہ آیات کی مراد کی تعبیر عربی الفاظ سے کی جائے یا غیر عربی الفاظ سے اس کی تعبیر کی جائے۔ جبکہ ترجمہ وتفسیر کرتے وقت وہ

---

[1] رواہ البخاری فی کتاب الجھاد (۹۹) و مسلم فی الجھاد (۷۴)
[2] دیکھیے: الزرقانی علی المواھب ج ۳، ص ۳۲۶ - ۳۶۹، السیرۃ الحلبیہ ج ۲ ص ۳۶۲ - ۳۷۸

معتبر، مفسر اور مترجم، ترجمہ کی لازمی شرائط کو پورا بھی کرنے والا ہو۔

جواب یہ ہے کہ اگر تو اپنے کلام میں ان کی ترجمہ سے مراد ترجمہ عرفی ہے تو ہم نے شرح و بسط کے ساتھ اس کے ممنوع ہونے کی وجوہات ذکر کر دی ہیں، وہ تو بالکل ممنوع ہے۔ اسی طرح ترجمہ عرفی اور ترجمہ تفسیری کے درمیان کئی فرق بھی لکھ آئے ہیں، خواہ وہ ترجمہ حرفی ہو یا تفسیری یا اصل زبان میں تفسیر ہو یا غیر اصل زبان میں تفسیر ہو۔

اور اگر ان کی مراد ترجمہ سے وہ ترجمہ لغوی ہے جو تفسیر بزبانِ اجنبی کے معنی پر مبنی ہو تو پھر تو ان کی بات قابل تسلیم ہے، لیکن اس عرفِ خاص کا اطلاق اس عرفِ عام پر کرنا جائز نہ ہوگا۔

چوتھا شبہ اور اس کا جواب

وہ کہتے ہیں کہ قرآنِ پاک کا ترجمہ عرفی اس کے معانی تبعیہ کی بہ نسبت جب دشوار ہو جائے تو معانی اصلیہ کے مقابلہ میں ممکن ہوتے ہیں۔ بناء بریں ہم قرآن کا ترجمہ بایں معنی کرتے ہیں کہ اس کے صرف معانی اصلیہ کو نقل کر رہے ہوتے ہیں، بالخصوص جبکہ یہی معانی اصلیہ قرآن سے مقصود و مطلوب ہدایت پر مشتمل ہوتے ہیں نہ کہ معانی تبعیہ۔

اس شبہ کا اوّلاً جواب یہ ہے کہ قرآن کے معانی اصلیہ کو نقل کرنا عرفاً ترجمہ نہیں کہلاتا، کیونکہ الفاظِ قرآن کا مدلول، معانی اصلیہ اور تبعیہ دونوں سے مرکب ہوتا ہے، لہٰذا قرآن کے ترجمہ کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے ہر طرح کے معانی کو نقل کیا جائے کہ کوئی فرق نہیں کہ وہ اس کے معنی اوّلی ہوں یا معنی ثانوی۔ اسی طرح ترجمہ کرنے کے معنی ہیں کہ قرآن کے تمام مقاصد کا نقل کئے جانا اور تمام مقاصدِ قرآن کا نقل کرنا بھی محال ہے، جیسا کہ اس پر پہلے بھی بحث ہو چکی ہے۔

بناء بریں یہ امر جائز نہیں کہ ترجمہ سے محض معانی اصلیہ نقل کیے جاتے ہیں معانی تبعیہ اور بقیہ مقاصد نقل نہیں کیے جاتے اس کو ترجمہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو ایسا ہے جیسے انسان کے ہاتھ کو انسان اور حیوان کی ٹانگ کو حیوان کا نام دے دیا جائے۔

ہاں اگر ترجمہ کا اطلاق اس معنی مراد پر اس کے قائلین تک محدود و منحصر ہو اور عرف عام تک اس کا اطلاق متصل نہ ہو تو بات سہل ہو سکتی ہے اور اس میں گنجائش کی صورت نکل سکتی ہے اگر چہ وہ صورتِ جواز بعید قسم کی ہوگی۔ لیکن وہ عرف جس کی ہم بات کر رہے ہیں اس میں لفظ "ترجمہ" کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ "ایسی صورت جو اصل کے مطابق ہو" جس میں تمام معانی و مقاصد کا احاطہ کیا گیا ہو، اس اعتبار سے دونوں میں لفظی فرق ہی ہوگا۔ جب ہم قرآن کے صرف معانی اصلیہ کو نقل کریں اور پھر عالمی عرفِ عام کے لوگوں سے کہیں کہ یہ ہے قرآن کا ترجمہ تو یقیناً ہم اہل عرف کو ایک اعتبار سے بے راہ کرتے ہیں اور دوسرے لحاظ سے قرآن کی عظمت و جلالتِ شان کو گھٹا دیتے ہیں۔

جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم قرآن کا ایک مثل یا اس کا شبیہ بنانے کا زعم کر رہے ہوں گے، جبکہ ہماری پیش کردہ چیز کی حقیقت قرآن کے ایک جزو کے آگے کمترین صورت سے زیادہ نہیں ہوگی اور اس صورت اور اصل کی جلالت و عظمت کے درمیان کئی مراحل ہیں، جس طرح کوئی شخص ایک عظیم انسان کے جزوِ اسفل کی صورت بنا کر کہے کہ یہ فلاں عظیم انسان کی صورت ہے۔

اور اس شبہ کا ثانیاً جواب یہ ہے کہ قرآن کے ثانوی معانی، بے انتہاء اور وسیع ہدایات و معارف کا گنجینہ ہیں، ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ قرآن کے صرف معانی اصلیہ ہی مصدر و منبع ہدایت ہیں۔ اس بارے میں ہم جو بحث پہلے کر چکے ہیں اسے دیکھ لیا جائے، اس

میں کافی بحث آ چکی ہے۔

پانچواں شبہ اور اس کا جواب

کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں نے دیگر اجنبی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے کئے ہیں، اصل میں انہوں نے قرآن کے معانی و مطالب ہی بدل کر رکھ دیئے ہیں، اس کا سارا حسن و جمال ہی بگاڑ دیا ہے اور انہوں نے بڑی فحش غلطیاں کی ہیں، ہم ایسا نہیں کریں گے، بلکہ ہم جب قرآن کا ترجمہ کریں گے تو بڑے اہتمام و خیال سے کریں گے، ہم ان کی غلطیوں کی اصلاح کریں گے اور ان غلط ترجموں کے پڑھنے والوں کی نظر میں اس قرآن کا اعتماد اور اعتبار دوبارہ بحال کریں گے اور اس طرح ہدایتِ اسلام کی راہ میں حائل ہو جانے والی گھاٹیوں کو ہٹائیں گے اور یوں ہم اس دینِ حنیف کی دعوت و اشاعت میں اپنا پیغام اور فریضہ ادا کریں گے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جنہیں یہ زعم ہوا کہ انہوں نے قرآن کا عربی ترجمہ کر دیا اصل میں انہوں نے قرآن کے حسن و جمال کو داغ دار کیا اور اس کے مقام و مرتبہ کو پست کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ تمہیں بھی اس کا اعتراف ہے۔ اور اب اگر تم بھی ان کی طرح ترجمہ کرنے کی سعی و کوشش کرو گے تو تم بھی ان کی طرح یا ان کے قریب قریب ان ہی غلطیوں کا ارتکاب کرو گے اور قرآن کی عظمت و جلالت کو ماند کرو گے۔ خواہ تم جس قدر چاہو کوشش کرلو اور خوب اہتمام و احتیاط کرلو، علم و فضل میں ماہر ہو جاؤ اور فہم و ادراک میں فائق ہو جاؤ، اس لئے کہ قرآن کا مرتبہ و مقام ہر قسم کے مصوّر کی دست اندازی سے بہت بلند و برتر ہے، خواہ وہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے۔ جیسا کہ ہم اس کی بھرپور وضاحت کر چکے ہیں۔

ہاں اگر تم قرآن کا ترجمہ اس کی اجنبی زبان میں تفسیر کے معنی کے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہو تو یہ اور مؤقف ہے، ہم تمہاری اس بارے میں تائید کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں بلکہ تم میں سے جو یہ کام کر سکتا ہے اس کو اس کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

چھٹا شبہ اور اس کا جواب

وہ کہتے ہیں کہ احادیث سے اس بات کی صراحت کے ساتھ تائید ہوتی ہے کہ قرآن کا ترجمہ کرنا جائز ہے، چنانچہ شرنبلانی نے اپنی کتاب "النفحة القدسية" میں لکھا ہے کہ:

"مروی ہے کہ اہلِ فارس نے سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ آپ ہمارے لیے سورۃ الفاتحہ فارسی زبان میں لکھ دیں، چنانچہ انہوں نے یوں لکھا کہ: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بنام یزدان بخشائید" پھر وہ اہل فارس اپنی نمازوں میں اسی طرح پڑھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی زبانیں نرم ہوگئیں اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام سے یہ بات پیش فرمائی تھی، اس کے بعد یہ واقعہ ہوا۔[1]

ہم اس کے جواب میں اوّلاً تو یہ کہتے ہیں کہ یہ خبر ایسی ہے کہ اس کی اصل مجہول ہے اس کی سند نامعلوم ہے، لہٰذا اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔

اور ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ خبر درست ہوتی تو لازماً تواتر سے منقول ہوتی، کیونکہ اس طرح کے امور یقینی طور پر متواتر نقل کیے جاتے ہیں۔

اور ثالثاً ہم کہتے ہیں کہ استدلال کی کمزوری کی دلیل تو خود اس میں موجود ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اہل فارس نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ وہ ان کے لیے سورۃ الفاتحہ کا ترجمہ لکھ دیں تو انہوں نے فاتحہ کا ترجمہ نہیں لکھا بلکہ صرف بسم اللہ کا ترجمہ لکھ دیا۔

---

① كذا في المبسوط، قاله في النهاية والدراية

اگر ترجمہ قرآن ممکن اور جائز ہوتا تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ضرور ان کا مطالبہ پورا کرتے، بصورتِ دیگر تو ان پر الزام آئے گا کہ وہ علم کو چھپانے والے تھے اور ایسا شخص تو ملعون ہوتا ہے۔

اور رابعاً ہم کہتے ہیں کہ اگر اس واقعہ میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے تو بسم اللہ کا بھی پورا ترجمہ نہیں کر کے دیا، اس لیے کہ جس روایت میں یہ آیا ہے کہ یہ الفاظ بسم اللہ کا ترجمہ ہے اس میں تو لفظِ "رحمٰن" کے بالمقابل کوئی لفظ بھی نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فارسی زبان اس جیسے مکرم و معظم لفظ کے وجود سے عاجز ہے۔

لہٰذا یہ اس بات کی دلیل مادی ہے کہ اس مقام پر ترجمہ سے مراد ترجمہ لغوی ہے نہ کہ ترجمہ عرفی اور یہ بھی تب جبکہ اس روایت کو ثابت فرض کر لیا جائے۔

اور خامساً ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ روایت کے الفاظ میں کمی و زیادتی ثابت ہے جو کہ موجب اضطراب اور باعث رد ہے اور اس اضطراب کی دلیل یہ ہے کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو "المجموع" میں بالفاظِ دیگر نقل کیا ہے، اس میں یوں مندرج ہے:

"اہل فارس کی ایک قوم نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ان کے لیے قرآن کا کوئی حصہ لکھ دیں، چنانچہ انہوں نے ان کے لیے سورۃ الفاتحہ فارسی زبان میں لکھ دی۔"

اب ان دونوں روایات میں تعارض ہے کہ اس روایت میں فاتحہ کا ذکر ہے اور مذکورہ روایت میں بسم اللہ کا ذکر ہے، نیز یہاں پر اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے معاملہ کو رکھا، جبکہ مذکورہ روایت میں پیش کرنے کا ذکر ہے۔ لہٰذا دونوں روایات باہم ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

اور سادساً ہم کہتے ہیں کہ اس روایت کو ہم اگر بالفرض صحیح تسلیم کر بھی لیں تو یہ سابقہ قطعی دلائل کے معارض ہوگی جن میں ترجمہ کے محال اور ناجائز ہونے کا ذکر ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ قطعی دلائل کے معارض روایت ساقط الاعتبار ہوتی ہے۔

ترجمہ قرآن کے پڑھنے کا حکم

فقہاءِ کرام تقریباً اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کا ترجمہ پڑھنا خواہ وہ کسی بھی زبان میں ہو، فارسی زبان میں ہو یا کسی بھی دوسری زبان میں، اور خواہ نماز میں اسے پڑھا جائے یا غیر نماز میں، ممنوع ہے۔ اگرچہ بعض احناف کی عبارات میں کچھ اضطراب موجود ہے۔ چنانچہ اب ہم فقہاءِ کرام کے چند اقوال اور مذاہب پیش کرتے ہیں اس سے حقیقتِ حال واضح اور روشن ہو جائے گی۔

مذہب شافعیہ ① "المجموع" (ص ۳۷۹، ج ۳) میں ہے کہ: "مذہب شافعیہ یہ ہے کہ قرآن کی قراءت زبانِ عرب کے بغیر جائز نہیں ہے، خواہ عربی زبان پر قدرت ہو یا نہ ہو، اور عام ازیں کہ نماز میں پڑھنا ہو یا غیر نماز میں، لہٰذا اگر عربی کی بجائے اس کا ترجمہ نماز میں پڑھا تو نماز درست نہ ہوگی، خواہ قراءت عمدہ کرے یا نہ کرے۔ جمہور علماء، جن میں امام مالک، امام احمد اور امام ابوداؤد رحمہم اللہ شامل ہیں، اسی کے قائل ہیں۔

② زرکشی رحمۃ اللہ علیہ "البحر المحیط" میں لکھتے ہیں کہ:
"قرآن کا ترجمہ فارسی یا کسی اور زبان میں کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ قرآن کو اسی ہیئت پر پڑھنا واجب ہے جس کے ساتھ اس کا اعجاز تعلق رکھتا ہے، کیونکہ ترجمہ اس سے قاصر ہے اور دیگر زبانیں بھی اس فصاحت و بیان سے عاجز ہیں جو اسی زبان (عربی) کی خصوصیت ہے۔"

③ نیز "حاشیۃ ترشیح المستفیدین" (ص ۵۲، ج ۱) میں مذکور ہے:
"جو شخص سورۃ الفاتحہ سے ناواقف ہو اس کے لیے اس کا ترجمہ کر لینا جائز نہیں ہے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا﴾ (یوسف: ۲) عجمی زبان ایسی نہیں ہے، نیز الفاظِ قرآن امر تعبدی ہے۔

④ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی "الاتقان" میں ہے: "قرآن کی قراءت بالمعنی جائز نہیں ہے، اس لیے کہ جبریل علیہ السلام نے اسے الفاظ کے ساتھ پہنچایا ہے، ان کے لیے وحی بالمعنی جائز نہیں تھی۔"

مذہب مالکیہ

① مالکیہ کی کتاب "حاشیۃ الدسوقی علی شرح الدردیر" (ص ۲۳۲-۲۳۶، ج ۱) میں ہے کہ: "غیر عربی میں قرآن کی قراءت جائز نہیں ہے۔ بلکہ نماز میں غیر عربی زبان میں تکبیر بھی جائز نہیں ہے حتیٰ کہ عربی کے مترادف کوئی اور لفظ تکبیر کی جگہ بھی جائز نہیں، اگر عربی میں فاتحہ پڑھنے سے عاجز ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ ایسے شخص کی اقتداء کرے جو فاتحہ اچھے طریقہ سے پڑھنا جانتا ہو۔ لہٰذا اگر اس کے لیے اقتداء کرنا ممکن تھا لیکن اس نے اقتداء نہیں کی تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ اور اگر اقتداء کے لیے کوئی امام نہ پائے تو اس سے فاتحہ کا پڑھنا ساقط ہوگا اور عربی زبان میں اللہ کا ذکر اور تسبیح ادا کر لے۔ اور علما فرماتے ہیں کہ ہر مکلف پر واجب ہے کہ فاتحہ عربی زبان میں سیکھے، اور اس کے لیے خوب کوشش کرے۔ اور اس فاتحہ کے اور اس پر مزید کوئی سورت کے سیکھنے میں بھرپور کوشش کرے۔ ہاں اگر اس سعی و کوشش کے دوران موت ہی حائل ہو جائے تو وہ معذور ہوگا۔"

② "المدونۃ" (ص ۶۲ ج ۱) میں ہے کہ: "میں نے ابن القاسم سے پوچھا کہ ایک شخص عربی زبان سے واقف نہیں ہے وہ نماز کا آغاز کسی عجمی (غیر عربی) زبان سے کرتا ہے تو اس کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا کیا ارشاد ہے؟ انہوں نے فرمایا: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس شخص کے بارے میں سوال ہوا تھا جو عجمی زبان میں قسم اٹھاتا ہے تو آپ نے اسے ناپسند جانا تھا اور فرمایا تھا کہ کیا وہ قرآن نہیں پڑھتا ہے؟ نماز نہیں پڑھتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اسے عربی زبان میں بات کرنی چاہیے نہ کہ کسی اور زبان میں۔ انہوں نے کہا کہ اسے کیا معلوم کہ جس کی اس نے قسم کھائی کیا وہ اللہ ہے یا کوئی اور؟ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ کوئی شخص نماز میں عجمی زبان میں دعا کرے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا ہے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ کوئی عجمی شخص عجمی زبان میں قسم اٹھائے۔ ابن القاسم کہتے ہیں کہ مجھے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خبر دی کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا کہ کوئی شخص عجمیوں کی طرح اجنبی زبان میں بات کرے، اور فرمایا کہ یہ بری بات اور دھوکہ دفریب ہے۔"

مذہبِ حنابلہ

① "المغنی" (ص ۵۲۶، ج ۱) میں مرقوم ہے کہ: "غیر عربی میں قراءت کافی نہ ہوگی اور اسی طرح عربی الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ سے بھی خواہ عربی میں قراءت اچھے انداز سے کر سکتا ہو یا نہ کر سکتا ہو، پھر فرمایا:

اگر عربی میں قراءت ٹھیک طرح نہ کرسکتا ہو تو اسے سیکھنا لازم ہے، اگر قدرت کے باوجود ایسا نہ کرے تو اس کی نماز درست نہ ہوگی۔"

۲ ابن حزم الحنبلی رحمہ اللہ "المحلی" (ص ۲۵۴ ج ۳) پر لکھتے ہیں کہ: "جو شخص نماز میں سورۃ فاتحہ یا اس کا کچھ حصہ یا قرآن کا کچھ حصہ عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے یا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ الفاظ کے علاوہ دیگر عربی الفاظ کے ساتھ پڑھے گا، جان بوجھ کر ایسا کرے یا دانستہ طور پر کوئی کلمہ آگے پیچھے کرے گا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔ اور وہ فاسق ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا﴾ (یوسف: ۲) اور غیر عربی کو عربی شمار نہیں کر سکتے، لہٰذا اسے قرآن نہیں کہیں گے، اور قرآن کی عربیت کو تبدیل کرنا، کلام اللہ کی تحریف ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی قرآن میں مذمت کی ہے۔ فرمایا: ﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ (النساء: ۴۶) جو شخص عربی ٹھیک طرح سے نہ پڑھ سکتا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی زبان میں اللہ کا ذکر کرے، کیونکہ ارشاد ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ: ۲۸۶) لہٰذا ایسے شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ ترجمہ کرتے ہوئے فاتحہ یا قرآن کا کوئی حصہ پڑھے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اسی کا پڑھنا اس کے ذمہ ہے، حالانکہ جو اس کے ذمہ پڑھنا لازم تھا وہ اس کے علاوہ ہے، اس طرح وہ خدا پر الزام تراشی کرنے والا ہوگا۔

مذہبِ حنفیہ

اس مقام پر حنفیہ کی روایات مختلف ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے خاص قسم کے اقوال میں اضطراب موجود ہے۔ ہم یہاں پر موضوع کو سمیٹتے ہوئے مختصر طور پر اس بارے میں مذہب حنفیہ کو ذکر کرتے ہیں اس کے ساتھ ان متعارض روایات میں تطبیق بھی کریں گے۔ اس کے لیے ہم "مجلۃ الازھر" (ج ۳، ص ۳۲، ۳۳، ۶۶، ۶۷) سے اقتباس نقل کرتے ہیں جو علماء حنفیہ کے ایک بڑے عالم کے قلم سے تحریر کردہ ہے، انہوں نے مذکورہ مسئلہ کو اختصار اور تصرف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

"ائمہ حنفیہ اس پر متفق ہیں کہ خارجِ صلوٰۃ قرآن کا غیر عربی زبان میں پڑھنا جائز نہیں ہے، ایسا کرنے والے شخص کو سختی سے روکا جائے گا، کیونکہ غیر عربی زبان میں قرآن کا پڑھنا دراصل قرآن کی قراءت میں تصرف کرنے کی قسم میں سے ہے جو قرآن کو اس کے مرتبہ اعجاز سے خارج کرنے کے مترادف ہے، بلکہ یہ امر اس کی بے ربطگی اور ناموزونیت کا موجب ہے۔ باقی نماز کے اندر غیر عربی زبان میں قرآن کا پڑھنا، یہ بھی بالاجماع حرام ہے، اس کی وجہ وہی ہے جو ابھی مذکور ہوئی۔ لیکن اگر کوئی شخص بالفرض ایسا کر لیتا ہے، یعنی کوئی نمازی، غیر عربی زبان میں قراءت کر لیتا ہے تو کیا حکم ہے، آیا اس کی نماز درست ہو جائے گی یا فاسد ہو جائے گی؟

علماء حنفیہ اپنی کتب میں لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ: "اگر کوئی نمازی قدرت کے باوجود غیر عربی زبان میں قراءت کرتا ہے تو اس کی قراءت کافی ہو جائے گی" لیکن آپ نے بعد میں اس سے رجوع کر لیا اور فرمایا کہ: "جب وہ عربی میں پڑھنے پر قدرت رکھتا ہو تو اس پر نظمِ عربی کی قراءت فرض ہوگی، اگر عربی کے علاوہ کسی زبان میں قراءت کرے گا تو اس کی نماز فاسد ہوگی، کیونکہ باوجود قدرت کے اس کی نماز قراءت سے خالی ہے۔" نیز وہ کلام الناس کی جنس میں سے ہے، کیونکہ جو اس نے پڑھا ہے وہ قرآن نہیں ہے۔"

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رجوع کی روایت مذہبِ حنفیہ کے بڑے بڑے ائمہ سے منقول ہے، جیسے نوح ابن مریم رحمہ اللہ، یہ

اصحابِ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں سے تھے۔ اس طرح علی ابن الجعد، جو اصحابِ ابی یوسف میں سے تھے، اسی طرح ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ روایت منقول ہے جو کہ چوتھی صدی ہجری میں علماءِ حنفیہ کے شیخ تھے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مجتہد جب اپنے قول سے رجوع کر لیتا ہے تو مرجوع عنہ کو اس کا قول شمار نہیں کیا کرتے۔ اس لیے کہ انہوں نے اس بات سے رجوع اسی وقت کیا ہے جب ان پر یہ بات واضح ہوئی کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مذہبِ حنفیہ میں بھی عربی زبان پر قدرت رکھنے والے شخص کا غیر عربی زبان میں قراءت کرنا کافی نہیں ہوگا اور اس سے استدلال کرنا بھی درست نہ ہوگا اور نہ ہی مرجوع قول قابلِ التفات ہوگا۔ بالخصوص جب ائمہ حنفیہ کا بھی اس بات پر صریح اجماع موجود ہے کہ "قرآن" اس مخصوص لفظ کا نام ہے جو معنی پر دلالت کرتا ہے، صرف معنی کا نام نہیں ہے۔

باقی جو شخص عربی زبان میں قرآن پڑھنے سے عاجز ہو تو اس کا حکم وہی ہے جو ایک اُمی کا ہوتا ہے، یعنی اس کے ذمہ قراءت نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا شخص کسی دوسری زبان میں قرآن کی ادائیگی کر کے خلاف ورزی کرے تو اگر ادا کردہ چیز کوئی قصہ، یا امر و نہی وغیرہ ہو تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ وہ "کلام" کے ساتھ تکلم کرنے والا ہوگا نہ کہ "ذکر" کے ساتھ۔ اور اگر اس نے جو ادا کیا وہ کوئی ذکر و تسبیح اور تنزیہ و تقدیس کی قسم میں سے ہو تو نماز فاسد نہیں ہوگی، کیونکہ "ذکر" کسی بھی زبان میں ہو، مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن کا ترجمہ پڑھنا جائز ہے۔ یہ بات پہلے ہو چکی ہے کہ قرآن کا ترجمہ پڑھنا بہرصورت شرعاً ممنوع ہے۔

چند قابلِ توجہ اُمور

بعض اکابرِ اُمت کی عبارات میں ایسے امور آ گئے ہیں جن سے طلباءِ بحث و تحقیق اشتباہ میں پڑتے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں پر مسئلہ ہذا کی تکمیل اور حقیقتِ امر کے اظہار کے لیے ان اکابرِ اُمت کی عبارات کے چند نمونے بھی ذکر کر دیں، اس کے بعد ان کے متعلق اپنی آراء اور توجیہات پیش کر دیں۔

① امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "الأم" میں "عجمی کی امامت" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

و اذا أتموا به فان أقاما معًا ام القرآن، و لحن أو نطق احدهما بالاعجمية أو لسان أعجمي في شيء من القرآن غيرها، أجزأته و من خلفه صلاتهم، إذا كان أراد القراءة لما نطق به من عجمة و لحن، فان أراد به كلامًا غير القراءات فسدت صلوته. اه." (ج۱، ص۱۴۷)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ قول کی مراد کی توضیح کرتے ہوئے علماء فرماتے ہیں کہ ان کی مراد یہ ہے کہ امام اور مقتدی جب سورۃ فاتحہ ٹھیک طرح سے پڑھیں، پھر ان میں سے کوئی ایک عجمی لہجے یا عجمی زبان کے ساتھ فاتحہ کے علاوہ قرآن کے کسی حصے کے ادا کرنے میں غلطی کریں یا ادائیگی کریں تو ان دونوں کی نماز باطل نہ ہوگی، مذکورہ عبارت میں "الأعجمية" سے لہجہ اور "اللسان" سے لغت و زبان مراد ہے، جیسا کہ اسے اس طرح کے مواقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مفروض (فاتحہ) کی قراءت کر لینے کے بعد عجمی زبان مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہوتی اور اس مسئلہ میں مذہبِ شافعیہ، حنفیہ کے موافق ہے۔

ہم امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ قول کی توجیہ بیان کرتے ہوئے اور اپنے کلام کی تائید میں کہتے ہیں کہ ہم اس سے قبل بھی مذہبِ حنفیہ پر بحث کر چکے ہیں، ہمیں اس کا اعادہ نہیں کرنا۔ البتہ جن علماء نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ قول کی جو مراد بیان کی ہے وہ

ہمیں تسلیم ہے، لیکن اس بات کو مکمل طور پر بیان کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس صورت میں نماز کا باطل نہ ہونا اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ قراءت کا قصد اور ارادہ کیا جائے، مگر جب قراءت مقصود نہ ہو تو نماز باطل ہو جائے گی۔ پھر یہ یاد رہے کہ مذکورہ صورت میں عدم بطلان کا منشاء وسبب یہ نہیں ہے کہ فاتحہ کے علاوہ قرآن کے دوسرے حصے کا عجمی زبان میں پڑھنا جائز ہے جیسا کہ ان لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ اصل منشاء یہ ہے کہ عجمی زبان میں قراءت ایسے محل میں واقع ہوئی ہے جو نہ نماز کا رکن ہے اور نہ ہی نماز کے واجبات میں سے ہے۔ کیونکہ مذہب شافعیہ میں یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ فاتحہ سے زائد کسی چیز کا پڑھنا کسی حال میں بھی نماز کے اندر واجب نہیں ہے اور یہ بات اس کے منافی نہیں ہے کہ عجمی زبان میں قراءت کرنا حرام ہے، جب کہ اس سے پہلے مذہب شافعیہ کی عبارت آپ کے سامنے گزر چکی ہیں۔ نیز خود امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے بھی قریب میں معلوم ہو چکا ہے۔ اس مسئلہ کے بہت سے نظائر موجود ہیں۔ جیسا کہ غصب کردہ زمین میں نماز ادا کرنا، اب یہ حرام ہونے کے باوجود نماز درست ہوگی۔

عجمی زبان میں قراءت کی حرمت کی تائید امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی خود مذکورہ عبارت سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ انہوں نے عجمی زبان میں قراءت کرنے اور اس میں غلطی کرنے دونوں کو ایک ہی درجہ کا حکم دیتے ہوئے ایک ہی لڑی میں پرویا ہے، جب کہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ قرآن میں لحن (غلطی کرنا) کرنا بالاتفاق تمام مسلمانوں کے نزدیک حرام ہے۔

② محققِ شاطبی کا قول

علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ جو مالکیہ کے بلند پایہ علماء میں سے ہیں، اپنی کتاب "الموافقات" (ج ۲ ص ۴۴، ۴۵) میں زیرِ عنوان "ترجمۂ قرآن کی ممانعت" لکھتے ہیں: "اس لحاظ سے کہ الفاظ، معانی پر دلالت کرتے ہیں، لغتِ عرب میں بدو وجہ غور کیا جا سکتا ہے، پہلی صورت یہ ہے کہ الفاظ اور عبارات مطلق ہوں جو معانی پر دلالت کر رہے ہوں اور یہ دلالتِ اصلیہ ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ الفاظ اور عبارات مقید ہوں اور معانی اس قید کے خادم ہوں اور یہ دلالتِ تابعہ ہے۔ پہلی صورت ایسی ہے کہ اس میں تمام زبانوں کا اشتراک پایا جاتا ہے اور اسی پر تمام گفتگو کرنے والوں کے مقاصد منتہی ہوتے ہیں، کسی گروہ کی دوسرے سے جدا کوئی خصوصیت نہیں ہوتی، کیونکہ جب کوئی فعل وجود میں آتا ہے، مثلاً زید کا کھڑا ہونا، پھر کوئی بھی صاحب زبان، زید کے قیام کی خبر دینا چاہتا ہے تو اس کے لیے بغیر کسی تکلف کے اس کا یہ ارادہ آسان ہوتا ہے، اسی اعتبار سے پہلے لوگوں کے اقوال کی عربی زبان میں خبر دینا اور ان کے اقوال کو بیان کرنا ممکن ہوتا ہے، اور یہ بات ان لوگوں کے لیے بھی ممکن ہوتی ہے جو عربی زبان نہیں جانتے، اسی طرح اہل عرب کے اقوال واخبار کو بیان کرنا غیرِ عرب کے لیے ممکن ہوتا ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں۔

باقی رہی دوسری صورت تو وہ خبر دینے اور بیان کرنے کے اعتبار سے عربی زبان کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ اس لحاظ سے ہر خبر کئی امور کی متقضی ہوتی ہے جو یہ خبر دینے کے خادم ہوتے ہیں اور وہ امور خبر دینے والے مخبر عنہ (جیسے مذکورہ مثال میں زید) مخبر بہ (زید کا قیام) اور حال ومساق میں نفس خبر سے متعلق ہوتے ہیں، نیز اسلوبِ بیان جیسے وضوح وخفا، ایجاز واطناب وغیرہ سے بھی متعلق ہوتے ہیں۔ اور یہ بات اس طرح سے ہے کہ آپ ابتداء میں یوں خبر دیتے ہیں کہ "قَامَ زَيْدٌ" اب اگر اس موقع پر مخبر عنہ مراد نہ ہو بلکہ خبر دینا مراد ہو، اور آپ مخبر عنہ کے متعلق خبر دینا چاہیں تو آپ یوں کہیں گے "زَيْدٌ قَائِمٌ" اور آپ کسی سوال کے جواب یا اس کی حالت کو ٹھیک طور پر بیان کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے "اِنَّ زَيْدًا قَامَ" اور جب کوئی زید کے قیام کا منکر ہو تو اس کو یوں جواب دیں گے

"وَاللهِ اِنَّ زَيْدًا قَامَ "اور اگر اس کے قیام یا متوقع قیام کی خبر دینا مقصود ہو تو آپ یوں کہیں گے"قَدْ قَامَ زَيْدٌ" یا"زَيْدٌ قَدْ قَامَ "اور کسی منکرِ حکم پر نکتہ چینی کرنے کی غرض سے آپ کہیں گے"اِنَّمَا قَامَ زَيْدٌ" یہ ایسے تصرفات ہیں جن سے ایک ہی کلام کے معنی میں متناسب اختلاف واقع ہو جاتا ہے اور یہ مقصود اصلی نہیں ہوتا، بلکہ یہ بطور تکمیل وتتمہ ہوتا ہے۔ اس نوع میں ایسی طلب کے اضافہ سے کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے جبکہ اس میں کوئی ناگوار امر موجود نہ ہو۔ اسی دوسری نوع کی وجہ سے قرآنِ مجید کی عبارتوں اور بہت سے قصوں میں اختلاف ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ بعض سورتوں میں قصہ بیان کرتے ہوئے ایک انداز پر آتے ہیں تو دوسری سورتوں میں دوسرے انداز پر اور تیسری میں تیسرے پر، اس طرح جو کچھ بھی اخبار سے اس ضمن میں ثابت ہوتا ہے وہ پہلی نوع کے لحاظ سے نہیں، الا یہ کہ بعض سورتوں میں کچھ تفصیلات سے خاموشی ہو اور دوسری سورتوں میں وضاحت ہو، اور یہ بھی موقع وحال کے تقاضے کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ "تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے"۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو جو شخص پہلی صورت کا اعتبار کرے گا تو اس کے لئے اس صورتِ حال میں عربی کلام سے کسی غیر عربی کلام میں ترجمہ کرنا ممکن نہ رہے گا چہ جائیکہ قرآنِ حکیم کا ترجمہ کیا جائے اور اسے کسی دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔ مگر اس صورت میں کہ دونوں زبانوں کا اعتبار بالکل ایسا ہی فرض کر لیا جائے جیسے وہ استعمال میں برابر ہوں۔ جیسا کہ اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے۔ جب یہی چیز عربی زبان کے ساتھ ساتھ نقل ہونے والی زبان میں بھی ثابت ہو جائے تو ایک زبان کا ترجمہ دوسری میں ممکن ہو جائے گا، جبکہ اس کا اثبات وضاحت کردہ سبب کی بناء پر مشکل ہے۔ متقدمین میں سے مناطقہ نے ان میں سے اکثر امور کی طرف اشارہ کیا ہے جبکہ متاخرین نے ان کو اختیار کیا ہے، تاہم وہ ناکافی ہے اور اس موقع پر بے نیاز نہیں کر سکتا۔

ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی دوسری وجہ کی بناء پر قرآن کا ترجمہ کرنے کے امکان کی نفی کی ہے، البتہ پہلی وجہ کی بناء پر یہ ممکن ہے، اس اعتبار سے عوام الناس کے لیے قرآن کی تفسیر اور اس کے معانی کی وضاحت کرنا درست ہے جن کے فہم کی رسائی قرآن کے معانی تک نہ ہو سکتی ہو۔ اہل اسلام کے ہاں یہ بالاتفاق درست ہے اور یہ اتفاق اصلی معنی پر ترجمہ کے صحیح ہونے کے بارے میں حجت ہے۔ (یہ ہم نے علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول کچھ تصرف واختصار سے نقل کیا ہے)۔

علماء لکھتے ہیں کہ ان کا یہ کلام انتہائی مدلل اور بحث بہترین توجیہ پر مشتمل ہے۔ آپ بڑے محقق، جلیل القدر عالم، اصولی اور صاحب فراست ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کا مذکورہ قول اس پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے کہ قرآن کے صرف معانی اصلیہ کو نقل کرنا ممکن ہے، دوسرے معانی تابعہ کو نقل کرنا ممکن نہیں۔ بناء بریں معلوم ہوا کہ ان کا ترجمہ قرآن کے لفظ کا اطلاق صرف ان معانی اصلیہ پر ہے جو کہ محض ایک لغوی اطلاق ہے جو قابل اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ہم اس کی دعوت دیتے ہیں اور اس پر حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اگرچہ اس پر بھی کچھ تحفظات ہیں جیسا کہ ماقبل میں گزر چکا ہے۔

لیکن قرآن کا ترجمہ عرفی وہ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کی قطعاً مراد نہیں ہے۔ نہ وہ قرآن کے بارے میں اس کے قائل ہیں اور نہ ہی دیگر ادبی نصوص کے بارے میں۔ ہمارے اس پر پانچ دلائل ہیں، جنہیں ہم بیان کرتے ہیں:

پہلی دلیل ۞ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے صریح الفاظ میں یہ بات کہی ہے"جب یہ بات ثابت ہوگئی تو جو شخص پہلی صورت کا اعتبار کرے گا تو اس کے لیے اس صورتِ حال میں عربی کلام سے کسی غیر عربی کلام میں ترجمہ کرنا ممکن نہ رہے گا، چہ جائیکہ قرآنِ کریم کا

ترجمہ کیا جائے اور اسے کسی دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔"

دوسری دلیل ۞ انہوں نے امام ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے یہ بات نقل کی کہ انہوں نے اس دوسری وجہ کی بناء پر ترجمہ قرآن کے امکان کی نفی کی ہے، پھر مذکورہ توجیہ کی بناء پر اس نفی کو برقرار رکھا۔

تیسری دلیل ۞ علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ مالکی المذہب ہیں، اور مالکیہ ترجمہ کی ممانعت کے حوالے سے سب سے زیادہ سخت ہیں، جیسا کہ آپ کو ان حضرات کی سابقہ عبارتوں سے معلوم ہوا ہوگا۔

چوتھی دلیل ۞ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کو ترجمہ قرآن کی بحث کے دوران کچھ تردّد ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض ایک بحث کا ذکر کر رہے ہیں، انہوں نے اپنے مذہب کے خلاف کوئی قطعی رائے نہیں دی ہے۔ باقی رہا حکم ترجمہ کا، وہ تو مسلم ہے۔ ان کے تردّد پر دلیل ان ہی کی مذکورہ کتاب "الموافقات" کی دوسری جلد کے صفحہ نمبر ۶۳ پر یہ عبارت ہے: "جب کلام کے معنی پر دلالت کے لحاظ سے دو پہلو ثابت ہو گئے، تو ضروری ہے کہ اس بحث میں اس انداز سے غور کیا جائے کہ اس سے احکام مستفاد ہوں، اس بات کے لیے کیا اصلی معنی والا پہلو ہی مختص ہے یا دونوں پہلو ایک ساتھ عام ہیں؟ اصلی معنی کے پہلو کا معاملہ تو یہ ہے کہ احکام پر دلالت کے اعتبار سے اس کی صحت میں مطلقاً کوئی اشکال نہیں، نہ کسی حال میں اس سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ رہا تبعی معنی کا پہلو اور اس سے احکام کا استفادہ کا معاملہ تو یہ محلِ تردّد ہے، کیونکہ دونوں فریقوں کے پاس اس پر غور کرنے کے دلائل موجود ہیں۔ (دونوں کے دلائل بیان کرنے کے بعد) فرماتے ہیں: "اس مسئلہ میں دلائل کا تعارض واضح ہو چکا اور معلوم ہو گیا کہ ہر دو جہات سے مانعین کی جہت ہی زیادہ قوی ہے، اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ دوسری جہت جو کہ تبعی معنی پر دلالت کرتی ہے، اس کی کسی زائد شرعی حکم پر دلالت نہ ہو۔ لیکن اس میں ایک بحث باقی رہ جاتی ہے کہ بعض اوقات پتہ چل جاتا ہے کہ یہ جہت، اصلی معنی سے زائد معنی پر دلالت کر رہی ہے اور وہ زائد معنی آدابِ شرعیہ اور اخلاقِ حسنہ کو اپنانا ہے، لہٰذا دوسری جہت بھی دلالت سے مطلقاً خالی نہیں ہوئی، ایسی صورت میں مطلق منع ہونے کی بناء پر بحث میں اشکال واقع ہو جاتا ہے۔" (مختصراً)

کیا آپ نے ان کے تردّد کو ملاحظہ کیا؟ پھر غور کیا کہ ان سے تطبیق دینے میں کیسے خطا سرزد ہوئی کہ وہ اس جزم کے ساتھ بات نہ کر پائے جس طرح ہم نے اسلام کی انواعِ ہدایت سے استفادہ کرنے کو جزم سے ذکر کیا ہے کہ ان کا تعلق قرآنِ کریم کے ثانوی اور تبعی معانی سے ہے، جیسا کہ ہم تفصیل سے پہلے بیان کر آئے ہیں اور اس کی امثلہ بھی ذکر کر آئے ہیں۔

پانچویں دلیل ۞ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الموافقات" (ص ۴۲) پر لکھا ہے کہ: قرآنِ کریم، عرب کی زبان میں نازل ہوا ہے، لہٰذا اس کے فہم کی طلب بھی صرف اسی طریق سے ہوگی۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ: "لہٰذا جو شخص قرآن کا فہم حاصل کرنا چاہتا ہو تو وہ عرب کی زبان سے ہی اسے سمجھے گا، اس جہت کے علاوہ اور کوئی طریقہ اس کے فہم کا نہیں ہے۔"

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی نظر میں قرآن کا ترجمہ اپنی تمام ہدایات و مقاصد کو حاوی نہیں ہو سکتا اور فہمِ قرآن کا ایک راستہ ہے کہ وہ شخص، قرآن اور اس کی زبان کی طرف رجوع کرے اور اسے عربی زبان کے مقرر کردہ قواعد و اسالیب کے مطابق پڑھے، ظاہر ہے کہ عموماً یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب اسے اس زبان کے علوم میں کامل مہارت حاصل ہو جائے۔

③ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "المستصفی (ج ۱ ص ۱۶۹) میں یہ عبارت ہے: "عالم کے لیے حدیث کی روایت بالمعنی کے جواز پر ائمہ کرام کا وہ اجماع دلالت کرتا ہے جو کہ عجمیوں کے لیے ان کی زبان میں شرع متین کی تشریح وتوضیح کے جواز پر ہوا ہے، تو جب عربی زبان کو اس کے مرادف عجمی زبان میں تبدیل کرنا جائز ہوا تو عربی زبان کا اس کے مرادف اور مساوی عربی زبان میں تبدیل کرنا بطریقِ اولیٰ جائز ہوگا۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفراء دیگر علاقوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کو وہاں کے لوگوں کی زبان میں پہنچایا کرتے تھے، اس لیے کہ الفاظ سے اصل مقصود معانی کا فہم اور اسے خلقِ خدا تک پہنچانا ہے، الفاظ کی حیثیت تشہد اور تکبیر کی طرح کوئی امر تعبدی نہیں ہوتی۔"

علماء لکھتے ہیں کہ: مذکورہ عبارت، قرآن اور سنت دونوں کو شامل ہے، کیونکہ یہ دونوں شریعتِ مطہرہ کی اساس و بنیاد ہیں، لہٰذا اس صورت میں دونوں کا ترجمہ کرنا جائز ہوگا۔ اس جواز میں کتاب اللہ، سنت کی طرح ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چند وجوہ کی بناء پر درست نہیں ہے:

① اس موقع پر انہوں نے جو اجماع ائمہ نقل کیا ہے۔ جبکہ سب جانتے ہیں کہ ترجمۃ القرآن کے جواز پر کبھی بھی اجماع منعقد نہیں ہوا ہے، بلکہ قریب قریب عدمِ جواز پر منعقد ہوا ہے، جیسا کہ ابھی گزرا۔

② امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقعِ استدلال پر جن سفراء صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا ہے، انہوں نے عجمیوں کے لیے قرآن کا ترجمہ نہیں کیا ہے، اگر ترجمہ کیا ہوتا تو تواتر کے ساتھ ضرور منقول ہوتا، کیونکہ اس کے نقل وتواتر پر دواعی اور اسباب موجود ہیں۔ انہوں نے تو صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اسلام کے احکام کا ترجمہ کیا ہے جیسا کہ خود امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

③ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے خود مذکورہ سطور میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ الفاظ امر تعبدی نہیں ہیں، ورنہ روایت بالمعنی جائز نہ ہو، اس بناء پر تو بطریقِ اولیٰ ترجمہ کرنا جائز نہ ہونا چاہیے، کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم کے الفاظ بالاجماع امر تعبدی ہیں، لہٰذا اسے بالمعنی روایت کرنا جائز نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کا ترجمہ کرنا درست ہے۔

④ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الوجیز" (ص ۲۶، ۲۷) کی عبارت تو کتب شافعیہ کی نصوص کے مطابق ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "فاتحہ کا ترجمہ فاتحہ کے قائم مقام نہیں ہوسکتا اور عربی زبان سے عاجز شخص کے لیے اس کا ترجمہ پڑھ لینا کافی نہیں ہے۔" جبکہ ان کی کتاب "الجام العوام" (ص ۱۴-۱۷) پر عبارت ایسی ہے کہ اس میں وہ متشدد لوگوں کا طریق اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور حدیث میں مذکور متشابہ الفاظ کو اپنے اصل معانی پر رکھنا ضروری ہے اور ان کے بارے میں سکوت اختیار کرنا اور قرآن کے الفاظ کو بھی غیر عربی میں پڑھنا ٹھیک نہیں ہے۔"

ترجمۃ القرآن کے بارے میں جامعہ ازھر کا مؤقف

چند سال سے جامعہ ازھر نے پورے اہتمام سے ترجمۃ القرآن کے موضوع پر بحث کی ہے، طویل بحث وگفتگو کے بعد یہ ہوا کہ جامعہ ازہر کے اکابر علماء نے تفسیر قرآن کے لیے ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا، چنانچہ عملی طور پر وہ کمیٹی بنی بھی جو کہ ازھر کے جید علماء اور وزارتِ معارف کے رجال کار پر مشتمل تھی تاکہ وہ ترجمۂ قرآن کی تمہید کے طور پر قرآن کریم کی دقیق عربی تفسیر لکھ سکیں جو کہ اس فنی اور منتخب کردہ کمیٹی کے زیر نگرانی کام کرے چنانچہ اس تفسیر کمیٹی کے کئی بار علامہ مفتی اعظم مصر کی

زیر سرپرستی اجتماعات بھی ہوئے، جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کمیٹی نے ایک دستور وضع کیا جس کا انہوں نے اپنے اس عظیم کام میں التزام بھی کیا، پھر اس دستور کو مختلف اطراف میں اکابر علماء اور اسلامی جماعتوں کے پاس بھیجا بھی گیا، تا کہ اس دستور کے متعلق ان کی آراء سے بھی آگاہی ہو سکے اور اس عربی تفسیر پر حتی الامکان اتفاقِ رائے حاصل کیا جا سکے۔ نیز وہ دستور، حزم و احتیاط پر بھی مشتمل تھا جس سے مقصد اس عظیم ہدف کو حاصل کرنا تھا۔ ہم آپ کے سامنے اس دستور کے ضوابط و دفعات پیش کرتے ہیں، تا کہ ہمارے ظاہر کردہ سابقہ تحفظات میں آپ اس کو بھی شامل کر سکیں۔ لیجئے! اس دستور کے قواعد و ضوابط جو مجلۃ الازھر (ج ۷ ص ۶۴۸، ۶۴۹) پر شائع ہوئے:

① حتی الامکان وہ تفسیر، علمی مباحث و اصطلاحات سے خالی ہو، الا یہ کہ کسی آیتِ قرآنی کے فہم میں اس کی ضرورت ہو تو الگ بات ہے۔

② اس تفسیر میں سائنسی نظریات کا ذکر نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً رعد و برق والی آیت میں رعد و برق کی سائنسی تفسیر سے گریز کیا جائے گا۔ اسی طرح جن آیات میں آسمان اور ستاروں کا ذکر ہے، ان کی تفسیر میں اہل فلکیات کی آراء کا ذکر نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ ان آیات کی تفسیر، الفاظِ قرآنی کی دلالت کے مطابق کی جائے گی، اور عبرت و ہدایت کی آیات کی خوب توضیح کی جائے گی۔

③ اگر کسی مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں تفصیلی بحث کی ضرورت پیش آئے تو کمیٹی اسے تفسیر کے حاشیہ میں لکھے گی۔

④ کمیٹی بھی الفاظ کے ان ہی معانی کو سامنے رکھے گی جو آیت کریمہ کا مدلول ہوگا، اس سلسلہ میں کسی متعین فقہی مذہب کی پابندی نہیں کرے گی حتیٰ کہ کلامی مذاہب وغیرہ میں سے بھی کسی کی پابندی نہیں کرے گی، اسی طرح معجزات پر مشتمل آیات اور آخرت وغیرہ کے امور میں بھی کسی تکلف کو اختیار نہیں کرے گی۔

⑤ قرآنِ حکیم کی تفسیر، قراءتِ حفص کے مطابق ہوگی، سوائے ضرورت کے کسی دوسری قراءت کی تفسیر نہیں کی جائے گی۔

⑥ آیات اور سورتوں کے باہمی ربط و تعلق کے سلسلہ میں تکلف اختیار کرنے سے اجتناب کیا جائے گا۔

⑦ بحث و جستجو کے بعد صحیح ثابت ہونے والے اسبابِ نزول ذکر کئے جائیں گے۔ نیز جو فہمِ آیات میں معاون ثابت ہوں ان ہی کو ذکر کریں گے۔

⑧ جب ایک ہی موقع اور مقام سے متعلق کوئی ایک آیت یا کئی آیات ہوں تو تفسیر کرتے وقت ایک وہ آیت اور کئی آیات مکمل طور پر ذکر کی جائیں گی۔ اس کے بعد انتہائی احتیاط سے الفاظ کے معانی تحریر کیے جائیں گے، پھر واضح اور صاف عبارت میں اس آیت یا آیات کی تفسیر ذکر کی جائے گی۔ اور مناسب موقع پر سببِ نزول، ربطِ آیات اور آیات سے اخذ کردہ احکام لکھے جائیں گے۔

⑨ کوشش کی جائے کہ نسخ آیات کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے۔ الا یہ کہ آیات میں جمع و تطبیق ناممکن ہو جائے۔

⑩ ہر سورت کے آغاز میں کمیٹی اس کے بارے میں جس تحقیق پر پہنچے کہ آیا یہ سورت مکی ہے یا مدنی؟ اس کا ذکر کرے گی، نیز یہ کہ مکی سورت ہے تو اس میں مدنی آیات کون کون سی ہیں، اسی طرح اس کے برعکس کہ مدنی ہے تو مکی آیات کون کون سی ہیں؟

⑪ شروع میں ایک مقدمہ تفسیر لکھا جائے جس میں قرآن کا تعارف دیا جائے، نیز قرآن جن فنون و معارف پر حاوی ہے جیسے دعوت الی اللہ، احکامات، قصص و واقعات، علم جدل وغیرہ، ان کو بھی بیان کیا جائے، نیز کمیٹی کو اس مقدمہ میں اپنا منہج تفسیر بھی ذکر کرنا چاہیے۔

طریقہ تفسیر بعدازاں کمیٹی کی رائے ہوئی کہ تفسیر قرآن کے طریقہ کے بارے میں چند خاص قواعد وضوابط وضع کیے جائیں، ہم ذیل میں ان کا ذکر کرتے ہیں:

① کمیٹی اسبابِ نزول اور تفسیر ماثور کی تحقیق کر کے ان روایات کی چھان بین کرے گی، پھر ان میں صحیح مرویات کو تفسیر میں درج کرے گی، اس کے ساتھ قوی کے قوی ہونے اور ضعیف کے ضعف کی وجہ بھی بیان کرے گی۔

② نیز کمیٹی، قرآنِ کریم کے مفردات کی لغوی تحقیق اور تراکیبِ قرآنی کے خصائص کی بلاغی تحقیق مرتب کر کے اسے بھی تفسیر میں درج کرے گی۔

③ اسی طرح کمیٹی، تفسیر بالرائے اور تفسیر بالماثور دونوں طرح کے مفسرین کرام کی چھان بین کر کے مختار قول کے مطابق آیتِ قرآنی کی تفسیر کرے گی، اس کے ساتھ ساتھ مردود کے رَد اور مقبول کے قبول کرنے کی وجہ بھی بیان کرے گی۔

④ اس کے بعد وہ تفسیر اس طرح تیار ہو کہ سابقہ تمام قواعد کا اس میں لحاظ کیا گیا ہو، نیز اس تفسیر کا اسلوب تمام سیکھنے والوں کے اذھان کے انتہائی مناسب ہو، ہر طرح کے تصنع وتکلف اور پیچیدگی سے خالی ہو۔

خلاصہ بحث اب یہ اہم حقائق کی بحث ختم ہوتی ہے، میرا خیال ہے کہ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو اس موضوع سے متعلق اختلاف کرنے والے لوگوں کا اختلاف ختم ہوسکتا ہے یا کم ازکم لفظی اختلاف کی حد تک قرار دیا جا سکتا ہے جس میں نزاع وجدل کا کوئی موقع نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ ترجمۃ القرآن خواہ ترجمہ لفظی ہو یا ترجمہ تفسیری، عربی یا غیر عربی زبان میں اس کی تفسیر کرنے کے مغایر ہے، اور قرآن کی تفسیر، غیر عربی زبان میں کرنا، قرآنِ کریم کی عربی تفسیر کے مساوی ہے۔ اور قرآنِ حکیم کا عام معنیٰ عرفی کے اعتبار سے ترجمہ کرنے کے لیے لازمی ہے کہ وہ قرآن کے تمام معانی ومقاصد کو حاوی اور مشتمل ہو۔ خواہ وہ ترجمہ لفظی ہو یا تفسیری۔ اور ترجمہ لفظی اور تفسیری میں فرق صرف ایک شکل اور صورت کا ہے، وہ یہ کہ پہلے میں اصل معنیٰ کی ترتیب ونظم کا لحاظ رکھا جاتا ہے جبکہ دوسرے میں ایسا نہیں ہوتا۔ اور "ترجمۃ القرآن" ایک مشترک لفظی ہے جو چار معانی کے لیے موضوع ہے۔ ایک تو وہ جس کے جواز پر اتفاق ہے یعنی ترجمہ بمعنی تبلیغ الفاظ اور ترجمہ بمعنی قرآن کی تفسیر عربی زبان میں اور ایک وہ جس کے عدمِ جواز پر اتفاق ضروری ہے، یعنی ترجمہ بمعنی نقل قرآن بطرف اجنبی زبان (غیر عربی زبان)۔ ساتھ ساتھ تمام معانی ومقاصد قرآن کا احاطہ۔ اور اسی طرح ایک معنیٰ وہ ہے جس میں اختلاف ہے، جبکہ ادلہ اس کے جواز کے مؤید ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ترجمہ بمعنی غیر عربی زبان میں قرآن کی تفسیر کرنا اور اس کے ساتھ ترجمہ وتفسیر کی تمام شرائط بھی موجود ہوں، علاوہ ازیں اس پر ہمارے اور تفسیر کمیٹی کے ظاہر کردہ وہ تحفظات بھی ہیں جن کا اس سے پہلے ذکر ہوا ہے۔

یہاں پر موضوع کی مناسبت سے علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ عبارت مجھے بہت پسند آئی جو انہوں نے اپنی کتاب "البحر المحیط" میں ذکر کی ہے، اس بحث کے اختتام پر ہم وہ عبارت قارئینِ کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں:۔

مسئلہ "قرآن کا ترجمہ فارسی یا دیگر زبان میں کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اسے اسی ہیئت وشکل میں پڑھنا ضروری ہے جس سے اس کا اعجاز متعلق ہے، کیونکہ ترجمہ اس کے ادا کرنے سے قاصر ہے، دیگر زبانیں قرآن کے اس بیان وفصاحت کو ذکر کرنے سے عاجز وبے بس ہیں جو صرف اس کی خصوصیت ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝﴾ (الشعراء: ۱۹۵) اس کی وجہ یہی ہے کہ

قرآن، اپنے اسلوب اور نظم کی وجہ سے چیلنج کرنے والا ہے، جب اس قرآن کی قراءت، عربی تفسیر میں جائز نہیں تو دیگر زبان میں اس کا ترجمہ کرنا بطریقِ اولیٰ ناجائز ہونا چاہیے، اسی لیے امام قفال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے: "میرے نزدیک یہ ہے کہ کوئی شخص فارسی زبان میں قرآن پیش کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، ان سے پوچھا گیا تو پھر کوئی قرآن کی تفسیر بھی نہیں کر سکتا؟ فرمایا: کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ اس موقع پر ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بعض مرادات کو پیش کر سکے اور بعض سے عاجز آ جائے، لیکن جب قرآن کو فارسی میں پڑھنا چاہے گا تو ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی تمام مرادات کو پیش کر سکے۔"

دیگر علماء نے ترجمہ وتفسیر میں فرق کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ زبانوں کی باہمی تفسیر کی جا سکتی ہے، کیونکہ "تفسیر" نام ہے حاجت وضرورت کی خاطر اپنے مافی الضمیر معانی کو بیان کرنا۔ جبکہ "ترجمہ" ایک لفظ کی جگہ دوسرا ایسا لفظ لانا جو مفہوم معنی میں اس کے قائم مقام ہو اور سامع ان الفاظ کو معتبر جانے، گویا کہ "ترجمہ" میں سامع کے فہم کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اور "تفسیر" میں مترجم کا اپنے فہم کو سامع کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے اور یہ بہت عمدہ فرق ہے۔

احسن اللہ لنا الخاتمۃ و جمعنا جمیعًا علی الحق والرشد، و جعلنا ممن یستمعون القول فیتبعون احسنہ. ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِکَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾ (الزمر: ۱۸)

بحث ⑭

نسخ کی بحث

موضوع کی اہمیت

اس بحث وموضوع کی بچند وجوہ خاص اہمیت ہے:

① نسخ کی بحث طویل بھی ہے، کثیر متفرعات پر بھی مشتمل ہے، نیز اس بحث میں مختلف مسالک ومذاہب بھی ہیں۔

② نسخ کی بحث ایسے دقیق مسائل پر مشتمل ہے جن میں علمائے اصول باہم معرکۃ الآراء ہیں۔ اسی وجہ سے اس امر کی ضرورت ہے کہ اس موضوع سے متعلق بحث وکرید کی جائے اور منصفانہ انداز میں کسی بہتر رائے اور قول کا انتخاب کیا جائے۔

③ منکرین دین، مستشرقین اور دیگر اعدائے اسلام شریعتِ اسلامی کی اس بحثِ نسخ کو زہر آلود ہتھیار بنا کر اس کے ذریعہ دین حنیف کے سینے پر وار کرتے ہیں اور قرآنِ کریم کے تقدس کو پامال کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شبہات کو اس کے ذریعہ مستحکم کیا اور لوگوں میں اپنے مطاعن کو خوب پھیلایا، حتیٰ کہ بعض علم ودین سے منسوب مسلمانوں کی عقلوں کو سحر زدہ کر دیا چنانچہ وہ نسخ کے وقوع کے انکاری ہونے لگے، حالانکہ احکام میں نسخ واقع ہوا ہے، اور وہ اس کے انکار کے لیے دُور از کار تاویلیں اور بے سروپا باتیں بنانے لگے۔

④ ناسخ ومنسوخ کی واقفیت سے اس شرعی حکم کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کی حکمت سے آگاہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ کس طرح مخلوق کی تربیت، نوعِ بشر کی تدبیر اور لوگوں کی آزمائش کرتا ہے، جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اس طرح کے قرآنِ حکیم کا مصدر اور اس طرح کے حکم کا منبع نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ محض حکیم وحمید ذات (اللہ جل جلالہٗ) کی جانب سے نازل کردہ ہے۔

⑤ ناسخ ومنسوخ کی معرفت، صحیح احکام کے جاننے اور اسلام کے فہم کے لیے ایک عظیم رکن کا درجہ رکھتی ہے، خاص طور سے جب ادلہ متعارض ہوں تو ناسخ ومنسوخ اور سابق ولاحق کی معرفت سے ہی وہ تعارض دُور ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے سلفِ صالحین اس پہلو پر خاص توجہ دیتے اور اس علم میں کامل دسترس حاصل کرتے تھے، نیز دوسروں کو بھی اس کی ترغیب اور اس پر متوجہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ ﴿وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ (البقرہ: ۲۶۹) میں لفظ ﴿حِكْمَة﴾ کی تفسیر، قرآن کے ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ، مقدم ومؤخر اور حلال وحرام کی معرفت کے سبب کی ہے۔ نیز مروی ہے کہ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک آدمی لوگوں کو ڈرا رہا ہے، پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ لوگوں کو تذکیر ووعظ کر رہا ہے، فرمایا کہ نہیں، یہ لوگوں کو نصیحت نہیں کر رہا، بلکہ یہ کہتا ہے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں، اسے میرے پاس بھیجو، جب اس کو آپ کے پاس بھیجا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھ

کہ کیا تم ناسخ ومنسوخ کا علم رکھتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں، فرمایا کہ نکل جاؤ ہماری مسجد سے، اب یہاں لوگوں کو وعظ نہیں کرنا۔۔۔،
نیز مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک قصہ گو شخص کے پاس سے گزرے، اس سے پوچھا کہ کیا تم ناسخ ومنسوخ کی معرفت رکھتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں، آپ نے فرمایا کہ تو بھی ہلاک ہوا اور تو نے دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔ مطلب یہ کہ جب تک تو ناسخ ومنسوخ سے واقف نہیں ہوگا خود کو بھی معرضِ ہلاکت میں ڈالے گا اور دوسروں کو بھی ڈالے گا۔

ان بیان کردہ پانچ وجوہ کی بناء پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس بحث پر توجہ مبذول کریں اور اس بارے میں احتیاط کا طریق اختیار کرتے ہوئے وسعت کے موقع پر وسعت اور دیگر مواقع پر اعتدال کی راہ اختیار کریں۔

حسبنا اللہ و کفی و سلامٌ علی عبادہ الذین اصطفی

نسخ کیا ہے؟

لغوی مفہوم لغتِ عرب میں لفظ نسخ کا اطلاق دو معانی پر ہوتا ہے:

① کسی چیز کو زائل کرنا اور معدوم کرنا۔ جیسے فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ﴾ (الحج: ۵۲)

"اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی بھی ایسا رسول اور نبی نہیں بھیجا کہ جس نے جب کوئی تمنا کی ہو اور شیطان نے اس کی تمنا میں کچھ آمیزش نہ کی ہو، پھر اللہ، شیطان کی آمیزش کو دور کر کے اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے۔"

اسی طرح اہل عرب کا قول ہے: "نسخت الشمس الظل" اور "نسخ الشیب الشباب" نیز "تناسخ القرون والزمان" (یہ سب ازالہ اور عدم کے معنی میں آتے ہیں)۔

② کسی چیز کو اپنی ذات میں باقی رکھتے ہوئے آگے نقل کرنا۔ امام لغت امام سجستانی رحمہ اللہ اس کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ "نسخ" کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی کا چھتے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا۔ اسی طرح تناسخ المواریث کہتے ہیں میراث کا ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہونا، نیز تناسخ الانفس کہتے ہیں نفس کا ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل ہونا۔ جیسا کہ بعض لوگ اس کے قائل ہیں۔ اور نسخ الکتاب کا لفظ بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ اس میں بھی نقل کی مشابہت موجود ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (الجاثیہ: ۲۹) "یعنی ہم تمہارے اعمال لکھ لیا کرتے تھے۔"

اس آیت میں نسخ سے مراد اعمال کا صحیفوں میں نقل کرنا ہے۔

اس کے بعد علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ لفظ نسخ جس معنی کے لیے وضع کیا گیا ہے وہ متعین طور پر کون سا معنی ہے؟

بعض نے کہا کہ لفظ نسخ دونوں معانی کے لیے وضع اوّلی کے اعتبار سے وضع کیا گیا ہے، اس بناء پر لفظِ نسخ مشترک لفظی ہوگا، یعنی لفظِ نسخ کے اطلاق سے دونوں معانی کا ایک ہی نسبت سے بظاہر معلوم ہونا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ لفظِ نسخ معنی اوّل کے لیے بے حقیقت اور معنی ثانی کے لیے مجاز ہے۔ جبکہ بعض حضرات اس کا برعکس کہتے ہیں، اور بعض کے نزدیک دونوں معانی میں قدرِ مشترک کے طور پر وضع کیا گیا ہے، لیکن یہ آخری آراء دلیل کی محتاج بھی ہیں اور تاویل وتکلف سے خالی بھی نہیں ہیں۔

اصطلاحی مفہوم

علماء کی اصطلاح میں "نسخ" کی بہت سی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، ان سب کو پیش کرنے میں کوئی مصلحت معلوم نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے باہمی موازنہ اور نقد وجرح کی کوئی ضرورت سمجھ میں آتی ہے۔ سب کی اصل غرض شریعت کی زبان میں نسخ کی حقیقت کو اُجاگر کرنا ہے، ہم صرف ایک تعریف پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں جسے ہم زیادہ قریب اور زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں اور وہ ہے "رفع الحکم الشرعی بدلیل شرعي" یعنی ایک شرعی حکم دوسرے شرعی حکم سے اُٹھالینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حکم شرعی کا افعال مکلفین سے تعلق ختم کرنا ہے، نہ یہ کہ خود اس حکم کو اٹھالیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ امر واقع ہے اور واقع امر مرتفع نہیں ہوا کرتا۔ اور حکم شرعی سے مراد ہے اللہ کا وہ خطاب جو افعال مکلفین سے متعلق ہوتا ہے خواہ طلب کے طور پر ہو یا روک دینے کے اعتبار سے ہو یا اختیار دینے کے طریقہ پر ہو، یا کوئی چیز سبب یا شرط یا مانع یا صحیح یا فاسد ہونے کے طور پر ہو۔ اور دلیل شرعی سے مراد اللہ کی وحی مطلق ہے خواہ متلو ہو یا غیر متلو، پس یہ کتاب اور سنت دونوں کو شامل ہوگا، باقی اجماع اور قیاس کے نسخ کے بارے میں مستقل بحث ہے جو اپنی جگہ پر آئے گی۔

تعریف میں ہمارا قول "رفع" بمنزلہ جنس کے ہے، اس قید سے وہ چیز تعریف سے خارج ہوگئی جس میں رفع نہ ہو جیسے تخصیص، کیونکہ اس میں حکم رفع نہیں بلکہ بعض افراد پر محصور ہو جاتا ہے، نسخ اور تخصیص میں فرق عنقریب آرہا ہے، انتظار کیجئے۔ اور نسخ کی تعریف میں ہمارا قول "الحکم الشرعی" بمنزلہ قیدِ اوّل کے ہے۔ اس قید سے شریعت میں عبادات کے وجوب کی ابتداء تعریف سے خارج ہو جائے گی، کیونکہ اس سے عقل کا حکم ذمہ داری سے رفع ہو جاتا ہے جیسے وجوب صلوٰۃ کا حکم، انسان کے براءتِ ذمہ کے لیے رافع ہے۔ شرعی حکم کے آنے سے قبل کا معاملہ بھی اس میں داخل ہے، اس کے باوجود اس کو نسخ نہیں کہا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ براءت ایک حکمِ عقلی ہے نہ کہ شرعی، یعنی یہ ایسا حکم ہے کہ اس پر عقل دلالت کرتی ہے حتیٰ کہ شریعت کے آنے سے قبل بھی، اور اس کے حکمِ عقلی ہونے میں کوئی قدغن نہیں کہ شریعت اس کی تائید کرتی ہے، جیسے فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝۱۵﴾ (بنی اسرائیل:۱۵)

"ہم عذاب نہیں دیتے جب تک کہ کوئی رسول نہ بھیج دیں۔

اور تعریفِ نسخ میں ہمارا قول "بدلیل شرعی" بمنزلہ قید ثانی کے ہے، اس سے وہ شرعی حکم تعریف سے خارج ہو جاتا ہے جسے دلیل عقلی سے رفع کیا گیا ہو، جیسا کہ انسان سے اس کی موت، جنون اور مدہوشی کے سبب تکلیفِ شرعی کا ساقط ہونا، کیونکہ ان اسباب میں سے کسی سبب کی وجہ سے تکلیف کا سقوط ایسا ہے کہ اس پر عقل دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ میت، مجنون اور مدہوش انسان، خطاب الٰہی کو نہیں سمجھتے کہ ان پر تکلیف شرعی کو لاگو کیا جائے، عقل، تکلیف کا فیصلہ ایسی صورت میں کرتی ہے جب انسان اس خطاب کو سمجھتا ہو، اللہ تعالیٰ جب عطا کردہ چیز کو لے لیتا ہے تو واجب کردہ امر کو ساقط کر دیتا ہے، اور اس دلیل کے عقلی ہونے میں کوئی قباحت

نہیں کہ شریعتِ مطہرہ نے اسے عزت بخشی ہے، جیسے ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((رفع القلم عن ثلاث عن النائم حتی یستیقظ، و عن الصبی حتی یحتلم، و عن المجنون حتی یفیق)).[1]

"تین لوگوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ سونے والے سے جب تک کہ بیدار نہ ہو، بچے سے جب تک کہ بالغ نہ ہو اور دیوانے سے جب تک کہ ہوش میں نہ آ جائے۔"

چار توجیہات

نسخ کی مذکورہ تعریف میں چار اہم نکات ہیں جن کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں: ① نسخ کی تعریف میں "رفع حکم" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخ کے ثبوت کے لیے دو امور کا ہونا ضروری ہے: (۱) دلیل شرعی کا اس رفع شدہ حکم شرعی سے مؤخر ہونا۔ (۲) ان دونوں دلیلوں کے درمیان حقیقی تعارض ہو کہ ان دونوں میں تطبیق ممکن ہی نہ ہو یا دونوں پر ایک ساتھ عمل نہ ہو سکتا ہو۔ جب پہلا امر منتفی ہو اور دلیل شرعی اس حکم سے مؤخر واقع نہ ہو تو یہ نسخ نہ ہوگا۔ جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ (البقرۃ: ۱۸۷) اس میں ﴿اِلَى الَّيْلِ﴾ حکم صوم کی غایت ہے کہ اس سے صوم کے حکم کی انتہاء معلوم ہوتی ہے کہ رات کے داخل ہوتے ہی اتمام صوم واجب ہو جاتا ہے لیکن اس انتہائے حکم پر دلالت کرنے والی غایت کو نسخ کا نام نہیں دیں گے، کیونکہ یہ غایت، حکم اوّل کی دلیل ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ﴾ سے متصل ہے، بلکہ مذکورہ غایت کو کلام کے معنی و مفہوم کے لیے بمنزلہ بیان وتتمہ اور ایک مدت یا شرط کے ساتھ مقدر قرار دیں گے۔ لہٰذا یہ رافعِ حکم نہ ہوگا، رافع تب بنتا جب دوسری دلیل حکم مطلق کے آنے کے بعد وارد ہوتی اور بغیر کسی قید وغیرہ کے باقی رہتی اور اس میں دوام ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے نسخ کی تعریف میں دلیل شرعی کو قیدِ تراخی کے ساتھ مقید بھی کیا ہے اور بعض نے اس بات کا اضافہ بھی کیا ہے کہ: "اس طریقہ پر کہ اگر وہ دلیل نہ ہو تو حکم اوّل باقی رہے"۔

آپ جان گئے ہوں گے کہ نسخ کی تعریف میں ان اضافات کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ لفظ "رفع" سے ہی ان دونوں امور کی تعبیر صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے۔

جب دوسرا امر منتفی ہو بایں صورت کہ دونوں دلیلوں کے درمیان تعارض حقیقی نہ ہو تو بھی یہ نسخ نہ ہوگا، کیونکہ نسخ ایک ضرورت ہے جس کی طرف رجوع اسی وقت کیا جاتا ہے جب حقیقی تعارض اس ضرورت کی متقاضی ہو، تاکہ اس حکم شرعی میں پیش آمدہ تعارض کو دُور کیا جا سکے جس کی شان یہ ہے کہ نہ اس کے آگے سے باطل آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، جب اس صورت میں حقیقی تعارض ہی نہیں تو نسخ کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ تعارض نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں دلیلوں پر عمل کرنا خواہ بطریق تاویل کیوں نہ ہو، اس سے بہتر ہے کہ ایک دلیل پر عمل کر لیا جائے اور دوسری کو ترک کر دیا جائے۔

اسی لیے امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "المستصفی" میں ان لوگوں کے اس خیال کی تردید کی ہے جو کہتے ہیں اور جن کا یہ وہم و خیال ہے کہ آیت کریمہ ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ (البقرۃ: ۲۸۲) اور اس حدیث کے درمیان تعارض ہے جس میں ایک آدمی کی گواہی مع قسم کے قبول کرنے کا ذکر آیا ہے، وہ لوگ اس میں تعارض کی بناء پر نسخ کے قائل ہوئے ہیں اور اس بارے

---

① رواہ البخاری فی کتاب الطلاق باب (۱۱)، و ابو داؤد فی الحدود (۱۷) و الترمذی فی الحدود (۱) و النسائی فی الطلاق (۲۱)، و ابن ماجۃ فی الطلاق (۱۵) والدارمی فی الحدود (۹) و احمد (۱/۱۱۶)

میں ظاہر آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اس آیتِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی کے سوا اور کوئی امر فیصلہ کے لیے قابل حجت نہیں ہے۔ حالانکہ ان کی یہ بات درست نہیں ہے، اس لیے کہ آیت ہذا سے معلوم ہوتا ہے کہ دو گواہ حجت ہیں اور ان دو گواہوں کے قول پر فیصلہ کرنا جائز ہے۔ لیکن کسی اور حجت کے ذریعہ فیصلہ کرنا درست نہیں، آیت اس پر دلالت نہیں کرتی کہ اس طرح آیت اور حدیثِ مذکور کے درمیان تعارض ثابت ہو جائے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی حکم بالاقرار کی طرح ہے۔ ایک حجت کا ذکر کرنا دوسری حجت کے وجود کو مانع نہیں ہوتا۔

۲) نسخ کی مذکورہ تعریف سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ نسخ صرف حکم کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور فی الواقع اور نفس الامر میں اسی طرح ہے، پھر علماء کا نسخ کو نسخِ تلاوت اور نسخِ حکم میں تقسیم کرنا محض وضاحت کی غرض سے ہے اور یہ تقسیم حقیقی نہیں بلکہ صُوری ہے۔ اس لئے کہ جس کو علماء نسخِ تلاوت کہتے ہیں وہ نسخ حکم ہونے سے خارج نہیں ہوتا، اس لیے کہ نسخِ تلاوت کا اصل معنی یہی ہے کہ اس آیت کا کوئی حکم منسوخ کر دیا گیا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کی محض ترتیل پر ثواب کا ملنا اور اس کے ذریعہ نماز کی صحت وغیرہ اُٹھالی گئی ہے۔

۳) نسخ کی مذکورہ تعریف کتاب اور سنّت دونوں میں پائے جانے والے نسخ کو شامل ہے، خواہ وہ سنّت قولی ہو یا فعلی، وصفی ہو یا تقریری، نیز خواہ وہ سنّتِ نبوی ہو یا قدسی، سب کو عام ہے۔ کیونکہ یہ تمام انواع بالفعل یا بالقوۃ وحی الٰہی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں لوگوں کے لیے ان سب کو قائم کیا ہے اور اللہ کے بندوں کے لیے اسے اسوۂ حسنہ بنایا ہے اور سب کو اس کی اتباع کا حکم دیا ہے لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ آنحضور ﷺ اپنی اُمت کے لیے ابتداءً یا نسخاً مشروع امور بغیر تصریحی یا تقریری وحی کے صادر فرماتے ہوں۔

کتاب اللہ کا کتاب اللہ کے ذریعہ نسخ کی مثال، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ﴾ (الاحزاب: ۵۲)

"اس کے بعد آپ کے لیے عورتیں حلال نہیں اور نہ یہ کہ آپ ان سے اور عورتیں تبدیل کریں۔"

یہ آیت کریمہ اس فرمانِ الٰہی کے ذریعہ منسوخ ہوئی:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الاحزاب: ۵۰)

"اے نبی! ہم نے آپ کے لئے آپ کی بیویاں حلال کر دیں جن کے آپ مہر ادا کر چکے ہیں۔ اور وہ عورتیں جو تمہاری مملوکہ ہیں جو اللہ نے آپ کو غنیمت میں دلوادی ہیں اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی اور اس مسلمان عورت کو بھی جو بلا عوض اپنے کو پیغمبر کو دے دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو نکاح میں لانا چاہے، یہ خالص آپ کے لیے ہے، نہ کہ اور مسلمانوں کے لئے۔"

اور سنّت کا سنّت کے ذریعہ نسخ کی مثال ((وضو مما مست النار)) والی حدیث کا منسوخ ہونا ہے پیغمبر ﷺ کے بکری کا گوشت تناول فرما کر وضو نہ کرنے سے۔

④ نسخ کی تعریف "رفع الحکم الشرعی" میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، اور اس کا فاعل مضمر ہے جو کہ اللہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں ناسخ اللہ کی ذات ہے۔ جیسا کہ اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہو رہا ہے:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ (البقرہ:۱۰۶)

"ہم جو کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بُھلا دیتے ہیں۔"

نیز اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ منسوخ حقیقت میں حکم مرتفع ہوتا ہے، کبھی حکم رافع پر بھی ناسخ کا اطلاق کیا جاتا ہے جیسے کہتے ہیں صومِ رمضان کا وجوب، صومِ عاشورہ کے لیے ناسخ ہے، اسی طرح دلیل نسخ پر بھی نسخ کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ کہتے ہیں کہ آیت مواریث نے والدین اور اقارب کے لیے وصیت والی آیت کو منسوخ کر دیا۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ وہ حدیث جس میں آنحضرت ﷺ کا بکری کا گوشت کھا کر وضو نہ کرنے کا ذکر ہے وہ ((وضو مما مست النار)) والی حدیث کے لیے ناسخ ہے وغیرہ ذلک۔

نسخ کے لیے چند ضروری امور

شاید آپ کو سابقہ گفتگو سے اس امر کا ادراک ہو گیا ہو کہ نسخ کے ثبوت کے لیے چار امور کا پایا جانا ضروری ہے ① منسوخ کا حکم شرعی ہونا ② رفعِ حکم کی دلیل کا دلیلِ شرعی ہونا ③ رافعِ حکم دلیل کا حکمِ اوّل سے مؤخر ہونا اور اس سے اس طرح متصل واقع نہ ہونا جس طرح قید، مقید سے اور تاقیت، مؤقت سے متصل ہوتی ہے۔ ④ دونوں دلیلوں کے درمیان تعارضِ حقیقی ہونا۔ یہ چار امور ہیں، نسخ کے تحقق کے لیے باتفاقِ جمہور علماء ان کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہاں پر چند اور شرائط بھی ہیں جن کے بارے میں اختلاف ہے، جیسے ناسخ قرآن کا قرآن ہونا اور ناسخ سنّت کا سنّت ہونا، نسخ کا منسوخ حکم کے بدل پر مشتمل ہونا، ناسخ کا منسوخ کے اس طرح مقابل ہونا جیسے امر، نہی کے اور مضیق، موسع کے مقابل ہوتا ہے۔ نیز جیسے ناسخ و منسوخ دونوں کا نصِ قطعی ہونا وغیرہ وغیرہ، اس کی تفصیل طویل ہو جائے گی، عنقریب اس کے متعلق ذکر ہو گا۔

نسخ اور بدا میں فرق

"بدا" باء کے فتح کے ساتھ، لغتِ عرب میں اس کا اطلاق دو قریب المعنی پر ہوتا ہے۔
(ا) خفا کے بعد ظہور جیسے فرمانِ باری ہے:

﴿وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ۝﴾ (الزمر:۴۷)

"اور اللہ کی طرف سے انہیں وہ پیش آئے گا جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔"

نیز فرمایا:

﴿وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا﴾ (الجاثیہ:۳۳)

"اور ان پر ان کے اعمال کی بُرائی ظاہر ہو جائے گی۔"

(ب) نئی رائے، جو پہلے موجود نہ ہو، سمجھ میں آنا اور سوجھنا۔ "القاموس" میں ہے: بدا له فی الامر بدوًا، و بداءً و بداةً، یعنی اس

کو اس بارے میں کوئی رائے معلوم اور سوجھی ہے۔ اسی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ﴾ (یوسف:۳۵)

"ان لوگوں کو نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی یوں سمجھ میں آیا کہ اسے ایک مدت تک قید کردیں۔"

ممکن ہے کہ قائلین بدا (اللہ ان کو رسوا کرے) کے لیے "بدا" کا یہ دوسرا معنی زیادہ مناسب اور ان کے مذہب کے موافق ہو۔ کیونکہ ان لوگوں سے جو عبارتیں اس سلسلہ میں منقول ہیں وہ اس دوسرے معنی کے اعتبار سے تو لائق عمل ہیں پہلے معنی کے لحاظ سے نامناسب ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے یہ لفظ "بدا" کا امام جعفر الصادق رحمہ اللہ کی طرف غلط منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

((ما بدا الله تعالٰی فی شیء کما بدا له فی اسماعیل)).

"یعنی اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کے بارے میں ایسا معلوم نہیں ہوا جیسا اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں ہوا۔"

بہرحال یہ لفظ "بدا" کے دو معنی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ یہ دونوں معانی، اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرنا محال اور غلط ہیں، کیونکہ اس سے سبقتِ جہل اور حدوثِ علم لازم آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے، کیونکہ اس عالم دنیا میں غور و تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی خالق و مدبر ہے جو ازل اور ابد سے وسیع، مطلق اور محیط علم سے متصف ہے کہ وہ سابقہ، موجودہ اور آئندہ پیش آمدہ احوال و واقعات سے پوری طرح باخبر ہے، اسی طرح اس فکر و تدبر کے نتیجہ میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نہ تو حادث ہوسکتی ہے اور نہ ہی حوادث کا محل بن سکتی ہے، ورنہ اس ذاتِ عالی کا اس بات سے ناقص اور عاجز ہونا لازم آئے گا کہ وہ ذات اس عالم کی مبدع ہو اور ایسی معجزانہ تدبیر سے اس کی مدبر ہو۔ یہ تو عقلی دلیل بطورِ اجمال کے پیش کی گئی ہے۔

باقی رہے نقلی دلائل تو وہ کثیر ہیں اور اس بات پر شاہد ہیں کہ ہر شے اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم میں ہے اور کوئی چیز اس سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (الحدید:۲۲)

"جو کوئی مصیبت زمین پر یا خود تم پر پڑتی ہے وہ اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں کتاب میں لکھی ہوتی ہے، بے شک یہ اللہ کے نزدیک آسان بات ہے۔"

اسی طرح فرمایا:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الانعام:۵۹)

"اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، جو کچھ جنگل اور دریا میں ہے وہ سب جانتا ہے اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اسے بھی جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے مگر یہ سب کچھ کتاب روشن میں ہیں۔"

اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝﴾ (الرعد:۸۔۱۰)

"اللہ کو معلوم ہے کہ جو کچھ ہر مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوئے ہے اور جو کچھ پیٹ میں سکڑتا اور بڑھتا ہے اور اس کے ہاں ہر چیز کا اندازہ ہے، پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے سب سے بڑا بلند مرتبہ ہے۔ تم میں سے جو شخص کوئی بات چپکے سے کہے یا پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے یا دن میں چلے پھرے یہ سب برابر ہیں۔"

اس طرح کی سینکڑوں آیات واحادیث موجود ہیں لیکن ان عقلی اور نقلی براہین سے قطع نظر کچھ لوگ راہِ حق سے بھٹک گئے، انہوں نے خود کو نادان بنایا، اس کتابِ ناطق و برحق میں غور کرنے سے چشم پوشی کی اللہ کا کلام اور اس کے پیغمبر برحق ﷺ کا کلام سننے کی بجائے خود کو بہرہ بنالیا اور یہ گمان کر لیا کہ "نسخ" بدا کی ایک قسم ہے یا بدا کو مستلزم ہے۔ اس طرح وہ خود بھی اشتباہ میں پڑے اور دوسروں کو بھی اس مسئلہ میں اشتباہ میں ڈالا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ کے لیے مصلحت اور رائے جدید کا ظہور نہ ہوتا تو وہ کبھی اپنے احکام کو منسوخ نہ کرتا اور اپنی تعلیمات کو تبدیل نہ کرتا۔ یہ لوگ بھول گئے یا بھولے بن گئے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی حکم کو کسی دوسرے حکم سے منسوخ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کے لیے اب کوئی امر ظاہر ہوا ہے جو پہلے اس پر پوشیدہ تھا یا کوئی نئی رائے اسے سوجھی جو اس کے سامنے پہلے مفقود تھی، بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تو کوئی حکم دینے سے پہلے ہی ناسخ و منسوخ سے باخبر ہوتے ہیں بلکہ مخلوق کی تخلیق اور زمین و آسمان کے بنانے سے بھی پہلے ہر چیز کا علم رکھتے ہیں۔ وہ اپنی حکمت کی بناء پر جانتے ہیں کہ سابقہ منسوخ حکم جو کسی مصلحت و حکمت سے متعلق تھا ایک متعین وقت پر ختم ہو جائے گا، اور اسی طرح اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس مقررہ وقت پر آنے والا ناسخ حکم بھی کسی دوسری حکمت و مصلحت سے وابستہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حکمتیں اور مصلحتیں لوگوں کے مختلف ہونے سے بدلتی رہتی ہیں اور ان کے احوال و واقعات کی وجہ سے ان میں جدت آتی رہتی ہے، یہ تمام احکام اور ان کی حکمتیں اور بندوں کی تمام مصلحتیں اور نواسخ و منسوخات سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہوتا ہے، اس کے سامنے بالکل ظاہر ہوتا ہے کوئی شے اس سے پوشیدہ نہیں ہوتی، نسخ کی صورت میں کوئی نیا حکم آنا دراصل بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے اس علم کا ظہور ہوتا ہے، یہ مطلب نہیں کہ اب اس ذات کے لیے اس کا ظہور ہوا ہے۔ جیسا کہ ایک معروف تعبیر ہے کہ:

((شئوون يبديها ولا يبتديها)).

"یعنی وہ امور کا اظہار کرتا ہے نہ یہ کہ اس کے لیے وہ امور ظاہر ہوتے ہیں۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝﴾ (مریم:۶۴)

"اور تیرا رب بھولنے والا نہیں۔"

یہود اور روافض اس گمراہ بات پر متفق تھے جس سے نسخ کا بدا ہونا لازم آتا تھا، پھر وہ دو گوشوں میں بٹ گئے، چنانچہ یہود نے نسخ کا انکار کر دیا اور اس انکارِ نسخ میں حد سے نکل گئے، کیونکہ ان کے خیال واعتقاد میں اس نسخ کا قائل ہونا بدا کو مستلزم ہے اور وہ محال ہے۔ ہم ان شاء اللہ کچھ دیر بعد ان کا مناقشہ اور محاسبہ کرتے ہیں۔

اور روافض نے نسخ کا اثبات کیا اور اپنے زعم میں اس بدا کے اثبات میں حد سے تجاوز کر گئے۔ آپ نے دیکھا کہ ہم نے ان کے خیالات کی کس طرح عقلی اور نقلی دلائل سے تردید کی؟ اور ہم نے ان کے شبہات کا جن کو وہ اپنے خیال میں دلیل سمجھتے تھے، کس طرح قلع قمع کیا؟ وہ شبہات تو درحقیقت محض ان کے اوہام وخیالات تھے اور بے محل اور بے موقع کی ٹامک ٹوئیاں تھیں، یقیناً نسخ اور بدا میں بہت فرق ہے کہ نسخ میں تو حکمت ومصلحت کی پوری پوری رعایت ملحوظ ہوتی ہے اور بدا میں تو سبقتِ جہل اور حدوثِ علم لازم آتا ہے۔

① علاوہ ازیں ان لوگوں نے اس آیت مبارکہ سے بھی استدلال کیا ہے۔

﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ (الرعد:۳۹)

"اللہ جو چاہے موقوف کر دیتا ہے اور باقی رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیت کریمہ ان کی متدل نہیں ہو سکتی، بلکہ ان کے زعم کی تردید کرتی ہے جس طرح کہ ان کے ہم مشرب لوگوں کے خیالات کو رد کرتی ہے جو نبی کریم ﷺ پر نسخ کا عیب والزام لگاتے ہیں۔ آیت مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے اپنے علم، ارادے اور حکمت کی بناء پر جو حکم چاہتے ہیں بدل دیتے ہیں، اس کے علم میں کسی قسم کا کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا، تغیر، علم میں نہیں بلکہ معلوم میں ہوتا ہے۔ جس کی دلیل یہ الفاظ قرآنی ہیں ﴿وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ یعنی اصل مرجع اسی کے پاس موجود ہے جو قائم اور باقی رہتا ہے، جس میں کوئی محو اور اثبات نہیں، محو اور اثبات تو محض اس کتاب کے مطابق ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک حکم کو محو کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم ثابت کر دیتا ہے۔ ایک حکم کا محو اور دوسرے کا اثبات ہوتا ہے، مرض کا حکم محو اور دوسرا صحت کا حکم ثابت کرتا ہے، فقر کو محو کرتا ہے اس کی جگہ مالداری والا حکم ثابت کرتا ہے، حیات کو محو کرتا ہے، موت کو ثابت کرتا ہے۔ یوں دستِ قدرت اس کی مخلوق اور احکامات میں کارفرما ہوتی ہے اور اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ ذات تو وحدہٗ لاشریک ہے برحق ہے، اسے کوئی تغیر وتبدل نہیں آتا، اس کے علم میں نہ محو کو گزر ہے اور نہ اثبات کو۔

اس توجیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ نسخ اصل میں معلوم میں تبدیلی کا نام ہے نہ کہ علم میں، مخلوق میں تغیر سے عبارت ہے نہ کہ خالق میں۔ اللہ تعالیٰ کے علمِ قدیم جو ہر شے کو محیط ہے اس کا کچھ حصہ اس کے ذریعہ ہم پر ظاہر اور واضح ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علماء نے نسخ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ:

"نسخ، اس حکم شرعی کی انتہاء کو بیان کرنے کا نام ہے جس کا ہمارے ذہنوں میں استمرار اور تسلسل موجود ہوتا ہے اور یہ بطور تراخی کے ہوتا ہے۔"

پھر وہ اس تعریف کے اختیار کرنے کی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: بلاشبہ اس تعریف سے بدا سے احتراز بھی ہو جاتا ہے اور

اس بات کا اثبات بھی کہ نسخ ہمارے حق میں تبدیلی اور صاحب شرع کے حق میں محض بیان کا نام ہے۔

② نیز وہ لوگ چند ایسے آثار سے بھی استدلال کرتے ہیں جنہیں وہ پاک باز ائمہ کرام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ:

((لو لا البداء لحدثتكم بما هو كائن إلى يوم القيامة)).

"اگر بدا کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں تم کو قیامت کے دن تک ہونے والے تمام حالات و واقعات سے باخبر کر دیتا۔"

ایک اثر یہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:

((ما بدا الله تعالى في شيء كما بدا له في اسماعيل)).

"اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی شے اتنی ظاہر نہیں ہوئی جتنی اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں ظاہر اور معلوم ہوئی۔"

اسی طرح ایک اثر یہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ نے فرمایا:

((البداء ديننا و دين آبائنا في الجاهلية)).

"یعنی بدا ہمارا اور دورِ جاہلیت میں ہمارے آباء واجداد کا دین ہے۔"

جواب یہ ہے کہ یہ سب افتراء بازیاں اور جھوٹی باتیں ہیں، سب سے پہلے اس کے تانے بانے بُننے والا کذاب ثقفی تھا، جو اپنے لئے عصمت اور علم غیب کا دعویدار تھا، جب اس کی باتیں غلط ثابت ہونے لگیں اور رسوا ہونے لگا تو کہنے لگا کہ اللہ نے مجھ سے ان امور کا وعدہ کیا تھا لیکن اب اس کے لیے دوسری بات ظاہر ہوئی، پھر جب اسے خدشہ لاحق ہوا کہ لوگ اس کا مواخذہ کریں گے، اور اس بدترین کفریہ باتوں پر اس سے انتقام لیں گے تو اس نے یہ تمام کفریات اعلامِ بیتِ نبوّت کی طرف منسوب کر دیں جبکہ وہ ائمہ و اعلام ان سے بری ہیں۔ اس طریقہ سے یہ ملعون شخص اور اس کی جماعت ان کفریات اور اکاذیب سے استدلال کرتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ (الرعد: ٣٣)

"جس کو اللہ ہی گمراہ کرے پھر اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔"

(نسأل الله تعالى السلامة بمنه و كرمه، آمين)

نسخ اور تخصیص میں فرق

اس سے پہلے ہم نسخ کی تعریف بیان کر آئے ہیں کہ ((رفع الحكم الشرعي بدليل شرعي)) علماء نے "تخصیص" کی تعریف یوں کی ہے: ((قصر العام على بعض افراده)) "یعنی عام حکم اس کے بعض افراد میں منحصر کر دینا"۔ ان دونوں تعریفوں کو دیکھیں تو دونوں میں کافی مشابہت لگتی ہے کہ نسخ میں بھی بعض زمانہ کے ساتھ حکم کی تخصیص کی مشابہت ہوتی ہے، اور تخصیص میں بھی بعض افراد سے رفع حکم کی مشابہت پائی جاتی ہے، اسی مشابہت کی وجہ سے بعض علماء اشتباہ میں مبتلا ہوئے، بعض تو شریعت میں وقوعِ نسخ کے سرے سے منکر ہو گئے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم جس کو نسخ سے موسوم کرتے ہیں وہ تخصیص ہی ہے۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو تخصیص کی بعض صورتوں کو بابِ نسخ میں شامل کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلا وجہ منسوخات کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اس لیے ہم آپ کے سامنے نسخ اور تخصیص میں سات طرح کے فرق بیان کرتے

ہیں۔جس سے مذکورہ اشتباہ دُور ہوگا جس میں بعض حضرات مبتلا ہوئے۔

پہلا فرق ✿ عام، تخصیص کے بعد مجاز ہو جاتا ہے، کیونکہ اس وقت اس کا مدلول اس کے بعض افراد ہوتے ہیں، جبکہ اس کے الفاظ کل کے لیے موضوع ہوتے ہیں، اور اس پر قرینہ ہی مخصص ہوتا ہے، اور جب اس طرح کی صورتِ حال ہو تو وہ مجاز ہوتا ہے، جبکہ اس کے مقابلہ میں منسوخ نص، اپنے معنی "موضوع لہ" میں پہلے کی طرح ہی مستعمل ہوتی ہے، جس کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ حکمِ ناسخ اس بات پر دال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا اور اس کا ارادہ ازل سے ہی ایک مقررہ وقت تک اس حکم کے باقی رہنے کا تھا، اگرچہ منسوخ نص (حکم) تمام زمانوں پر حاوی ہوتی ہے، یہ بات اس صورت میں واضح ہوگی جب مثلاً شارع کہے کہ تم فلاں کام ہمیشہ کے لیے کرو، پھر وہ ایک مختصر زمانے کے بعد اس حکم کو منسوخ کر دے تو اس سے یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ اس کا مدلول صرف وہی مختصر زمانہ تھا، بلکہ وہ تمام زمانوں کے لیے نص کے طور پر پہلے کی طرح ہی مستعمل ہوگا۔ جس کی دلیل اس شارع کا یہ کہنا ہے "ہمیشہ کے لیے" ہاں فرق صرف یہ ہوا کہ جو عمل اس نص پر جو لفظاً تمام زمانوں کو شامل تھی، ناسخ نے اس کو باطل کر دیا، کیونکہ نص پر عمل کا استمرار اور تسلسل، ناسخ کے نسخ کے وارد نہ ہونے سے مشروط ہے، وہ نص یا ناسخ کوئی بھی ہو۔

اگر کوئی سوال کرے کہ نص کو لفظاً مؤبد رکھنے میں کیا حکمت پنہاں ہے؟ حالانکہ اللہ کے علمِ ازلی میں وہ مؤقت ہوتی ہے؟ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس کی حکمت، اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو آزمانا ہے کہ آیا وہ اس ظاہری طور پر مؤبد حکم پر راضی ہیں یا نہیں؟ پھر جب اللہ تعالیٰ کھرے کھوٹے کو پرکھ لیتے ہیں کہ کون اس کے حکم پر سر ڈالتا ہے اور کون سر اٹھاتا ہے تو نسخ کا حکم تخفیف وغیرہ کی حکمت لیے آجاتا ہے۔

دوسرا فرق ✿ تخصیص کی وجہ سے جو حکم خارج ہو جاتا ہے وہ اس حکمِ عام میں کبھی مراد ہی نہیں تھا، جبکہ نسخ کی وجہ سے خارج ہونے والا حکم وہ منسوخ میں لفظاً مراد ہوتا ہے۔

تیسرا فرق ✿ امر و نہی میں تخصیص ایک شخص کے لیے وارد نہیں ہوتی جبکہ نسخ کبھی ایک شخص کے لیے ہوتا ہے اور کئی اشخاص کے لیے بھی ہوتا ہے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص احکام کا منسوخ ہونا۔

چوتھا فرق ✿ نسخ، منسوخ کی حجیت کو اس صورت میں باطل کر دیتا ہے، جبکہ وہ عام کے تمام افراد کی نسبت سے رافعِ حکم ہو، اور منسوخ کی حجیت کو اس صورت میں کچھ باقی رکھتا ہے جبکہ وہ عام کے بعض افراد سے رافعِ حکم ہو جبکہ اس کے بالمقابل تخصیص، عام کی حجیت کو کبھی باطل نہیں کرتی بلکہ تخصیص کے بعد باقی ماندہ افراد پر عمل باقی رہتا ہے۔

پانچواں فرق ✿ نسخ صرف کتاب و سنّت سے ہوتا ہے جبکہ تخصیص کتاب و سنّت سے بھی ہوتی ہے اور اس کے علاوہ سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ دلیل حس و عقل۔ اس کی مثال یہ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ (المائدہ:۳۸)

"چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو۔"

اس عام حکم میں نبی کریم ﷺ نے تخصیص کرتے ہوئے فرمایا:

((لا قطع الا فی ربع دینار)).[1]

"یعنی قطع ید صرف ربع دینار پر ہوگا۔"

اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا﴾ (الاحقاف:۲۵)

"وہ اپنے رب کے حکم سے ہر ایک چیز کو برباد کر دے گی۔"

اب اس حکمِ عام میں حس کے ذریعہ تخصیص کی گئی کہ اس تدمیر سے آسمان و زمین محفوظ رہیں گے، وہ آندھی ان کو برباد نہیں کرے گی۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾﴾ (البقرۃ:۱۰۹)

"بلاشبہ اللہ، ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔"

اس عام حکم میں عقل کے ذریعہ تخصیص ہوئی کہ قدرتِ خداوندی کا واجب عقلی اور محال عقلی سے تعلق محال ہے۔

چھٹا فرق ٭ نسخ صرف منسوخ سے متاخر دلیل سے ہوتا ہے جبکہ تخصیص، سابق، لاحق اور مقارن سے بھی ہو جاتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ تخصیص صرف دلیلِ مقارن سے ہوتی ہے، لہٰذا اگر عام حکم پر عمل کرنے سے مؤخر ہو تو وہ مخصص باہمی تعارض کی وجہ سے ایک اعتبار سے عام کے لئے ناسخ ہوگا۔ اس کی مثال جیسا کہ شارع نے حکم دیا کہ: ((اقتلوا المشرکین)) "مشرکین کو قتل کر دو" اور پھر وقتِ عمل کے بعد فرمایا کہ: ((و لا تقتلوا اهل الذمه)) "لیکن ذمیوں کو قتل نہ کرو۔"

ان حضرات کے قول کی توجیہ یہ ہے کہ مخصص سے مقصود، عام کی مراد کو بیان کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اگر وہ وقتِ عمل سے مؤخر ہوا تو اس سے بوقتِ ضرورت بیان کی تاخیر لازم آتی ہے جو کہ جائز نہیں ہے، اس وجہ سے اس کو ناسخ ہی مانا رہ جاتا ہے۔

ساتواں فرق ٭ نسخ اخبار میں واقع نہیں ہوتا، بخلاف ازیں تخصیص، وہ اخبار میں بھی اور دیگر امور میں بھی واقع ہوتی ہے۔

نسخ کے قائلین اور منکرین

نسخ کے بارے میں تین مذاہب ہیں:

مذہب اوّل ٭ "نسخ" عقلاً جائز اور سمعاً و نقلاً واقع ہے، اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ لیکن یہ اجماع ابو مسلم اصفہانی اور اس کے ہم خیال لوگوں کے ظاہر ہونے سے پہلے تک کا ہے، نیز اس پر نصاریٰ کا بھی اجماع ہے، لیکن یہ بھی اس دور سے قبل تک کے لیے ہے جب اس اجماع کو توڑنے والے پیدا ہوئے، یہی رائے یہود کے تین گروہوں میں سے ایک گروہ "عیسویہ" کی ہے۔

مذہب ثانی ٭ "نسخ" عقلاً اور نقلاً دونوں طرح ممنوع اور ناجائز ہے۔ اس دور کے تمام نصاریٰ کا اسی طرف رجحان ہے۔ اور انہوں نے اسی نسخ کو لے کر دین حنیف پر طعن و تشنیع کی ہے، یہود کے ایک دوسرے گروہ "شمعونیہ" بھی اسی کے قائل ہیں۔

---

① رواہ مسلم فی الحدود (۱) و ابوداؤد فی الحدود (۳۳)، والترمذی فی الحدود (۱۶)، والنسائی فی قطع ید السارق (۹)، و ابن ماجة فی الحدود (۲۲) والدارمی فی الحدود (٤) و مالک فی الحدود (۲٤) و احمد (٦/۳٦)

مذہب ثالث ۞ "نسخ" عقلاً تو جائز اور ممکن ہے لیکن عقلاً ممتنع ہے۔ یہود کا تیسرا گروہ "عنانیہ" اسی کا قائل ہے، اور یہی قول مسلمانوں میں ابومسلم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے، لیکن ان سے اس قول کے منقول ہونے میں اضطراب پایا جاتا ہے، اور تاویل کی صورت میں جمہور مسلمانوں سے ان کے اختلاف کو لفظی قرار دیا جائے گا۔ نسخ کے بارے میں اہل مذاہب کی یہ اجمالی آراء ہیں۔ اب ہم ان آراء واقوال کی تفصیل بیان کرتے ہیں جس کے لیے آپ پوری طرح ہمہ تن گوش ہو جائیں۔ اس بارے میں مذہبِ حق کی ادلہ کے ذریعہ تائید پیش کریں گے، پھر اس میں اللہ کی حکمت بھی بیان کی جائے گی۔ بعدازاں دیگر مذاہب اور ان کے مستدلات کو پیش کر کے ان کے شبہات کا ازالہ کریں گے اور حق وصواب کے چہرے پر پڑے پردوں کو اُٹھا دیں گے۔

نسخ پر عقلی ونقلی دلائل

منکرین نسخ کے سامنے نسخ کے ثبوت کی غرض سے ہم چند دلائل نسخ کے جوازِ عقلی پر اور چند دلائل نسخ کے وقوعِ نقلی پر قائم کرتے ہیں۔

(ا) جوازِ نسخ پر عقلی دلائل

جوازِ نسخ کے عقلی دلائل اجمالی طور پر چار ہیں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بعض دلائل نسخ کے جواز اور وقوع دونوں کے ثابت ہو جائیں۔

پہلی دلیل ۞ نسخ کے جواز میں عقلی طور پر کوئی امرِ ممنوع لازم نہیں آتا، جو امر بھی اس طرح کا ہوتا ہے وہ عقلاً جائز ہوتا ہے، کبریٰ تو تسلیم شدہ ہے، مگر صغریٰ میں اختلاف ہے، چنانچہ اہلِ سنّت کے ہاں جو دلیلِ صغریٰ ہے وہ معتزلہ سے مختلف ہے اور یہ اختلاف اس پر مبنی ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ کے احکام کے لیے ضروری ہے کہ وہ بندوں کی مصلحت کے تابع ہوں یا ضروری نہیں ہے؟ چناں چہ اہل سنّت اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ بندوں کی کوئی شے واجب نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات فاعل ومختار اور کبیر و متعال ہے، وہ ذات اپنے اختیار، مشیت اور کبریائی وعظمت کی بناء پر اپنے بندوں کو جو چاہے حکم دے سکتا ہے اور جس کام سے چاہے منع کر سکتا ہے، جو حکم باقی رکھنا چاہے باقی رکھ سکتا ہے اور جو منسوخ کرنا چاہے منسوخ کر سکتا ہے، اس کے حکم اور قضا کو کوئی رَدّ نہیں کر سکتا۔ اس پر لازم نہیں کہ وہ اپنے بندوں کے مصالح کی رعایت کرے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ ذات (نعوذ باللہ) ظالم اور زیادتی کرنے والی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے تمام افعال حکمتِ بالغہ اور وسعتِ علمی سے خالی نہیں ہوتے، وہ ذات ظلم وزیادتی سے منزہ اور پاک ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ (فصلت:۴۶)

"تیرا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔"

نیز فرمایا: ﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ (الکہف:۴۹)

"تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔"

نیز ارشاد ہے: ﴿اِنَّ رَبَّكَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ﴾ (یوسف:۶)

"بلاشبہ تیرا رب علیم و حکیم ہے۔"

نیز فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ (البقرہ:۱۴۳)

"بلاشبہ اللہ لوگوں پر بڑا مہربان اور شفقت کرنے والا ہے۔"

جبکہ معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے احکام میں اپنے بندوں کی مصلحتوں کی رعایت رکھے، جس امر میں لوگوں کی مصلحت ہو اسی کا ان کو حکم دے اور جس کام میں ان کی مضرت ہو اس سے ان کو منع کرے، اور جو کام کبھی مصلحت اور کبھی مضرت بنتے ہوں تو ان کاموں میں بھی کبھی ان کا حکم دے اور کبھی ان سے منع کرے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہم اہلِ سنت کے مذہب کے مطابق دلیلِ صغریٰ اس طرح بناتے ہیں کہ "نسخ" فاعل و مختار اور کبیر و متعال ذات کی طرف سے احکام میں تصرف کرنے کا نام ہے۔ جس پر حکم کے بارے میں بندوں کی مصلحتوں کی رعایت رکھنا واجب نہیں ہے، گو اس کا حکم، حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ جو امر بھی اس طرح کا ہو وہ عقلاً ممنوع نہیں ہوتا۔ (بلکہ ممکن ہوتا ہے)۔

معتزلہ کے مذہب کے مطابق دلیل یوں بنے گی کہ نسخ اس امر پر مبنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے افعال کی مصلحت کو جانتا ہے کہ کس وقت کیا اس کے لیے بہتر ہے، لہٰذا وہ اس وقت میں اسی بات کا ان کو حکم دے گا اور اسی طرح اسے معلوم ہے کہ دوسرے وقت میں بندوں کے لیے کیا مضر ہے تو وہ ان کو اس دوسرے وقت میں اس سے منع کرے گا، جو امر بھی اس طرح کا ہو اس میں عقلاً کوئی استحالہ نہیں ہوتا۔

بھلا ایسا امر عقلاً کیسے ممنوع ہو سکتا ہے؟ جبکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ مصلحتیں اشخاص، ازمان اور احوال کے بدلنے سے بدلتی رہتی ہیں، ایک طبیب مریض کو جب تک وہ مریض ہے، دوا لینے کا کہتا ہے، لیکن جب وہ مرض سے شفایاب ہو جاتا ہے تو اسے دوا لینے سے منع کر دیتا ہے۔ عورت اپنے چھوٹے بچے کو دودھ وغیرہ بہت ہلکی غذا دیتی ہے، پھر جب وہی بچہ رعنا جوان ہو جاتا ہے، مرضعہ کو دودھ پلانا حرام ہو جاتا ہے تو پھر وہ عورت دودھ کے علاوہ دوسری غذا دیتی ہے، اس طرح وہ اس بچہ کو خفیف غذا سے ثقیل غذا کی طرف لے جاتی ہے۔ اور پھر ثقیل سے زیادہ ثقیل غذا کی طرف، کیونکہ اب وہ بچہ قوت اور پختہ عمر میں پہنچ چکا ہے۔

اسی طرح ایک معلّم، ابتدائی درجہ کے طلباء کو سہل ترین معلومات فراہم کرتا ہے، پھر اس سے کم آسان، پھر آسان معلومات سے ذرا مشکل معلومات، پھر زیادہ مشکل معلومات کی طرف رفتہ رفتہ لے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پھر ان کو زیادہ دقیق و عمیق نظریات تک پہنچا دیتا ہے، اس بارے میں وہ ان کی فکری اور ذہنی سطح اور عقلی کمال کو مدنظر رکھتا ہے۔ یہی حال ہے امتوں کا کہ ان میں بھی افراد کی طرح مختلف انقلابات آتے ہیں، لہٰذا ان کی راہ نمائی اور تدبیر کے لیے حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ احکام ان کے حال و زمان کے مناسب دیئے جائیں، پھر جب وہ حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوں تو پہلے حکم کی بجائے کوئی دوسرا حکم جو اس نئے دور اور حالت سے میل کھاتا ہو، دیا جائے، بصورتِ دیگر احکام اور حکمت کے درمیان وہ ارتباط اور تعلق خلل انداز ہوگا، اور مخلوق میں وہ نظم و تدبیر جس کا ہم دن رات مشاہدہ کرتے ہیں قائم نہ رہے گا۔ اسی دلیل کی طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد مشیر ہے:

﴿مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ﴾ (البقرۃ:۱۰۶)

اس آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی آیت کسی حکمت و مصلحت کے تقاضے سے موقوف کر دیتے ہیں کہ اس آیت کے الفاظ یا حکم یا دونوں کو اُٹھا لیتا ہے، پھر اس کے بدلے میں کوئی حکم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا تو پھر وہ اپنے بندوں کے لیے دوسری نوع کا حکم لے آتے ہیں جو موقوف کردہ حکم سے زیادہ بہتر ہوتا ہے یا اس کے برابر ہوتا ہے۔ اور یہ بہتری کبھی نفع کے اعتبار سے ہوتی ہے اور کبھی اجر و ثواب کے اعتبار سے، اور کبھی دونوں لحاظ سے ہوتی ہے، البتہ مثلیت (برابری) صرف ثواب کے لحاظ سے ہوتی ہے، کیونکہ مثلیت نفع میں متصور نہیں ہو سکتی، کیونکہ حکمِ اوّل کے مرتفع ہونے کی صورت میں اس سے وابستہ حکمت بھی مرتفع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ مصلحت آئندہ آیت کی ہی باقی رہ جاتی ہے، اس طرح وہ لامحالہ اپنے نفع کے اعتبار سے مرفوع حکم سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ اور جب یہ فرض کیا جائے کہ حکم باقی ہے اور صرف تلاوت منسوخ ہوئی ہے تو پھر پہلی مصلحت اپنی حالت پر باقی رہتی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری مصلحت موجود نہیں ہوتی کہ دوسرے حکم کو اس سے بہتر یا برابر قرار دیا جائے۔

دوسری دلیل ✿ یہ منکرین کے لیے الزامی دلیل ہے کہ اگر "نسخ" عقلاً اور نقلاً جائز نہ ہوتا تو شارع اپنے بندوں کو کوئی ایسا حکم نہ دیتے جو کسی وقت کے ساتھ موقت ہو کہ وقت کے ختم ہونے پر وہ ختم ہو جاتا ہو حالانکہ وہ لوگ اس کو عقلاً جائز مانتے ہیں، بلکہ نقلاً بھی اس کے وقوع کے قائل ہیں، جب اس کو جائز قرار دیتے ہیں تو نسخ کو بھی جائز کہنا چاہیے۔ کیونکہ "نسخ" کا مطلب بھی تو یہی ہے کہ حکمِ اوّل اس مقررہ وقت پر ختم ہو گیا جو اللہ کے علم میں تھا، اگرچہ اس کے نسخ سے قبل ہمیں معلوم نہیں تھا، اللہ نے ہمیں نسخ کے ذریعہ بتایا یہ فرق مؤثر نہیں ہے، مثلاً شارع کا رمضان کے پہلے روز یہ حکم دینا کہ "اس مہینہ کے اختتام تک روزے رکھو" یہ اس قول کے مساوی ہے کہ شارع رمضان کے پہلے دن یوں حکم دے کہ "روزے رکھو" مدتِ انتہا کی قید لگائے بغیر۔ حتیٰ کہ پھر جب رمضان کا مہینہ ختم ہو کر شوال کا پہلا دن آئے اور یوں حکم دے کہ "روزے رکھنا چھوڑ دو" تو اس کا یہ آخری قول بلاشبہ نسخ کہلائے گا۔ منکرین نسخ پہلی مثال کو جائز کہتے ہیں تو اس دوسری مثال کو بھی جائز قرار دینا چاہیے کیونکہ یہ اسی کے مساوی ہے، قاعدہ ہے کہ دو مساوی چیزوں کا حکم میں متحد ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ ایک دوسرے کے مساوی نہ ہوں گے۔

تیسری دلیل ✿ اگر "نسخ" عقلاً اور نقلاً ناجائز مانا جائے تو رسول اللہ ﷺ کی نبوّت و رسالت کا عموم ثابت نہ ہوگا، حالانکہ آپ ﷺ کی رسالت کا قطعی دلائل و براہین سے تمام لوگوں کے لیے عام ہونا ثابت ہے۔ اس کی وضاحت سے بات لمبی ہو جائے گی۔ بایں صورت سابقہ شرائع باقی نہ رہیں گے بلکہ اس آخری شریعت کے ذریعہ منسوخ ہوں گی، معلوم ہوا کہ نسخ عقلاً اور نقلاً جائز ہے، چنانچہ اگر اس دلیل کے مدِّنظر نسخ کے جواز اور وقوع نہ مانا جائے تو سابقہ شرائع کا باقی رہنا لازم آتا ہے اور اگر ان کو باقی (غیر منسوخ) مانا جائے تو آنحضرت ﷺ کی رسالت کا ثبوت تمام بنی نوع انسان کے لئے نہ ہوگا۔

چوتھی دلیل ✿ آئندہ بیان کردہ نسخ کے نقلی طور پر وقوع کے دلائل بھی اس کے جواز کی ایک دلیل ہے، اس لیے کہ نسخ کا وقوع اس کے جواز کو مستلزم ہے۔

وقوعِ نسخ پر نقلی دلائل

وقوعِ نسخ پر نقلی دلائل دو طرح کے ہیں:

① جن سے یہود و نصاریٰ اور دیگر منکرین نسخ پر حجت قائم ہوتی ہے لیکن ان کے لیے نبوت

و رسالت کا اثبات اس پر موقوف نہیں ہے۔

② جن سے ان لوگوں پر حجت قائم ہوتی ہے جو آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں۔ جیسے ابو مسلم اصفہانی، مسلمانوں میں سے اور فرقہ عیسویہ یہود میں سے، کیونکہ وہ بھی آپ ﷺ کی رسالت کے معترف ہیں البتہ وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی نبوت صرف عرب کے لیے تھے، ان کو ہم اس طرح الزامی جواب دیں گے کہ جب آپ ﷺ کی رسالت کو مانتے ہو تو پھر آپ ﷺ کی لائی ہوئی تمام تر تعلیمات کو ماننا لازم ہو جاتا ہے، آپ ﷺ کی دعوت کے عموم کا بھی یہی تقاضا ہے اور کتاب وسنت میں وارد شدہ نسخ بھی اس امر کا متقاضی ہے۔

پہلی قسم ◆ پہلی قسم کے دلائل بہت زیادہ ہیں، دینی کتب ان سے لبریز ہیں، ہم یہاں پر محض ثبوت کے لیے درج ذیل چند دلائل پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم ان تمام امور پر ایمان نہیں رکھتے جن پر وہ (اہل کتاب) ایمان رکھتے ہیں۔

① تورات کے سفر اوّل میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی سے باہر نکلتے وقت فرمایا: "میں نے ہر زندہ جانور کو تیرے اور تیری اولاد کے لیے کھانے کی چیز بنا دیا ہے اور اسے تمہارے لیے نباتات کی طرح کر دیا ہے۔ سوائے خون کے، کہ وہ تم نہ کھاؤ" اس کے بعد وہ لوگ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے بعد اصحاب شرائع پر بہت سے جانور حرام کر دیئے تھے اور ان میں موسیٰ علیہ السلام بھی ہیں، جیسا کہ ان کی تورات کے سفر ثالث میں موجود ہے۔

② تورات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ: "اپنی بیٹیوں کی اپنے بیٹوں سے ہی شادی کرو، منقول ہے کہ آدم علیہ السلام کے ہاں ہر بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ آپ مختلف بطن کے لڑکے اور لڑکی کی شادی کر دیتے تھے، گویا بطون کا اختلاف ہی ماں باپ اور نسب کے اختلاف کے قائم مقام تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کر دیا اور اس پر تمام اہلِ ادیان مسلمان، یہود و نصاریٰ کا اتفاق ہے۔

③ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا، پھر بعد میں حکم دیا کہ اسے ذبح نہ کرو، منکرینِ نسخ بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

④ دنیا کے کام کاج ہفتہ کے روز مباح تھے، شکار کرنا بھی اس میں شامل تھا، پھر یہود خود اس بات کے معترف ہیں کہ بعد میں اللہ نے اسے حرام کر دیا تھا۔

⑤ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا کہ بچھڑے کو جن لوگوں نے پوجا تھا ان کو قتل کرو، پھر اس حکم کو ان سے اٹھا لیا۔

⑥ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا مباح تھا، پھر موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حرام ہو گیا۔

⑦ طلاق، موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں مشروع تھی، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں صرف زوجہ پر زنا کے ثبوت کی صورت میں مشروع رہی، ورنہ حرام تھی۔

⑧ انجیل متیٰ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نقل کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "میں صرف بنی اسرائیل میں سے راہ گم کردہ بھیڑ بکریوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت مقامی تھی، اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص تھی۔

پھر انجیل مرقس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہی نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: "سارے جہاں میں چلے جاؤ اور انجیل کو بھی

وہاں اپنانے کے لیے لے جاؤ۔"
اب اگر ہم خلوصِ نیت سے دیکھیں تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پہلا قول اس دوسرے قول کے ذریعہ منسوخ ہے ورنہ دونوں بیانات ایک دوسرے سے متعارض ہوں گے اور تعارض کی بناء پر ساقط الاعتبار ہوں گے، اور اسی طرح دونوں انجیلیں ناقابلِ اعتبار قرار پائیں گی، بلکہ تمام اناجیل کا ساقط الاعتبار ہونا لازم آئے گا، کیونکہ وہ آپس میں مماثل ہیں کہ کسی ایک کے لیے جو بات جائز ہوگی وہ دوسری کے لئے بھی جائز ہوگی۔

⑨ ختنے کا حکم حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے ادیان میں موجود تھا، لیکن پھر رفعِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حواریوں نے اس ختنے سے منع کر دیا، جیسا کہ حواریوں کے رسائل میں یہ بات موجود ہے۔ اب یہ عمل یا تو نسخ تھا یا پیغمبر پر افتراء اور کذب بیانی تھا، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ختنے کے منسوخ ہونے کے بارے میں کوئی بات بھی منقول نہیں ہے۔

⑩ خنزیر کا گوشت کھانا یہودیت میں حرام تھا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور بھی گزر گیا، انہوں نے بھی اس کے حلال ہونے پر کوئی بات نہیں فرمائی، لیکن عروجِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حواریوں نے اس کو بھی مباح کر لیا اب یہ مسیحی برادری کے خیال میں مباح ہے۔ اب اسے نسخ قرار دیں گے یا ماقبل کی طرح افتراء پردازی اور کذب بیانی؟۔

دوسری قسم ✿ وقوعِ نسخ کے نقلی دلائل میں سے یہ دوسری قسم ہے، چنانچہ اس کے متعلق دلائل یہ ہیں:

① ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (البقرۃ:۱۰۶)

"ہم جو کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے برابر لاتے ہیں۔"

② نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝﴾ (الرعد:۳۹)

"اللہ جو چاہے موقوف کر دیتا ہے اور باقی رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔"

ان دونوں آیتوں پر گفتگو پہلے ہو چکی ہے، مزید یہ کہ دونوں آیتیں وقوعِ نسخ پر دلالت کرتی ہیں، علاوہ ازیں یہ بات بھی مدِ نظر رہے کہ ان کا نزول ان لوگوں کی تردید میں ہوا ہے جو شریعتِ مطہرہ میں وقوعِ نسخ کی وجہ سے ہی اسلام اور پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔

③ نیز فرمانِ رب العالمین ہے:

﴿وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (النحل:۱۰۱)

"اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری بدلتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو وہ اُتارتا ہے تو کہتے ہیں کہ تُو بنا لاتا ہے یہ بات نہیں بلکہ اکثر ان میں سے نہیں سمجھتے۔"

اس آیت میں وجہ استدلال یہ ہے کہ تبدیلی اصل کو اٹھا کر اس کے بدلے کسی چیز کو اس کی جگہ رکھنے کا نام ہے۔ اس کا نام نسخ

ہے۔ خواہ وہ مرفوع تلاوت ہو یا حکم۔

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ﴾ (النساء: ۱۶۰)

"سو یہود کے گناہوں کے سبب سے ہم نے ان پر بہت سی پاک چیزیں حرام کر دیں جو ان پر حلال تھیں۔"

اس آیت میں طریقہ استدلال یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ پہلے جو حلال تھا وہ ان پر حرام کر دیا گیا، اسی کو نسخ سے تعبیر کرتے ہیں، لفظ ﴿اُحِلَّتۡ لَهُمۡ﴾ سے مفہوم ہو رہا کہ حکمِ اوّل بھی حکمِ شرعی تھا، براءتِ اصلی نہ تھا۔

⑤ اسلافِ اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ نسخ کا شریعتِ اسلامی میں وقوع ثابت ہے۔

⑥ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام منسوخ ہوئے، جو اس امر کی دلیل ہے کہ نسخ واقع ہوا ہے، بلکہ منسوخ شدہ آیات میں سے ہر ایک مستقل طور پر وقوعِ نسخ کی کامل دلیل ہے، اس لیے کہ وقوع کے اثبات کے لیے فردِ واحد کا وجود کافی ہوتا ہے۔ ہم عنقریب ان شاء اللہ ان منسوخ آیات کے بارے میں بیان کریں گے۔

نسخ کی حکمت

اس سے پہلے ہم نے نسخ کی تعریف اور دوسرے امور سے اس کا التباس و اشتباہ بیان کیا اور دلائل سے اس کو مؤید کیا، اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم نسخ میں اللہ تعالیٰ کی پنہاں حکمت و مصلحت کو واضح کریں، کیونکہ جب حکمت معلوم ہوگی تو دل کو راحت ملے گی التباس دُور ہوگا، وساوس و شبہات سے بچاؤ ہوگا، بالخصوص نسخ کے موضوع کے حوالے سے، کیونکہ اس کے منکرین بہت زیادہ ہیں، اس نسخ کے انکار کے لیے انہوں نے مختلف شبہات بنا رکھے ہیں۔ چنانچہ ہم نسخ کی حکمت کو تفصیل سے بیان کرنے کی غرض سے کہتے ہیں کہ "نسخ" شریعتِ اسلامی کے ذریعہ بھی ہوا اور خود شریعتِ مطہرہ میں بھی ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ سابقہ تمام ادیان کو بھی منسوخ کیا ہے اور خود اس دین اسلام کے بھی بعض احکام کو بعض دوسرے احکام کے ذریعہ منسوخ کیا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دینِ اسلام کے ذریعہ سابقہ تمام ادیان کو جو منسوخ کیا اس کی حکمت یہ ہے کہ اصل میں اسلام کے احکام ایسے کامل و مکمل ہیں کہ انسانی حاجات جو مرحلہ وار ابتداء سے انتہاء کو پہنچے ہیں، ان کی پوری کفایت کرتے ہیں۔ جس کی توضیح یہ ہے کہ بنی نوعِ انسانی ایک بچے کی طرح مختلف ادوار سے گزرتی رہی ہے، ہر دور کے مناسب کچھ احوال ہوتے ہیں جو اس کے مقابل دوسرے دور کے احوال کے مغایر اور مخالف ہوتے ہیں، چنانچہ انسان کے وجود کا عہدِ اوّل بچے کے وجود کے دورِ اوّل کی مانند تھا، انتہائی سادہ، ناتواں، نادانی، پھر رفتہ رفتہ اس دور سے دوسرے ادوار کی طرف منتقل ہوتا رہا، اس دوران جداگانہ متفاوت انداز میں اعراض پیش آتی رہیں کہ عقلی و فکری گمراہی، جہالت کا اندھا پن، جوانی کا جوش و جذبہ، قوت و طاقت کا غرور وغیرہ، اسی تفاوت کے تقاضے کے مطابق ان کے لیے مختلف شرائع و ادیان آتے رہے، حتیٰ کہ جب پورا عالم اپنی فکری پختگی کے وقت کو پہنچ گیا، مختلف اقوام میں مدنیت پروان چڑھ گئی تو آخر میں یہ دینِ حنیف تمام ادیان کے لیے ناسخ و خاتم بن کر آیا جس نے تمام سابقہ شرائع کی تکمیل بھی کر دی اور انسانی مصلحتوں اور زندگی کے تمام شعبوں کو جمع کر دیا، گویا روح اور جسم کے مطالب میں تطبیق دے دی اور علم و دین کا باہمی رشتہ جوڑ دیا، انسان کا اللہ سے بھی اور سارے عالم سے بھی ربط و تعلق قائم کیا خواہ وہ افراد ہوں یا خاندان ہوں یا مختلف اُمتیں ہوں یا قومیں، حیوانات ہوں نباتات ہوں یا جمادات۔ ان امور نے دینِ اسلام کو بجا طور پر رہتی دُنیا تک کے لیے عالمی دین بنا دیا ہے جو

ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔

یہ اجمالی طور پر اس کی حکمت بیان کی گئی ہے جس کی تفصیلات کی طرف ہم نے سابقہ مناسب مواقع پر اشارات کیے ہیں، آئندہ بھی ہم مناسب مواقع پر ان شاء اللہ اسے پیش کریں گے۔

باقی رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کے بھی بعض احکام کو ایک دوسرے احکام سے منسوخ کیا ہے اس کی حکمت کا مرجع بھی اس امت کے تدریجی مراحل کو پیش نظر رکھنا ہے۔ جس کی توضیح یہ ہے کہ جب پیغمبر علیہ السلام نے ابتداء میں دعوتِ دین کا آغاز کیا تو یہ اُمتِ اسلامی ابھی ابتدائی دورِ تربیت میں تھی جس میں وہ دوسرے دَور میں منتقل ہونے کی مشقت برداشت کر رہی تھی۔ بلکہ اس کے لیے اپنے عقائد و عادات اور موروثی روایات کو ترک کرنا نہایت دشوار تھا، خاص طور سے اہل عرب کو اس وقت جب انہیں اسلام سے نیا نیا واسطہ پڑا تھا، اپنے عقائد پر بڑا فخر و ناز تھا، ان کا خیال یہ تھا کہ اگر انہوں نے اس نئے دین کو اختیار کر لیا تو ان کا اصل مقصد حاصل نہ ہو سکے گا، اسلام تو اپنے ابتدائی دَور میں ہی ختم ہو جائے گا اور پھر ان کا دفاع کرنے والا اور ہمدردی کرنے والا کوئی نہ ہو گا، کیونکہ فطرت کے آگے انسان بے بس اور مجبور ہوتا ہے۔ اسی لیے شریعتِ مطہرہ نے درجہ بدرجہ تدریجی طریقے سے لوگوں کو مانوس و مالوف کرتے ہوئے انہیں اوجِ کمال تک پہنچایا اور رفتہ رفتہ ترقی کی منازل و درجات تک پہنچا دیا کہ پہلے ان کو آسان ترین عمل پر لگایا، پھر اس سے کم آسان عمل پھر دشوار کام پھر زیادہ مشکل اور دشوار عمل تک لے گئی۔ حتیٰ کہ پھر ایسا وقت آیا کہ اسلام پوری طرح اپنے مقصد میں کامیاب و کامران ہوا کہ اس کے سبب انسانیت نے تیزی سے ترقی کی اور لوگوں کے قلوب والا ذہان اس سے مانوس ہوئے جس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

مذکور حکمت اس صورت میں زیادہ نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے جبکہ حکمِ ناسخ، منسوخ حکم سے زیادہ دشوار ہو، جیسا کہ زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب کے لیے شراب کے مسئلہ کے بارے میں اسلام نے جو طریقہ اختیار کیا تھا جو کہ انتہائی پیچیدہ مسئلہ رہا ہے، تقریباً سارے لوگ شراب نوشی میں مبتلا تھے، یہ صرف ان کی عادت نہیں تھی، بلکہ طاقت کی علامت اور قوت کا مظہر مانی جاتی تھی۔ اب آپ بتایئے کہ کیا ایسے حال میں اسلام زبردستی ان کو شراب نوشی سے روک سکتا تھا؟ اگر اسلام ان کے ساتھ ملاطفت اور نرمی کا سلوک نہ کرتا تو وہ کبھی اس سے باز نہ آتے۔ شروع میں اس درجہ نرمی کر دی کہ ان کو لگا کہ شاید وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہے، بلکہ ابتداء میں جب بعض لوگوں کے افکار و اذہان اس قابل ہو گئے تھے کہ وہ حرمتِ شراب کا حکم سننے کی تاب لا سکیں، ایسے وقت میں بھی حرمت کا حکم لگانے سے گریز کیا، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۔﴾ (البقرہ:۲۱۹)

"وہ لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔"

زیادہ دشوار حکم کو اس کی نسبت زیادہ آسان حکم کے ذریعہ منسوخ قرار دینے کی حکمت لوگوں کے لیے تخفیف اور آسانی کرنا ہے تاکہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کا اظہار بھی ہو اور اس طرح انہیں ترغیب بھی ہو گئی، وہ بڑھ چڑھ کر اللہ کا شکر اور اس کی بزرگی بیان کریں گے اور ان کے دِل میں اللہ اور اس کے دین کی محبت بھی جاگزیں ہو گی۔

باقی رہا یہ امر کہ کبھی صعوبت یا سہولت کے اعتبار سے مساوی حکم کو منسوخ کرنے کی کیا حکمت ہوتی ہے؟ تو اس کی حکمت

ابتلاء وآزمائش ہے، تاکہ مومن کا سب کوعلم ہواور وہ کامیابی سے ہمکنار ہواور منافق کا بھی سب کو پتہ چلے اور وہ ہلاکت سے دوچار ہو۔ اللہ تعالیٰ، پاک کو ناپاک سے علیحدہ اور جدا کیا کرتے ہیں۔

باقی رہا یہ امر کہ کبھی تلاوت باقی اور حکم منسوخ اور کبھی اس کا برعکس کہ تلاوت منسوخ اور حکم باقی رکھا جاتا ہے! اس کی کیا حکمت ہے؟ تلاوت کو باقی رکھتے ہوئے حکم کو منسوخ کرنے کی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کے لیے اسلام کے ظاہری احکام کو بھی محفوظ رکھا جائے اور لوگ اس بات کی گواہی دے سکیں کہ یہ دین برحق ہے، اللہ کے نبی ﷺ سچے ہیں، اور اللہ کی ذات بھی علیم وحکیم، رحمان و رحیم اور حق ومبین ہے، علاوہ ازیں اس کی تلاوت پر بھی انہیں اجر وثواب حاصل ہو، بلکہ ایسی منسوخ آیات میں پوشیدہ بلاغت بیانی یا علمی یا سیاسی معجزات کی سماعت کرسکیں۔

جیسا کہ ایک صحیح روایت میں مذکور ہے کہ عمر بن الخطاب اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: قرآنِ کریم کا ایک حصہ یہ بھی نازل ہوا تھا؟ ((الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة))۔ مطلب یہ کہ یہ بھی قرآنی آیت تھی جس کی تلاوت ہوتی تھی، پھر تلاوت منسوخ ہوگئی اور حکم باقی رہا جس پر آج تک عمل ہوتا ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ ابتداء میں اس آیت کی تلاوت، تقریر حکم کے لیے ہوتی تھی، تاکہ ان لوگوں کا رد ہو جائے جن کے دل میں یہ خیالات آتے ہیں کہ اس فحش کام میں بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ملوث ہو سکتے ہیں۔ جب یہ حکم ان کے دلوں میں اچھی طرح بیٹھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تلاوت کو کسی اور حکمت کی بناء پر منسوخ کردیا اور وہ حکمت اس عمل کی قباحت وشناعت اور شیخ وشیخہ سے اس عملِ بد کا صادر ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے یوں بیان کیا کہ یہ عملِ بد کرنا تو کجا اس کا ذکر بھی مناسب نہیں، گویا یہ کام محال امور میں سے ہے جن کا وقوع نہیں ہوتا، جیسے یوں کہا ہو کہ اپنے کانوں کو اس کے سننے سے اور زبانوں کو اس کے ادا کرنے سے پرہیز کرو، بجائے اس کے کہ یوں کہا جائے کہ تم اس عملِ بد سے راہِ فرار اختیار کرو اور اس گندگی سے خود کو ملوث نہ کرو۔

کتب اللہ لنا الحفظ والعصمة، انه ولی کل نعمةٍ وتوفیقٍ

منکرینِ نسخ کے شبہات اور ان کے جوابات

ہم منکرینِ نسخ کو چند انواع میں تقسیم کرسکتے ہیں، ایک تو وہ قسم جو نسخ کے عقلی جواز اور نقلی وقوع دونوں کے منکر ہیں، اور وہ اس دَور کے نصاریٰ ہیں، نیز یہود کا فرقہ شمعونیہ بھی اس میں شامل ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو عقلاً تو اس کے جواز کو مانتی ہے مگر نقلاً منکر ہے۔ اور وہ یہود کا ہی فرقہ عنانیہ ہے۔ اور ایک تیسری قسم ہے جو نسخ کے عقلاً جواز کو بھی مانتی ہے اور نقلاً بھی اس کی قائل ہے لیکن اس بات کی منکر ہے کہ شریعتِ اسلامی یہودیت کے لیے ناسخ ہے۔ اور یہ یہود کے تینوں فرقے یعنی عیسویہ کا نظریہ ہے۔ اور ایک چوتھی قسم بھی ہے جو عقلاً تو جوازِ نسخ کی قائل ہے مگر نقلاً اس کی منکر ہے البتہ اس کا انکار حقیقی نہیں بلکہ صوری اور ظاہری ہے، ان کا جمہور

مسلمانوں سے لفظی یا مشابہ بہ لفظی اختلاف ہے، اس سے مراد ابو مسلم اصفہانی اور ان کے پیرو کاروں کا نظریہ ہے۔

اب ہمارے سامنے وہ لوگ جو عقلاً انکارِ نسخ میں منفرد ہیں وہ دورِ حاضر کے نصاریٰ اور یہود کا فرقہ شمعونیہ ہے اور جو لوگ نقلاً انکارِ نسخ میں باہم متفق ہیں اگرچہ انکار کی کیفیت میں باہم مختلف ہیں، وہ دورِ حاضر کے ہی نصاریٰ، یہود کے فرقے عنانیہ اور عیسویہ اور ابو مسلم اصفہانی اور ان کے متبع دیگر مسلمان لوگ ہیں۔

ان تمام منکرینِ نسخ کے چند شبہات ہیں جن کو وہ اپنے دلائل خیال کرتے ہیں، حالانکہ وہ دلائل نہیں ہیں۔ جیسا کہ عنقریب ہم اس جامع گفتگو میں اس کی وضاحت کریں گے۔

(ا) عقلاً جوازِ نسخ کے منکرین کے شبہات

یقیناً جوازِ نسخ کے عقلاً منکرین کا مذہب زیادہ قبیح، زیادہ راہِ حق سے دُور اور باطل میں زیادہ مبتلا ہے، ان کا محض عقلی جواز کا انکار ہی نسخ کے وقوعِ شرعی کو مستلزم ہے، کیا عقل جس کو محال قرار دے اس کا وجود واقع اور ثابت ہو سکتا ہے؟ اب ہم ان کے شبہات کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کا جواب دیں گے۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب

منکرین کہتے ہیں کہ اگر یہ جائز مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام کو منسوخ کیا کرتے ہیں تو یہ نسخ یا تو کسی حکمت کی وجہ سے ہوگا جو پہلے اس پر مخفی تھی بعد میں ظاہر ہوئی یا پھر بغیر کسی حکمت کے ہوگا، دونوں باتیں باطل ہیں، کیونکہ پہلی بات ہو تو اس سے علام الغیوب ذات کے لیے بدا اور جہل کو ماننا لازم آتا ہے اور دوسری بات ہو تو اس سے حکیم و علیم اور لطیف و خبیر ذات پر عبث کا ماننا لازم آتا ہے، جبکہ بدا اور عبث دونوں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے تجویز کرنا محال ہے اس پر عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں، لہٰذا جو چیز (یعنی جوازِ نسخ) ان دو کا سبب بنے گی وہ بھی محال ہوگی۔؟

اس شبہ کا جواب اس طرح سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام میں سے جو چاہتے ہیں منسوخ کرتے ہیں، اس کا مدار اس حکمت پر ہوتا ہے جو اس ذات کو پہلے سے معلوم ہوتی ہے اس پر پوشیدہ نہیں ہوتی، اور نہ ہی کبھی پوشیدہ ہوگی، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بندوں کے مصالح زمانہ کے تجدد سے متجدد ہوتی رہتی ہیں اور اشخاص و احوال کے بدلتے رہنے سے بدلتی رہتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسرار و حکم لامتناہی ہیں، اس کے سوا اس کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جب وہ ایک حکم سے دوسرے حکم کو منسوخ کرتا ہے تو اس دوسرے حکم میں بھی ایک نئی حکمت ہوتی ہے جو پہلے حکم کی حکمت کے علاوہ ہوتی ہے، اس نئے حکم میں نئی مصلحت پنہاں ہوتی ہے، وہ ذات پاک ہے ہر شے اس کے احاطۂ علم میں ہے۔ معلوم ہوا کہ احکام کو منسوخ کرنے سے اللہ تعالیٰ پر نہ بدا لازم آتا ہے اور نہ ہی عبث کا الزام آتا ہے۔

لیکن لگتا ایسا ہے کہ یہ منکرین اس امر سے غافل ہیں یا دانستہ طور پر غافل بنے ہوئے ہیں، جو شبہ بھی پیش کیا وہ بھی وجوہِ احتمال کو حاوی نہیں بلکہ ناقص درجہ کا ہے، کیونکہ اگر اپنے اس شبہ کو جامع انداز میں پیش کرتے تو یوں کہتے کہ: نسخ یا تو ایسی حکمت کی بناء پر ہوگا جو مخفی ہونے کے بعد اس ذات پر ظاہر ہوئی یا ایسی حکمت کی وجہ سے ہوگا جو اس پر مخفی نہ تھی بلکہ پہلے سے معلوم تھی یا وہ نسخ بغیر کسی حکمت

کے سبب ہوگا، غالباً ان منکرین کو اس سے آگاہی نہ ہوئی، اگر بات کی گہرائی اور سمجھ ہوتی تو انہیں اشتباہ نہ ہوتا اور اگر بالفرض اس کو سمجھ لینے کے بعد انہیں اشتباہ پیش آتا تو ہم اس میں سے دوسری شق اختیار کرتے اور اس پر عقلی ونقلی دلائل دیتے اور مسئلہ کو ثابت کرتے۔

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

منکرینِ نسخ کہتے ہیں کہ اگر یہ بات مان لی جائے کہ اللہ تعالیٰ ایک حکم کو دوسرے حکم کے ذریعہ منسوخ کیا کرتے ہیں تو دو باطل امور میں سے ایک ضرور لازم آئے گا، یا تو جہل لازم آئے گا یا تحصیل حاصل، اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یا تو پہلے حکم کے مؤبد ہونے کا علم ہوگا اور یا پھر اس کے مؤقت ہونے کا علم ہوگا، اگر تو اس کے علم میں ہو کہ یہ حکم ہمیشہ کے لیے برابر جاری رہے گا اور پھر اسے منسوخ کر دے اور اس کو برابر جاری نہ قرار دے تو اس کا علم (نعوذ باللہ) جہل سے منقلب ہو جائے گا اور جہل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا محال ہے۔ اسی طرح اگر اس کے علم میں یہ ہو کہ یہ حکم مؤقت ہے، ایک مقرر مدت تک کے لیے ہے، پھر اس مقرر مدت کے وقت اسے منسوخ کر دے تو یہ الزام آتا ہے کہ مؤقت حکم اپنے وقت کی انتہاء سے خود ہی ختم ہو گیا تھا، لیکن پھر دوبارہ اس کو نسخ کے ذریعہ ختم کرنا تحصیلِ حاصل ہے جو کہ باطل ہے۔

ہم اس شبہ کا دفعیہ اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ (مثلاً) منسوخ حکم مؤقت ہے، مؤبد نہیں ہے، لیکن دوسری طرف اس کے علم میں یہ بھی تھا کہ اس حکم کی تاقیت، ناسخ کے آنے سے ہوگی، کسی اور چیز کی وجہ سے نہ ہوگی، جس طرح حکم اوّل کی دلیل کسی غایت و انتہاء کے ساتھ مقید ہو، لہٰذا اللہ کی ذات کا ناسخ کے ذریعہ اس حکم کی انتہاء کو جاننا نسخ کو مانع نہیں ہے، ناسخ کا آنا اس کے علم سے محقق ہے، اس کے مخالف نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا علم تو اسباب اور مسببات سب سے متعلق ہوتا ہے، ہم ایک موقع پر ثابت کر آئے ہیں کہ "نسخ" اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بیان اور ہماری نسبت سے رفع حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے آپ مت بھولیے۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

منکرینِ نسخ کہتے ہیں کہ نسخ کو جائز ماننے کی صورت میں دو باطل امور میں سے ایک ضرور لازم آتا ہے، یا تو تحصیل حاصل لازم آتا ہے اور یا پھر اسی کے ہم معنی اور مشابہ امر لازم آتا ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ منسوخ حکم یا تو ایسا ہوگا کہ اس کی دلیل کسی غایت و انتہاء کے ساتھ متعلق ہوگی کہ اس غایۃ کے انتہاء سے وہ دلیل بھی منتہی ہو جائے گی اور یا پھر وہ بطورِ نص کے مؤبد ہوگی، اگر تو وہ دلیل کسی غایۃ سے متعلق ہے تو محض اس غایۃ کے وجود سے ہی وہ دلیل منتہی ہو جائے گی تو اس صورت میں نسخ کے ذریعہ اسے ختم کرنے کی ضرورت ہی نہیں ورنہ تحصیل حاصل لازم آئے گا اور اگر حکمِ اوّل کی دلیل مؤبد ہو تو اس صورت میں مؤبد ہونے کے باوجود ناسخ کا آنا تین وجوہ سے محال کو مستلزم ہے:

① دونوں میں تعارض آئے گا کہ مؤبد حکم تو حکم کے باقی رہنے کا تقاضا کرے گا اور نسخ بلاشبہ اس کے منافی ہوگا۔

② اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو حکم کی ابدیت کا افادہ متعذر رہوگا، کیونکہ نسخ کے احتمال کی وجہ سے ہر نص کا افادہ باطل ہو جاتا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کا عجز لازم آئے گا کہ جو حکم اس نے لوگوں کو ابدی طور پر دیا تھا اس سے وہ عاجز ہو گیا، اللہ کی ذات اس سے بلند و برتر ہے۔

③ یہ سب کچھ اس بناء پر لازم آتا ہے کہ شریعتِ اسلامی میں نسخ کے جواز کو تسلیم کیا گیا، جبکہ قائلینِ نسخ کے نزدیک بھی شریعتِ مطہرہ

قیامت کے دن تک باقی رہے گی۔

ہم اس شبہ کا جواب دیتے ہیں کہ: ① منکرینِ نسخ کا منسوخ حکم کو صرف مذکورہ دوصورتوں میں منحصر کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ منسوخ حکم نہ تو مؤقت ہو اور نہ ہی مؤبد، بلکہ وقت کی قید سے بھی اور تابید سے بھی دونوں سے مطلق اور آزاد ہو، بنابریں منکرین کے ذکر کردہ محال امور لازم نہ آئیں گے، بلکہ حکم کا اطلاق ہی نسخ کی صحت وجواز کے لیے کافی ہوگا، کیونکہ وہ ظاہر کے اعتبار سے استمرار اور تسلسل پر دلالت کرتا ہے، خواہ نص اس کو معارض نہ ہو۔

② منکرین کا یہ ذکر کرنا کہ مؤبد حکم کا منسوخ ہونا ممتنع ہوتا ہے، درست نہیں ہے، اور اس پر انہوں نے جن امور کو مستدل بنایا ہے وہ تین وجوہ سے مخدوش ہیں۔

(۱) ان کا یہ استدلال کہ اس سے تعارض لازم آتا ہے، اس طرح مردود ہے کہ خطاباتِ شرعیہ ابتداء سے ہی اس بات سے مقید ہوتے ہیں کہ کوئی ناسخ وارد نہ ہو، اسی طرح وہ اس بات سے مقید ہوتے ہیں کہ مکلف، تکلیف کا اہل ہو، اس پر جنون، غفلت یا موت وغیرہ طاری نہ ہو، لہٰذا ناسخ کا وارد ہونا کسی بھی صورت میں دونوں میں تعارض کا سبب نہ بنے گا۔

(۲) ان منکرین کا یہ استدلال کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے متعذر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے کوئی تابیدی حکم بیان کرے، یہ استدلال بھی مردود ہے، کیونکہ تابیدی حکم ایسا ہے کہ لوگ اسے بآسانی سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اللہ کے خطاباتِ شرعیہ ابدی طور پر ہیں، ہم میں سے ہر ایک اس کا شعور واحساس رکھتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حکمِ اوّل کا باقی رہنا ہی اصل ہوتا ہے، اس حکم سے تاقیت وتابید یا نسخ کا تعلق ایک مرجوح احتمال کا ہوتا ہے، انسان کی طبیعت اصل کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس امر کی تائید عقل وشرع دونوں سے ہوتی ہے۔

(۳) قائلینِ نسخ پر شریعتِ اسلامی میں جوازِ نسخ کا الزام بھی محض ایک عقلی احتمال کا درجہ رکھتا ہے کوئی شرعی احتمال نہیں ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ ہماری بحث اور گفتگو جوازِ عقلی میں ہو رہی ہے نہ کہ جوازِ شرعی میں۔ باقی رہا شریعتِ اسلامی کا دیگر شرعی پہلو سے منسوخ ہونا تو یہ واضح طور پر محال امور میں سے ہے کیونکہ اس پر دلائل موجود ہیں کہ اسلام ہمیشہ رہنے والا عالمگیر دین ہے، جو امر شرعی اعتبار سے محال ہو اس کے بارے میں یہ کوئی مضائقہ یا حرج کی بات نہیں کہ وہ عقلی اعتبار سے جواز کے قبیل سے ہو۔

چوتھا شبہ اور اس کا جواب

نسخ کا جواز اجتماعِ ضدین کو مستلزم ہے، حالانکہ اجتماعِ ضدین محال ہوتا ہے، اس کی توضیح یہ ہے کہ کسی بات کا حکم دینا اس بات کا تقاضا کرتا کہ وہ بات اچھی ہوگی، اللہ کی نظر میں پسندیدہ اور محبوب ہوگی اور اسی طرح کسی بات سے منع کرنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ بات یا کام قبیح اور معصیت والا ہوگا، اللہ کو ناپسندیدہ ہوگا، اب اگر اللہ تعالیٰ کسی بات کا حکم دے کر اس سے پھر منع فرمائیں یا منع کر کے پھر اسی کا حکم دے دیں تو ایک ہی فعل جس سے امر ونہی متعلق ہوتا ہے، اس میں متضاد صفات کا اجتماع لازم آئے گا۔؟

ہم اس شبہ کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کسی کام کا اچھا یا برا ہونا اسی طرح اس کے متعلق امور بھی فعل کی ذاتی صفات میں سے نہیں ہوتے کہ وہ صفات ہمیشہ قائم وثابت رہیں کبھی اس میں تغیر نہ آئے، بلکہ وہ فعل سے امر ونہی کے تعلق کے تابع ہوتی ہیں، بناء بریں وہ فعل، اللہ کو محبوب اور پسندیدہ اس وقت تک ہوگا جب تک کہ وہ مامور من اللہ ہوگا، پھر وہی فعل، اللہ تعالیٰ کو ناپسندیدہ، معصیت

ومکروہ ہوگا جب تک وہ منہی من اللہ ہوگا۔

جو معتزلہ فعل میں حسن وقبح کے عقلی طور پر قائل ہیں وہ اس بات کے معترف ہیں کہ یہ حسن وقبح اشخاص، اوقات اور احوال کے اختلاف سے مختلف ہوتے رہتے ہیں، اس توجیہ سے اجتماع ضدین کی نفی ہو جاتی ہے کیونکہ جس زمانہ اور وقت میں وہ فعل حسن تھا وہ اس وقت کے خلاف اور مغایر ہوتا ہے جس میں وہ فعل قبیح ہوتا ہے، لہٰذا ایک ہی وقت میں ایک فعل میں حسن اور قبح کا جمع ہونا لازم نہ آئے گا۔

(ب) نقلاً جوازِ نسخ کے منکرین کے شبہات

ہم نے اس سے پہلے منکرین کو چند انواع میں منقسم کیا تھا اور کہا تھا کہ ہر منکر کا اپنے دعویٰ اور شبہ کو ثابت کرنے کا خاص طریقہ ہے، لیجئے اب ہم ان کے دعاوی اور شبہات کو پیش کرتے ہیں۔

① فرقہ عنانیہ اور شمعونیہ کا شبہ

یہ لوگ کہتے ہیں کہ تورات جس کو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا وہ ہمارے پاس محفوظ ہے اور تواتر کے ساتھ ہم تک منقول چلی آئی ہے، اس تورات میں یہ ہے کہ: یہ شریعت ہمیشہ رہے گی جب تک کہ آسمان وزمین باقی رہیں گے۔ نیز اس میں یہ بھی ہے کہ یوم السبت کو ہمیشہ لازم پکڑو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخ ممتنع ہے، اس لیے کہ تورات کے کسی حکم کا منسوخ ہونا، خصوصاً یوم السبت کی تعظیم کا حکم، یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا ابطال ہے۔

ہم اس شبہ کا پانچ طرح سے جواب دیتے ہیں:

① اس شبہ سے ان کا مدعیٰ ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ زیادہ سے زیادہ (بصورتِ تسلیم) اس سے شریعتِ موسوی علیہ السلام کا دوسری شریعت کے ذریعہ نسخ کا ممتنع ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر شرائع کے منسوخ ہونا بھی ممتنع ہو۔ ان کا یہ شبہ اس پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ کوئی بعید نہیں کہ یہود اس کا انکار کریں کہ یہودیت سے قبل کی شرائع شریعتِ موسوی کے ذریعہ منسوخ ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان کا دعویٰ مذکورہ دلیل سے جو انہوں نے پیش کی ہے، ثابت نہیں ہوتا۔

② ہمیں ان کا مدعیٰ تسلیم نہیں کہ تورات ان کے پاس محفوظ چلی آرہی ہے تاکہ اس سے ان کا استدلال درست قرار پائے، بلکہ اس بات پر کثرت سے دلائل موجود ہیں کہ اب تورات صحیح کا کوئی وجود باقی نہیں رہا اسے وہ تغیر وتبدل پیش آیا ہے کہ جس نے اسے قصہ پارینہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ تورات کا جو نسخہ سامریوں کے پاس تھا اس کی عمر عنانیوں کے نسخہ کے مطابق ایک ہزار سال سے زائد تھی، اور نصاریٰ کے نسخہ کے مطابق ایک ہزار تین سو سے زائد تھی۔ نیز تورات کے ایک نسخہ میں یہ بات ملتی ہے کہ نوح علیہ السلام نے آدم علیہ السلام تک کے تمام آباء واجداد کا زمانہ پایا ہے، اور یہ کہ انہوں نے آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر تقریباً دو سو سال کا دور پایا ہے۔ دیگر نسخوں کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کی عمر میں سے پچاس سال پائے ہیں، جبکہ تاریخی اعتبار سے یہ سب باطل اور بے بنیاد ہے۔

نیز اس پر ایک دلیل یہ ہے کہ آج ان کے پاس تورات کے جو نسخے موجود ہیں ان میں اللہ تعالیٰ، اس کے انبیاء و رُسل اور فرشتوں کے بارے میں ایسے امور منقول ہیں کہ انسانی عقل انہیں تسلیم کرنے سے انکاری ہے اور طبیعت ناگواری محسوس کرتی ہے۔ اور ان کو سننا اذیت رسانی کا باعث ہوتا ہے، لہٰذا یہ محال ہے کہ وہ کسی پارسا مومن ہی سے صادر شدہ کتاب ہو، چہ جائیکہ وہ کسی ولی کی طرف منسوب کی جائے یا کسی پیغمبر کی طرف منسوب ہو یا اللہ رب العالمین کی طرف منسوب کی جائے۔

جیسا کہ یہ منقول ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو سارے عالم میں طوفان بھیجنے پر بعد میں ندامت ہوئی، نیز یہ کہ وہ اس پر اتنا رویا کہ آنکھیں دُکھنے لگیں، اور یہ کہ یعقوب علیہ السلام سے کشتی ہوئی تو یعقوب علیہ السلام نے اس کو پچھاڑ دیا، اللہ کی ذات ان تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ اسی طرح یہ منقول ہے کہ لوط علیہ السلام نے (نعوذ باللہ) شراب نوشی کی جس سے وہ مدہوش ہو گئے، اور اپنی بیٹیوں سے بدکاری کی (نعوذ باللہ)۔ اسی طرح یہ کہ ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے بچھڑا بنایا تھا اور ان کو کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر اس کی پوجا کرو۔

ایک اور دلیل جس سے ان کا یہ دعویٰ کہ تورات محفوظ اور اپنی اصل شکل میں باقی ہے، کا فساد اور غلط ہونا معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مؤرخین بلکہ خود یہود کے نزدیک یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ بنی اسرائیل، جو کہ تورات کے حاملین اور محافظ تھے، دین سے کئی بار مرتد ہو گئے تھے، بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے، اپنے انبیاء کو بُری طرح قتل کیا کرتے تھے۔ ان کے مذکورہ مطاعن ایسے شنیع و قبیح اور جارحانہ قسم کے ہیں کہ ادنیٰ درجہ کی ثقاہت و عدالت کا حامل شخص بھی ان کا متحمل نہیں ہو سکتا، اور تورات کے نسخوں کو اصلی تورات ہونے کا دعویٰ کرنا بھی کسی قیمت پر درست نہیں قرار دیا جا سکتا، جب تک کہ وہ ان کے رواۃ اور محافظ رہیں گے اور جب تک کہ وہ نسخے ان ہی کے طریق اور روایت سے جانے جائیں گے۔

③ انہوں نے جس تورات پر تواتر کا لباس چڑھایا وہ بھی ہمیں تسلیم نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ تورات تواتر سے ثابت و منقول ہوتی تو یہ لوگ ضرور افضل الانبیاء والرسل ﷺ سے جھگڑتے اور تورات کو لے کر حضور ﷺ کے عمومِ رسالت کے دعویٰ سے معارضہ کرتے کہ حضور ﷺ تورات کو مانتے ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے بلکہ علانیہ طور پر کہتے ہیں کہ میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور خود مسلمانوں کو بھی اس تورات پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، اگر ایسی بات ہوتی تو یقیناً تورات منقول ہوتی اور لوگوں میں مشہور ہوتی، جبکہ اس کے برخلاف منقول اور مشہور یہ ہوا کہ بہت سے علماءِ یہود جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ، انہوں نے ایمان قبول کرتے ہوئے ساری قیادت و سیادت رسول اللہ ﷺ کو دے دی، اور فرمانبرداری اختیار کرتے ہوئے آپ کی شریعت کے تابع ہوئے اور اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ وہی رسول ہیں جس کی تورات و انجیل میں بشارت دی گئی تھی۔

④ جس تابید کے لفظ کا انہوں نے اپنی منقول عبارت میں ذکر کیا ہے وہ بھی ان کے لیے قابل حجت نہیں ہے، کیونکہ یہود کے ہاں اس کا اکثر و بیشتر استعمال غیر حقیقی معنی میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ گائے جس کے ذبح کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا، اس میں یہ الفاظ آئے ہیں ((ھذہ سنة لکم ابدًا)) "یعنی یہ تمہارے لیے ابدی طور پر سنت ہے۔" اور قربانی کے بارے میں یہ الفاظ ہیں:

((قربوا کل یوم خروفین قربانًا دائمًا)).

"یعنی تم ہر روز دائمی طور پر دو بھیڑ بکریاں قربان کیا کرو۔"

حالانکہ خود یہود کا اعتراف ہے کہ یہ دونوں حکم منسوخ ہیں باوجود یکہ ان دونوں کے بارے میں مذکورہ تصریح کے مطابق تابیدی حکم تھا۔

⑤ صحیح قول کی بناء پر مؤبد حکم کا لفظاً منسوخ ہونا جائز ہے، جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بھی اس طرف اشارہ کیا تھا، لہٰذا ان کی ذکر کردہ دونوں عبارتیں بھی منسوخ قرار پانی چاہئیں۔ اور تعارض کا شبہ اس طرح مندفع ہوگا کہ تابید میں ناسخ کا عدمِ ورود شرط ہے، لہٰذا جب ناسخ آ جائے تو تابید کی نفی ہو جائے گی، اور یہ امر واضح ہو جائے گا کہ یہ ابتلاء و آزمائش کے لیے محض لفظی تابید تھی۔

② نصاریٰ کا شبہ

نصاریٰ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ آسمان و زمین کو زوال آ سکتا ہے لیکن میرے کلام کو زوال نہیں آئے گا، اس سے پتہ چلا کہ نقلاً منسوخ ہونا ممتنع ہے۔

ہم اس شبہ کے جواب میں اوّلاً کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بات تسلیم نہیں کہ ان کے پاس جو کتاب موجود ہے وہ وہی انجیل ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، وہ تو ایک تاریخی قصہ گوئی ہے جسے بعض اہل مسیح نے وضع کیا تھا۔ اس میں مسیح علیہ السلام کی حیات، ولادت، نشوونما، دعوت اور ان مقامات کو بیان کیا گیا ہے جہاں وہ آتے جاتے رہے۔ اسی طرح ان کے ہاتھ ظاہر ہونے والے معجزات اور مواعظ و مناظرات کا ذکر ہوا ہے، اسی طرح اس کتاب میں صلیب کا بے بنیاد واقعہ بھی مذکور ہے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ اس کتاب کی صحت، امانت وضبط اور اس کے کاتبین کی عدالت وثقاہت پر کوئی دلیل بھی قائم کرنے سے عاجز وقاصر ہیں۔ اسی طرح وہ اس کی سند کے اتصال اور شذوذ وعلت سے سلامت اور محفوظ ہونے پر بھی کوئی دلیل بیان نہیں کر سکتے بلکہ اس کے برخلاف اس قصے کے نسخوں کا باہم متعارض ہونا علمی طور پر ثابت ہے جس کا انہوں نے اپنے پاس سے انجیل نام رکھ دیا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتے تو اس کی شان یہ ہوتی کہ نہ تو اس کے سامنے سے باطل کا گزر ہوتا اور نہ اس کے پیچھے سے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان سچا ہے:

﴿ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ ﴾ (النساء: ۸۲)

"اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ضرور بہت اختلاف پاتے۔"

اور ہم ثانیاً یہ کہتے ہیں کہ ان کی انجیل کے مذکور الفاظ کا سیاق وسباق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی اس سے مراد اپنی پیشین گوئیاں ہیں کہ عنقریب ضرور وہ پوری ہوں گی، نسخ سے بالکلیہ کوئی تعلق نہیں نہ نفی کا اور نہ اثبات کا، اس لیے کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے پیش آمدہ چند امور بیان کیے، اپنی گفتگو ختم کرنے کے بعد آخر میں یہ جملہ ذکر کیا کہ اس کو مضبوطی سے تھامے رہنا کہ: "آسمان وزمین کو تو زوال آ سکتا ہے، لیکن میرے کلام کو زوال نہیں آئے گا۔" اس میں کوئی شبہ نہیں کلام کی مراد جاننے میں سیاق و سباق کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، ان ہی کے مفسرین نے انجیل کی یہی تشریح کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس جملہ کے عمومی مفہوم پر اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ مسیح علیہ السلام چند احکام کی تصریح کرتے ہیں پھر ان ہی کے برخلاف احکام جاری کر دیتے ہیں۔ جیسے انجیل متی کے مطابق اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ "تم اُمتوں کے راستہ پر نہ چلو اور نہ سامریوں کے شہر میں داخل ہوں بلکہ تم بنی اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں کی طرف جاؤ" یہ اس بات کا کھلا اعتراف ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی رسالت بنی اسرائیل کے لیے مخصوص تھی۔

پھر ایک مرتبہ اس کے برخلاف (انجیل مرقس کے مطابق) فرمایا: "تم سارے عالم میں جاؤ اور انجیل کو اپنانے کی خاطر لے جاؤ۔" اب دوسرا قول پہلے کے لیے ناسخ ہوگا۔

ہم ثالثاً کہتے ہیں کہ اگر مذکورہ جملہ اور اس کے رواۃ بلکہ اس کتاب کو جس میں یہ جملہ مذکور ہے، سب کو درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو تب بھی اس سے یہ بات معلوم اور ثابت نہیں ہوتی کہ نسخ مطلقاً ممنوع ہے، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ مسیحی کے بعض احکام کا نسخ ممتنع ہے۔ اس شبہ سے ان کا مدعیٰ تو ثابت نہیں ہوتا۔

③ فرقہ عیسویہ کا شبہ

یہود کا یہ فرقہ جو ابوعیسیٰ اصفہانی کے متبعین میں سے ہے، یہ کہتا ہے کہ حضور ﷺ کی نبوت و رسالت کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی نبوت کو بہت سے معجزاتِ قاہرہ سے ثابت ومؤید کیا ہے، نیز تورات میں بھی آپ کی آمد کی بشارت آئی ہے، اسی طرح آپ ﷺ کی رسالت کے عموم کو ماننے کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اگر عموم رسالت کو مانا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ آپ ﷺ کی شریعت کی وجہ سے بنی اسرائیل کی شریعت منسوخ ہوگئی، حالانکہ شریعتِ اسرائیلی ابدی ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ تورات میں یہ مذکور ہے کہ یہ شریعت تمہارے لیے ابدی ہے، جب تک کہ آسمان و زمین موجود رہیں گے۔ آنحضور ﷺ تو بس عرب کے لیے رسول ہیں، بناء بریں ان کے اور سابقہ فرقہ کے درمیان اختلاف یہ ہوا کہ ان کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ شریعتِ محمدی ﷺ کی وجہ سے شریعتِ موسوی منسوخ نہیں ہوئی اور جبکہ سابقہ فرقہ کا شبہ ان کے مدعیٰ کو ثابت نہیں کرتا۔ فرقہ عیسویہ کے اس نظریہ سے یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ اس بات کو جائز قرار دیتے ہیں کہ شرائع و ادیان کا نقلی طور پر نسخ ثابت ہے، صرف مذکورہ صورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ ہم ان کے شبہ کا دو طرح سے جواب دیتے ہیں۔

① اس فرقہ نے جو دلیل بیان کی ہے وہ بعینہ ان سے پہلے ذکر کردہ فرقے عنانیہ اور شمعونیہ کی دلیل ہے۔ ہم نے مذکورہ چھ وجوہات سے ان کی دلیل کا کمزور اور لچر ہونا ثابت کیا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت کے علاوہ جو جواب وہاں دیا وہ یہاں بھی ہوگا۔

② ان کا یہ اعتراف کرنا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اللہ نے معجزات کے ذریعہ ان کی نبوت کا اثبات بھی کیا اور تورات میں آپ ﷺ کی آمد کی بشارت آئی ہے، خود ان کے خلاف یقینی طور پر جاتا ہے کہ پھر وہ حضور ﷺ کی لائی ہوئی تمام تعلیمات وہدایات کو بھی مانیں، جس میں آپ ﷺ کی رسالت کا عموم بھی داخل ہے اور ماقبل شرائع کے لیے ناسخ ہونا بھی شامل ہے بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے لیے بھی ناسخ ہونا داخل ہوگا جن کے بارے میں خاص طور سے حضور ﷺ نے فرمایا تھا: "اگر آج میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔"

یہ تو خود ان لوگوں کا ایک کھلی حجت سے انکار ہے اور اپنی ہی بات کو متعارض بنانا ہے کہ آپ ﷺ کہ آپ کی رسالت کو تو مانتے ہیں، لیکن آپ ﷺ کی عموم رسالت کی تصدیق نہیں کرتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ ۝﴾ (الانفال:٦)

"وہ تجھ سے حق بات میں اس کے ظاہر ہو چکنے کے بعد جھگڑتے تھے گویا وہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں۔"

④ ابو مسلم اصفہانی کا شبہ

ابو مسلم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ کے نقل ہونے میں اضطراب پایا جاتا ہے، کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ وہ علی الاطلاق نقلی طور پر وقوعِ نسخ کو نہیں مانتے، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک شریعت کے اندر وقوعِ نسخ کے منکر ہیں۔ جبکہ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ وہ صرف قرآن میں وقوعِ نسخ کے منکر ہیں، اس آخری روایت کو ترجیح دی گئی ہے اور اسے اصح الروایات قرار دیا گیا ہے، اور اس بارے میں جو تاویلات ابو مسلم سے منقول ہیں وہ قرآن کے منسوخات کی حد تک ہیں اس سے باہر نہیں ہیں، اور پہلی روایت کو بعید ترین روایت قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ عام مسلمان سے بھی اس طرح کی بات کا ثابت ہونا کوئی معقول بات نہیں چہ جائیکہ وہ عالم ہو ابو مسلم کی طرح کہ وہ وقوعِ نسخ کا مطلقاً منکر ہو، اس سے خلاصی کی یہی صورت ممکن ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اصل مسئلہ شاید تسمیہ کا ہے یعنی جس امر کو مثلاً ہم نسخ کہتے ہیں وہ اسے تخصیص کا نام دیتے ہوں، بعض محققین نے یہی رائے اختیار کی ہے اس طرح مسئلہ کی شدت میں کمی آئے گی۔

تاج سبکی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: "ابو مسلم اس معنی کے وقوع کے منکر نہیں ہیں جسے ہم نسخ سے موسوم کرتے ہیں، بلکہ وہ اسے نسخ کا نام دینے کی بجائے تخصیص سے نامزد کرتے ہیں۔" ابو مسلم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے:

﴿لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ۴۲)

"جس میں نہ آگے اور نہ پیچھے سے غلطی کا دخل ہے حکمت والے تعریف کئے ہوئے کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔"

ابو مسلم کا اس آیت سے استدلال اس طرح سے ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے احکام کبھی باطل نہیں ہوں گے، جب کہ نسخ، حکمِ سابق کے ابطال کا نام ہے۔

ہم ابو مسلم کے شبہ اور مذہب کا چار وجوہ سے جواب دیتے ہیں:

① اگر آیت میں لفظ "باطل" کا معنی یہ ہو کہ اس کی قرآنیت کو باقی رکھتے ہوئے اس پر عمل متروک ہو جاتا ہے، تو اس صورت میں ان کی دلیل ان کے مدعیٰ سے قاصر ہو گی، کیونکہ اس صورت میں آیتِ ہذا صرف مخصوص قسم کے نسخ کے ممتنع ہونے پر دلالت کرتی ہے، یعنی نسخ الحکم دون التلاوۃ، اس طرح وہ اکیلے شخص ہوں گے جو قرآن میں متروک العمل کے وجود کے قائل ہوں گے، باقی رہا نسخ التلاوۃ مع الحکم یا مع بقاء الحکم کی صورتیں تو اس تاویل کے مطابق اس کے امتناع پر آیتِ مذکورہ دلالت نہیں کرتی ہے۔

② مذکورہ آیت میں "باطل" کا معنی ہے کہ جو حق کے خلاف ہے، حالانکہ نسخ امرِ حق ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے عقائد، عقل کے مطابق ہیں اور اس کے احکام، حکمت سے وابستہ ہیں اور اس کے اخبار واقع کے مطابق ہیں اور اس کے الفاظ ہر طرح کے تغیر و تبدل سے محفوظ ہیں۔ ممکن نہیں کہ قرآن میں کسی صورت بھی خطا اور غلطی کا گزر ہو جائے جیسا کہ فرمایا:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹)

"یقیناً ہم نے ذکر کو اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

نیز ارشاد ہے: ﴿وَبِالْحَقِّ أَنزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ۗ﴾ (الاسراء: ۱۰۵)

"اور ہم نے اس قرآن کو سچائی سے نازل کیا اور وہ سچائی سے ہی نازل ہوا۔"

آپ نے اس بات کا ادراک کیا ہوگا کہ آیت مذکورہ کی اس تفسیر سے نسخ کا اثبات اور وقوع اس کی نفی اور امتناع کی نسبت زیادہ بہتر طور پر معلوم ہورہا ہے، اس لیے کہ "نسخ" حقیقت میں ایک حکیم ذات کے تصرف کا نام ہے جس کا تقاضا ہے کہ اس میں کوئی حکمت ومصلحت موجود ہو۔

③ اگر ہم بالفرض یہ کہیں کہ ابومسلم اصفہانی رحمہ اللہ کا جمہور مسلمانوں سے اختلاف ایک لفظی اختلاف ہے جوصرف نام رکھنے کی حد تک ہی ہے، تب بھی ہم ان کا مؤاخذہ کریں گے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اختیار کردہ لفظ (نسخ) کے مقابلہ میں اپنی رائے قائم کر کے بڑی جسارت سے کام لیا ہے، اس طرح انہوں نے بے ادبی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (البقرہ:۱۰۶)

"ہم جو آیت منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے برابر لے آتے ہیں۔"

کیا اللہ تعالیٰ کے اختیار کردہ ایک لفظ کے بعد بھی کسی کو کوئی اور لفظ اختیار کرنا چاہیے؟ کیا قرآن کی تعبیر سے بھی اعلیٰ کوئی تعبیر ہوسکتی ہے؟۔

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (البقرہ:۳۲)

④ نسخ اور تخصیص میں چند فرق ہیں، اس سے قبل تفصیل سے ہم بیان کر چکے ہیں، اگر چاہیں تو مراجعت کرلیں، اس سے آپ کو ہمارے ان صاحب کی بے راہ روی کا پتہ چلے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بے راہ روی اور کج روی اختیار کرنے سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

اہم بات ○ بعض جدید اور قدیم اہل علم نے ابومسلم اصفہانی رحمہ اللہ کی پیروی میں کچھ رطب ویابس جمع کیے ہیں جس سے کچھ بنے اور غلط شبہات اسلام کے حکم نسخ کے بارے میں پھیل گئے ہیں، اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ مذکورہ وہی شبہات ہیں جن کا ہم دفعیہ کر آئے ہیں، اس لیے ہم تکرار سے بچنے اور خصومت کے پھیلنے سے اجتناب اور سلامتی کے ساتھ حقیقتِ امر تک رسائی کی چاہت کی خاطر مذکورہ امور پر ہی اکتفاء کرتے ہیں۔

معرفتِ نسخ کے طریقے

نسخ کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ شارع کی طرف سے دو ایسی دلیلیں پائی جائیں جن کے درمیان حقیقی طور پر تعارض موجود ہو، وجوہ تاویل کی کسی بھی صورت سے ان کے درمیان تطبیق ممکن نہ ہوتی ہو تو ایسی صورت میں لامحالہ ان میں سے ایک کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ قرار دیں گے، تاکہ شارع حکیم کے کلام میں پائے جانے والے تعارض وتناقض کو دور کیا جاسکے، لیکن متعین طور پر کس دلیل کو ناسخ اور کس کو منسوخ شمار کریں گے؟ یہ تو ایسی بات ہے کہ اس میں عقل اور خواہش نفس کا دخل نہیں کہ اس کے ذریعہ کوئی حکم لگایا جائے۔ بلکہ ایسے موقع پر کسی دلیل صحیح کا پایا جانا ضروری ہے کہ جس سے معلوم ہو کہ یہ امر دوسرے سے متاخر ہے، اس وقت سابق حکم کو منسوخ اور لاحق کو ناسخ کہیں گے، اس کی تین صورتیں ہیں:

① دونصوص میں سے کسی ایک میں کوئی ایسی بات ہو جو متاخر امر کی تعیین پر دلالت کرتی ہو، اس کی مثال، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۚ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (المجادلہ: ۱۳)

"کیا تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے، پھر جب تم نے نہ کیا اور اللہ نے تمہیں معاف بھی کر دیا تو (بس) نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبر دار ہے۔"

نیز جس طرح یہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (الانفال: ٦٦)

"اب اللہ نے تم سے بوجھ ہلکا کر دیا اور معلوم کر لیا کہ تم میں کس قدر کمزوری ہے بس اگر تم میں سو ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

اسی طرح اللہ کے نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ:

"میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے منع کیا تھا، اب تم قبروں کی زیارت کر لیا کرو، لیکن بُری بات نہ کہو۔" [1]

② کسی بھی دور میں امت اسلامیہ کا دو نصوص میں سے ایک کے مقدم اور دوسرے کے مؤخر ہونے پر اجماع منعقد ہو جائے۔

③ کسی صحابی رسول سے صحیح طریق سے کوئی قول آ جائے جس سے دو متعارض نصوص میں سے ایک کے سابق اور دوسرے کے متاخر ہونے کی تعیین معلوم ہو جائے، مثلاً وہ صحابی رضی اللہ عنہ یوں کہے کہ: یہ آیت اس آیت کے بعد نازل ہوئی یا یہ آیت اس آیت سے پہلے نازل ہوئی یا وہ یوں کہے کہ یہ آیت فلاں سال میں نازل ہوئی اور اس متعارض آیت کا مقدم ہونا یا مؤخر ہونا معروف ہو۔

باقی کسی صحابی رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ: "یہ ناسخ اور یہ منسوخ ہے" نسخ کی دلیل نہیں بنے گا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس صحابی سے یہ بات خطا اجتہادی سے صادر ہو گئی ہو اور انہیں علی التعیین حکم سابق اور حکم لاحق معلوم نہ ہو سکا ہو، جبکہ ابن الحصار رحمہ اللہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

اسی طرح درج ذیل صورتوں کا بھی ناسخ اور منسوخ کی معرفت میں اعتبار نہیں ہوگا۔

(ا) کسی مجتہد کا بغیر سند اور ثبوت کے اجتہاد کرنا، اس لیے کہ اس کا اجتہاد حجت نہیں ہے۔

(ب) کسی مفسر کا بغیر دلیل کے یہ کہنا کہ یہ ناسخ ہے اور یہ منسوخ ہے، اس لیے کہ کسی مفسر کا ایسا قول حجت اور دلیل نہیں ہے۔

(ج) مصحف کے اندر ایک نص کا دوسری نص سے پہلے موجود ہونا، کیونکہ مصحف کی ترتیب، ترتیب نزولی کے مطابق نہیں ہے۔

(د) ایک کا راوی صغارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہو اور دوسرے کا کبارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہو تو بھی یہ حکم نہیں لگائیں گے کہ صغیر راوی کی حدیث کبیر راوی کی حدیث سے متاخر ہے۔ اس لیے کہ عین ممکن ہے کہ صغیر راوی نے اس شخص سے منسوخ حکم کو روایت کیا ہو جو صحبتِ رسول ﷺ میں مقدم ہو اور دوسری طرف ہو سکتا ہے کہ صغیر راوی کا منسوخ حکم کے سننے کے بعد کبیر راوی نے رسول اللہ

① رواہ مالک فی الموطا، ضحایا (۸)

ﷺ سے ناسخ حکم کو سنا ہو، جس کی وجہ دونوں میں زمانی فاصلہ یا ناسخ و منسوخ دونوں کا متاخر ہونا ہے۔

(ھ) دو راویوں میں سے ایک دوسرے سے پہلے اسلام لایا ہو، پھر بھی یہ حکم نہیں لگائیں گے کہ سابق الاسلام کی روایت منسوخ اور بعد والے کی روایت ناسخ ہے، کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہو۔

(و) دو راویوں میں سے ایک ایسا ہو کہ اس کی صحبت حضور ﷺ سے منقطع ہو گئی ہو کیونکہ یہ امر محتمل ہے کہ جس راوی کی صحبت باقی ہے اس کی حدیث اس سے سابق اور مقدم ہو جس کی صحبت منقطع ہو گئی ہے۔

(ز) دو نصوص میں سے ایک نص تو براءتِ اصلیہ کے مطابق ہو اور دوسری مطابق نہ ہو، کیونکہ بسا اوقات ایسی صورت میں احتمال ہوتا ہے کہ جو اس کے موافق ہے وہ سابق ہو اور جو متاخر ہے وہ لاحق ہو، حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے، کیونکہ جو روایت براءتِ اصلیہ کے خلاف ہو اس کے اس پر مقدم ہونے سے کوئی امر مانع نہیں ہے جو اس براءتِ اصلیہ کے مطابق ہو۔ اس کی مثال آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا وُضُوءَ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ)).①

اب اس کے لیے لازم نہیں کہ اس سے پہلے ما مسّت النار سے ایجابِ وضو کا حکم آیا ہو اور ایسا حکم، عظیم حکمت سے خالی نہیں ہوگا، اور وہ حکمت یہ ہے کہ تشدید میں مبتلا کرنے کے بعد بندوں کے لیے تخفیف پیدا ہو۔

قانونِ تعارض

تعارض کے مسئلہ میں ہم آپ کے سامنے یہ قانون بیان کرتے ہیں کہ دو متعارض نصوص یا تو قطعی اور ظنی ہونے میں متفق ہوں گی یا مختلف ہوں گی کہ ان میں سے ایک قطعی اور دوسری ظنی ہوگی، اگر دونوں مختلف ہوں تو ان میں نسخ نہیں ہوگا، کیونکہ قطعی نص، ظنی سے زیادہ قوی ہوتی ہے، لہٰذا قطعی کو لے لیا جائے گا، یقینی امر کو ظن کی وجہ سے ترک نہیں کرتے۔ اور اگر دونوں نصوص متفق ہوں تو اگر بین قابلِ اعتماد طریقوں میں سے کسی طریقے سے ان میں سے ایک کا دوسرے سے متاخر ہونا معلوم ہو جائے تو وہ متاخر حکم ناسخ اور دوسرا منسوخ ہوگا اور اگر اس طرح نہ معلوم ہوتا ہو تو توقف اختیار کرنا ضروری ہوگا، بعض کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں ان پر عمل کرنے میں اختیار دے دیا جائے گا۔

یہ سب اس صورت میں ہے کہ جب تخصیص و تاویل کی کسی صورت سے بھی دو نصوص میں جمع و تطبیق نہ ہو سکے۔ بصورتِ دیگر دونوں میں تطبیق دینا ضروری ہے۔ کیونکہ دونوں دلیلوں پر عمل کرنا بہ نسبت اس کے بہتر ہے کہ ایک پر عمل کیا جائے اور دوسرے کو ترک کر دیا جائے۔ نیز احکام میں اصل بھی یہی ہے کہ حکم کو باقی مانا جائے، منسوخ نہ مانا جائے لہٰذا کسی واضح دلیل کے بغیر اس اصل پر عمل کو ترک کرنا مناسب نہ ہوگا۔

نسخ کن امور کو شامل ہوتا ہے؟

نسخ کی تعریف میں جو یہ بات آئی کہ نسخ کہتے ہیں "رفع حکم شرعی بدلیل شرعی" اس سے معلوم ہوا کہ نسخ صرف احکام میں ہوتا ہے۔ اتنی بات میں تو قائلینِ نسخ کے درمیان اتفاق ہے، خصوصاً عبادات و معاملات کے فروع میں تو اتفاق ہے، لیکن ان فروع کے علاوہ دیگر عقائد، بنیادی اخلاقیات،

① رواه البخاري في كتاب الأطعمة، باب (٥٣) ومسلم في كتاب الحيض حديث (٩٠) واحمد (٤٦٢/١)

اصولِ عبادات و معاملات اور خالص اخبار کے مدلولات میں جمہور علماء کی درست رائے کے مطابق ان میں نسخ نہیں ہوتا۔

عقائد میں تو اس لیے نہیں ہوتا کہ عقائد صحیح ثابت شدہ حقائق ہوتے ہیں، تغیر و تبدل کو قبول نہیں کرتے۔ للہذا یہ امر بدیہی ہے کہ ان کے ساتھ نسخ متعلق نہیں ہوسکتا۔ باقی بنیادی اخلاقیات کا بھی امر واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ہی منفعت کی خاطر اس کا حکم دیا ہے کہ وہ ان کو اپنائیں۔ مرورِ زمانہ کی وجہ سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نیز اشخاص اور امتوں کے بدلنے سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی کہ اس تبدیلی کی وجہ سے نسخ ان اخلاقیات کو بھی شامل ہو جائے۔ باقی رہے اصولِ عبادات و معاملات میں نسخ نہ ہونے کی وجہ، تو لوگ تزکیہ نفس اور تطہیر نفس کی وجہ سے ان امور کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں، نیز مخلوق کا خالق سے تعلق بھی اس کا سبب ہے۔ للہذا نسخ کے ذریعہ ان اصولِ عبادات و معاملات کو رفع کرنے کی کوئی وجہ حکمت معلوم نہیں ہوتی۔ باقی رہے خالص اخبار کے مدلولات کا منسوخ نہ ہونا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو منسوخ ماننے سے شارع کا ناسخ و منسوخ دو خبروں میں سے کسی ایک میں کاذب ہونا لازم آتا ہے جو کہ عقلاً و نقلاً محال ہے۔ عقلاً تو اس لئے کہ کذب ایک نقص ہے، اور نقص اللہ تعالیٰ پر محال ہے اور نقلاً اس لئے کہ اس طرح کے ارشاداتِ ربانی موجود ہیں:

﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (النساء: ۱۲۲) نیز ﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ (النساء: ۸۷)

ہاں البتہ مدلول کے بغیر لفظ خبر کا نسخ ان لوگوں کے ہاں بالا جماع جائز ہے جو نسخ کے قائل ہیں۔ اسی لئے دو صورتیں ہیں:

(۱) ایک صورت یہ کہ کوئی آیت کسی چیز کی خبر دینے کے لیے نازل ہو پھر اس کی صرف تلاوت منسوخ ہو جائے۔ اور دوسری صورت یہ کہ شارع ہمیں کسی چیز کو بیان کرنے کا حکم دے پھر ہمیں اس کو بیان کرنے سے منع کر دے۔

لیکن جو خبر خالص اخبار میں سے نہ ہو بایں طور کہ وہ انشاء کے معنی و مفہوم میں ہو اور ایسے امر یا نہی پر دلالت کرے جس کا عملی فرعی احکام سے تعلق ہو تو اس کے نسخ اور اس کے ذریعہ نسخ کے جواز میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ کیونکہ اعتبار معنی کا ہوتا ہے لفظ کا نہیں۔ خبر بمعنی امر کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا﴾ (یوسف: ۴۷)

"تم سات برس لگاتار کھیتی کرو گے۔"

خبر بمعنی نہی کی مثال، جیسے فرمانِ الٰہی ہے:

﴿اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّ الزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ﴾ (النور: ۳)

"بدکار مرد سوائے بدکار عورت یا مشرکہ کے نکاح نہیں کرے گا اور بدکار عورت سے سوائے بدکار مرد یا مشرک کے اور کوئی نکاح نہیں کرے گا۔"

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم خود بھی مشرکہ عورت اور بدکار عورت سے نکاح نہ کرو ﴿لَا تَنْكِحُوْا﴾ میں تاء کے فتح کے ساتھ جب پڑھا جائے۔ اور ﴿لَا تُنْكِحُوْا﴾ میں تا کے ضمہ کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ تم ان کا دوسرے سے بھی نکاح نہ کرواؤ۔ لیکن یہ احتمال کی بعض وجوہ کی صورت میں ہے۔ باقی عبادات و معاملات کے اصول اور ان کے فروع کے درمیان فرق یہ ہے کہ فروع کا تعلق ہیئت و

شکل، مکان و زمان اور تعداد کے ساتھ ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ فروع ان کی کیفیات و کمیات ہیں اور اصول سے مراد ان عبادات و معاملات کی ذات ہے، ان کی کمیت و کیفیت سے قطع نظر۔

جاننا چاہیے کہ ہم نے جو بات طے کی کہ نسخ صرف فرعی عملی احکام میں منحصر ہے دوسری قسم کے احکام میں نسخ نہیں ہوتا تو یہی درست رائے ہے کہ دل بھی اس سے مطمئن ہوتا ہے اور دلیل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس بارے میں بلاوجہ نزاع کیا ہے، ہم ان کی گفتگو سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

جیسے ایک شاعر کہتا ہے کہ ؎

و لیس کل خلاف جاء معتبرا ۔۔ الا خلاف له حظ من النظر

"یعنی ہر اختلاف قابلِ اعتبار نہیں ہوتا، سوائے ایسے اختلاف کے جس کا غور و فکر سے کوئی تعلق ہو۔"

مزید براں یہ کہ جن امور میں ہم نے واضح کیا کہ نسخ نہیں ہوتا اس میں ادیانِ الٰہیہ بھی شامل ہیں، کیونکہ وہ عقائد، بنیادی اخلاق، اصولِ عبادات و معاملات اور خالص اخبار کے بارے میں متحد ہوتے ہیں کہ نسخ اور نقص کو قبول نہیں کرتے۔ اگر آپ دلائل کے خواہش مند ہیں تو قرآنِ کریم کی چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔

① ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (الشوریٰ: ۱۳)

"تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا کہ جس کا نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور اسی راستہ کی ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اور اسی کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو حکم دیا تھا کہ اسی دین پر قائم رہو اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔"

② ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء: ۲۵)

"اور ہم نے تم سے پہلے ایسا کوئی رسول نہیں بھیجا جس کی طرف یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا اور کوئی معبود نہیں سو میری ہی عبادت کرو۔"

③ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (البقرہ: ۱۸۳)

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے۔"

④ ﴿وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾ (الحج: ۲۷)

"اور لوگوں میں حج کا اعلان کردے کہ تیرے پاس پا پیادہ اور پتلے دبلے اونٹوں پر دور دراز راستوں سے آئیں۔"

⑤ ﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ (المائدہ: ۲۷)

"تو اہلِ کتاب کو آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں کا قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنا دے جب ان دونوں نے قربانی کی، اُن میں سے

ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی نہ ہوئی۔ اس نے کہا میں تجھے مار ڈالوں گا تو اس نے جواب دیا اللہ پرہیز گاروں ہی سے قبول کرتا ہے۔"

⑥ ﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ﴾ (المائدہ:۴۵)

"اور ہم نے ان پر اس کتاب میں لکھا تھا کہ جان بدلے جان کے اور آنکھ بدلے آنکھ کے اور ناک بدلے ناک کے اور کان بدلے کان کے اور دانت بدلے دانت کے اور زخموں کا بدلہ ان کے برابر ہے۔"

⑦ ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ﴾ (آل عمران:۹۳)

"بنی اسرائیل کے لیے سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں مگر وہ چیز جو اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کی تھی۔"

⑧ ﴿اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ﴾ (القصص:۲۷)

"میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا تجھ سے نکاح کر دوں اس شرط پر کہ تو آٹھ برس تک میری نوکری کرے۔"

⑨ ﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ (النساء:۱۶۰)

"یہود کے گناہوں کے سبب سے ہم نے ان پر بہت سی پاک چیزیں حرام کر دیں جو ان پر حلال تھیں۔"

⑩ ﴿وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ یَعِظُهٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (لقمان:۱۳) (قصہ لقمان کے آخر تک)

"اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیٹا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔"

نسخ فی القرآن کی انواع

نسخ فی القرآن کی تین انواع ہیں:

نسخ التلاوۃ والحکم معًا، نسخ الحکم دون التلاوۃ اور نسخ التلاوۃ دون الحکم۔

① **نسخ التلاوہ والحکم معًا** پر تو تمام قائلین نسخ مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

نیز اس کے وقوع پر نقلی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں:

((كَانَ فِيمَا أُنْزِلَ مِنَ الْقُرْآنِ عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُومَاتٍ فَتُوُفِّيَ رَسُولُ

اللہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُنَّ فِیْمَا یُقْرَأُ مِنَ الْقُرْاٰنِ))۔[1]

"اس بارے میں جو قرآن میں نازل کیا گیا وہ دس مقرر شدہ گھونٹ تھے جو حرام کر دیے تھے پھر ان کو پانچ مقرر گھونٹوں سے منسوخ کر دیا گیا رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے اور یہ اسی طرح قرآن میں پڑھا جاتا ہے۔"

یہ حدیث صحیح ہے۔ اگر موقوف علی عائشہ بھی ہو تو حکم میں مرفوع کے ہو گی۔ کیونکہ اس طرح کے امور رائے اور عقل سے متصور نہیں ہو سکتے، بلکہ اس پر توقف ضروری ہوتا ہے۔ آپ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ جملہ ((عشر رضعاتٍ معلوماتٍ یحرمن)) مصحف میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے کہ اس کی تلاوت کی جاتی ہو، اور نہ ہی اس سے مستفاد حکم پر عمل باقی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ تلاوت اور حکم دونوں کا ایک ساتھ منسوخ ہونا واقع ہے۔ جب نسخ کا وقوع ثابت ہوا تو اس کا جواز بھی ثابت ہوگا، کیونکہ کسی چیز کا وقوع اس کے جواز کی پہلی دلیل ہوتا ہے اور اس سے ان لوگوں کا مذہب باطل ہونا ثابت ہوا جو شرعاً نسخ کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ جیسے ابو مسلم وغیرہ۔

② **نسخ الحکم دون التلاوۃ** ٭ اس نوع کے وقوع پر بھی بہت سی آیات دلالت کرتی ہیں: مثلاً پیغمبر ﷺ سے سرگوشی کرنے سے قبل صدقہ وخیرات والی آیت:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقَةً﴾ (المجادلہ: ۱۲)

"اے ایمان والو جب تم رسول (ﷺ) سے سرگوشی کرو تو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دے لیا کرو۔"

اب یہ آیت، اس فرمانِ الٰہی کے ذریعہ منسوخ ہے:

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ﴾ (المجادلہ: ۱۳)

"کیا تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے پھر جب تم نے نہ کیا اور اللہ نے تمہیں معاف بھی کر دیا تو (بس) نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔"

مطلب یہ کہ پہلی آیت دوسری آیت کی وجہ سے منسوخ ہوئی حالانکہ دونوں کی تلاوت اپنی جگہ باقی ہے۔

نیز مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ﴾ (البقرہ: ۱۸۴) یہ آیتِ کریمہ اس فرمانِ الٰہی سے منسوخ ہے: ﴿فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ﴾ (البقرہ: ۱۸۵) اب ان آیات میں بھی پہلا حکم دوسرے حکم سے منسوخ ہے لیکن دونوں کی تلاوت باقی ہے۔

③ **نسخ التلاوۃ دون الحکم** ٭ کی صورت کے وقوع پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی وہ صحیح روایت دلالت کرتی ہے جس میں وہ دونوں فرماتے ہیں کہ:

((کان فیما انزل من القراٰن: "الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھا البتة"))۔[2]

---

① رواہ مسلم فی الرضاع حدیث (۲۵)، وابوداؤد فی النکاح باب: (۱۰) ومالک فی الرضاع (۱۸)

② رواہ ابوداؤد فی الحدود (۱٦) وابن ماجۃ فی الحدود (۹) ومالک فی الحدود (۱۰) واحمد (۵/ ۱۸۳)

آپ خوب جانتے ہیں کہ اس آیت کا وجود نہ تو مصحف میں ہے اور نہ ہی قراء کی زبانوں پر اس کی تلاوت ہے، جبکہ اس کا حکم باقی ہے، منسوخ نہیں ہے۔ اسی طرح اس نوع کے وقوع پر اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی یہ صحیح روایت بھی دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

((کانت سورۃ الاحزاب توازی سورۃ البقرۃ أو اکثر)). ①

"یعنی سورۃ الاحزاب، سورۃ البقرہ کے برابر یا اس سے بڑی تھی۔"

حالانکہ اس قدر آیات کہ جس کی تلاوت منسوخ ہو عموماً ایسے اعتقادی احکام سے خالی نہیں ہوتیں جو نسخ کو قبول نہیں کرتی۔ نیز اس کے وقوع پر رضاع والی آیت ناسخہ بھی دلالت کرتی ہے، پہلی نوع میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ نیز اس کے وقوع پر ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی صحیح روایت بھی دال ہے کہ:

((انهم كانوا يقرؤون سورة على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فى طول سورة براءة، و انها نسيت الا اٰية منها، و هى "لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغَى ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلَى مَنْ تَابَ")). ②

جب نسخ کی ان دو انواع کا وقوع ثابت ہوا تو ان کا جواز بھی ثابت ہو گیا، کیونکہ کسی چیز کا وقوع اس کے جواز کی سب سے بڑی دلیل ہوا کرتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کا رد ہو گیا جو شرعاً نسخ کے جواز کے قائل نہیں ہیں، جیسے ابومسلم وغیرہ۔ اسی طرح ان لوگوں کا بھی رد ہو گیا جو عقلاً اس کے قائل نہیں ہیں۔ جیسے معتزلہ کا ایک گروہ جو جماعت سے الگ ہو گیا تھا، جس کا زعم یہ تھا کہ عقلی طور پر نسخ کی مذکورہ دونوں انواع کا جواز محال ہے۔ معتزلہ سے الگ ہونے والے اس گروہ کو نسخ کے عقلی جواز پر آپ یہ دلیل بھی دے سکتے ہیں اور اس طرح ان کو لاجواب کر سکتے ہیں کہ: قرآنی نصوص سے جو احکام متعلق ہوتے ہیں، مثلاً اس کے الفاظ کی تلاوت کا منجملہ عبادات میں سے ہونا، اس کے ذریعہ نماز کا جائز ہونا، جُنبی کے لیے اس کے پڑھنے اور چھونے کا حرام ہونا وغیرہ، ان امور کی پوری پوری مشابہت ہے اس کے مدلول یعنی وجوب اور حرمت وغیرہ سے جو اس کے متعلق ہوتے ہیں کہ مذکورہ امور میں سے ہر ایک شرعی حکم ہے جس کا آیتِ کریمہ سے تعلق ہے، جو کبھی تو تمام کے نسخ کی مصلحت کا تقاضا کرتی ہے اور کبھی اس بات کا کہ مذکورہ امور میں سے کچھ تو منسوخ ہوں اور کچھ نہ ہوں، معلوم ہوا کہ کوئی آیت ایسی ہو سکتی ہے کہ جس کی تلاوت اور حکم دونوں ایک ساتھ منسوخ ہوں، ایسی بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی تلاوت تو منسوخ ہو جائے لیکن حکم منسوخ نہ ہو، اور ایسا بھی ممکن ہے کہ حکم منسوخ ہو تلاوت منسوخ نہ ہو۔

جب یہ بات ثابت ہوئی تو مذکورہ گروہ جو معتزلہ سے جُدا ہوا جس نے نسخ کی مذکورہ دو انواع کو عقلی طور پر محال خیال کیا تھا، اس کی تردید ہو جاتی ہے۔

---

① اخرجه ابن حبان فى صحيحه.

② اخرجه البخارى فى الرقاق (١٠) و مسلم فى الزكاة (١١٦) و الترمذى فى المناقب (٣٢)، والدارمى فى الرقاق (٦٢) و احمد (١١٧/٥)

مانعینِ نسخ کے شبہات اور ان کے جوابات

افادۂ عام کی خاطر ہم ان کے شبہات کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ایک ایک شبہ کا جواب بھی دیں گے۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب

ان کا کہنا ہے کہ آیت اور اس سے مستفاد حکم دونوں کا آپس میں منطوق اور مفہوم والا تلازم اور تعلق ہوتا ہے، لہٰذا کسی ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ جواب یہ ہے کہ آیت اور اس کے حکم کے مابین تلازم اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ کوئی معارض (ناسخ) موجود نہ ہو، لیکن جب ناسخ پایا جائے گا تو تلازم ختم ہو جائے گا، اور ایسی صورت میں حکم ناسخ کے لیے ہوگا، چاہے تو حکم کو ختم کر کے تلاوت کو باقی رکھے یا چاہے تو اس کے برعکس معاملہ کرے اور چاہے تو دونوں کو ایک ساتھ ختم کر دے، یعنی حکمت و مصلحت کا جیسا تقاضا ہوگا ویسا کیا جائے گا۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ کسی لفظ کے منطوق اور اس کے مفہوم کے درمیان تلازم اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ اس میں کوئی تعارض موجود نہ ہو، لیکن جب منطوق، مفہوم کے معارض پایا جائے گا تو اس وقت مفہوم معطل ہوگا اور صرف منطوق پر عمل برقرار رہے گا۔

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

منکرینِ نسخ کہتے ہیں کہ اگر حکم کو منسوخ اور تلاوت کو باقی مانا جائے تو اس سے کلامِ الٰہی کا تعطل لازم آتا ہے، یہ ایک ایسا نقص اور عیب ہے کہ کوئی عقل مند شخص بھی اپنے کم تر قسم کے کلام کے بارے راضی نہیں ہوسکتا تو بھلا اللہ تعالیٰ اپنے افضل ترین کلام کے بارے میں ایسے عیب پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ ہم اس لزوم کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک آیت کا حکم منسوخ اور اس کی تلاوت باقی اور برقرار بھی رہے تب بھی وہ مفید اعجاز ہوتی ہے اور لوگوں کے لئے ذریعہ عبادت رہتی ہے، بلکہ وہ آیت بندوں پر اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت کی یادگار بن کر رہتی ہے کہ اس ذات نے ہر وقت احکام کی حکمت و مصلحت کے طریقے کو جاری رکھا۔ علاوہ ازیں آیت منسوخ الحکم کے بعد بھی عام طور پر عقیدے کی دعوت، نیک عمل یا اچھی عادت کی ترغیب وغیرہ پر ضرور مشتمل ہوتی ہے تو حکم کی منسوخی سے اس طرح کی چیزیں منسوخ نہیں ہوتیں بلکہ ایسی آیت اس کے لئے مفید ہوتی ہیں کیونکہ نسخ کا اس سے تعلق نہیں ہوتا۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی حکم منسوخ کر دیا جائے لیکن اس کی تلاوت کو باقی رکھا جائے تو اس طرح مکلف اُلجھن میں پڑے گا، اور اس سے لوگ غلط اعتقاد میں مبتلا ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بات محال ہے کہ وہ اپنے بندوں کو تردّد اور شک میں مبتلا کرے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ تب درست مانا جاسکتا ہے جب اللہ تعالیٰ اس نسخ پر کوئی دلیل قائم نہ کریں، لیکن جب اس پر دلائل قائم ہوں تو پھر نہ تو کسی جاہل کے لیے کوئی عذر رہتا ہے اور نہ تلبس و تشکیک کا موقع باقی رہتا ہے، کیونکہ جس ذات نے پہلا حکم مشروع کیا اور اس کا اعلان کیا اسی ذات نے ناسخ کا اعلان کر کے بتایا کہ اب اس نے اسے منسوخ کر دیا ہے اور اٹھا لیا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (الانعام:۱۴۹)

"کہہ دو کہ پس اللہ کا الزام پورا ہو چکا پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کر دیتا۔"

((اللّٰھم اھدنا بھداك یارب العالمین فانه لا ھادی الّا انت))

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ (الرعد:۳۳)

"یعنی جسے اللہ گمراہ کریں تو اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔"

چوتھا شبہ اور اس کا جواب

مانعینِ نسخ کہتے ہیں کہ آیت، حکم کی دلیل ہوتی ہے، اگر آیت کو منسوخ اور حکم کو منسوخ نہ مانا جائے تو حکم کے مرتفع ہونے سے آیت کا نسخ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ نیز اس میں مکلف کے لیے تلبیس بھی ہے اور اعتقادِ فاسد میں اسے اُلجھانا بھی لازم آتا ہے۔

ہم اس شبہ کا دفعیہ اس طرح کرتے ہیں کہ یہ تمام لوازم باطلہ تب درست ہوں گے جب شارع نسخِ تلاوت اور بقاءِ حکم پر کوئی دلیل قائم نہ کرے لیکن جب شارع صرف تلاوت کے منسوخ ہونے اور حکم کے باقی رہنے پر دلیل قائم کر دے تو پھر نہ تو کوئی تلبیس کا الزام آتا ہے اور نہ اعتقادِ فاسد میں مکلف کو مبتلا کرنے کا الزام آتا ہے، جیسا کہ محصن زانیوں کو رجم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

پانچواں شبہ اور اس کا جواب

وہ اعتراض کرتے ہیں کہ تلاوت کو منسوخ مان کر حکم کو باقی رکھنا ایک فعلِ عبث ہے جو ایک حکیم و دانا شارع کی شان کے لائق نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسے تصرفات ہوں گے جن کا کوئی فائدہ متصور نہیں ہوگا؟ ہم اس شبہ کے دو جواب دیتے ہیں:

① آیت کو منسوخ کر کے اس کے حکم کو باقی رکھنا حکمت و فائدہ سے خالی نہیں ہوتا کہ اس کو فعلِ عبث کہا جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں بھی سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے، اور وہ حکمت و فائدہ یہ ہے کہ قرآن کو ایک محدود دائرہ میں منحصر کر کے امت کے لیے اس کو یاد کرنا اور اس میں تحقیق و معرفت حاصل کرنا سہل اور آسان ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مضبوط فصیل اور چہار دیواری ہے جو قرآنِ کریم کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے محفوظ بناتی ہے جو اس میں کمی زیادتی کر کے اس کو کھلواڑ بناتے ہیں، کیونکہ ایک کلام جب شائع و ذائع ہو جاتا ہے، ہر سو اس کا چرچا ہونے لگتا ہے ایسے میں کوئی شخص اس میں تحریف اور ردّ و بدل کی کوشش کرتا ہے تو بہت جلد اس کی شناخت بھی ہو جاتی ہے اور اس سے شدت کے ساتھ مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اصل تغیر و تبدل سے محفوظ رہ کر باقی رہتا ہے جس سے اس فرمانِ الٰہی کی تصدیق ہوتی ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹)

"اس ذکر کو ہم نے اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی ضرور حفاظت کریں گے۔"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اس بات کی متقاضی ہوئی ہے کہ چند آیات، شرعی عملی احکام کے بارے میں نازل ہوں، پھر وہ احکام لوگوں میں حدِ شہرت حاصل کریں پھر اللہ تعالیٰ ان آیات کی صرف تلاوت منسوخ کر دیں تاکہ قرآن کی اجمال گوئی کی روش اور احکام و فروع کے بارے میں قرآن کی مختصر گوئی کا شیوہ باقی رہے۔ اسی طرح اس کا حفظ کرنا اور نتیجہ کے طور پر اس کے

ضمن میں اس کی حفاظت بھی رہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ:۲۱۶)

"اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

۴ اگر بالفرض ہم اس نوع کے نسخ کی حکمت اور فائدے سے بے خبر ہیں (تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے) کیونکہ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس چیز کے عدم کی دلیل نہیں ہوا کرتا۔ ورنہ جہل خود، علم کی راہوں میں سے ایک راہ کہاں شمار ہو سکتا ہے؟ پھر حقیقت حال یہ ہے کہ علیم وحکیم اور رحمان ورحیم ذات کی طرف سے جو حکم بھی صادر ہوتا ہے وہ ضرور کسی حکمت اور فائدہ کے تحت صادر ہوتا ہے ہمارا اس پر ایمان ہے، خواہ ہمیں متعین طور پر اس کا علم نہ ہو، اسلام کے کتنے امورِ تعبدی ایسے ہیں کہ اس کی حکمت کا علم خاص اللہ ہی کو ہوتا ہے یا اپنے خاص مقرب اور محبوب بندوں کو اس پر آگاہ فرماتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾ (یوسف:۷۶)۔ نیز فرمایا: ﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (الاسراء:۸۵)

یہ کوئی قابلِ تعجب بات نہیں ہے، بسا اوقات گھر کا مالک اپنے بچوں کو ایسی باتوں کا حکم دیتا ہے جس کا فائدہ وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے نہیں جانتے ہوتے، حالانکہ وہ واقع میں اُن کے لیے مفید ہوتی ہیں اور وہ بچے بھی فائدہ نہ جانتے ہوئے بھی مالک کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں، اسی طرح ایک مدیر اپنے ماتحتوں کو ایسی باتوں کا حکم دیتا ہے جس کے راز اور حکمت کے ادراک سے وہ عاجز ہوتے ہیں، جبکہ حقیقت میں اس میں کوئی راز اور حکمت ضرور ہوتی ہے۔ وہ ماتحت لوگ اس کے حکم پر عمل پیرا ہوتے ہیں خواہ اس کے راز اور حکمت سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ یہی حال اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ ہے کہ ان پر احکام کے اسرار وحکم پوشیدہ ہوتے ہیں، اور انہیں اس بات کا فائدہ معلوم نہیں ہوتا کہ تلاوت تو منسوخ کر دی لیکن حکم باقی ہے۔ فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (النحل:۶۰)

نسخ بہ بدل اور بغیر بدل

اللہ تعالیٰ جس حکم کو منسوخ فرما دیتے ہیں اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو اس کی جگہ دوسرا حکم بھی لے آتے ہیں یا نہیں لاتے۔ اگر تو ایک منسوخ کر کے دوسرا حکم اس کے بدلے میں لائیں تو اسے نسخ بہ بدل کہتے ہیں، اور اگر کوئی اور حکم نہ لایا جائے تو اسے نسخ بغیر بدل کہتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں جمہور علماء کی رائے میں عقلاً اور نقلاً دونوں طرح جائز ہیں۔ نسخ بہ بدل کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شروع میں قتالِ کفار سے منع کیا اور عفو ودرگزر کی ترغیب دی، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (البقرہ:۱۰۹)

"اکثر اہلِ کتاب تو اپنے حسد سے حق ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح سے تمہیں ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا کر لے جائیں سو معاف کرو اور درگزر کرو جب تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے اس ممانعت کو منسوخ کر کے جہاد کی اجازت دے دی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾

(الحج: ۳۹-۴۱)

”جن سے کافر لڑتے ہیں انہیں بھی لڑنے کی اجازت دی گئی ہے، اس لئے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بیشک اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے، وہ لوگ جنہیں ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا ہے صرف اس کہنے پر کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا تو تکئے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں ڈھادی جاتیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا بیشک اللہ زبردست غالب ہے، وہ لوگ اگر ہم اُنہیں دنیا میں حکومت دے دیں تو نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام تو اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے۔“

بعدازاں اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر قتال کے حکم کی سختی کی اور انہیں راہِ جہاد میں نکلنے کا حکم دیا اور نہ نکلنے پر وعید فرمائی، چنانچہ فرمایا:

﴿اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ۬ وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِیْنَتَهٗ عَلَیْهِ وَ اَیَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۴۰﴾﴾ (التوبہ: ۳۹-۴۰)

”اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کرے گا اور تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر تم رسول کی مدد نہ کرو گے تو اس کی اللہ نے مدد کی ہے جس وقت اُسے کافروں نے نکالا تھا کہ وہ دو میں سے دوسرا تھا جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا تو غم نہ کھا بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر اللہ نے اپنی طرف سے اُس پر تسکین اُتاری اور اُس کی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو پست کر دیا اور بات تو اللہ ہی کی بلند ہے اور الہ زبردست حکمت والا ہے۔“

نسخ بلا بدل کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ﴾ (المجادلہ: ۱۲)

”اے ایمان والو! جب تم پیغمبرؐ سے سرگوشی کرو تو اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دے لیا کرو۔“

بعدازاں اس حکم کو لوگوں سے اٹھا لیا مگر اس کی جگہ کوئی اور حکم نہیں دیا، بلکہ صرف پہلے حکم کو ترک کرنے کا فرمایا:

﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۚ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ﴾ (المجادلہ:١٣)

"کیا تم ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ دو۔ پھر جب تم نے نہ کیا اور اللہ نے تمہیں معاف بھی کر دیا تو (بس) نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔"

ایک شبہ اور اس کا جواب

مذکورہ مذہب جمہور علماء کا تھا، لیکن بعض معتزلہ اور ظاہریہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ نسخ بلا بدل شرعاً جائز نہیں ہے، اس بارے میں ان کے شبہ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ۗ﴾ (البقرہ:١٠٦)

وجہ شبہ یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ منسوخ حکم کی جگہ کوئی دوسرا حکم لایا جانا ضروری ہے جو اس سے بہتر یا کم از کم اس کے برابر ہو۔

لیکن اس سے پہلے جو دو آیاتِ مبارکہ، پیغمبر ﷺ سے سرگوشی کرنے سے قبل صدقہ پیش کرنے کے بارے میں ہم ذکر کر آئے ہیں اس سے مذکورہ شبہ رفع ہو جاتا ہے۔ باقی مذکورہ طریقے پر ان کا استدلال کرنا بے سود اور غلط ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کوئی حکم بغیر بدل کے منسوخ کرتے ہیں تو بندوں کی حکمت اور مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کا فائدہ اور بہتری اسی میں ہے کہ منسوخ حکم کی جگہ کوئی اور حکم نہ دیا جائے۔ ایسے موقع پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت کا حکم منسوخ کر دیا اور اس سے بہتر صورت لے آئے جو عدم حکم پر دلالت کرتی ہے جو بوقتِ نسخ اس منسوخ کردہ حکم کی بہ نسبت لوگوں کے لیے زیادہ مفید اور بہتر تھی۔ چنانچہ آیت ﴿مَا نَنْسَخْ ....﴾ کا مطلب مذکورہ تاویل کے خلاف نہیں ہے، بلکہ اس کو بھی اسی طرح شامل ہے جس طرح دوسرے کو شامل ہے اور اس آیت میں مذکور "نسخ" کا لفظ عام ہے، خواہ تلاوت اور حکم دونوں اجتماعی طور پر منسوخ ہوں یا انفرادی طور پر منسوخ ہوں اور پھر منسوخ بہ بدل ہوں یا بغیر بدل کے ہوں۔ نیز اس آیت میں خیریت اور مثلیت بھی عام ہے خواہ ثواب کے اعتبار سے ہو یا نفع کے لحاظ سے ہو۔ اس سے قبل نسخ کے عقلی دلائل کے تحت اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

نسخ بہ بدل کی اقسام

پھر نسخ بہ بدل کی تین قسمیں ہیں:

① نسخ بہ بدل اخف ② نسخ بہ بدل مساوی ③ نسخ بہ بدل اثقل۔

① پہلی قسم جو کہ نسخ بہ بدلِ اخف ہے، یہ ذاتِ مکلف پر حکمِ سابق کی بہ نسبت خفیف ہوتا ہے، جیسا کہ رمضان کی راتوں میں سو جانے کے بعد کھانے، پینے اور جماع کی حرمت کو اباحت کے ذریعہ منسوخ قرار دینا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠﴾ (البقرہ:١٨٧)

"تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں سے مباشرت کرنا حلال کیا گیا ہے، وہ تمہارے لئے پردہ ہیں اور تم ان

کے لئے پردہ ہو اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے پس اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور تمہیں معاف کر دیا سو اب ان سے مباشرت کیا کرو اور طلب کرو وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تمہارے لئے سفید دھاری سیاہ دھاری سے فجر کے وقت صاف ظاہر ہو جائے۔"

۲) دوسری قسم جو کہ نسخ بہ بدل مساوی ہے، یہ ذاتِ مکلف پر خفت یا ثقل میں حکمِ سابق کے مساوی ہوتا ہے، جیسا کہ استقبال کعبہ کے ذریعہ استقبال بیت المقدس کا حکم منسوخ ہوا، ارشاد فرمایا:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ﴾ (البقرۃ: ۱۴۴)

"بیشک ہم آپ کے منہ کا آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں سو ہم آپ کو ہی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ پس آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیجئے، اور جہاں کہیں تم ہوا کرو اپنے مونہوں کو اسی کی طرف پھیر لیا کرو۔"

جو لوگ نسخ کے قائل ہیں ان کے نزدیک مذکورہ دونوں انواع کے عقلی اور نقلی جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۳) تیسری قسم نسخ بہ بدلِ اثقل ہے، یعنی منسوخ شدہ حکم کی بہ نسبت زیادہ ثقیل حکم آ جاتا ہے۔ اس قسم میں اختلاف ہوتا ہے، جمہور علماء تو مذکورہ دو انواع کی طرف اس کے بھی عقلاً ونقلاً جواز کے قائل ہیں، اور اس پر ایسی بہت سی مثالوں سے استدلال کرتے ہیں جس سے اس کا نقلی وقوع ثابت ہوتا ہے اور جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ نقلی دلیل، عقلی جواز کی بڑی دلیل ہوتی ہے۔

ان مثالوں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اباحتِ خمر کو تحریم خمر سے منسوخ کیا، اسی طرح جنگجو کفار سے پہلے مصالحت کا حکم تھا جسے بعد میں قتال کی فرضیت سے منسوخ کر دیا، فرمایا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ﴾ (البقرۃ: ۲۱۶)

"تم پر قتال فرض کر دیا گیا اور وہ تمہارے لئے ناگوار ہے۔"

اسی طرح ابتدائے اسلام میں زنا کی سزا بس یہ تھی کہ گھروں میں قید رکھا جائے اس سے زیادہ نہیں تھی، پھر اس حکم کو کنوارے کے حق میں کوڑوں اور جلاوطنی کے حکم کے ذریعہ اور شادی شدہ کے حق میں رجم کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے شروع میں عاشوراء کا روزہ فرض کیا تھا، پھر ماہِ رمضان کے روزے فرض کر کے اسے منسوخ کر دیا اور اس کے ساتھ پہلے اختیار بھی تھا کہ تندرست اور مقیم شخص روزہ رکھ لے یا اس کا فدیہ دے دے، لیکن پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس اختیار کو بھی منسوخ کر کے تندرست اور مقیم کے لئے روزہ ہی رکھنا لازم کر دیا۔

مانعین کے شبہات اور ان کے جوابات

یہ تو جمہور علماء کی رائے تھی، لیکن کچھ لوگ اس تیسری قسم کو عقلی طور پر نہیں مانتے اور کچھ لوگ حد سے بڑھتے ہوئے اس قسم کے نقلی جواز کے منکر ہیں، ہمارے ذکر کردہ دلائل ان سب سے مستور ہیں، ہم صرف اس پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ان لوگوں کے شبہات پیش کریں گے، پھر ان کا آپ کے سامنے قلع قمع کریں گے تاکہ آپ کو بھی کوئی دھوکہ نہ لگے اور دوسرا بھی کوئی دھوکہ میں مبتلا نہ ہو۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب

جو لوگ اس قسم کو عقلی طور پر نہیں مانتے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جس حکم کا بھی مکلف بناتے ہیں اس میں بندوں سے متعلق ضرور کوئی مصلحت ہوتی ہے، ایسا ممکن ہی نہیں کہ وہ حکم، مصلحت کے بغیر دیا گیا ہو، ورنہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا فعل عبث کا کرنے والا لازم آتا ہے۔ اور یہ بھی ناممکن ہے کہ اس مصلحت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ساری مخلوق سے بے نیاز ہے، لہٰذا جب تکلیف کا تعلق صرف بندوں کی مصلحت سے ہے تو اس کا بندوں کے لئے قابل عمل ہونا ضروری ہوگا، حالانکہ (اس تیسری قسم میں) بندوں کو ایک اخف حکم سے اشد حکم کی طرف لے جانے میں امتثالِ امر نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف عدمِ امتثال ہے۔ اس طرح کے حکم سے تو بندے اطاعت سے اور واجب احکام سے دُور ہوں گے، لہٰذا جو امر بھی اس طرح کا ہو اس کا منجاب اللہ صادر ہونا عقلی طور پر ممتنع ہے؟

ہم اس شبہ کے چند جوابات دیتے ہیں:

① اس طرح کی باتیں محض وہمی خیالی اور مغالطہ آمیزی پر مبنی ہوتی ہیں، شریعت کے ثابت شدہ حقائق سے ایسے لوگ اندھے ہیں یا دانستہ طور پر اندھے بنے ہوئے ہیں، بندوں کو خفیف حکم سے شدید حکم کی طرف لے جانا بھی ان حقائق میں شامل ہے، جس طرح کہ ہم نے ابھی چند مثالیں ذکر کی ہیں۔

② ہم ان ہی کی بیان کردہ دلیل ان پر مارتے ہیں، ان کی چال کو ان ہی کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور ان کے ہتھیار کو ان ہی کی گردنوں پر مارتے ہوئے کہتے ہیں کہ بندوں کی مصلحت جو کہ شارع حکیم ورحیم کا مقصود ہے، اس کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو حکم کا مکلف اس طرح سے بنائے کہ اس کی تعمیل بندوں کے لئے ممکن ہو، اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ حکم میں تدریج کا طریقہ اختیار کرے کہ پہلے زیادہ خفیف حکم دیا جائے پھر اس سے کم خفیف حکم آئے، پھر اس کی جگہ کم ثقیل حکم دیا جائے، پھر اس سے زیادہ ثقیل حکم دیا جائے، کیونکہ اگر شروع ہی میں ثقیل حکم کا مکلف بنا دیا جائے تو لوگ اس کی تعمیل سے عاجز آجائیں گے اور متنفر بھی ہوں گے اور مقصودِ ہدایت بھی منعکس ہو جائے گا، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تربیت کرنے والے حضرات اور عوام کے سیاسی قائدین جو حکیم اور دانا ہوتے ہیں، وہ آسان ترین طریقے سے اپنی تربیت وسیاست کا آغاز کرتے ہیں اور پھر اس میں تدریج کا طرز اختیار کرتے ہیں، جلد بازی سے کام نہیں لیتے۔

③ ان لوگوں کی مذکورہ دلیل ایسے طریقے سے مخدوش ہو جاتی ہے کہ وہ اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے

بندوں کو ابتداء میں کسی حکم کا مکلف بناتے ہیں، پھر مطلق اباحت یا براءت اصلی سے ان کو مختلف قسم کے احکامات کی تکلیف کی شفقت کی طرف لے جاتے ہیں، اب ان کے پاس اس کا کیا جواب ہے۔ مانعین اس کا جو جواب دیں گے وہی ہمارا جواب ہوگا۔

④ منکرین باہم تعارض کا شکار ہیں، اس لئے کہ بندوں کی جس مصلحت پر انہوں نے اپنے شبہ کی بنیاد رکھی ہے وہ اس صورت کو قبول نہیں کرتی جبکہ اشد حکم کو ناگہانی صورت میں اور مناسب تمہید کے بغیر ہی اخف حکم کے ذریعہ منسوخ کیا جائے۔ ان کا مذہب اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ شروع سے ہی اشد حکم کا مکلف بنا دیا جائے اور اخف حکم کے لئے پہلے تمہید مناسب نہ ہو۔

⑤ ہمیں یہ بات تسلیم نہیں کہ شارع کا مقصود، تکلیف سے محض لوگوں کی مصلحت ہوتا ہے، کبھی مصلحت ہوتا ہے اور کبھی ابتلاء و آزمائش بھی ہوتا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ، کھرے کھوٹے میں فرق کر دے، تاکہ لوگوں کے لیے کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنے کے بعد کوئی حجت باقی نہ رہے۔ اس دوسرے مقصد کا اللہ نے بہت سی آیات میں اظہار کیا ہے: مثلاً فرمایا:

﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ ۝﴾ (محمد:۳۱)

نیز فرمایا: ﴿وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء:۳۵)

نیز فرمایا: ﴿ا۟لَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (الملک:۲)

اس سے معلوم ہوا کہ حکم کو اشد حکم سے منسوخ کرنا کبھی بندوں کی آزمائش کے لئے ہوتا ہے۔ یہ ایسی حکمت بالغہ ہے جو اللہ کی ذات سے عبث کے الزام کو دُور کر دیتی ہے۔

⑥ بسا اوقات حکمِ اشد، جو ناسخ ہوتا ہے، وہی بندوں کے لیے مصلحت آمیز ہوتا ہے، نہ کہ منسوخ شدہ حکمِ اخف، کیونکہ وہ اپنی شدت و ثقل کے باوجود ایسے امر پر مشتمل ہوتا ہے جو اس حکم کی تعمیل کا موجب ہوتا ہے جو نسخ کے وقت پہلے حکم میں موجود نہیں ہوتا۔ جیسے ترغیب و ترہیب یا دنیا و آخرت میں اس جدید حکم کے تحت موجود فوائد و خصائص سے آراستہ کرنا وغیرہ۔

شراب کی آخری تحریم کی آیات اور اس میں موجود انواع میں غور کریں، اسی طرح مشروعیتِ جہاد کی آیات اور اس میں ترغیب و ترہیب کی انواع میں بھی غور کیجئے کہ کس طرح انسان کی طبیعت کو مال و جان کی سخاوت وغیرہ کے لئے متحرک کیا گیا ہے، اگر معمولی سا بھی غور کیا جائے تو ایسے امور احکامِ ناسخہ سے معلوم ہو جاتے ہیں۔

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

جو لوگ صرف اثقل حکم کے ذریعہ اخف حکم کے منسوخ ہونے کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (الاعراف:۱۵۷)

"اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ قیدیں اتارتا ہے جو ان پر تھیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے لوگوں پر جو شدائد تھے وہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے دُور کر دیئے، اب نسخ کی مذکورہ قسم یعنی نسخ الاخف بالاشد، اس صریح وعدے کے خلاف ہے، معلوم ہوا کہ یہ نقلاً ممنوع ہے۔

ہم اس شبہ کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس آیت سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امتِ محمدیہ کو

ایسے سخت احکام کا مکلف بنانا چھوڑ دیا جن کا گزشتہ اُمتوں کو بنایا کرتے تھے جو ان کی گردنوں میں طوق کی طرح ہوتے تھے۔ یہ امر اس بات کے منافی نہیں کہ شریعتِ اسلامی کے بعض احکام بعض دیگر احکام کی بہ نسبت اشد ہوں، نیز یہ کہ اس کے بعض احکام میں سے اخف حکم کو اللہ تعالیٰ اثقل حکم کے ذریعہ منسوخ کریں، ہاں البتہ وہ اپنی شدت میں گزشتہ اُمتوں کے احکام کی طرح نہیں ہوں گے، پس اللہ تعالیٰ نے اس امت سے تخفیف کا وعدہ کیا ہے جو کہ سچا وعدہ ہے۔ اسی طرح ایک حکم کو اس سے زیادہ ثقیل حکم سے منسوخ کرنا بھی حق ہے۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ اسلام کے بعض احکام میں شدت بعض دیگر احکام کی نسبت سے ہے، باقی رہا دیگر شرائع وادیان اس کی نسبت سے تو قطعی طور پر اخف ہیں۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

نیز یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرہ:۱۸۵)

نیز فرماتا ہے کہ ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ﴾ (النساء:۲۸) ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اخف حکم سے اثقل حکم کی طرف جانے میں نہ تیسیر ہے اور نہ تخفیف۔

اس شبہ کے جواب میں ہم اوّلاً کہتے ہیں کہ مذکورہ دو آیاتِ کریمہ زیادہ سے زیادہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تمام شرعی احکام اپنی ذات میں سہل اور آسان ہیں، ان میں مکلفین کے لئے کوئی سختی نہیں ہے، اگرچہ وہ شرعی احکام ایک دوسرے سے متفاوت ہیں کہ کچھ اثقل ہیں اور کچھ نسبتاً اخف ہیں۔

ثانیاً یہ کہ اگر آیات کا مفہوم وہی مان لیا جائے جو انہوں نے سمجھا کہ مطلق تیسیر وتخفیف مراد ہے تو اس سے تو اصل تکلیف کا مخدوش ہونا لازم آئے گا، کیونکہ تکلیف نام ہی اس بات کا ہے کہ کسی کام کو لازم کرنا جس میں کلفت ومشقت ہو۔

ثالثاً یہ کہ پہلی نص ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ ....﴾ موقع خاص میں لائی گئی ہے، یعنی خاص طور سے بیماروں اور مسافروں کو رخصت دینے کا حکم ہے کہ وہ اس حالت میں روزہ نہ رکھیں، بعد میں دوسرے ایام میں قضا کرلیں۔ بناء بریں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں کہ بیمار اور مسافر رمضان میں روزہ نہ رکھیں اور دوسرے دنوں میں قضا رکھ لیں، تمہارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہے سختی کا نہیں چاہتا۔

اسی طرح دوسری نص ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ﴾ بھی موقع خاص پر وارد ہوئی ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لئے یہ امر مباح کردیا ہے کہ وہ مومن باندیوں سے نکاح کرلیں جبکہ وہ مومن پاک دامن آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ اس شرط کے ساتھ کہ اُنہیں زنا میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو۔ بناء بریں اس سیاق میں تخفیف سے مراد ایسے لوگوں کے لئے رخصت کی تخفیف ہے جو نادار ہوں، جنہیں بدکاری میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو کہ وہ ایمان دار باندیوں سے نکاح کرلیں۔

چوتھا شبہ اور اس کا جواب

نیز یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ (البقرہ:۱۰۶)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ نسخ کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں، ایک اخف کہ اس میں "خیر" کی صورت ہے اور ایک مساوی کہ اس میں "مثل"

والی صورت ہے، جبکہ اثقل کی صورت کو مذکورہ آیت شامل نہیں ہے۔

ہم اس شبہ کا دفعیہ اس طرح کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت میں خیریت اور مثلیت سے مراد وہ نہیں ہے جو ان لوگوں نے سمجھا کہ حکمِ اوّل سے خفیف یا مساوی ہونا، بلکہ نفع وثواب میں خیریت اور مثلیت مراد ہے، جیسا کہ اس سے پہلے بھی اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس بناء پر کیا مانع ہے کہ اثقل ناسخ حکم، اخف منسوخ حکم سے زیادہ دنیا میں نفع والا اور آخرت میں زیادہ اجر وثواب والا ہو؟!

امتثالِ امر سے پہلے حکم کو منسوخ کرنا

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ مکلف کی اطلاع سے پہلے حکم کو منسوخ کرنا ممنوع ہے، اسی طرح اس بات پر اتفاق ہے کہ امتثالِ امر کے امکان کے بعد حکم کو منسوخ کرنا جائز ہے، اس میں امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کسی کا اختلاف نہیں ہے، امام کرخی سے مروی ہے کہ امتثالِ امر کا تحقق عملی طور پر ہونے سے پہلے حکم کا نسخ ممنوع ہے، باقی رہا یہ امر کہ مکلف کی اطلاع کے بعد اور امتثالِ امر سے پہلے حکم کو منسوخ کرنا، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور اہل سنت اور ان کے موافقین علماء اس کے جواز کے قائل ہیں اور جمہور معتزلہ اور ان کے ہمنوا اس کے عدمِ جواز کے قائل ہیں۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ ۚ اِلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ: ۱۸۰)

اب ہمارے جمہور علماء اس بات کو جائز قرار دیتے ہیں کہ اس آیت میں مذکور وصیت کا وجوب، اس کا علم حاصل ہونے کے بعد اور مکلف پر موت کا وقت آنے سے پہلے منسوخ ہو جاتا ہے۔ جبکہ جمہور معتزلہ کہتے ہیں کہ اس حکم کا نسخ مکلف پر موت کا وقت آ جانے اور وصیت پر قدرت ہو جانے کے بعد ہی ہوسکتا ہے اس سے پہلے یہ ایسا ہونا محال ہے۔ اور امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں محض مکلف کا وصیت پر قدرت حاصل ہونا کافی نہیں بلکہ عملی طور پر وصیت کرنا بھی ضروری ہے ان کے نزدیک بعد میں نسخ جائز ہوگا۔

قائلین کے دلائل

جو لوگ اس قسم کے نسخ کے قائل ہیں، وہ تین دلائل سے استدلال کرتے ہیں:

① امتثالِ امر سے قبل حکم کی منسوخی پر عقلی استحالہ کا وقوع مرتب نہیں ہوتا، جو امر ایسا ہو وہ عقلاً جائز ہوتا ہے۔

② عملی طور پر امتثالِ امر سے قبل منسوخ کر دینا بھی ان موانع کی طرح ایک مانع ہے جو بندوں کو اس کی بجا آوری سے منع کرتا ہے، کیونکہ ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اگر نسخ کی یہ نوع جائز نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مرض یا نوم کی وجہ سے آئندہ زمانہ میں حکم ادا کرنے کا نہ فرماتا۔ حالانکہ مشاہدہ اس کے برخلاف ہے۔ منکرینِ نسخ کو خود اس کا اعتراف ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے بہت سے احکام دیتا ہے کہ بسا اوقات ان کے ادا کرنے میں رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں، لہٰذا نسخ کی یہ نوع بھی جائز ہونی چاہیے۔

③ نسخ کی یہ نوع عملاً واقع بھی ہے اور وقوع، جواز کی دلیل ہے۔ پھر اس نسخ کے وقوع پر دو دلیلیں ہیں:

پہلی دلیل ⭘ اللہ تعالیٰ نے ہم سے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کا قصہ بیان کیا ہے:

﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ٞ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَ نَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَ تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الصافات: ۱۰۱-۱۱۱)

”پس ہم نے اسے ایک لڑکے حلم والے کی خوشخبری دی پھر جب وہ اس کے ہمراہ چلنے پھرنے لگا کہا اے بیٹے! بے شک میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس دیکھ تیری کیا رائے ہے کہا اے ابا! جو حکم آپ کو ہوا ہے کر دیجیے آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والوں میں پائیں گے پس جب دونوں نے تسلیم کر لیا اور اس نے اسے پیشانی کے بل ڈال دیا اور ہم نے اسے پکارا کہ اے ابراہیم! تو نے خواب سچا کر دکھایا بے شک ہم اسی طرح نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، البتہ یہ صریح آزمائش ہے اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض دیا اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی۔ ابراہیم (علیہ السلام) پر سلام ہو اسی طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں بے شک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھے۔“

ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور ان کے ذبیح بیٹے اسماعیل علیہ السلام کا قصہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا لیکن پھر اس سے پہلے کہ وہ اس حکم کی تعمیل کرتے اس دیئے ہوئے حکم کو منسوخ کر دیا۔

البتہ ابراہیم علیہ السلام کو اس حکم ذبح کی طرف راہ نمائی اولاً تو اس طرح ہوئی کہ انہوں نے بیٹے سے کہا: ﴿اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ﴾ یعنی میں تمہیں اپنے خواب میں ذبح کرتا ہوا دیکھتا ہوں، اس لئے کہ ایک اعتبار سے انبیاء کرام علیہم السلام کا خواب حق ہوتا ہے اور دوسرے اعتبار سے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس عظیم عمل کے لئے پہلے اپنے بیٹے سے مذاکرہ کیا جس سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کام نہایت ضروری تھا۔ ورنہ آپ ان سے ایسا خطرناک اور گھبراہٹ میں ڈالنے والا مذاکرہ نہ کرتے جو کہ تعمیلِ حکم کا پہلا مرحلہ تھا۔

اور ثانیاً اس طرح ہوئی کہ اسماعیل علیہ السلام اپنے والد کو جو جواب دیا اس میں عاجزی کا اظہار اور رب تعالیٰ کے حکم کی تعمیل پائی جاتی ہے: ﴿قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ٞ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

ثالثاً اس طرح کہ ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے قریبی اسباب کو اختیار کرنے کا راستہ اپنایا کہ باپ اور بیٹا دونوں نے سر تسلیم خم کیا: ﴿فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝﴾

رابعاً اس طرح سے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو پکارا کہ: ”تو نے اپنا خواب سچا کر دکھایا“ اس سے معلوم ہوا کہ اگر یہ حکم الٰہی نہ ہوتا جس کی اطاعت واجب تھی تو اللہ تعالیٰ ان کی تعریف میں یہ نہ فرماتے کہ آپ نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ نیز ابراہیم علیہ السلام اپنے مولیٰ کے حکم کی تعمیل میں بیٹے کو لے کر نہ چلتے۔

خامساً اس طرح سے کہ اللہ نے ایک عظیم ذبیحہ کا عوض دیا، معلوم ہوا کہ اگر اسماعیل علیہ السلام کا ذبح کرنا مطلوب نہ ہوتا تو فدیہ اور عوض دینے کا پھر کوئی سبب نہ تھا۔

سادساً اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی یہ کہہ کر مدح فرمائی کہ وہ ایمان دار اور نیکوکار لوگوں میں سے تھے جو اللہ کے اکرام وانعام کے مستحق ہوتے ہیں کہ سختی کے بعد آسانی فرمادی جاتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے اسے صریح آزمائش بھی قرار دیا اور بعد والوں کے لئے اس طریقے کو رہنے دیا۔ اور فرمایا: ﴿سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ﴾ یہ تمام امور اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ واقع میں اللہ نے ان کو حکم دیا تھا جس کی انہوں نے اطاعت کی ان کی سخت آزمائش ہوئی جسے انہوں نے جھیلا اور پوری طرح فرماں برداری کی۔

اب دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے امتثالِ حکم سے پہلے حکم کو منسوخ فرمادیا، جس کی تنفیذ وتعمیل کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے کئی کوششیں کیں اور کئی ایک اقدامات اٹھائے، اپنے بیٹے سے بھی بات چیت کی کہ وہ بھی اس حکم کی توثیق کرتا ہے یا کوئی اور بات کرتا ہے، پھر دونوں کا عملی طور پر اس حکمِ ذبح کے لئے بالکل تیار ہونا، ابراہیم علیہ السلام کا اسماعیل علیہ السلام کو، جوان کے جگر کا گوشہ اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھا، زمین پر ڈال دینا، تاکہ رب العالمین کے حکم کے مطابق چھری سے ان کو ذبح کردیں، لیکن حکمِ ذبح کی تنفیذ وامتثال سے قبل فدیہ اور عوض دے دینے کی ندا آجاتی ہے، یہ بات بالکل محال اور بعید ہے کہ اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو امتثالِ حکم کا کوئی موقع ملا ہو کہ پھر اس کو ترک کردیا ہو تاکہ یہ اعتراض ہوسکے کہ فدیہ کے ذریعہ حکم کی منسوخی ذبح پر قدرت حاصل ہونے کے بعد ہوئی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حکمِ ذبح، امتثالِ امر پر قدرت پانے سے پہلے بطورِ فدیہ منسوخ ہوا ہے، اب اس کا وقوع، جواز کی دلیل ہے بلکہ جواز کی بڑی دلیل ہے۔

دوسری دلیل ۞ سنتِ مطہرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر پچاس نمازیں فرض کی تھیں، پھر نو مرتبہ بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موسیٰ علیہ السلام اور پروردگارِ عالم کے پاس آمدورفت کی وجہ سے پینتالیس نمازیں اللہ نے منسوخ کردیں، اور یہ بات واضح ہے کہ نو مرتبہ یہ نسخ اس سے قبل واقع ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت اس حکم کی تعمیل کرتے۔ یہ وقوع، جوازِ عقلی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ جیسا کہ اپنی جگہ اصول موجود ہے۔

منکرین کے شبہات اور ان کے جوابات

منکرین کے شبہات بہت زیادہ ہیں، کچھ تو وہ ہیں جنہیں وہ دلائل کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جنہیں وہ قائلین کے پیش کردہ دلائل کو مناقشہ اور مباحثہ کی صورت میں پیش کرکے ان کا ابطال کرتے ہیں۔ لیجئے! ہم انہیں آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کا رَد بھی کریں گے۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب

منکرین کا اعتراض ہے کہ اگر امتثالِ امر پر قدرت پانے سے پہلے ہی حکم منسوخ کردیا جائے تو اس کا حکم کا فائدہ سے خالی ہونا لازم آئے گا، اس طرح کا حکم فعلِ عبث کہلائے گا اور اللہ تعالیٰ کے لئے فعلِ عبث کو ماننا محال ہے۔

ہم اس شبہ کے جواب میں کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں حکم فائدہ سے خالی نہیں ہوگا جیسا کہ ان کو گمان ہو رہا ہے، بلکہ حکم کا ایک فائدہ اور اس کی ایک حکمت بندوں کی آزمائش بھی ہے کہ آیا وہ اس حکم کو مانتے ہیں یا نہیں! اگر تو وہ اس حکم کو قبول کرتے ہیں، اس پر اذعان اور ایمان لاتے ہیں، اپنے آپ کو اس کی تعمیل کا خوگر بناتے ہیں تو ان کے لیے اجر عظیم ہوتا ہے اور ان کی فضیلت اور مقام لوگوں پر نمایاں ہو جاتا ہے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کے بارے میں آزمائش ہوئی اور اس طرح ان کی فضیلت کا اظہار ہوا حالانکہ وہاں پر حکم کی تعمیل وتنفیذ نہیں ہو پائی تھی، اور جو اللہ کا بندہ اس طرح کے حکم سے انکار کرتا ہے وہ ذلت ورسوائی سے دوچار بھی ہوتا ہے اور عدل وانصاف سے اس کی محرومی اور گمراہی کا اظہار ہوتا ہے، اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ (فصلت:۴۶)

"یعنی تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔"

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

وہ اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ امتثالِ امر سے قبل جو فعل حکم کو منسوخ کرے گا وہ یا تو بوقتِ نسخ مطلوب ہوگا یا نہیں، اگر تو بوقتِ نسخ مطلوب ہو تو ایک ہی چیز پر نفی اور اثبات کا توارد آئے گا جو کہ محال ہے، اور اگر بوقتِ نسخ وہ فعل مطلوب نہ ہو تو پھر نسخ ہی نہ ہوگا، کیونکہ نسخ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے ایک حکم آئے، پھر وہ اس کو رد اور رفع کرے۔

ہم اس شبہ کا اوّلاً یہ جواب دیتے ہیں کہ ورودِ نسخ کے وقت وہ فعل مطلوب نہیں تھا، لیکن یہ بات نسخ کی حقیقت کے منافی نہیں ہے، جیسا کہ انہوں نے سمجھا، بلکہ نسخ کو ثابت کرتی ہے، اس لئے کہ نسخ، حکم اور معلول کے ارتفاع میں علّت کی مانند ہوتا ہے، زمانہ میں علّت کے مقارن ہوتا ہے، اگرچہ تعقل میں اس سے مؤخر ہوتا ہے۔ لہٰذا ناسخ کے آنے کے سبب حکم کا مرتفع ہو جانا ضروری ہے، ورنہ نسخ معلوم نہ ہوگا۔

ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ یہ شبہ تو نسخ کی تمام صورتوں میں جاری ہو سکتا ہے، اس صورت میں ان منکرین کے لئے دو باتوں میں سے ایک کا ماننا ضروری ہوگا یا تو مطلقاً نسخ کا انکار کر دیں حالانکہ وہ اس کے قائل نہیں ہیں اور یا پھر اپنے اس شبہ کو بے بنیاد اور غلط قرار دیں۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

معترضین کہتے ہیں کہ جب شارع نے حکم دیتے ہوئے کہا کہ: "کل کو روزہ رکھو" تو کل کے روزے کا حسن ہونا اور مصلحت آمیز ہونا لازم آئے گا تو اگر کل کے آنے سے پہلے ہی شارع اس سے منع کر دے تو اس سے اس روزے کا قبیح اور مضرت آمیز ہونا لازم آئے گا، اس طرح ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز میں حسن اور قبح کا اجتماع لازم آتا ہے جو کہ محال ہے۔

ہم اس شبہ کا اوّلاً اس طرح جواب دیتے ہیں کہ اس شبہ کی بنیاد ہی امر باطل پر ہے اور وہ ہے حسنِ عقلی اور قبحِ عقلی کا قاعدہ اور اصول، اس قاعدہ کا بطلان اہل سنّت کے اشاعرہ کے ہاں معروف ہے۔

ثالثاً ہم کہتے ہیں کہ اداءِ حکم سے قبل شارع کا شے مطلوب سے منع کرنا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وہ شے اللہ تعالیٰ کے منع کرتے وقت ہی عقلاً قبیح تھی۔ باقی رہی یہ بات کہ پھر اس سے پہلے کیوں حکم دیا گیا تو یہ چیز اس کے حسن پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ

حسن پر دلالت صرف وہ چیز کرتی ہے جو اس حکم سے متصل ہے یعنی بندوں کا اس پر ایمان لانا اور ان کے دلوں کا اس پر مطمئن ہو جانا اور اس حکم کو کر گزرنے کا جذبہ اور عزم ہونا۔ اس طرح کے احکام میں بندوں کی اطاعتِ الٰہی پر تربیت، امتثالِ حکم کا انہیں عادی بنانا اور حسنِ نیت پر ثواب و اجر سے نوازنا وغیرہ ہوتا ہے۔

گویا کہ ایسی صورت میں مامور بہ وہ مقدمات ہوتے ہیں جو فعل پر سبقت لے جانے والے ہوتے ہیں، خود فعل نہیں ہوتا، جس کی دلیل یہ ہے کہ امتثالِ امر سے پہلے ہی فعل کو منسوخ کر دیا جاتا ہے، لیکن نفسِ فعل کا حکم دیا جاتا ہے، کیونکہ اس فعل پر عمل کا جذبہ اور عزم اور اس کے مقدمات کو بجالانا اسی صورت میں ثابت ہو سکتا ہے۔

چوتھا شبہ اور اس کا جواب

منکرین اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے ذبیح (اسماعیل علیہ السلام) کے قصے سے استدلال کرنا ہمیں تسلیم نہیں ہے، جس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ تو محض ایک خواب تھا جو ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا تھا، انہیں لگا کہ شاید انہیں ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ حقیقت میں انہیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

اوّلاً جواب یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے خواب بھی وحی برحق ہوا کرتے ہیں، اس میں باطل یا تخیل نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اور وحی اس علم ضروری سے متصل ہوتا ہے جو صاحبِ وحی کو حاصل ہوتا ہے کہ جو امر وحی کے ذریعہ دیا جا رہا ہے وہ برحق ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ شیطان ان کی صورت اختیار نہیں کر سکتا، شیطان کو نہ بیداری میں انبیاء کرام علیہم السلام پر کوئی قدرت و غلبہ حاصل ہوتا ہے اور نہ خواب میں۔ کوئی احمق اور بے وقوف شخص ہی یہ بات مان سکتا ہے کہ کوئی بوڑھا شخص، ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی ہیئت جلالی میں آ کر غلط خیال اور جھوٹا وہم ڈال گیا تھا کہ وہ ایک کبیرہ گناہ یعنی بیٹے کو قتل کرنے پر قدم اٹھائے، اپنے اکلوتے اور جگر گوشے کو ذبح کر دے، حالانکہ اس سے قبل اس کے مولیٰ و آقا نے خوشخبری دی تھی کہ وہ غلام حلیم ہوگا اور وہ بیٹا بھی اسے بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے کے بعد عطا ہوا۔ پھر وہ خوشخبری پوری بھی ہوئی، بچہ بڑا بھی ہوا پروان چڑھا کہ اپنے باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا، باپ ابراہیم علیہ السلام اپنے سامنے اسے دوڑتا پھرتا دیکھتے تھے اس سے ان کی آنکھیں نور سے اور دل بہجت و سرور سے لبریز ہو جاتا تھا۔ منکرین اس کی دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر بالفرض ابراہیم علیہ السلام کا خواب مبنی برحق تھا لیکن آپ اپنے لختِ جگر کو ذبح کرنے پر مامور نہ تھے، آپ صرف ذبح کے عزم و ارادے کے مامور تھے، تاکہ اس عزم پر آپ کے صبر کا امتحان ہو جائے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس سلسلہ میں جو کوشش کی، قرآنِ حکیم نے اس کی جو منظر کشی کی ہے کہ انہوں نے اس پر اپنے عزم مصمم کا اظہار کیا اور واجب امر کا حق ادا کر دکھایا، لہٰذا یہاں نسخ کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔

ہم اس کا جواب دو صورتوں سے دیتے ہیں:

① جس امتحان کا انہوں نے ذکر کیا وہ اسی صورت میں متحقق ہوگا جب امر واجب پر عزم ثابت ہوگا، لیکن جو امر واجب ہی نہیں اس پر عزم کا وجوب کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ ایسی صورت میں تو ابراہیم علیہ السلام کے ذمہ بیٹے کو ذبح کرنا واجب ہوگا، تاکہ اس عزم کا وجوب ثابت ہو جس سے ابتلاء اور آزمائش کا مقصد متحقق ہو سکے۔

② اگر عزم کو مامور بہ قرار دیا جائے نہ کہ ذبح کو، تو اس صورت میں فدیہ دینا بے معنی ہو جاتا ہے، اس لئے کہ ابراہیم علیہ السلام نے

رب تعالیٰ کے حکم کو پورا پورا ادا کیا، کچھ نہیں چھوڑا، اللہ نے اس میں کوئی تخفیف بھی نہیں کی تھی جیسا کہ ان لوگوں کا زعم ہے۔

منکرین اس کی تیسری وجہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو دراصل مقدماتِ ذبح کا حکم ملا تھا مثلاً بیٹے کو کروٹ کے بل لٹائیں، پیشانی کے بل زمین پر ڈالیں، چھری وغیرہ چلائیں بس، حقیقت میں ذبح کر دینے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔

جواب یہ ہے کہ یقیناً ابراہیم علیہ السلام نے ان تمام مقدمات کو بھی پورا کیا، اگر مامور بہ یہی امور تھے، ذبحِ ولد نہ تھا تو پھر فدیہ اور عوض دینے کا کیا مطلب رہ جاتا ہے؟

اس کی چوتھی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر بالفرض ابراہیم علیہ السلام ذبح ولد پر ہی مامور تھے تو یقیناً انہوں نے اس حکم کی تعمیل و تنفیذ میں اپنی پوری جان لگا دی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ذبیح اللہ کی گردن کو لوہے یا تانبے کا بنا دیا تھا تاکہ وہ نہ کٹ سکے، تو اس عذر مانع کے سبب ابراہیم علیہ السلام سے حکم ساقط ہوا ہے، کسی ناسخ کے پائے جانے کی وجہ سے نہیں ہوا۔

اس کا جواب تین طرح سے دیا جاتا ہے:

① انہوں نے جو یہ بات ذکر کی کہ ان کی گردن تانبے یا لوہے کی کر دی گئی تھی یہ موضوع روایت ہے، مضحکہ خیز اور بے بنیاد ہے۔

② اگر ذبح کا وجوب اس عذر کی وجہ سے ساقط ہوا ہو تو فدیہ ادا کرنا بے معنی رہ جاتا ہے۔

③ یہ منکرین اس بات کو جائز مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کسی بات کا حکم دیں پھر درمیان میں کوئی عذر حائل ہو سکتا ہے تو پھر ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں بنتی کہ اللہ ایک بات کا حکم دیں پھر ناسخ درمیان میں حائل ہو جائے کیونکہ دو موانع کے درمیان کوئی مؤثر امرِ فارق نہیں ہے۔

منکرین اس کی پانچویں وجہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے واجب حکم ادا کیا اور اپنے بیٹے کو واقع میں ذبح بھی کیا، لیکن زخم مندمل ہو گئے تھے اور گردن ذبیح اللہ کی پوری طرح جڑ گئی تھی، لہٰذا نسخ ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس کا اوّلاً جواب یہ ہے کہ یہ بھی موضوع روایت ہے بلکہ اس کا کذب بیانی میں بہت دخل عمل ہے، نیز آیاتِ قصہ کے ظاہری معنی سے بھی بہت بعید ہے اگر بالفرض ایسا ہوا ہوتا تو قرآن اسے ضرور بیان کرتا، کیونکہ یہ فدیہ دینے کے معاملے سے کوئی کم اہمیت کی بات نہ تھی، یا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کم از کم اسے بیان فرماتے اور تواتر کے ساتھ یہ قصہ نقل ہوتا، کیونکہ اس طرح کے واقعات تواتر کے ساتھ نقل ہوا کرتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ اگر واجب کردہ حکم مکمل طور پر ادا کر دیا تھا اور عملی طور پر بیٹے کو بھی ذبح کر دیا تھا اور کوئی مانع اور ناسخ بھی نہیں پایا گیا تو پھر فدیہ دینے کا کیا مطلب ہوگا؟

منکرین اس کی چھٹی وجہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ ہمیں یہ بات تسلیم نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام سے حکم کا وجوب فدیہ کے ادا کر دینے کی وجہ سے ساقط ہوا ہے، بلکہ وہ حکم تب تک باقی ہے جب تک کہ وہ فدیہ میں آنے والا جانور ذبح نہ کر دیں، اگر ذبح کرنے میں کوئی کوتاہی کی تو وہ اسی طرح گنہگار ہوگا جس طرح وہ شخص گنہگار ہوتا ہے جسے اپنا بیٹا ذبح کرنے کا مکلف بنایا گیا ہو مگر وہ ذبح نہ کرے، اگر ذبحِ ولد کا وجوب فدیہ کے آنے کے سبب مرتفع ہو جائے تو فدیہ کو فدیہ نام دینا درست نہ ہوگا، جیسا کہ استقبالِ بیت المقدس کے بعد استقبالِ کعبہ کو اس کا فدیہ کے ساتھ نام نہیں رکھ سکتے، کیونکہ فدیہ میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ دو امور میں سے ایک مکروہ چیز میں دوسرے

کے قائم مقام بن جائے۔ اس بناء پر نسخ ثابت نہیں ہوگا۔

جواب یہ ہے کہ یہ گفتگو لغو گوئی کے مشابہ ہے، کیونکہ وہ اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام نے فدیہ نازل ہونے کے بعد اپنا بیٹا ذبح کر دیا تو وہ گنہگار ہوں گے، اس وقت اس کو ذبح کرنا حرام ہوگا جبکہ فدیہ نازل ہونے سے پہلے یہ واجب تھا، اور اس پر پوری طرح نسخ کا معنی منطبق ہوتا ہے کہ ایک حکم شرعی کو دلیلِ شرعی کی وجہ سے اٹھالیا گیا۔ نسخ کا یہی تو مطلب ہے۔

پانچواں شبہ اور اس کا جواب

منکرین اعتراض کرتے ہیں کہ معراج کی رات پچاس نمازوں کی فرضیت کے نسخ سے تمہارا استدلال کرنا بھی باطل ہے، کیونکہ یہ غیر ثابت شدہ خبر ہے، جمہور معتزلہ معراج کے منکر ہیں، اور ان میں جو اس کا اثبات کرتے ہیں وہ بھی پچاس نمازوں کی فرضیت والی خبر کی نفی کرتے ہیں کہ ایسا کوئی نسخ وارد نہیں ہوا اور اسے وضع کردہ زیادتی اور اضافہ قرار دیتے ہوئے استدلال یہ کرتے ہیں کہ یہ زیادتی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ حکم، علم اور اطلاع پر قدرت پانے سے پہلے ہی منسوخ ہو جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پچاس نمازیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض نہیں کی گئیں تھیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر بھی اس کو فرض کیا گیا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو اس حکم کی اطلاع ہوتی، منسوخ کر دی گئیں۔

اور اگر اس زیادتی اور اضافہ کو مان بھی لیا جائے تو ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ یہ حکم لازمی درجے کا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا اختیار دے دیا تھا کہ اگر پچاس نمازیں اختیار کرنا چاہیں تو پچاس کر دیتے ہیں اور پانچ نمازیں چاہیں تو پانچ نمازیں فرض کر دیتے ہیں؟۔

ہم اس کا اوّلاً جواب یہ دیتے ہیں کہ واقعہ معراج متعدد صحیح روایات سے ثابت شدہ ہے۔ صرف ایک طریق سے مروی نہیں ہے، اہل بدعت کا اس سے انکار اس کے ثبوت کی قیمت و اہمیت کو کم نہیں کرتا بلکہ اس سے خود ان کی قیمت و قدر کم پڑ جاتی ہے۔

عبدالظاہر البغدادی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ فرقہ قدریہ کا معراج کے واقعہ سے انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ رؤیتِ باری تعالیٰ، شفاعت، عذابِ قبر اور حوض و میزان سے انکاری ہیں، اور ان اہلِ ہوا و بدعت کے انکار و طعن کی وجہ سے خبرِ صحیح کو مسترد نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ روافض اور خوارج کے طعن و تشنیع کی وجہ سے موزوں پر مسح کرنے کی احادیث کو رَد نہیں کیا جا سکتا، نیز جیسا کہ خوارج کے انکار کی وجہ سے رجم کی احادیث کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ صحیحین وغیرہ میں یہ زیادتی اور اضافہ ثابت ہے۔ بالفرض اگر بعض روایات اس زیادتی سے خالی ہوں تو بھی اس سے فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہوتی ہے، جس طرح کہ یہ ثقہ عادل اور ضابط راویوں کی روایت سے ثابت ہے، جو ثقاہت، عدالت اور ضبط کے ایسے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں کہ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ وغیرہ نے بھی اپنی صحیحین میں اسے نقل کیا ہے، صحیحین کے راوی ہی اس کی ثقاہت کے لئے کافی ہیں۔

ثالثاً ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ قول کہ "یہ حکم کو اس سے پہلے منسوخ کرنا ہے کہ اُمت کو اس کا علم حاصل ہو" یہ بات ان کے لئے ذرا بھی مفید نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر دن رات میں پچاس نمازیں اسی طرح فرض کی تھیں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر فرض کی تھیں، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا طبعاً علم تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے بعد اور امتثالِ امر سے قبل

اس فرضیت کو منسوخ کر دیا۔ یہ بات ہمارے مدعیٰ کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ امتثالِ امر سے پہلے حکم منسوخ ہو سکتا ہے۔

رابعاً ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ قول کہ پچاس نمازیں وجوبی اور لازمی طور پر فرض نہیں تھیں یہ بھی غلط بات ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ یہی روایت ان کے دعویٰ کی تردید کرتی ہے نیز اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ حضور ﷺ کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا تھا کہ اگر پچاس نمازیں چاہیں تو پچاس فرض کر دیتے ہیں اور اگر پانچ نمازیں چاہیں تو پانچ فرض کر دیتے ہیں، جبکہ ان کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آنحضور ﷺ سے فرمایا کہ میں نے تجھ پر اور تیری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں، حضور ﷺ سے فرمایا کہ میں نے تجھ پر اور تیری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں، حضور ﷺ نے اسے فرماں بردار اور مختار بن کر قبول فرمایا، پھر جب موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ تیرے پروردگار نے کیا حکم دیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر اور میری اُمت پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے پروردگار کے پاس واپس جائیں اور اس میں تخفیف اور کمی کی درخواست کریں اور انہوں نے آپ ﷺ کو یہ بتایا کہ انہوں نے اس سے پہلے بنی اسرائیل کو اس کی خبر دی تھی لیکن وہ اس پر عمل نہ کر سکے تھے، موسیٰ علیہ السلام آپ ﷺ کو مسلسل کہتے رہے یہاں تک کہ آنحضور ﷺ مقامِ مناجات پر واپس آئے اور اپنے مولیٰ سے تخفیف کی درخواست کی، چنانچہ پانچ نمازیں کم کر دی گئیں، پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور بات چیت ہوئی، اس طرح مسلسل آپ ﷺ موسیٰ علیہ السلام اور پروردگارِ عالم کے پاس آتے جاتے رہے اور ہر مرتبہ پانچ نمازیں کم ہوتی رہیں، یہاں تک کہ پچاس نمازوں میں سے پانچ نمازیں باقی رہ گئیں۔ اس پر بھی موسیٰ علیہ السلام نے حضور ﷺ کو مشورہ دیا کہ دوبارہ جا کر تخفیف کا سوال کریں لیکن آپ ﷺ نے معذرت کر لی کہ اب سوال کرنے سے حیا آتی ہے۔ کیا اس تفصیل کے بعد بھی یہ بات قابلِ فہم ہو سکتی ہے اور ذہن اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ پچاس نمازیں بطور وجوب کے فرض نہیں کی گئیں تھیں، بلکہ آنحضرت ﷺ کو اختیار دیا گیا تھا کہ پچاس نمازیں قبول کر لیں یا پانچ نمازیں؟! ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا﴾ (الکھف: ۵) "یہ لوگ محض جھوٹ بولتے ہیں۔"

کتاب وسنّت میں پائے جانے والا نسخ

شریعتِ اسلامی کا نسخ کبھی تو کتاب اللہ میں وارد ہوتا ہے اور کبھی سنّتِ مطہرہ میں اور منسوخ بھی اسی طرح کتاب وسنّت دونوں میں وارد ہوتا ہے۔ اس طرح چار اقسام ہوئیں:

① نسخ القرآن بالقرآن

پہلی قسم نسخ القرآن بالقرآن ہے، اس قسم کے جواز اور وقوع پر تمام قائلینِ نسخ کا اتفاق ہے، جواز کی وجہ یہ ہے کہ قرآنی آیات علم میں اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کے وجوب میں برابر ہیں، اور وقوع کی وجہ ایک تو ہم پہلے دلائل ذکر کر چکے ہیں اور دوسرے یہ کہ عنقریب ہم آیاتِ ناسخہ ومنسوخہ بھی ذکر کریں گے جو اس کے وقوع پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر یہ قسم تین انواع میں منقسم ہوتی ہے: ① نسخ التلاوۃ والحکم جمیعًا ② نسخ التلاوۃ دون الحکم ③ نسخ الحکم دون التلاوۃ۔ ہم اس سے پہلے اس پر سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں۔

② نسخ القرآن بالسنۃ

دوسری قسم نسخ القرآن بالسنۃ ہے، اس قسم میں علماء کا اختلاف ہے، بعض جائز قرار دیتے ہیں اور بعض نا جائز قرار دیتے ہیں۔ پھر جائز قرار دینے والوں میں اس کے وقوع اور عدمِ وقوع کا اختلاف ہے۔ چنانچہ بحث و گفتگو دو امور میں ہوگی ایک امرِ جواز اور دوسرا امرِ وقوع۔

① **امرِ جواز** ✿ جواز کے قائلین میں امام مالک، اصحابِ ابی حنیفہ رحمہم اللہ، اشاعرہ میں سے جمہور متکلمین اور معتزلہ شامل ہیں، اور ان کی حجت یہ ہے کہ نسخ القرآن بالسنۃ نہ لذاتہٖ محال ہے اور نہ لغیرہٖ، لذاتہٖ محال نہ ہونے کی وجہ تو ظاہر ہے، باقی رہا لغیرہٖ بھی محال نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت بھی وحیِ الٰہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن وحیِ الٰہی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم: ۳، ۴)

اور ان دونوں میں کوئی امرِ فارق نہیں ہے سوائے اس کے کہ قرآنِ حکیم کے الفاظ اللہ تعالیٰ کی ترتیب اور ایجاد میں سے ہیں اور سنت کے الفاظ رسولِ پاک ﷺ کی ترتیب اور ایجاد میں سے ہیں، قرآن کے اپنے خصائص ہیں اور سنت کے اپنے خصائص ہیں، ان فروق کا ہماری بحث و گفتگو میں کوئی اثر نہیں ہے، کیونکہ اللہ کی ذات ہی اپنی وحی کو وحی کے ذریعہ ہی منسوخ کرتی ہے کہ دو وحیوں میں سے ایک کو دوسرے سے منسوخ کر دیا اس میں عقلاً کوئی مانع بھی نہیں ہے جیسا کہ اس میں شرعاً کوئی مانع موجود نہیں ہے۔ اس طرح اس میں عقلاً اور شرعاً کوئی مانع بھی نہیں ہے۔ یہ تو جائز قرار دینے والوں کی دلیل اور حجت ہے۔

باقی جو حضرات عدمِ جواز کے قائل ہیں ان میں امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ اور اکثر اہل ظواہر شامل ہیں، وہ اس عدمِ جواز پر پانچ دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔

لیجیے! ہم ان کے دلائل اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے وجوہِ رَد بیان کرتے ہیں۔

پہلی دلیل ✿ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ سے فرماتے ہیں:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۴)

"اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا تاکہ آپ لوگوں کے لیے واضح کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے۔"

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کا عمل بیانِ قرآن میں منحصر ہے۔ اگر سنت، قرآن کے لئے ناسخ ہوتی تو اس صورت میں وہ اس کے لئے بیان نہ بنتی بلکہ اس کے لئے رافع ہوتی۔

یہ استدلال مخدوش ہے، اوّلاً اس لئے کہ آیتِ ہٰذا اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ سنتِ رسول ﷺ بیانِ قرآن میں منحصر ہے، کیونکہ آیت ہٰذا میں حصر کا کوئی طریق موجود نہیں ہے، بلکہ اس آیت سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی سنت، قرآن کے لیے مبیّن ہے اور سنت کا قرآن کے لئے ناسخ ہونا اس کے منافی نہیں ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝﴾ (الفرقان: ۱)

"وہ بڑی برکت والا ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا تاکہ تمام جہان کے لئے ڈرانے والا ہو۔"

اس آیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آنحضور ﷺ تمام جہانوں کے لئے نذیر ہیں، اس سے آپ ﷺ کا تمام جہانوں کے لئے بشیر

ہونا منتفی نہیں ہوتا۔

ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ اگر پیغمبر ﷺ کی سنت، بیان قرآن میں منحصر ہوتو اس سنت کا مستقل طور پر قانونِ شریعت ہونا صحیح نہ ہوگا، جیسے اس سے بعض احکام کا وجوب اور بعض کی حرمت معلوم ہوتی ہے، حالانکہ اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ سنتِ رسول ﷺ بھی مستقل طور پر قانونِ شریعت ہے۔ جیسا کہ آنحضور ﷺ نے ہی پرندوں میں ہر پنجہ دار اور درندوں میں ہر کچلی دار جانور کو حرام قرار دیا ہے۔① اسی طرح آپ ﷺ نے انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت کے جاری نہ ہونے کا حکم دیا کہ:

((نحن معاشر الانبياء لا نورث ما تركناه صدقة)).②

اور ثالثاً اس لئے کہ سنت کا مستقل طور پر قانونِ شریعت ہونا اور مفید احکام ہونا خود سنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے، حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسولِ اکرم ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا:

”کیا تم میں سے کوئی شخص ٹیک لگاتے ہوئے یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف وہی چیزیں حرام کی ہیں جو قرآن میں ہیں، خبردار! میں نے بھی حکم دیا ہے، وعظ کیا ہے اور کچھ چیزوں سے منع کیا ہے، اور یہ قرآن کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال نہیں کیا کہ تم اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت داخل ہو جاؤ اور نہ ہی ان کی عورتوں کو مارنا اور نہ ہی ان کے پھل کھانا حلال کیا ہے، لیکن جب وہ تم کو وہ چیز دے دیں جو ان پر فرض کی گئی ہے۔“③

رابعاً اس لئے کہ اگر بالفرض آیت ہذا حصر پر دلالت کرتی ہے، اور اس بیان سے مراد خاص شرح ہے، تو ما انزل الی الناس سے مراد اس کی وہ جنس ہے جو اس کے بعض افراد پر صادق آتی ہے، اس سے سنت کے ناسخ ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ چنانچہ پیغمبر ﷺ ثابت اور موجود احکام کے لیے مبیّن اور مرتفع احکام کے لئے ناسخ ہوں گے۔

خامساً یہ کہ اگر فرض کر لیں کہ آیتِ ہذا حصر پر دلالت کرتی ہے تو ہم کہیں گے کہ اس میں بیان سے مراد تبلیغ ہے، شرح نہیں ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے یقیناً وہ احکام لوگوں تک پہنچا دیئے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے تھے، اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے سنت سے منسوخ فرما دے۔

دوسری دلیل ○ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ خود قرآن سے سنتِ نبویہ ﷺ کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے تو اگر سنت، قرآن کے لیے ناسخ ہوگی تو خود وہ اپنا ابطال کرے گی، کیونکہ نسخ نام ہے رفع حکم کا، جب اصل مرتفع ہو گیا تو فرع بھی مرتفع ہوگی۔ اس بات کی دلیل کہ قرآن خود سنتِ نبویہ ﷺ کو حجت ہونا ثابت کرتا ہے، مثلاً ارشادِ باری ہے:

﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ (محمد: ۳۳)

---

① رواہ مسلم فی الصيد (١٥) وابوداؤد فی الاطعمة (باب ٣٢)

② رواہ البخاری فی فضائل اصحاب النبی ﷺ (١٢) و مسلم فی الجهاد، حديث (١٥) والترمذی فی السير (٤٣) والنسائی فی الفئ و مالک فی الكلام (٢٧) و احمد (٤/١)

③ رواہ ابوداؤد فی الخراج والامارة والفئ، باب تعشير اهل الذمة .... حديث (٣٠٥٠)

نیز ارشاد ہے: ﴿وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر: ۷)

نیز فرمایا: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (آل عمران: ۳۱)

ہم اس استدلال کا اوّلاً اس طرح رد کرتے ہیں کہ ہماری بحث اس میں نہیں ہے کہ آیا سنتِ نبویہ، قرآن کی ان نصوص کے لئے ناسخ ہوسکتی ہے جو سنت کی حجیت پر دلالت کرتی ہیں؟ تا کہ اس سے خود سنت کا ابطال لازم آئے، ہماری بحث تو اس کے سوا ان نصوص سے ہے جن کا نسخ سے تعلق ہوسکتا ہے کہ سنتِ نبویہ ﷺ اس کو نسخ کرسکتی ہے یا نہیں؟

ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ ان کا استدلال خود ان کے خلاف حجت ہے، کیونکہ اطاعتِ رسول ﷺ کا وجوب خود اس بات کا متقاضی ہے کہ حضور ﷺ جو حکم بھی پیش کریں اسے قبول کرنا چاہیے کیونکہ آپ ﷺ حکم کے لئے ناسخ بھی ہیں۔

تیسری دلیل ○ ان کی تیسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ (النحل: ۱۰۲)

"تو کہہ دے اسے تیرے رب کی طرف سے پاک فرشتے نے سچائی کے ساتھ اتارا ہے۔"

مذکورہ آیت منکرینِ نسخ کی تردید اور اسی نسخ کی وجہ سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر عیب گیری کرنے والوں کے متعلق نازل ہوئی ہے، جس کی دلیل اللہ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ۱۰۱)

"اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری بدلتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے، تو کہتے ہیں کہ تو بنالاتا ہے یہ بات نہیں لیکن اکثر ان میں سے نہیں سمجھتے۔"

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ روح القدس ہی قرآن کو اُتارتا ہے، جب ایسا ہے تو قرآن کا نسخ صرف قرآن سے ہوگا (کسی اور سے نہیں ہوگا)۔

ہم اس استدلال کا جواب دیتے ہیں کہ کتاب اور سنت دونوں اللہ کی وحی ہیں۔ ان دونوں کو ہی روح القدس نازل کرتے ہیں۔ جس کی دلیل یہ ارشاد ہے:

﴿وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۙ﴾ (النجم: ۳-۴)

"اور نہ وہ اپنی خواہش سے کچھ کہتا ہے یہ تو وحی ہے جو اس پر آتی ہے۔"

لہٰذا یہ کہنا کہ روح القدس صرف قرآن لے کر نازل ہوتے تھے بے بنیاد بات ہے۔

چوتھی دلیل ○ ان کی ایک دلیل یہ فرمانِ باری بھی ہے:

﴿وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ﴾ (یونس: ۱۵)

"اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں وہ لوگ کہتے ہیں جنہیں ہم سے ملاقات کی امید نہیں کہ اس

کے سوا کوئی قرآن لے آیا اسے بدل دے تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اپنی طرف سے اسے بدل دوں"

اس آیتِ کریمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سنّت، قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی، کیونکہ سنّت کا صدور رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ہوتا ہے۔

اس استدلال کا جواب بھی سابقہ جواب کی طرح ہے کہ سنّت کو پیغمبر ﷺ کی ذات سے صادر ہونے والی چیز لینا درست نہیں ہے کہ آپ ﷺ کی خواہشِ نفس سے اس کا تعلق ہو! بلکہ سنّت کے معانی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کردہ ہوتے ہیں جس امر کو پیغمبر ﷺ اپنے الفاظ سے تعبیر کرے وہ بھی وحیِ الٰہی ہوتا ہے، وہ پیغمبر ﷺ کی خود خواہش نفس سے نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنّت کے ذریعہ قرآن کے نسخ کو اپنی جانب سے اسے تبدیل کرنے کا نام نہیں دیا جائے گا بلکہ یہی کہیں گے کہ قرآن کا نسخ وحیِ الٰہی سے ہوا ہے۔

پانچویں دلیل ● آیت کریمہ ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ (البقرہ:۱۰۶) بھی بوجوہِ ثلاثہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نسخ القرآن بالسنۃ ممتنع ہے۔ (۱) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ حالانکہ سنّت، قرآن سے نہ زیادہ بہتر ہے اور نہ اس کے برابر۔ (۲) ﴿نَاْتِ﴾ کا لفظ بتاتا ہے کہ لانے والے خود اللہ تعالیٰ ہیں جبکہ سنّت کو اللہ تعالیٰ نہیں لاتے بلکہ اس کا رسول ﷺ لاتے ہیں۔

(۳) آیت کریمہ ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝﴾ (البقرہ:۱۰۶-۱۰۷)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نسخ اسی ذات سے صادر ہوتا ہے جسے کامل اقتدار و ملک حاصل ہو اور جو مطلق سلطنت کا مالک ہو، وہ صرف اللہ کی ذات ہے۔

ہم اس استدلال کی پہلی وجہ کا جواب یہ دیتے ہیں کہ آیت کریمہ میں نسخ سے مراد عام ہے، خواہ احکام میں ہو یا تلاوت میں ہو اور خیریت اور مثلیت بھی عام ہے کہ مصلحت کے اعتبار سے ہو یا ثواب کے لحاظ سے، اس سے قبل اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس پہلو سے کبھی سنّتِ ناسخہ بھی قرآنِ منسوخ حکم سے بہتر ہو سکتی ہے اگرچہ قرآنِ حکیم اپنے دائمی اور امتیازی خصوصیات کے پہلو سے سنّت سے زیادہ بہتر ہے۔

اور دوسری وجہ کا جواب یہ ہے کہ سنّت بھی وحیِ الٰہی ہے، اور پیغمبر ﷺ اس کے لئے مبلغ اور معبر ہوتا ہے تو حقیقت میں صرف اللہ کی ذات ہی اس سنّت کو لانے والی ہوتی ہے۔

اور تیسری وجہ کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں ناسخ صرف اللہ تعالیٰ ہیں، سنّت کو ناسخ صرف اس حیثیت سے کہا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک وحی ہے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے صادر ہوتی ہے۔

دو شبہات اور ان کے جوابات

① کوئی معترض یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ سنّت کا ایک حصہ وہ ہوتا ہے جو نبی کریم ﷺ کے اجتہادات کا ثمرہ ہوتا ہے اور یہ وحی نہیں ہوتا جس کی دلیل پیغمبر ﷺ پر ہونے والا وہ عتاب ہے جس کا قرآن نے کبھی تو نرم انداز میں اور کبھی سخت انداز میں ذکر کیا ہے، پھر یہ کہنا کیسے درست ہو سکتا

ہے کہ سنت بھی وحیِ الٰہی ہوتی ہے؟!۔

جواب یہ ہے کہ یہاں سنت سے مراد وہ سنت ہے جو وحیِ جلی یا وحیِ خفی کی صورت میں ہو، سنتِ اجتہادی یہاں مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اجتہاد ہوتا ہی وہاں پر ہے جہاں نص موجود نہ ہو، پھر وہ اس کے معارض اور رافع کیسے ہوگا؟ ہم نے اپنی کتاب "المنهل الحديث في علوم الحديث" میں انواعِ سنت کی خوب وضاحت کی ہے، اگر آپ چاہیں تو اس کتاب کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں۔

② نیز معترض یہ اعتراض بھی کر سکتا ہے کہ سنتِ نبویہ ﷺ میں اخبارِ آحاد بھی آتی ہیں، خبرِ واحد خواہ کس قدر صحیح درجہ کی ہو مفیدِ علم قطعی نہیں ہوتی، جبکہ قرآن کا متن قطعی ہے بھلا وہ ایسی سنت سے کیسے منسوخ ہو سکتا ہے جو علم قطعی کو مفید نہ ہو، بھلا ظنی چیز قطعی چیز کے لئے رافع کیسے ہو سکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں سنت سے مراد سنتِ متواترہ ہے، اخبارِ آحاد نہیں ہے، سنتِ متواترہ، قرآن ہی کی طرح قطعی الثبوت ہوتی ہے، اس اعتبار سے دونوں برابر درجے کے ہوتے ہیں، لہٰذا ایک کے دوسرے کے لئے ناسخ ہونے سے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ خبرِ واحد میں حق بات تو یہی ہے کہ معنی مذکور کے اعتبار سے اس کو قرآن کے لئے ناسخ قرار دینا جائز نہ ہو کہ وہ ظنی ہے اور قرآن قطعی ہے، ظنی درجہ میں قطعی سے ضعیف ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اس کو رفع کرنے پر قدرت نہ رکھے گی۔

جو لوگ سنتِ آحادیہ سے نسخِ قرآن کے جواز کے قائل ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ قرآن ظنی الدلالۃ ہے، ان کی یہ دلیل قابلِ اعتبار نہیں ہے اس لئے کہ قرآن اگر قطعی الدلالۃ نہ بھی ہو تو قطعی الثبوت تو ہے، جبکہ سنتِ آحادیہ ظنی الدلالۃ بھی ہوتی ہے اور ظنی الثبوت بھی۔ تو وہ قرآن سے ضعیف تر ہوئی تو پھر کیسے اس کے لئے رافع ہو سکتی ہے؟!۔

② **امرِ وقوع** ○ ہم نے اس سے پہلے جوازِ نسخ پر بحث کی تھی، باقی رہی بات وقوع کی تو مجوّزین کا اس میں اختلاف ہے، کچھ تو اس کا اثبات کرتے ہیں اور کچھ اس کی نفی کرتے ہیں:

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا﴾ (البقرہ:۱۴۸)

"اور ہر ایک کے لئے ایک طرف ہے جس طرف وہ منہ کرتا ہے۔"

دونوں فریقوں کا نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے، اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حق ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس کی نفی کرتے ہیں۔

اثبات کرنے والے حضرات چار ادلّہ سے استدلال کرتے ہیں:

پہلی دلیل ○ ان کی پہلی دلیل آیتِ جلد ہے:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ (النور:۲)

"زانی عورت اور زانی مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔"

یہ آیتِ مبارکہ محصنین اور غیر محصنین دونوں کو شامل ہے، پھر سنت نے آکر اس کے عموم کو منسوخ کر دیا محصنین کے اعتبار سے، اور سنت نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کی سزا رجم ہے۔

جو لوگ اس دلیل کی نفی کرتے ہیں وہ دو طریقے سے اس کا مناقشہ کرتے ہیں: (ا) یہ نسخ نہیں ہے بلکہ تخصیص ہے۔

(۲) منسوخ التلاوۃ آیت: "الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة" تخصیص صورتوں کو حکم سے خارج کرنے والی ہے۔ اگرچہ سنّتِ نبویہ اس کے مطابق واقع ہوئی ہے، مذکورہ آیت کے بارے میں مفصل گفتگو اس سے قبل ہو چکی ہے جہاں پر یہ بحث ہوئی تھی کہ کبھی تلاوت منسوخ اور حکم باقی ہوا کرتا ہے۔

دوسری دلیل ✿ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾﴾ (البقرہ:۱۸۰)

"تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی ایک کو موت آ پہنچے اگر وہ مال چھوڑے تو ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے مناسب طور پر وصیت کرے یہ پرہیز گاروں پر حق ہے۔"

مذکورہ آیتِ مبارکہ، آنحضور ﷺ کے اس فرمان کے ذریعہ منسوخ ہے: ((لا وصية لوارث)).[1] "یعنی وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔"

جو حضرات نفی کرتے ہیں وہ دو طریقوں سے اس کی جرح کرتے ہیں:

(۱) مذکورہ حدیث خبر واحد ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ خبر واحد سے نسخِ قرآن کا عدمِ جواز ہی قولِ حق ہے۔

(۲) حدیثِ کامل سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل ناسخ آیاتِ میراث ہے، حدیثِ مذکور نہیں ہے، مکمل حدیث اس طرح سے ہے:

((ان الله اعطى كل ذى حق حقه، فلا وصية لوارث)).

"یعنی اللہ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے اب کسی وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔"

ابوداؤد شریف کی روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ:

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ﴾ (البقرہ:۱۸۰) کے بارے میں فرمایا کہ وصیت کا حکم پہلے اسی طرح موجود تھا، پھر آیاتِ میراث نے اسے منسوخ کر دیا۔"[2]

تیسری دلیل ✿ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ﴿١٥﴾﴾ (النساء:۱۶)

"اور تمہاری عورتوں میں سے جو کوئی بدکاری کرے ان پر اپنوں میں سے چار مرد گواہ لاؤ پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انہیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے۔"

مذکورہ آیت، حضور ﷺ کے اس فرمان کے ذریعہ منسوخ ہوئی ہے کہ:

((خُذُوا عَنِّي خُذُوا عَنِّي قَدْ جَعَلَ اللهُ لَهُنَّ سَبِيلًا الْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ

---

[1] رواه البخاری فی الوصایا (٦) وابوداؤد فی الوصایا (٦) والترمذی فی الوصایا (٥) والنسائی فی الوصایا (٥) واحمد ٤/١٨٤

[2] ابوداؤد، الوصایا باب ٢٨

مِائَةٍ وَالرَّجْمُ)).①

”مجھ سے حاصل کرلو مجھ سے حاصل کرلو۔ تحقیق اللہ نے عورتوں کے لئے راستہ بنایا ہے کنوارا مرد کنواری عورت سے جو زنا کرنے والا ہو تو ان کو سو کوڑے مارو اور ایک سال کے لئے ملک بدر کرو (مصلحت کے تحت) اور شادی شدہ عورت سے زنا کرے تو سو کوڑے مارو اور رجم یعنی سنگسار کرو۔“

جو لوگ نفی کے قائل ہیں وہ جواب میں اوّلاً کہتے ہیں کہ یہاں ناسخ اصل میں آیتِ جلد اور آیتِ شیخ وشیخہ ہے، گو حدیث بھی ان کے مطابق واقع ہوئی ہے۔

ثانیاً یہ کہ یہ نسخ نہیں بلکہ تخصیص ہے، اس لئے کہ حکمِ اوّل کی انتہاء اللہ نے موت کو قرار دیا یا فرمایا کہ بدکار عورتوں کے بارے میں کوئی نیا قانون صادر ہوگا۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ حکم کا اپنی غایت وانتہاء کو پہنچنا نسخ نہیں کہلاتا۔

چوتھی دلیل ۞ آنحضرت ﷺ کا ہر کچلی دار ۔۔۔۔۔ اور پنجہ دار پرندے سے منع کرنا اس فرمانِ خداوندی کے لئے ناسخ ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ (الانعام:۱۴۵)

”کہہ دو میں اس وحی میں جو مجھے پہنچی ہے کسی چیز کو کھانے پر حرام نہیں پاتا جو اسے کھائے مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ وہ ناپاک ہے یا وہ ناجائز ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے۔“

جو لوگ نفی کے قائل ہیں وہ اس کا مناقشہ یوں کرتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ کا مقصد یہ نہیں کہ اس کے ماسوا ہر چیز مباح ہے، بلکہ وہ تو براءتِ اصلیہ کی وجہ سے مباح ہے اور مذکورہ حدیث نے اسی براءتِ اصلیہ کو رفع کیا ہے اور اس سے پہلے بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ براءتِ اصلیہ کا رفع نسخ نہیں کہلاتا۔

اس تفصیل سے یہ بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ نسخ القرآن بالسنۃ نہ تو عقلاً ممنوع ہے اور نہ شرعاً۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا وقوع نہیں ہے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ وقوع کے مذکورہ دلائل اعتراضات سے محفوظ نہیں ہیں۔

③ نسخ السنۃ بالقرآن

یہ تیسری قسم ہے، اس میں بھی دوسری قسم کی طرح علماء کا جواز اور عدمِ جواز کے اعتبار سے اختلاف ہے، البتہ یہاں پر مانعین کی آواز ذرا پست ہے یعنی دلائل کمزور ہیں۔ اور دوسری جانب مثبتین کے مدعیٰ کی تائید دلیلِ جواز اور دلیلِ وقوع دونوں سے ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں پر مثبتین کی صف میں جمہور فقہاء اور متکلمین کھڑے نظر آتے ہیں اور مانعین کی صف میں امام شافعی رحمہ اللہ اپنے ایک قول کے مطابق اور ان کے چند اصحاب ہی نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کردہ روایت بھی کچھ مضطرب ہے یا ان کی مراد خلافِ ظاہر ہے۔

دلیلِ جواز ۞ یہاں پر بھی سابقہ قسم کی طرح مثبتین جواز پر استدلال کرتے ہیں کہ: نسخ السنۃ بالقرآن نہ تو محال لذاتہ ہے اور نہ ہی محال لغیرہ ہے۔ پہلی بات تو واضح ہے، دوسرے کی وجہ یہ ہے کہ سنت بھی قرآن کی طرح وحی ہے ایک وحی کے ذریعہ دوسری وحی

① رواہ مسلم فی الحدود، حدیث (۱۲) وابوداؤد فی الحدود (۲۳) والترمذی فی الحدود (۸) وابن ماجۃ فی الحدود (۷) والدارمی فی الحدود (۱۹) واحمد: ۳/۴۷۶)

کے منسوخ ہونے سے کوئی امر مانع نہیں ہے کیونکہ اس جہتِ مذکور سے دونوں ایک درجے کے ہیں۔

وقوع اور جواز کے دلائل

اس قسم کے وقوع پر بہت سے واقعات کے ذریعہ استدلال کیا گیا ہے، ہر واقعہ جواز کی بھی دلیل بنتا ہے اور وقوع کی بھی دلیل ہے، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ وقوع، جواز پر دلالت کرتا ہے۔

① ان واقعات میں سے ایک واقعہ نماز میں بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا ہے، یہ صرف سنّتِ نبویہؐ سے معلوم ہوا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان نے منسوخ کیا ہے:

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۗ﴾ (البقرہ:۱۴۴)

"پس اب اپنا مُنہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیجئے اور جہاں کہیں تم ہوا کرو اپنے مونہوں کو اسی طرف پھیر لیا کرو۔"

② رمضان کی راتوں میں کھانا پینا اور مباشرت کرنا روزے داروں پر حرام تھا، پھر اس حرمت کو اس فرمانِ باری تعالیٰ نے منسوخ کر دیا:

﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۚ﴾ (البقرہ:۱۸۷)

"سو اب ان سے مباشرت کیا کرو اور طلب کرو وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تمہارے لئے سفید دھاری سیاہ دھاری سے فجر کے وقت ظاہر ہو جائے۔"

③ حضور نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے سال اہل مکہ سے صلح کا معاہدہ کیا تھا، جس کی ایک شرط یہ تھی کہ اہل مکہ میں سے اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینے آئے گا تو حضور ﷺ اسے واپس کریں گے۔① آنحضور ﷺ نے اپنے اس معاہدہ کو پورا کیا کہ جب ابوجندل اور اہل مکہ کی ایک جماعت مسلمان ہو کر پہنچے تھے تو آپ ﷺ نے ان کو واپس کر دیا۔ پھر جب ایک عورت بھی آئی اور حضور ﷺ نے اسے بھی واپس بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو اللہ نے یہ حکم نازل فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۗ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۗ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۚ﴾ (الممتحنہ:۱۰)

"اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کی جانچ کر لو اللہ ہی ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے پس اگر تم انہیں مومن معلوم کرو تو اُنہیں کفار کی طرف نہ لوٹاؤ نہ وہ (عورتیں) ان کے لئے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) ان کے لئے حلال ہیں۔"

---

① اخرجه البخاری فی الصلح، باب (۷) و مسلم فی الجهاد حدیث (۹۳)

مانعین کا شبہ اور اس کا جواب

ان واقعات سے جو استدلال کیا گیا ہے اس پر مانعین نے ایک اعتراض کیا ہے کہ: ممکن ہے کہ مذکورہ امر میں نسخ سنّت سے ثابت ہو پھر قرآن کا حکم اس کے مطابق آ گیا ہو اس طرح نسخ السنۃ بالسنۃ سے تاویل کی جائے گی، اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ منسوخ حکم اوّلاً قرآن سے ثابت ہو جس کی تلاوت منسوخ ہو پھر سنت نبویہ اُس کے مطابق آ جائے، اس صورت میں نسخ القرآن بالقرآن سے تاویل ہوگی۔

ہم اس اعتراض کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس اعتراض کی بنیاد ہی مہمل امور اور محض احتمالات پر ہے، کسی دلیل سے اس کی تائید نہیں ہوتی، اگر ہم ان احتمالی امور کا اعتبار کرلیں اور اس کا دروازہ کھول دیں تو کسی فقیہ کے لئے جائز نہ ہوگا کہ وہ کسی نص کے متعلق فیصلہ کرے کہ یہ کسی دوسری نص کے لیے ناسخ ہے جب تک کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی تائید صراحتاً ثابت نہ ہو، یہ بات باطل ہے، کیونکہ اس کے برخلاف اُمت کا اجماع ہو چکا ہے، نیز اس قاعدہ پر اتفاق ہے کہ حکم کا مدار اس دلیل پر ہوگا کہ ممکن حد تک استقرار کے بعد اس کے سوا کوئی اور دلیل معلوم نہ ہو سکے۔

مانعین کے دلائل اور ان کا ردّ

① مانعین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سنّت، قرآن کا صرف بیان ہوتی ہے، اگر قرآن، اس سنّت کے لئے ناسخ ہو تو سنّت اس کے لئے بیان نہیں رہے گا۔

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں حصر کا کوئی طریق اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ اس آیت میں حصر موجود ہے تو اس آیت میں بیان سے مراد تبلیغ ہوگا نہ کہ شرح، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تبلیغ بھی اظہار کی ایک صورت ہے، اور بالفرض اگر آیت میں حصر ہو اور بیان سے تبلیغ کی بجائے شرح مراد ہو تو نسخ کے بعد آیت کا بیان فی الجملہ باقی ہے اس اعتبار سے آیت منسوخ نہیں ہوگی اور آپ جانتے ہیں کہ حکمِ شرعی کا بقاء اس شرط کے ساتھ مشروط ہوا کرتا ہے کہ کوئی ناسخ وارد نہ ہو۔ آپ اس تفصیل کو دیکھ لیجئے جو ہم نے نسخ القرآن بالسنۃ کے مانعین کی ذکر کردہ دلیل کے رَدّ میں ذکر کی ہے اس کا آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔

② نیز مانعین یہ بھی کہتے ہیں کہ نسخ السنۃ بالقرآن کی وجہ سے لوگوں پر ان کا دین ملتبس اور مشتبہ ہوگا اور سنّتِ نبویہؐ پر ان کا اعتماد متزلزل ہو جائے گا اور ان کے دل میں آنے لگے کہ سنّتِ رسول ﷺ مرضیاتِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اس طرح شارع کا جو مقصود ہے کہ لوگ پیغمبر ﷺ کے اقوال و افعال کی اقتداء کریں اور رسول کی اطاعت و اتباع کا وجوب یہ سب لاحاصل ہو جائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ بات درست نہیں ہے، لہٰذا جس امر کی وجہ سے (یعنی نسخ السنۃ بالقرآن) یہ بات لازم آئی وہ بھی غلط اور بے بنیاد ہوگی۔

اس استدلال کا اوّلاً جواب یہ ہے کہ اس طرح کی بات تو نسخ کے ان انواع کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے جس کے تم بھی قائل ہو تو جو تمہارا جواب ہوگا وہی ہمارا بھی جواب ہوگا۔

ثانیاً یہ کہ نسخ السنۃ بالقرآن سے مذکورہ باطل امور کا لازم آنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ اس پر قرآنی دلائل کثرت سے موجود ہیں کہ رسولِ کریم ﷺ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے بلکہ جو بھی بولتے ہیں وہ اللہ کی جانب سے وحی ہوتا ہے، یہ امر، مذکورہ فاسد قسم کے احتمالات کو مانع بھی ہے اور اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ نسخ السنۃ بالقرآن کا حکم وہی ہے جو نسخ السنۃ بالسنۃ اور

نسخ القرآن بالقرآن کا ہے، کوئی انصاف پسند اس کا انکار نہیں کرسکتا۔

④ نسخ السنۃ بالسنۃ نسخ السنۃ بالسنۃ کی چار انواع ہیں:
① سنتِ متواترہ کا نسخ سنتِ متواترہ سے۔ ② سنتِ آحادیہ کا نسخ سنتِ آحادیہ سے۔
③ سنتِ آحادیہ کا نسخ سنتِ متواترہ سے۔ ④ سنتِ متواترہ کا نسخ سنتِ آحادیہ سے۔

پہلی تین انواع تو عقلاً و شرعاً دونوں طرح جائز ہیں۔ چوتھی نوع یعنی سنتِ متواترہ کا سنتِ آحادیہ کے ذریعہ نسخ، اس کے عقلاً جواز پر علماء کا اتفاق ہے، لیکن شرعاً جواز کے بارے میں اختلاف ہے، چنانچہ جمہور علماء اس کی نفی اور اہل ظواہر اس کا اثبات کرتے ہیں۔

جمہور کے دلائل ⬢ جمہور علماء نے اپنے مذہب پر دو دلیلیں بیان کی ہیں:

① متواترہ قطعی الثبوت ہوتی ہے اور خبر واحد ظنی الثبوت ہوتی ہے، قطعی دلیل، ظنی دلیل سے مرتفع نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ اس سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ اقویٰ، اضعف کی وجہ سے مرتفع نہیں ہوا کرتا۔

② حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فاطمہ بنتِ قیس رضی اللہ عنہا کی اس خبر کو رد کر دیا تھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے سکنیٰ کا حکم نہیں دیا تھا حالانکہ اس کے شوہر نے اسے طلاقِ بائن دی تھی، اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تردید کو برقرار رکھا۔ اس طرح یہ اجماعی فیصلہ ہوا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کی خبر، خبرِ واحد تھی جو مفیدِ ظن ہوتی ہے، اپنے سے قوی تر خبر کا معارضہ نہیں کرسکتی یعنی کتاب اللہ کے اس حکم کا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ﴾ (الطلاق:٦)

”طلاق دی ہوئی عورتوں کو وہیں رکھو جہاں تم اپنے مقدور کے موافق رہتے ہو۔“

نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ متواترہ کے بھی معارض اور مقابل نہیں ہوسکتی جس میں سکنیٰ کو طلاق بائن والی عورت کا حق قرار دیا گیا ہے۔

اہم بات اس موقع پر کتبِ اصول میں حضرت فاطمہ بنتِ قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث میں کچھ الفاظ داخل کر دیئے گئے ہیں، مثلاً ان کتب میں یہ ہے کہ ”جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ حدیث پہنچی تو فرمایا: ہم اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ایک عورت کے قول کی بناء پر ترک نہیں کرسکتے۔ کیا پتہ اس نے سچ بولا یا جھوٹ بولا، بات کو یاد رکھا یا بھول گئی!“ بعض لوگوں نے اس داخل شدہ الفاظ کی نسبت امام مسلم رحمہ اللہ کی طرف کی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ((أصدقت أم كذبت)) ”سچ بولا یا جھوٹ بولا“ کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ صرف یہ الفاظ ہیں: ((أحفظت أم نسيت)) ”اس نے یاد رکھا یا بھول گئی۔“

آپ کے علم میں ہوگا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حفظ و نسیان میں شک کی وجہ سے ان کی عدالت و صداقت مجروح نہیں ہوتی۔ آپ کو چاہیے کہ بے جا بحث و مباحثہ کرنے والے مستشرقین اور ان کے دُم بردار لوگوں سے اجتناب کریں، ان کی باتوں میں آ کر اس طرح کی ناقابلِ اعتبار روایات کی بناء پر کہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جرح اور تنقید نہ شروع کر دیں۔

اگر آپ کو مزید اس طرح کی روایت کی تحقیق وتعلیق درکار ہو تو ہم نے اپنی کتاب "المنهل الحديث فی علوم الحديث" میں اس عنوان کے تحت "دفع شبهات فی هذا المقام" جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ لیجئے۔

اہل ظواہر کے دلائل

اہل ظواہر نے اخبار آحاد کے ذریعہ خبر متواتر کے شرعاً جوازِ نسخ کے سلسلہ میں چند شبہات پر اعتماد کیا ہے جنہیں وہ ادلہ خیال کرتے ہیں، حالانکہ وہ حقیقت میں ادلہ نہیں ہیں۔

درج ذیل چند ایک دلائل پیش کیے جاتے ہیں:

① نسخ، عمومِ زمانہ کی تخصیص کا نام ہے۔لہٰذا خبرِ واحد سے نسخ جائز ہے، خواہ منسوخ حکم خبرِ متواتر ہی کیوں نہ ہو! جیسا کہ عمومِ اشخاص کی تخصیص خبرِ واحد کے ذریعہ جائز ہوتی ہے، اگرچہ عام مخصوص البعض خبر متواتر ہو۔

ہم اس کا اوّلاً جواب یہ دیتے ہیں کہ منسوخ شدہ نص سے مقصود تمام زمانے ہوتے ہیں۔اس سے مقصد صرف حکم کا وقتِ نسخ تک استمرار اور تسلسل نہیں ہوتا، تب تو نسخ عموم کی تخصیص کا نہیں بلکہ مقتضائے عموم کو رفع کرنے کا نام ہوگا۔

پھر بھلا نسخ کو تخصیص پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے حالانکہ تخصیص، مقصودِ کلام کے لئے بیانِ محض ہوتی ہے۔

ثانیاً یہ کہ ہم بھی حنفیہ کی رائے کے مطابق خبرِ واحد کے ذریعہ تخصیصِ متواتر کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔

② اہلِ قبا بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک آنے والے شخص نے ان کو خبر دی کہ قبلہ اب تبدیل ہو کر خانۂ کعبہ ہو گیا ہے، سب نے اس کی خبر کو مانتے اور قبول کرتے ہوئے نماز ہی کی حالت میں اپنا رخ کعبہ کی طرف پھیر لیا، جب یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے اس بات کو برقرار رکھا۔یہ اس امر کی دلیل ہے کہ خبرِ واحد متواتر کو منسوخ کر سکتی ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مذکورہ واقعہ میں اس خبرِ واحد کے ساتھ ایسے قرائن شامل ہو گئے جس نے اس خبر کو مفید علم قطعی بنا دیا، ہماری گفتگو ایسی خبرِ واحد میں ہے جو علم قطعی کا فائدہ نہ دیتی ہو، یہ قرائن جس نے اس موقع پر قطعی علم کا فائدہ دیا، ہم ان کو اس طرح جان سکتے ہیں کہ یہ مروی واقعہ ایک ایسا جزوی حسی واقعہ ہے کہ جو خطا ونسیان کا احتمال نہیں رکھتا اور اس واقعہ کا تعلق بھی ایک عظیم امر سے ہے یعنی مسلمانوں کی ایک جماعت کا نماز ادا کرنا۔نیز اس واقعہ کے راوی بھی ایک جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ ہیں، اور پھر اس راوی اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان اور کوئی واسطہ بھی نہیں ہے۔نیز وہ راوی بھی بخوبی جانتے تھے کہ اگر جھوٹ بولے گا تو لامحالہ اس کی سب کے سامنے رسوائی ہوگی اور پھر وہ ایسی سزا وعقاب سے دوچار ہوگا جسے عام طور پر عقل محال سمجھتی ہے، حالانکہ وہ عظیم مرتبہ کے راوی ہیں۔علاوہ ازیں استقبال بیت المقدس کی منسوخی بھی متوقع تھی، کیونکہ اہلِ عرب کو بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کو بھی استقبالِ کعبہ محبوب تھا جو ان کے لئے اور ان کے آباء واجداد کے لئے فخر ومباہات کا باعث تھا۔آنحضرت ﷺ اس کے لئے وحی کے منتظر رہتے، آسمان کی طرف اپنا رخ مبارک اُٹھایا کرتے تھے۔جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ﴾ (البقرۃ: ۱۴۴)

"بیشک ہم آپ کے مُنہ کا آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں سو ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے

ہیں پس آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیجئے اور جہاں کہیں تم ہوا کرو اپنے مونہوں کو اسی کی طرف پھیر لیا کرو۔"

قیاس کا ناسخ اور منسوخ ہونا

اس کی تین صورتیں ہیں:

① قیاس ایک ایسے حکم کو منسوخ کرے جس پر خود قیاس دلالت کرتا ہو، علماء نے اس کی مثال یہ بیان کی ہے کہ مثلاً زید کی سخاوت کی وجہ سے اس کا اکرام کرنا شارع واجب قرار دے پھر اس علتِ سخاوت کے پائے جانے کی وجہ سے عمرو کو بھی اس پر قیاس کریں پھر بعد ازاں شارع نشہ کا عادی ہونے کی وجہ سے بکر کی اہانت کو لازم قرار دے پھر ہم نشہ کی علت، پائے جانے کی وجہ سے اس پر مذکورہ عمرو کو بھی قیاس کر لیں، اس طرح عمرو کے اکرام کا وجوب اس کی اہانت کے وجوب کی وجہ سے منسوخ ہوگا یہ اس صورت میں ہے کہ جب دوسرے قیاس کو پہلے پر ترجیح دی جائے۔

② قیاس ایسے حکم کو منسوخ کرے جس پر نص دلالت کرتی ہو۔ جیسے شارع نبیذ کی اباحت پر صراحت کرے، پھر اس کے بعد نشہ آور ہونے کے سبب شراب کو حرام قرار دے، پھر ہم علتِ سکر پائے جانے کی وجہ سے اس پر نبیذ کو قیاس کر لیں۔ اس طرح نص سے ثابت ہونے والی اباحت کا حکم منسوخ ہوگا اس حرمت کے حکم کے ذریعہ جو قیاس سے ثابت ہوا۔

③ کوئی نص، قیاس کو منسوخ کرے، مثلاً شارع، خمر کو نشہ آور ہونے کی وجہ سے حرام قرار دے، پھر ہم اس پر علتِ سکر کے پائے جانے کی وجہ سے نبیذ کو بھی محمول کریں، اس کے بعد شارع، نبیذ کی اباحت پر صریح حکم دے دے، پس اس طرح قیاس سے ثابت ہونے والی نبیذ کی حرمت منسوخ ہوگی نبیذ کی اس اباحت کے ذریعہ جو نص سے ثابت ہوئی۔

علماء کا اس کے بارے میں اختلاف ہے بعض تو قیاس کے ناسخ اور منسوخ ہونے کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں، اور کچھ حضرات اسے مطلقاً جائز کہتے ہیں اور کچھ لوگ اس میں تفصیل بیان کرتے ہیں۔ جمہور علماء قطعی ہونے کی صورت میں قیاس کے ناسخ اور منسوخ ہونے کو جائز قرار دیتے ہیں اور ظنی ہونے کی صورت میں اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔

اور قیاسِ قطعی اس قیاس کو کہتے ہیں جس میں قیاس کی دونوں اطراف میں عدم اختلاف کی نسبت قطعی اور یقینی طور پر پائی جاتی ہو۔ جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کے گرنے سے ہم قیاس کریں کہ اس میں پیشاب موجود ہے اور اس پر اس کا حکم یعنی کراہت کا حکم لگا دیا جائے۔

مانعین کے دلائل

جو حضرات قیاس کے منسوخ ہونے کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر قیاس کو منسوخ مان لیا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ اصل کا حکم تو باقی رہے اور فرع کا حکم مرتفع ہو جائے، عقل اس کو قبول نہیں کرتی، نیز وہ علت جس پر شارع نے اصل کا حکم مرتب کیا ہے وہ فرع میں موجود ہوتی ہے تو جب تک اصل کا حکم باقی رہے گا وہ علت فرع میں بقائے حکم کا موجب ہوگی۔

ہم اس استدلال کو دو طریقے سے رَد کرتے ہیں:

① قیاس کا منسوخ ہونا مذکورہ امر کا تقاضا نہیں کرتا، بلکہ حکمِ فرع کے ارتفاع کی وجہ سے حکمِ اصل کے تبعاً ارتفاع کا تقاضا کرتا ہے: مطلب یہ کہ فرع کے حکم کا منسوخ ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شارع نے اس علت کو ہی کالعدم قرار دے دیا ہے جس پر اصل کا حکم مرتب تھا، اب اس علت کو کالعدم قرار دینا ارتفاعِ حکم کا ہی تقاضا کرتا ہے۔

② اس میں کوئی عقلی امتناع نہیں ہے کہ شارع حکم فرع کو اس بناء پر منسوخ قرار دے کہ اس نے علت میں کسی ایسی قید کا اعتبار کیا ہے جو اس سے قبل معتبر نہ تھی، اور یہ قید اصل حکم میں موجود ہو اور فرع میں موجود نہ ہو۔

یہ تو قیاس کی منسوخیت مطلقاً ناجائز قرار دینے والوں کی دلیل اور اس کا مناقشہ تھا، باقی قیاس کی ناسخیت کے مطلقاً ناجائز ہونے کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ: منسوخ کی تین صورتیں ہیں:

(۱) منسوخ حکم کوئی نص ہوگی۔ (۲) منسوخ حکم کوئی اجماع ہوگا۔ (۳) منسوخ حکم کوئی قیاس ہوگا۔

پہلی صورت کہ منسوخ حکم کوئی نص ہو، ایسا نہیں ہوسکتا، کیونکہ نص کی دلالت، قیاس سے قوی تر ہوتی ہے، ضعیف چیز اپنے سے قوی تر چیز کو رفع نہیں کرسکتی۔ اسی طرح دوسری صورت کہ منسوخ حکم کوئی اجماع ہو تو یہ بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ جماع ناسخ یا منسوخ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، جیسا کہ اس کی تحقیق آگے آ رہی ہے۔ اور تیسری صورت کہ منسوخ حکم کوئی قیاس ہو یہ بھی جائز نہیں، کیونکہ صحتِ قیاس کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ اپنے مساوی اور ارجح معارض سے سالم اور محفوظ ہو۔ اس مؤخر قیاس میں فرض کردہ امر یہی ہے کہ وہ پہلے سے ارجح ہوگا۔ اس سے قیاسِ اوّل کا بطلان واضح ہو جاتا ہے جب اس کا بطلان واضح ہوگیا تو اس قیاس کے ناسخ ہونے کا قول بھی باطل ہو جائے گا۔ کیونکہ نسخ نام ہے ایسے حکم کو اٹھا لینے کا جو پہلے سے ثابت اور موجود ہو۔ یہاں تو اس کا عدم ثبوت اور بطلان واضح ہو چکا ہے۔

ہم اس استدلال کا مناقشہ اس طرح کرتے ہیں کہ مطلقاً یہ کہنا کہ نص دلالت کے اعتبار سے قیاس سے قوی تر ہوتی ہے، ہمیں تسلیم نہیں ہے، کیونکہ کچھ ایسی نصوص بھی ہوتی ہیں جن کی دلالت مخفی ہوتی ہے کہ ماہرین ہی ان کو سمجھ پاتے ہیں اور اسی طرح کچھ ایسے قیاس بھی ہوتے ہیں جن کی دلالت پر انصاف پسند محقق پر ظاہر اور واضح ہوتی ہے۔

مجوّزین کی دلیل

جو لوگ قیاس کے علی الاطلاق ناسخ اور منسوخ ہونے کے قائل ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ قیاس ایک دلیل شرعی ہے، کوئی عقلی یا نقلی دلیل اس کے ناسخ اور منسوخ نہ ہونے پر موجود نہیں ہے۔

ہم اس استدلال کا مناقشہ یوں کرتے ہیں کہ ان کا علی الاطلاق یہ کہنا اس بات کو مستلزم ہے کہ قیاسِ ظنی اور قیاسِ قطعی میں مساوات ہے، اسی طرح اس قول سے قیاس ظنی سے قیاس قطعی کے ارتفاع کا جواز لازم آتا ہے، جبکہ یہ دونوں اُمور عقلاً اور نقلاً باطل اور بے بنیاد ہیں۔

جمہور کی دلیل

اگر قیاس قطعی ہو تو اس کی ناسخیت و منسوخیت کے جواز پر جمہور علماء کا استدلال یہ ہے کہ قیاسِ قطعی کی ناسخیت و منسوخیت کسی عقلی یا شرعی مانع کو مستلزم نہیں ہے اور اگر قیاسِ ظنی ہو تو اس کی ناسخیت و منسوخیت کے عدم جواز پر ان کا استدلال یہ ہے کہ اس کا جواز امر محال کو مستلزم ہے اس کی منسوخیت کے عدم جواز کی توضیح یہ ہے کہ قیاسِ ظنی کا ناسخ یا تو قطعی ہوگا یا ظنی، دونوں صورتیں قیاسِ اوّل کو باطل قرار دیتی ہیں، اور باطل کا تو کوئی ثبوت ہی نہیں کہ وہ منسوخ قرار پائے، جمہور علماء کا اس بات پر کہ یہ دونوں صورتیں قیاسِ اوّل کو باطل کرنے والی ہیں، یہ ہے کہ قیاس، حکم کا تقاضا اس شرط کے ساتھ کرتا ہے کہ اس کے مساوی یا اس سے زیادہ راجح کوئی معارض موجود نہ ہو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مؤخر قیاس قطعی، قیاسِ اوّل سے زیادہ قوی ہے، اور ظنی اس سے زیادہ راجح ہے تو بھلا وہ اس کے لیے ناسخ کیسے ہوگا؟ تو ان دو صورتوں میں سے کوئی صورت ظاہر ہو تو اس سے قیاسِ

اوّل کا بطلان واضح ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ قیاسِ ظنی کا منسوخ ہونا جائز نہیں ہے۔

اور قیاسِ ظنی کی ناسخیت کے عدم جواز پر ان کی دلیل یہ ہے کہ قیاسِ ظنی سے منسوخ کردہ حکم یا تو قطعی ہوگا یا ظنی ہوگا، قطعی ہونا جائز نہیں، کیونکہ ظنی چیز یقینی چیز کو رفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتی، اسی طرح ظنی ہونا بھی جائز نہیں، کیونکہ قیاسِ ظنی حکم کا تقاضا اس شرط کے ساتھ کرتا ہے کہ اس کے مساوی یا اس سے زیادہ راجح کوئی معارض موجود نہ ہو، جبکہ اس صورت میں اس کا معارض موجود ہے اور وہ مؤخر قیاس ہے جس کا اس سے زیادہ راجح ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اس کے لئے ناسخ بن سکے۔ بناء بریں مؤخر قیاس پہلے کے لئے ناسخ نہیں ہوگا بلکہ مقدم قیاس جو حکم کا تقاضا کرتا ہے اس کے بطلان کو ظاہر کرنے والا ہوگا۔

اجماع کا ناسخ اور منسوخ ہونا

جمہور علماءِ اصول کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اجماع ناسخ بھی نہیں بن سکتا اور منسوخ بھی نہیں بن سکتا۔ ان کا استدلال اس کے ناسخ نہ ہونے پر یہ ہے کہ اجماع کے ذریعہ منسوخ شدہ حکم یا تو کوئی نص ہوگی یا اجماع ہوگا یا قیاس ہوگا، نص ہونا بھی جائز نہیں، کیونکہ اجماع کے لئے ضروری ہے کہ اس پر کوئی نص موجود ہو جس پر اس کا اعتماد ہو، خصوصاً جبکہ اجماع کا انعقاد ہی نص کے خلاف حکم پر ہو تب تو ناسخ وہ نص ہوگی جس پر اجماع کی بنیاد رکھی گئی تھی، نفسِ اجماع نہ ہوگا۔ اسی طرح وہ منسوخ حکم اجماع بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اجماع کے لئے کسی نص یا قیاس کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے جس پر اس کی بنیاد ہوتی ہے۔ کسی دلیل کے بغیر اجماع ایسا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف بغیر علم کے کوئی بات منسوب کردینا۔ اور بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی قول منسوب کرنا ضلالت اور گمراہی ہے، اور اُمتِ محمدیہ کبھی بھی ضلالت پر جمع نہیں ہوسکتی اور اس میں اجماعِ ثانی کی دلیل کا نص ہونا ضروری ہے جو اجماعِ اوّل کے بعد پیش آئی ہو، کیونکہ اگر وہ نص، اجماعِ اوّل سے پہلے متحقق ہوگی تو اجماع کا اس کے خلاف منعقد ہونا ممکن نہ ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد کسی نص کا پایا جانا محال ہے، لہٰذا جو امر اس کا سبب بنا ہے یعنی نسخ الاجماع بالاجماع وہ بھی محال ہوگا۔

اسی طرح اجماع کے ذریعہ قیاس کا منسوخ ہونا بھی جائز نہیں، اس لئے کہ کسی خلاف قیاس امر پر اجماع کا ہونا دو امور میں سے کسی ایک کا تقاضا کرتا ہے یا تو قیاس کے غلط ہونے کا اور یا پھر دلیل اجماع سے اس کے منسوخ ہونے کا۔ دونوں صورتوں میں اجماع اس کے لئے ناسخ نہیں ہوگا۔

جمہور علماء نے اس بات پر کہ اجماع کا منسوخ ہونا بھی جائز نہیں، اس طرح استدلال کیا ہے کہ اجماع کا حجت ہونا وصالِ رسول ﷺ کے بعد معتبر مانا گیا ہے، تو ایسی صورت میں اجماع کے لئے امر ناسخ کی بھی تین صورتیں ہوں گی۔ (۱) وہ ناسخ کوئی نص ہو (۲) وہ ناسخ قیاس ہو (۳) وہ ناسخ اجماع ہو۔ وہ ناسخ نص بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ ناسخ، منسوخ سے مؤخر ہوتا ہے، یہ بات قابلِ فہم نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال فرما جانے کے بعد کوئی نص وجود میں آئے۔ اور وہ ناسخ اجماع، کوئی قیاس بھی نہیں ہوسکتا، کیونکہ قیاس سے اجماع کا نسخ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اصل پر دلالت کرنے والا حکم، رسول اللہ ﷺ کے بعد وجود میں آئے اور یہ امر باطل ہے۔ اسی طرح اجماع کا ناسخ، اجماع بھی نہیں ہوسکتا، اس کی وجہ پہلے گزر چکی ہے۔

باقی علماء کا یہ قول کہ "هذا الحكم منسوخ اجماعًا" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اجماع اس بات پر منعقد ہوا ہے

کہ یہ حکم کتاب وسنّت کی دلیل سے منسوخ ہے، یہ مطلب نہیں کہ خود اجماع نے اس حکم کو منسوخ کیا ہے۔

مجوّزین کے مذہب پر بحث اور گفتگو

اس سے پہلے جمہور علماء کا مذہب بیان کیا گیا، اس کے مقابل بعض معتزلہ اور دیگر حضرات اس بات کو جائز قرار دیتے ہیں کہ اجماع ہر ایسے حکم کے لئے ناسخ بن سکتا جہاں کوئی نص اس کی صلاحیت رکھتی ہو۔

انہوں نے چند دلائل سے استدلال کیا ہے۔

① مؤلفۃ القلوب کا زکوٰۃ میں سے حصّہ، قرآن کی صریح آیت ﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ الۡعٰمِلِیۡنَ عَلَیۡہَا وَ الۡمُؤَلَّفَۃِ قُلُوۡبُہُمۡ .....﴾(التوبہ:٦٠) سے ثابت ہے۔ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں باجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اس کا حکم منسوخ ہوا ہے۔ ہم چند وجوہ سے اس استدلال کا جواب دیتے ہیں، اوّلاً یہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ثابت نہیں ہے جس کی دلیل ائمہ مجتہدین کا مؤلفۃ القلوب کے حصّے کے سقوط کے بارے اختلاف کا پایا جانا ہے۔

ثانیاً یہ کہ ان مصارفِ زکوٰۃ میں مؤلفۃ القلوب کے اعتبار کی علت یہ تھی کہ ان کی وجہ سے اسلام کو عزت وشوکت ہو، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اسلام کے پیروکاروں میں خوب اضافہ ہوا اور اسلام کو وسعت واشاعت بھی حاصل ہوئی اس وجہ سے دورِ صدیقی میں عملی طور پر اسلام کو عزت وشوکت حاصل ہو چکی تھی اب انہیں عزت دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تو علّت کے سقوط کی وجہ سے ان مؤلفۃ القلوب کا حصہ بھی ساقط ہو گیا۔

ثالثاً یہ کہ اگر بالفرض اس اجماع کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اجماع کی بنیاد کسی دلیل پر ہوتی ہے تو ناسخ وہ بنیادی دلیل ہوا نہ کہ خود اجماع۔

ناسخ ومنسوخ کے بارے میں علماء کا مؤقف

اس بارے میں علماء کا مؤقف مختلف ہے، کوئی تو معتدل مؤقف رکھتا ہے اور کوئی افراط کا اور کوئی تفریط کا شکار ہے۔

ناسخ ومنسوخ کے بارے میں جو حضرات تفریط کا شکار ہوئے انہوں نے نسخ سے علی الطلاق گلوخلاصی کرتے ہوئے تاویل کا طریقہ اختیار کیا اور اسے تخصیص وغیرہ سے تعبیر کر دیا، جیسا کہ ابو مسلم اصفہانی رحمہ اللہ اور ان کے ہم نوا۔ ہم اپنی رائے ان کے بارے میں پہلے بیان کر آئے ہیں۔ اور اس بارے میں معتدل مؤقف رکھنے والے معقول حدود میں نسخ کے قائل ہوئے، کہ نہ تو ابو مسلم وغیرہ کی طرح اس کی بالکلیہ نفی کی اور نہ ہی افراط اور غُلو اختیار کرنے والوں کی طرح اس کا دائرہ وسیع کیا بلکہ حدِ ضرورت کا مؤقف اختیار کیا کہ جہاں دلائل میں حقیقی تعارض پایا جاتا ہے اور مقدم اور مؤخر امور کا پتہ چلتا ہے، صرف اس حد تک نسخ کے قائل ہوئے ہیں۔

کچھ لوگ حدِ افراط سے آگے نکل کر ناقابلِ اعتبار شبہات کی بناء پر نسخ میں ایسے امور بھی شامل کرنے لگے جن کا نسخ سے کوئی تعلق نہیں تھا، ان لوگوں میں ابوجعفر النحاس رحمہ اللہ (جن کی کتاب "الناسخ والمنسوخ" ہے) ھبۃ اللہ بن سلامۃ اور ابوعبداللہ محمد بن حزم رحمہ اللہ وغیرہ شامل ہیں، ان حضرات نے نسخ کے موضوع پر کتابیں لکھیں، اور اس میں اشتباہ یا مغالطے کی وجہ سے کثرت سے ناسخ ومنسوخ کا ذکر کیا، ان کے اس اضافے کا منشا اور سبب یہ ہوا کہ انہیں دھوکہ لگا کہ انہوں نے اسلاف سے منقول ہر نسخ کو اصطلاحی نسخ سمجھ لیا، حالانکہ اسلاف کی مراد اس سے اصطلاحی معنی میں نسخ نہیں تھا، بلکہ وہ اس کا عام معنی مراد لیتے تھے یعنی بیان

مجمل، تقییدِ مطلق وغیرہ

زیادہ نسخ ماننے والوں کی غلطی اور اس کے اسباب

ہم یہاں ان کی اس غلطی کے پانچ اسباب بیان کرتے ہیں:

① ان کا یہ خیال کہ جو حکم بھی کسی سبب کی وجہ سے مشروع ہوا، پھر وہ سبب ختم ہوگیا تو وہ بھی منسوخ میں شامل ہے، اس بناء پر انہوں نے وہ آیاتِ کریمہ جن میں مسلمانوں کے ضعف اور قلت کے زمانہ میں کفار کی ایذاء رسانی پر صبر وتحمل کی ترغیب دی گئی ہے ان کو آیاتِ قتال سے منسوخ قرار دے دیا، حالانکہ وہ منسوخ نہیں ہیں، بلکہ ان آیات کے احکامات کا دارومدار اسباب پر ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ضعف اور عددی قلت کے زمانے میں مسلمانوں کو ضعف وقلت کے سبب صبر وتحمل کا حکم دیا ہے، پھر قوت اور کثرت کے زمانے میں ان کو جہاد کا حکم دیا ہے۔ جس کی علت اور سبب قوت اور کثرت ہے، آپ کو بخوبی علم ہے کہ حکم اپنے وجود اور عدم کے اعتبار سے دائر مع العلۃ ہوتا ہے، اب انتفاءِ علت سے انتفاءِ حکم ہو تو اسے نسخ شمار نہیں کرتے، جس کی دلیل یہ ہے کہ ضعف و قلت کے وقت صبر وتحمل کا وجوب آج تک برابر پایا جاتا ہے، اور قوت وکثرت کے وقت جہاد اور دفاع کا وجوب بھی اسی طرح آج تک برابر موجود ہے۔

② ان کا یہ وہم وگمان کہ اسلام نے زمانۂ جاہلیت کے جن امور کو باطل اور کالعدم قرار دیا وہ بھی منسوخ شدہ احکام میں شامل ہے کہ اسلام نے ایک حکم کو دوسرے حکم سے منسوخ کیا ہے، مثلاً باپ کی بیویوں سے نکاح کا ناجائز قرار دینا، طلاق کی تعداد کو تین میں منحصر کرنا، نکاح کی تعداد کو بھی چار تک رکھنا، جبکہ یہ دونوں چیزیں پہلے محدود درجے میں نہ تھیں۔ حالانکہ یہ امور نسخ میں شامل نہیں ہیں، اس لئے کہ "نسخ" حکمِ شرعی کے اٹھا لینے کا نام ہے، جبکہ مذکورہ مثالوں میں اسلام نے براءتِ اصلیہ کو اٹھایا ہے اور وہ حکمِ عقلی ہے، شرعی نہیں ہے۔

③ ان کو تخصیص کے بارے میں نسخ کا اشتباہ ہونا بھی اس کا ایک سبب ہے، مثلاً وہ آیات جن میں استثناء یا غایت کی وجہ سے بعض افراد کو حکم سے خارج کیا گیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا﴾ (الشعراء: ۲۲۴، ۲۲۷)

"اور شاعروں کی پیروی تو گمراہ ہی کرتے ہیں، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں بھٹکتے پھرتے ہیں، اور وہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں مگر وہ جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لیا۔"

نیز فرمایا: ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ (البقرہ: ۱۰۹)

"سو معاف کرو اور درگزر کرو جب تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے۔"

④ انہیں بیان کے بارے میں نسخ کا اشتباہ ہوا۔ جیسے ارشادِ باری ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (النساء: ۶)

"اور جسے ضرورت نہ ہو وہ یتیم کے مال سے بچے اور جو حاجت مند ہو وہ مناسب مقدار کھالے۔"

ان میں بعض لوگوں کو یہ وہم ہوا کہ مذکورہ آیت ناسخ ہے اس فرمانِ الٰہی کے لئے

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡكُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا﴾ (النساء:۱۰)

حالاں کہ مذکورہ آیت اس کے لئے ناسخ نہیں بلکہ ﴿مالیس بظلم﴾ کا بیان ہے، اس آیت میں ﴿ظُلۡمًا﴾ کی قید سے معلوم ہوا کہ جو ظلم میں شامل نہ ہو وہ جائز ہے، قاعدہ ہے کہ: "وبضدها تتميز الاشياء" یعنی اضداد سے اشیاء واضح ہوتی ہیں۔

⑤ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اُنہیں دو نصوص میں تعارض کا وہم ہو جاتا ہے، حالانکہ حقیقت میں کوئی تعارض نہیں ہوتا۔ جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے: ﴿وَ اَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰكُمۡ﴾ (المنافقون:۱۰) نیز فرمانِ الٰہی ہے ﴿وَ مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ﴾ (البقرہ:۳) اب یہاں پر بعض لوگوں کو یہ وہم ہوا کہ یہ مذکورہ دونوں آیات، آیتِ زکوٰۃ سے منسوخ ہیں جس کی بنیاد یہ وہم ہے کہ ان دونوں میں تعارض پایا جاتا ہے، حالانکہ کوئی تعارض اور منافات نہیں ہے، کیونکہ مذکورہ دونوں آیتوں کو زکوٰۃ، نفلی صدقات، اہل وعیال اور عزیز واقارب وغیرہ پر خرچ کرنے پر محمول کرنا درست ہے اور آیتِ زکوٰۃ کو بھی ان آیات کے ساتھ ہی ساتھ افرادِ عام میں سے ایک فرد کے قبیل میں سے قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی چیز عام میں تخصیص کی طاقت نہیں رکھتی چہ جائیکہ اس میں نسخ کی قوت پیدا ہو۔ کیونکہ ان میں حقیقی تعارض موجود ہی نہیں ہوتا، نہ ہی تمام افرادِ عام کے اعتبار سے کہ وہ ناسخ ہو اور نہ ہی بعض افرادِ عام کے لحاظ سے کہ وہ مخصص بن جائے۔

جن آیات کا منسوخ ہونا مشہور ہے

جیسا کہ ابھی یہ بات آپ کو معلوم ہوئی کہ کچھ لوگ مغالطہ یا اشتباہ کی وجہ سے بہت سی آیات کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ اب ہم مزید ایک اور بات آپ کو بتاتے ہیں کہ بعض بلند پایہ علماء نے ایسے لوگوں کا تعاقب بھی کیا ہے اور ان کے اس قول پر تنقید بھی کی ہے۔ جیسے قاضی ابوبکر ابن العربی اور علامہ جلال الدین السیوطی رحمہما اللہ وغیرہ، علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے قرآن کی قابلِ نسخ آیات کو بائیس کے عدد میں منحصر کیا ہے، پھر یہ بھی کہا ہے کہ استیذان اور قسمت والی دو آیات میں صحیح قول کے مطابق نسخ نہیں ہے، بلکہ وہ محکم ہیں۔ وہ بائیس آیاتِ منسوخہ بہ ترتیبِ قرآنی مع تشریح وتوضیح کے پیش کی جاتی ہیں:

پہلی آیت ○ ﴿وَ لِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَ الۡمَغۡرِبُ ٭ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرہ:۱۱۵)۔ بعض علماء کے قول کے مطابق یہ آیت مذکورہ، اس فرمانِ الٰہی سے منسوخ ہے: ﴿فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ ... وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ﴾ (البقرہ:۱۴۹-۱۵۰)۔

اس لئے کہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں مسجد حرام کے علاوہ کی طرف بھی رُخ کرنا جائز ہے جب تک کہ تمام آفاق اللہ کے لئے موجود ہیں اور اللہ کی کوئی جہت متعینہ نہیں ہے۔ اور دوسری آیتِ مبارکہ اس کے عدمِ جواز پر دلالت کرتی ہے، جب تک کہ مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کا حتمی حکم موجود ہے، خواہ ہم کسی بھی جگہ پر ہوں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت منسوخ نہیں ہے، بلکہ محکم ہے، ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ یہ آیت مذکورہ، تحویلِ قبلہ کے وقت یہود کے اس قول کی تردید میں نازل ہوئی کہ:

﴿مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ (البقرہ:۱۴۲)

"ان کو اس قبلے سے کس نے پھیر دیا جس پر وہ پہلے کار بند تھے۔"

اس صورت میں بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما مذکورہ آیت، نزول کے اعتبار سے آیتِ تحویل سے مؤخر ہوگی، اور یہ نا قابلِ فہم بات ہے کہ ناسخ، منسوخ سے پہلے ہو، پھر اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تمام آفاق اللہ کے ہیں، جبکہ اللہ کی ذات کسی مخصوص جگہ میں نہیں ہے اور اس میں اس کے لئے کوئی متعین جہت نہیں ہے۔ بایں صورت تو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ بندوں کو نماز میں جس جانب بھی وہ چاہے رُخ کرنے کا حکم دے دے اور جس طرف بھی وہ چاہے ان کو پھیر دیں، اب اس معنی میں کوئی تعارض نہیں ہے، نیز اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے بندوں کو استقبالِ بیت المقدس کے بعد استقبالِ کعبۃ اللہ کا وجوبی طور پر حکم دے دے۔ جہاں تعارض نہ ہو وہاں نسخ نہیں ہوتا، بلکہ دونوں آیتیں اپنی جگہ محکم ہیں، اس کی تائید اس جملے سے ہوتی ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ یہ جملہ تحویلِ قبلہ کے سلسلہ میں نازل ہونے والی ان آیات کے ضمن میں آیا ہے جو تحویلِ قبلہ کے بارے میں الزام لگاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھ لیجئے:

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ﴾ (البقرہ:۱۴۲)

بعض علماء یوں تعارض کی نفی اور نسخ کو دُور کرتے ہیں کہ آیتِ کریمہ ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾ (البقرہ:۱۱۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کی حالت میں سواری پر سوار ہو کر نفلی نماز کعبہ کے علاوہ کسی اور جانب رُخ کر کے پڑھنا جائز ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اب بھی یہ حکم باقی ہے، منسوخ نہیں ہوا اور دوسری آیت فرض نمازوں میں استقبالِ کعبہ کے وجوب پر دلالت کرتی ہے، بعض حضرات پہلی آیت کو توجہ فی الدعا پر اور دوسری آیت کو توجہ فی الصلوٰۃ پر محمول کرتے ہیں۔ بہر حال ان دونوں احتمالات کی روشنی میں آیات میں کوئی تعارض موجود نہیں ہے۔ جب تعارض نہیں ہے تو نسخ بھی نہیں ہوگا۔ مذکورہ دو آراء اگرچہ آیت کے محکم ہونے میں سابقہ رائے کے مطابق ہے، لیکن آیت کے معنی میں ایسی تاویل پر مبنی ہیں جو ظاہری معنی کے خلاف ہے، جیسا کہ یہ بات واضح ہے۔

ہاں البتہ جن کے ہاں نسخ السنۃ بالقرآن جائز ہے ان کی رائے کے مطابق آیتِ کریمہ ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ﴾ (البقرہ:۱۴۹) استقبالِ بیت المقدس کے وجوب کے لئے ناسخ قرار پائے گی جس کا وجوب سنّت سے ثابت ہوا ہے۔

دوسری آیت ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (البقرہ:۱۸۰)

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ جس مسلمان کا وقتِ موت آ جائے اس پر والدین اور اقربین کے لئے وصیت کرنا فرض اور واجب ہے۔ اس آیت کے منسوخ ہونے، نیز اس کے ناسخ کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء اس آیت کو منسوخ کہتے ہیں اور ناسخ آیاتِ مواریث کو قرار دیتے ہیں۔ بعض علماء اس آیت کو منسوخ بالسنۃ کہتے ہیں، کہ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے: ((لا وصیۃ لوارث))۔ بعض کے نزدیک اجماعِ اُمت کی وجہ سے منسوخ ہے کہ والدین اور اقربین کی وصیت کے عدمِ وجوب پر اجماع ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں ہے۔ پھر محکم ماننے والے علماء میں اختلاف ہے، چنانچہ ان میں بعض علماء اس آیت کو اس شخص پر محمول کرتے ہیں جو اقربین میں سے میراث سے محروم رکھا گیا ہو۔ اور بعض علماء اس کو اس شخص پر محمول

کرتے ہیں جس کے حالات ایسے ہوں جو شفقت و ہمدردی کا تقاضا کرتے ہوں، جیسے بوڑھی عورت اور ورثاء میں کثیر العیال شخص۔

میری رائے یہ ہے کہ جمہور علماء کی بات مبنی برحق ہے کہ آیتِ مذکورہ منسوخ ہے اور اس کی ناسخ، آیاتِ مواریث ہے، اس آیتِ مذکورہ کو محکم قرار دینا تکلف پر مبنی قول ہے اور موضوع سے ہٹی ہوئی بات ہے۔ اس لئے کہ والدین (جن کا مذکورہ آیت میں ذکر آیا ہے) کسی بھی صورت میں میراث سے محروم نہیں ہوتے، علاوہ ازیں وارث کے لئے وصیت کے عدم جواز پر کثرت سے دلائل موجود ہیں، تاکہ ورثاء کے حصص کی پاس داری بھی ہو اور اس قطع رحمی سے حفاظت بھی ہو جس کے ہم بُرے نتائج دیکھ رہے ہیں کہ شیطان، مورث کو سُجھاتا ہے اور وہ مرنے سے پہلے اپنی وصیت کے ذریعہ کسی وارث کو دوسروں پر فوقیت دے کر ان میں باہمی بغض و عداوت کا تخم ڈال دیتا ہے۔

باقی یہ کہنا کہ اس آیت کی ناسخ، سنّتِ نبویہؐ ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آحادی حدیث ہے۔ آحادی حدیث ظنی درجہ کی ہوتی ہے اور ظنی چیز قطعی چیز کو منسوخ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔

اور اجماع کو ناسخ قرار دینا بھی درست نہیں جس کی وجہ پہلے آ چکی کہ اجماع کا ناسخ اور منسوخ بننا جائز نہیں ہے۔ ہاں البتہ آیتِ وصیت کا آیاتِ مواریث کے ذریعہ منسوخ ہونا قابلِ خفا و لائق احتمال ہے۔ لیکن سنّتِ نبویہؐ سے یہ خفا اور احتمال دُور ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کا ناسخ ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے آیتِ میراث کے نزول کے بعد ارشاد فرمایا: "بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق عطا کر دیا ہے، اب وارث کے لئے وصیت جائز نہیں" بایں معنی امام شافعی رحمہ اللہ سے ایک بات منقول ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے: "اللہ تعالیٰ نے آیتِ وصیت بھی نازل فرمائی اور آیتِ میراث بھی اب اس میں احتمال ہے کہ آیتِ میراث کے ساتھ آیتِ وصیت کا حکم بھی باقی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ آیتِ میراث، آیتِ وصیت کے لئے ناسخ ہو، علماء نے جستجو کی کہ ان دو احتمالوں میں سے کون سا احتمال راجح ہے؟ تو انہیں رسول اللہ ﷺ کی سنّت میں یہ حکم ملا: ((لا وصية لوارث))۔ یہ حدیث اگرچہ خبرِ واحد ہے جو نسخِ آیت کی طاقت نہیں رکھتی، لیکن بیانِ آیت اور نسخ کے احتمال کو عدمِ نسخ کے احتمال پر ترجیح دینے کے باب میں ضعیف نہیں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی اس بات کو خوب یاد رکھیے۔ ہم یہ بات بھی بتاتے ہیں کہ امام شعبی اور امام نخعی رحمہما اللہ آیتِ وصیت کو منسوخ نہیں مانتے، جس کی بنیاد یہ ہے کہ وصیت ایک مستحب حکم ہے، وجوبی درجہ کا حکم نہیں ہے، لہٰذا اس آیتِ وصیت کا آیتِ میراث کے ساتھ کوئی تعارض نہیں ہے۔ اسی طرح آیتِ وصیت اور اس حدیثِ مبارک ((لا وصية لوارث)) کے مابین بھی کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ وارث کے لئے کوئی واجب درجے کی وصیت نہیں ہے۔ یہ وصیت کے استحباب کے منافی نہیں ہے۔ جب تعارض نہیں تو نسخ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن ہماری سمجھ کے مطابق یہ رائے کمزور ہے، اس لئے کہ آیتِ وصیت میں لفظ ﴿كُتِبَ﴾ فرضیت کے معنی پر دلالت کر رہا ہے، مذکورہ رائے اس ظاہری مفہوم کے خلاف ہے، اسی طرح اس میں ﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ﴾ بھی معنی الزام و وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں سنّتِ نبویہ ﷺ کے شواہد بھی وصیت وارث کی ممانعت کا پتہ دیتے ہیں۔

تیسری آیت ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (البقرہ: ۱۸۴)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے اسے اختیار ہے چاہے تو روزہ رکھ لے اور چاہے روزہ چھوڑ دے اور فدیہ دے دے۔ اس آیت کو اس فرمانِ الٰہی نے منسوخ کر دیا: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (البقرہ:۱۸۵) جس سے پتہ چلتا ہے کہ اختیار نہیں ہے بلکہ ہر تندرست اور مقیم مسلمان پر روزہ رکھنا واجب ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ آیتِ بالا محکم ہے، منسوخ نہیں ہے، اس لئے کہ وہاں حرفِ نفی محذوف ہے، اصل عبارت یہ تھی: ﴿وَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ ....﴾ اس حذف پر ﴿يُطَوَّقُوْنَهٗ﴾ (واو کی تشدید اور اس کے فتح کے ساتھ) کی قراءت دلالت کرتی ہے، مطلب یہ ہوگا کہ وہ بڑی مشقت اور جدوجہد کے ساتھ روزہ رکھ پاتا ہو۔ ایسی صورت میں نہ تعارض ہوگا اور نہ ہی نسخ ماننے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس رائے کو اوّلاً اس لئے مسترد کر دیا گیا ہے کہ اس کی بنیاد اس پر ہے کہ آیت کے اندر حذف کو مانا گیا ہے، اور یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ حذف، خلافِ اصل ہوتا ہے، باقی تشدید کے ساتھ ﴿يُطَوَّقُوْنَهٗ﴾ والی قراءت بھی کسی ایسی مشقت پر دلالت نہیں کرتی جو وجوبِ صوم کے بعد صاحبِ مشقت کو جوازِ افطار تک پہنچا دے، ہاں البتہ تھوڑی بہت مشقت پر ضرور دلالت کرتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر روزے میں کچھ نہ کچھ مشقت ہوا کرتی ہے۔ خصوصاً جب اس کی مشروعیت کی ابتداء ہوئی تھی۔ ثانیاً اس لیے ابوجعفر النحاس نے اپنی کتاب "الناسخ والمنسوخ" میں حضرت سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ ....﴾ تو ہم میں سے جو چاہتا روزہ رکھتا اور جو چاہتا فدیہ دے دیتا، لیکن پھر اس کے بعد والی آیت نے اسے منسوخ کر دیا۔

چوتھی آیت ✿ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (البقرہ:۱۸۳)

اس آیت میں ذکر کردہ تشبیہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ سابقہ لوگوں پر جو احکام آئے تھے جیسے ہمبستری کا حرام ہونا روزے کی رات سونے کے بعد کھانے کا نا جائز ہونا وغیرہ، اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے موافق ہو (یعنی ان پر بھی مذکورہ امور حرام ہوں) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہ امور منسوخ ہو گئے ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾ (البقرہ:۱۸۷) علماء نے اسی طرح بیان کیا ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ تشبیہ من کل الوجوہ ہو، بناء بریں ﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ کی تشبیہ سے استدلال کر کے اہلِ کتاب کی موافقت کے وجوب کا تقاضا ثابت کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ بناء بریں ان دو آیتوں میں کوئی تعارض نہیں، جب تعارض منتفی ہے تو نسخ بھی منتفی ہوگا۔

پانچویں آیت ✿ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ﴾ (البقرہ:۲۱۷)

اس آیت سے ماہِ حرمت میں قتال کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ امام ابن جریر رحمہ اللہ حضرت عطا بن میسرہ رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ منسوخ ہے۔ اس فرمانِ الٰہی کی وجہ سے ﴿وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً﴾ (التوبہ:۳۶) بلکہ ابوجعفر النحاس رحمہ اللہ نے حضرت عطاء کے سوا دیگر علماء سے اس کی منسوخیت پر اجماع نقل کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آیتِ ہذا ﴿وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کے ساتھ قتال کی اجازت عام ہے، اور اشخاص کا عموم، زمانوں کے عموم کو مستلزم ہے، اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین میں قبیلہ ہوازن اور طائف میں قبیلہ ثقیف سے جو قتال کیا تھا وہ ۸ھ میں شوال اور ذی قعدہ کے مہینوں میں کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذی قعدہ بھی اشہرِ حرم میں داخل ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت (۲۱۷) کی ناسخ آیت ہذا ﴿وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً﴾ نہیں ہے بلکہ یہ آیت کریمہ ہے ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ (التوبہ:۵) کیونکہ امکنہ کا عموم، ازمنہ کے عموم کو مستلزم ہوتا ہے۔ یہ جمہور علماء کی رائے ہے جو ہماری فہم کے مطابق حضرت عطاء بن میسرہ وغیرہ کے قول کی وجہ سے مرجوح ہے کہ پہلی آیت میں عمومِ اشخاص اور دوسری آیت میں عمومِ امکنہ ان میں سے کوئی بھی عمومِ ازمنہ کو مستلزم نہیں ہے، تب تو کوئی تعارض بھی نہیں آتا اور نسخ بھی لازم نہیں آتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آیتِ اولیٰ عمومِ اشخاص اور آیتِ ثانیہ عمومِ امکنہ پر متنبہ کرتی ہے اور دونوں میں سے ہر ایک اشہرِ حرم میں حرمتِ قتال کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ عمومِ اشخاص اور عمومِ امکنہ اشہرِ حرم کے سوا بعض ازمنہ میں متحقق ہوتا ہے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اشہرِ حرم میں قتال کی حرمت ہمیشہ باقی رہے گی۔ ہاں البتہ جب اس سے زیادہ سخت امر کی جزا ہو تو اس وقت اس عارض کی وجہ سے قتال جائز ہوگا، جیسا کہ اسی آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے:

﴿وَ صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ﴾ (البقرہ:۲۱۷)

"اور اللہ کے راستہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بڑا گناہ ہے اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔"

چھٹی آیت ۞ ﴿وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ﴾ (البقرہ:۲۴۰)

یہ آیت اس فرمانِ الٰہی سے منسوخ ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ﴾ (البقرہ:۲۳۴)

اس لیے کہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو جب تک وہ گھر سے نہ نکلے اس کے لیے ایک سال تک نفقہ اور سکنیٰ کی وصیت کی جائے گی۔ اگر گھر سے نکلے گی تو پھر اسے کوئی چیز نہیں ملے گی۔ اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی عورت چار ماہ دس دن انتظار کرے گی جو کہ اس کے لیے واجب ہے، اس سے یہ بات لازمی طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ اس مدت میں اس کے لئے گھر سے نکلنا یا شادی کرنا جائز نہ ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ نسخ نہیں بلکہ تخصیص ہے، کیونکہ عورت حاملہ ہو تو کبھی اس کی عدت پورا ایک سال ہوتی ہے، لیکن یہ بات اس طرح مسترد کی جاتی ہے کہ آیتِ اولیٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت پورا سال عدت گزارے جبکہ وہ غیر حاملہ ہو اور حاملہ ہو تو اس کا حمل ایک سال نہ ٹھہرا ہو۔ اور آیتِ ثانیہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم یقینی طور پر اٹھا لیا گیا ہے۔ اس سے نسخ ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ حاملہ ہونے کی صورت میں ایک پورا سال عدت گزارنا آیتِ اولیٰ سے مفہوم نہیں ہوتا، بلکہ اس آیتِ کریمہ ﴿وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ﴾ (الطلاق:۴) سے اس کا حکم معلوم ہوتا ہے (کہ اس کی عدت بس وضع حمل ہے) اور یہ ایک سال کے ساتھ مقید نہیں ہے بلکہ اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

بعض کا خیال یہ ہے کہ آیتِ اُولیٰ محکم ہے اور پہلی اور دوسری آیت میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ پہلی آیت ایک خاص صورت کے ساتھ مخصوص ہے کہ جب زوجہ کو اس کی وصیت کی گئی ہو اور وہ گھر سے نہ نکلے اور شادی نہ کرے۔ اور دوسری آیت میں اس مدت اور عدت کو بیان کیا گیا ہے کہ اس کے لئے کتنا عرصہ رُکے رہنا واجب ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ دونوں مختلف موقع ہیں۔ لیکن یہ خیال اس طرح مردود ہے کہ پہلی آیت تو ایسی عورت کو جس کا شوہر فوت ہو جائے حقِ خروج بھی دیتی ہے اور حقِ زواج بھی کہ جب چاہے گھر سے نکل بھی سکتی ہے اور شادی بھی کرسکتی ہے۔ اس کے لئے چار ماہ دس دن سے قبل بھی حرام نہیں ہے۔ جبکہ دوسری آیت سے یہ دونوں امور حرام ہونا معلوم ہوتے ہیں اور ایسی عورت پر ایک عرصہ تک انتظار کرنے کو واجب قرار دیتی ہے کہ وہ اس طویل مدت (چار ماہ دس دن) میں گھر سے باہر بھی نہیں جاسکتی اور شادی بھی نہیں کرسکتی۔ معلوم ہوا کہ حق بات یہ ہے کہ یہاں نسخ کا قول زیادہ معتبر مانا جائے، جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔

ساتویں آیت ۞ ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ ﴾ (البقرۃ: ۲۸۴) یہ آیت اس فرمانِ خداوندی سے منسوخ ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ دل میں جو خطرات اور خیالات آتے ہیں جن کو انسان دُور کرنے پر قدرت نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کا بھی مکلف بناتا ہے (کہ اس پر بھی باز پرس کریں گے) جبکہ اس کے مقابلہ میں دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں اس کا مکلف نہیں بناتے، کیونکہ وہ ان ہی امور کا بندوں کو مکلف بناتا ہے جو ان کی وسعت اور قدرت میں ہوتا ہے۔

ہمیں یوں لگتا ہے کہ دوسری آیت، پہلی آیت کے لئے مخصص ہے، ناسخ نہیں ہے۔ اس لیے کہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان امور کا مکلف بناتے ہیں جن کو وہ ظاہر کرنے یا چھپانے کی استطاعت رکھتے ہیں اور آیتِ اولیٰ کی افادیت ہمیشہ رہے گی، دوسری آیت کے معارض نہیں ہے کہ ہم اسے منسوخ قرار دیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ آیتِ مذکورہ محکم ہے کہ اس کا تعلق گواہی کے چھپانے اور ظاہر کرنے سے ہے۔ لیکن یہ رائے بھی درست نہیں کیونکہ اس تخصیص پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ مذکورہ آیت محکم بھی ہے اور اپنے عموم پر باقی بھی ہے، مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مومنین اور کفار دونوں کا ان امور پر محاسبہ کریں گے جو وہ ظاہر کرتے اور جو وہ چھپاتے ہیں، لیکن پھر مومنین کو معاف فرما دیں گے اور کافروں کو سزا دیں گے۔

لیکن یہ رائے بھی مسترد کی جاتی ہے، کیونکہ جب یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس امر کا مکلف بناتے ہیں جو اس کی طاقت میں ہوتا ہے، تو اس کے بعد آیت میں عموم مراد نہیں لیا جا سکتا، خواہ وہ شخص مومن ہو یا کافر، اس لئے کہ آیت میں موجود لفظ ﴿نَفْسًا﴾ نکرہ تحت النفی واقع ہونے کی وجہ سے عموم کا فائدہ دیتا ہے۔

آٹھویں آیت ۞ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آل عمران: ۱۰۲)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سورۂ آل عمران میں اس آیت کے علاوہ اور کسی آیت کے بارے میں دعوائے نسخ درست نہیں ہے۔ لہٰذا بعض علماء کے نزدیک یہ آیت اس فرمانِ خداوندی سے منسوخ ہوئی ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ... الخ﴾ (التغابن: ۱۶)

میرے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ کیونکہ ان دونوں آیتوں میں حقیقی تعارض ناقابلِ تسلیم ہے، کیونکہ پہلی آیت میں

جو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ سے ڈرو جیسے ڈرنے کا حق ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مکلفین کی استطاعت میں جو کچھ ہے وہ اس کے مطابق احکام بجالائیں، جو ان کی استطاعت میں نہیں ہے وہ بجالانا مراد نہیں ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں بھی یہ آیا ہے کہ انسان اپنے سر اور جس کو وہ شامل ہے اس کی حفاظت کرے اور اپنے پیٹ اور جس کو وہ شامل ہے اس کی حفاظت کرے اور موت کو اور بوسیدہ ہو جانے کو یاد رکھا کرے اور یہ چیز بلاشبہ اللہ کی توفیق سے انسان کی استطاعت اور طاقت میں شامل ہے۔ بناء بریں مذکورہ دونوں آیات کے درمیان کوئی تعارض نہ ہوگا۔ جب تعارض نہیں تو نسخ بھی نہیں ہوگا۔

نویں آیت ۞ ﴿وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝﴾ (النساء:۸)

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت مبارکہ آیتِ میراث سے منسوخ ہوگئی ہے۔ لیکن ظاہر یہی ہے کہ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے۔ کیونکہ اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ ترکہ تقسیم ہوتے وقت جو عزیز و اقارب یتیم اور مسکین لوگ موجود ہوں اُنہیں بھی اس ترکہ میں سے کچھ دے دیا کرو، اب یہ حکم ورثاء کے علاوہ مذکورہ لوگوں کے لیے علی وجہ الاستحباب اب بھی باقی ہے۔ بناء بریں نہ تعارض ہے اور نہ نسخ ماننے کی ضرورت۔

ہاں اگر ہم مذکورہ لوگوں کو ترکہ میں سے کچھ دینا وجوبی طور پر قرار دیں تو پھر یہ وجوب آیتِ میراث سے منسوخ ہوگا۔ اور حکم مذکور میں استحباب کا درجہ حکم اوّل کی بجائے ایک دوسری دلیل سے ثابت ہے۔ پس قولِ نسخ سے کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آیت مذکورہ محکم ہے لیکن لوگ اس پر عمل کرنے میں سُستی کرنے لگے ہیں۔ اسی لئے ہم ترجیح اس بات کو دیں گے کہ آیتِ مذکورہ میں شروع ہی سے حکم استحباب کا تھا وجوب کے لئے نہیں تھا، حتیٰ کہ اس کے محکم ہونے کا قول اختیار کیا جائے۔ (غور کرلیں)

دسویں آیت ۞ ﴿وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ﴾ (النساء:۳۳) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان نے مذکورہ آیت کو منسوخ کردیا ہے: ﴿وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ (الانفال:۷۵)۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت منسوخ نہیں ہے، کیونکہ یہ مولی الموالات کی وراثت پر دلالت کرتی ہے جو اب بھی باقی ہے ہاں البتہ وراثت میں ان کا درجہ ذوی الارحام کے بعد ہے۔ فقہاء عراق اسی کے قائل ہیں۔

گیارھویں آیت ۞ ﴿وَ الّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝ وَ الَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا﴾ (النساء:۱۵-۱۶)۔ یہ آیت سورۂ نور کی اس آیت سے منسوخ ہے: ﴿اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَ لْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (النور:۲)۔ اور یہ نسخ صرف غیر شادی شدہ کے اعتبار سے ہے خواہ مرد ہو یا عورت۔ لیکن جو مرد اور عورت شادی شدہ ہو ان دونوں کے اعتبار سے حکمِ اوّل منسوخ ہو کر اس کے بدلہ میں رجم کا حکم دیا گیا ہے جس پر منسوخ التلاوۃ آیت ﴿الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ﴾ دلالت کرتی ہے۔ نیز سنتِ نبویہ ﷺ بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔

بعض حضرات مذکورہ آیت کو محکم قرار دیتے ہیں کہ یہ منسوخ نہیں ہے، بلکہ محکم ہے جس کی وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ پہلی

آیت ان عورتوں کے بارے میں ہے جو فسق و فجور اور شک و تہمت کے موقعوں پر آتی جاتی ہوں لیکن زنا اور بدکاری کا ارتکاب نہ کریں اور دوسری آیت ان عورتوں کے بارے میں ہے جن سے بدکاری کا عمل ثابت ہوا ہو۔ لیکن یہ قول بھی قابلِ ردّ ہے، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ ایسی تاویل ہے جو بغیر کسی دلیل کے ظاہر آیت کے متصادم ہے، کیونکہ فرمانِ الٰہی ﴿ يَأْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ ﴾ سے متبادر یہی مفہوم ہو رہا ہے کہ ان عورتوں کا نفسِ فاحشہ سے تعلق ہو، نہ کہ محض فاحشہ کے اسباب اور اس کے مواقع سے ان کا تعلق ہو۔ نیز حضور اکرم ﷺ کا بھی فرمان ہے:

((خُذُوا عَنِّي خُذُوا عَنِّي قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا الْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَنَفْيُ سَنَةٍ وَالثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَالرَّجْمُ)).

بارھویں آیت ○ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ﴾ (المائدہ:۲) بعض علماء اس آیت کے ایک جزو ﴿ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ﴾ کو اس فرمانِ الٰہی کے عمومِ مقتضیٰ کے سبب منسوخ قرار دیتے ہیں: ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ﴾ (التوبہ:۳۶) اس پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ بہر حال حق یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔

تیرھویں آیت ○ ﴿ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ﴾ (المائدہ:۴۲) یہ آیتِ کریمہ اس فرمانِ خداوندی کے سبب منسوخ ہے: ﴿ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ (المائدہ:۴۹)۔ بعض حضرات عدمِ نسخ کے قائل ہیں، نیز یہ کہ دوسری آیت پہلی آیت کا تتمہ ہے۔ پہلی آیت میں پیغمبر علیہ السلام کو اختیار دیا گیا کہ ان کے درمیان فیصلہ کریں یا اعراض کریں، اور دوسری آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر آپ فیصلہ کریں گے تو پھر اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہوگا، ہم اسی رائے کو راجح قرار دیتے ہیں، کیونکہ نسخ صرف اسی موقع پر مانا جاتا ہے جب جمع و تطبیق ممکن نہ ہو۔

چودھویں آیت ○ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ ﴾ (المائدہ:۱۰۶) اس آیت میں ﴿ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ ﴾ منسوخ ہے اس فرمانِ خداوندی کی وجہ سے ﴿ وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ (الطلاق:۲)۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت منسوخ نہیں ہے، اس لیے کہ پہلی آیت اس صورت کے ساتھ خاص ہے کہ جب کوئی مسافر حالتِ سفر میں موت کی کشمکش میں مبتلا ہو جائے اور وہ وصیت کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو حکم دیا گیا کہ اس کی وصیت دو عادل شخصوں کی گواہی سے ثابت ہوگی، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اس عموم کی وجہ مسافروں کے لئے آسانی پیدا کرنا ہے، کیونکہ بسا اوقات سفر کے حالات بڑے دشوار گزار ہوا کرتے ہیں، صرف مسلمان کا ملنا دشوار ہو جاتا ہے، اگر شارع غیر مسلم کی گواہی کو جائز قرار نہ دیتا تو معاملہ مشکل کا شکار ہو جاتا اور وصیت کا عمل بھی بسا اوقات رائیگاں چلا جاتا ہے، اور دوسری آیت میں ایک معروف قاعدہ بتایا گیا ہے جس کا سفر کے حالات سے تعلق نہیں ہے۔

پندرھویں آیت ○ ﴿ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ ﴾ (الانفال:۶۵) یہ آیتِ مبارکہ اس فرمان سے منسوخ ہے۔ ﴿ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۚ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾ (الانفال:۶۶) منسوخ ہونے کی وجہ

یہ ہے کہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک فرد کا دس افراد کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا واجب ہے، جبکہ دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کا دو کے مقابلے میں ثابت قدمی واجب ہے، اب یہ دونوں حکم باہم متعارض ہیں، لہٰذا آیت ثانیہ، آیت اولیٰ کے لئے ناسخ ہوگی۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور نہ ہی نسخ ہے، کیونکہ دوسری آیت، پہلے حکم کو رفع نہیں کرتی، کہ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ ایک آدمی دس آدمیوں سے قتال نہ کرے جبکہ وہ اس کی طاقت بھی رکھتا ہو، بلکہ یہ آیت صرف تخفیف کرنے والی ہے جس کا معنی یہ ہوا کہ اگر کوئی مجاہد دس آدمیوں سے لڑنے کی طاقت رکھتا ہے تو اسے اختیار حاصل ہے، مسلمانوں کے غلبہ و شوکت کے بعد اللہ کی طرف سے اسے رخصت حاصل ہے۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس صورت کو اختیار کر کے بھی نسخ کو ماننے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ پہلی آیت مجاہد کے لئے اس بات کو لازم قرار دیتی ہے کہ وہ دس افراد کے مقابلہ میں ثابت قدم رہے، جبکہ دوسری آیت دس افراد کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے اور دو سے زیادہ افراد کی صورت میں ثابت قدم نہ رہنے کا اختیار دیتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں یعنی تخییر اور متعین طور پر لازم کرنا ان میں باہم تعارض ہے۔

سولھویں آیت ٥ ﴿اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا﴾ (التوبہ:۴۱) یہ آیت، آیات عذر سے منسوخ ہے اور وہ یہ ہیں:

① ﴿لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَی الْمَرْضٰی وَ لَا عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ مَا یُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ (التوبہ:۹۱)

② ﴿وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَیْهِمْ لَعَلَّهُمْ یَحْذَرُوْنَ﴾ (التوبہ:۱۲۲)

بعض علماء کا قول ہے کہ: آخری آیت کا تعلق قتال سے نہیں ہے بلکہ تعلیم و تفقہ کے لئے گھر سے نکلنے سے ہے، اور پہلی دو آیات مخصص ہیں، اور مذکورہ دو آیات، آیت اُولیٰ کے لئے ناسخ نہیں ہیں۔ گویا کہ شروع ہی یوں فرمایا کہ تم میں سے ہر وہ شخص جو جہاد پر جانے کی طاقت رکھتا ہو اور اسے کوئی عذر لاحق نہ ہو اسے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ہلکے اور بوجھل ہو کر نکلنا چاہیے۔

سترھویں آیت ٥ ﴿اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ﴾ (النور:۳) یہ آیت مبارکہ اس فرمانِ الٰہی سے منسوخ ہے ﴿وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰی مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآئِكُمْ﴾ (النور:۳۲) اس لیے کہ آیت ہے تو خبر لیکن نہی کے معنی میں ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ ایک قراءت میں ﴿لَا یَنْكِحْ﴾ جزم کے ساتھ آیا ہے۔ قراءات ایک دوسرے کی تفسیر کیا کرتی ہیں۔

بعض حضرات نسخ کے قائل نہیں ہیں کہ اصل میں پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو زانی زنا کاری میں معروف ہو وہ زانیہ عورت یا مشرکہ عورت کے سوا اور کسی سے نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، کیونکہ پاک دامن اور ایمان دار عورتیں ایسے شخص کی زوجہ بننے سے نفرت رکھتی ہیں۔ اسی طرح جو عورت بدکاری میں مشہور ہو اس سے سوائے بدکار مرد یا مشرک عورت کے کوئی دوسرا شخص نکاح کرنے کی رغبت نہیں رکھا کرتا، کیونکہ نیک و صالح مومن ایسی عورت کو اپنی بیوی بنانے سے نفرت کیا کرتے ہیں۔

حق بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت منسوخ ہے، کیونکہ یہ خبر ہے لیکن نہی کے معنی میں ہے، جیسا کہ پہلے گزرا۔ نیز اس لیے کہ

مشرک اور مشرکہ کے اعتبار سے حکم درست نہیں رہتا جب تک کہ نسخ کو نہ مانا جائے۔

اٹھارھویں آیت ﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَ الَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَ حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ وَ مِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ﴾ (النور:۵۸)

بعض علماء اس آیت کی منسوخیت کے قائل ہیں، حالانکہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، لہٰذا حق یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے، اس میں ایک عظیم ادب سکھایا گیا ہے کہ خدمتگار اور چھوٹے بچے کشفِ عورت کے مواقع سے دُور رہا کریں، تا کہ کسی کی آبروریزی یا ہتکِ عزت نہ ہو پائے اور آنکھوں کی بھی حفاظت ہو پائے کہ کپڑے اتارنے کے اوقات میں کسی نا مناسب جگہ پر نظر نہ پڑ جائے۔

اُنیسویں آیت ﴿ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ ﴾ (الاحزاب:۵۲) یہ آیتِ کریمہ، اس فرمانِ خداوندی سے منسوخ ہے: ﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِیْۤ اٰتَیْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَیْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ٘ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَاۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ (الاحزاب:۵۰)

یاد رہے کہ مذکورہ نسخ اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جب اس آیت کو پہلی سے نزول میں مؤخر مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولِ کریم ﷺ کے لئے ﴿ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ ...الخ ﴾ میں پہلے جو چیز حرام کی تھی وہ آپ ﷺ کی آخری زندگی میں حلال کر دی تھی۔

جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا، امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ نیز امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ناسخ میں اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ترمذی میں نقل کر کے اس کی تصحیح کی ہے۔ اسی طرح امام نسائی، اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو روایت کیا اور اس کی تصحیح بھی کی ہے۔ [1]

اور ابن المنذر وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ کی وفات نہیں ہوئی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے حلال کر دیا کہ محرم عورت کے سوا جس عورت سے نکاح کرنا چاہیں کر لیں۔

اللہ تعالیٰ نے اوّلاً آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے سوا باقی عورتیں حرام کر دیں، پھر جو حرام کی تھیں ان کو حلال کر دیا، اس میں نکتہ یہ ہے کہ پہلی بار تحریم میں آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی خاطر داری مقصود تھی اس بناء پر کہ انہوں نے آیتِ تخییر کے نزول کے بعد دنیا کے مقابلہ میں اللہ، اس کے رسول ﷺ اور دارِ آخرت کو ترجیح دی تھی، پھر بعد میں جو حرام کیا تھا اسے حلال کر دیا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے مزید شادی نہیں فرمائی اس سے آپ ﷺ کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے اور ازواج کے ساتھ اکرام کا برتاؤ بھی پتہ چلتا ہے کہ جائز ہونے کے باوجود آپ ﷺ نے ان ہی پر اکتفاء فرمایا، مزید شادی نہیں فرمائی۔

ہم نے جو بات ذکر کی ہے اس کے خلاف بھی اس موضوع میں دیگر روایات آتی ہیں، لیکن ہماری نظر میں ان میں سے کوئی روایت درجہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ اس لئے ہم نے اس بات کو ترجیح دی ہے جو تفصیل سے ہم ذکر کر آئے ہیں، یہاں پر نسخ کی وجہ سے

---

[1] رواہ الترمذی فی کتاب تفسیر القرآن، باب (۳۴) حدیث (۳۲۱۶) والنسائی فی کتاب النکاح، باب ما افترض اللہ عزوجل علی رسولہ علیہ السلام وحرمہ علی خلقہ، والمستدرک للحاکم ۲/۴۳۷)

بات بے لطف نہیں کی جائے گی، کیونکہ آیتِ منسوخہ، مصحف میں آیتِ ناسخہ سے مؤخر ہے، آپ جانتے ہی ہیں کہ دارومدار ترتیب نزولی کا ہے، مصحف کی ترتیب کا نہیں ہے۔

بیسویں آیت ۞ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً﴾ (المجادلہ: ۱۲) اس کو بعد والی آیت نے منسوخ کیا ہے: ﴿ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ (المجادلہ: ۱۳)

بعض کے نزدیک یہاں نسخ کی صورت نہیں پائی جاتی، دلیل یہ ہے کہ دوسری آیت میں اس صدقے کی وضاحت بیان کی گئی ہے جس کا پہلی آیت میں حکم دیا گیا تھا کہ وہ صدقہ یوں بھی دیا جا سکتا ہے کہ وہ صدقہ مالی نہ ہو جیسے نماز قائم کر لی جائے، زکوٰۃ دے دی جائے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کر لی جائے۔

آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات تکلف اور تاویل بے جا سے خالی نہیں ہے، صدقہ اپنے معروف معنی کے اعتبار سے صرف مالی طور پر کچھ خرچ کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ اس لفظ کا معنی حقیقی و عرفی ہے۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ صدقہ پیش کرنے کا وجوب اس کا سبب زائل ہونے کی وجہ سے ختم ہو چکا ہے، اور اس کا سبب یہ تھا کہ منافق اور غیر منافق میں امتیاز ہو جائے۔ یہ رائے بھی قابلِ اعتبار نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر حکم کو جو منسوخ کرتے ہیں وہ کسی حکمت کی بناء پر ہی کرتے ہیں، جیسے کوئی مصلحت یا سبب ہو جس سے حکمِ اوّل کا تعلق وابستہ ہو، پھر وہ مصلحت یا سبب ختم ہو جائے۔

اکیسویں آیت ۞ ﴿وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا﴾ (الممتحنہ: ۱۱) بعض کی رائے میں آیتِ غنیمت اس کی ناسخ ہے جو یہ ہے: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ (الانفال: ۴۱)

اس کی توضیح یہ ہے کہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی وہ بیویاں جو مرتد ہو کر دارالحرب چلی جائیں تم ان کے (سابقہ) شوہروں کو ان کے دیئے ہوئے مہر کے برابر مالِ غنیمت میں سے دے دو جو تم نے ان سے حاصل کیا تھا اور دشمن کو وہ مال لے کر ان کو سزا دی تھی۔ اور دوسری آیت بتاتی ہے کہ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں پھر شارع کے حکم کے مطابق ان کو تقسیم کیا جائے گا۔

لیکن آپ ذرا غور کریں گے تو آپ پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہاں نسخ کی صورت نہیں ہے۔ دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ بلکہ دونوں میں تطبیق دینا ممکن ہے، وہ اس طرح سے کہ اوّلاً تو مالِ غنیمت میں سے ان مرتد ہو کر دارالحرب جانے والی بیویوں کے مہر دیئے جائیں گے پھر مالِ غنیمت کے پانچ حصے کر کے اس کو شرعی مصارف میں بانٹ دیا جائے گا۔

بائیسویں آیت ۞ ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝﴾ (المزمل: ۱-۴) یہ آیت سورۂ ہذا کی آخری آیت سے منسوخ ہے: ﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۚ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ (المزمل: ۲۰)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر نصف رات یا اس سے کم یا زیادہ قیام کرنا واجب تھا، اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نظرِ کرم فرمائی کہ ان کو اس قیام لیل کے ترک کرنے کی رخصت عنایت فرمادی اور اس بارے میں ہر طرح کی مشقت اٹھالی ہے کہ اس پر کوئی سزا وغیرہ نہیں رکھی، جیسا کہ گنہگار لوگ توبہ کرلیں تو ان سے گناہ کی سزا وغیرہ اٹھالی جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دوسرا حکم پہلے حکم کو اٹھا لینے والا ہے، لہٰذا نسخ ہی کی صورت بنے گی۔ ان آیات کی تفسیر وتشریح میں بہت کچھ کہا گیا ہے، ہم اس کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کثرت سے قیل وقال کرنے سے بچائے رکھے اور نزاع واختلاف سے دُور رکھتے ہوئے اپنے دین اور اپنی محبت کی بناء پر ہماری صفوں میں اتحاد پیدا فرمائے۔ (آمین)

سلامٌ علی المرسلین والحمد للہ ربّ العالمین

بحث ⑮

قرآن کا محکم اور متشابہ

لغوی مفہوم محکم اور متشابہ، ان دو لفظوں کے لغوی اور اصطلاحی طور پر مختلف اطلاقات ہیں، اہل لغت لفظِ احکام (ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ) کو متعدد معانی میں استعمال کرتے ہیں، لیکن تعدد کے باوجود ان کا خلاصہ اور مرجع ایک ہی ہے اور وہ ہے "روکنا"۔ چنانچہ اہل لغت کہتے ہیں: "احکم الامر" یعنی اس چیز کو مستحکم کیا اور اسے فساد سے روکا۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ: "احکمه عن الامر" یعنی اس نے اس کو اس کام سے روکا، نیز کہتے ہیں "حکم نفسه و حکم الناس" مطلب ہوتا ہے کہ اس نے خود کو اور دوسروں کو نامناسب کام سے روکا۔ اسی طرح اہل عرب کہتے ہیں کہ "احکم الفرس" یعنی گھوڑے کو لگام دی، احکم کا لفظ حَكَمَة (تینوں حرکتیں فتح کے ساتھ) سے ماخوذ ہے، گھوڑے کی دونوں جانب جو لگام ہوتی ہے جو اسے ادھر اُدھر حرکت کرنے سے روکتی ہے، اسے کہتے ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ "آتاه الله الحكمة" اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عدل یا علم یا حلم یا نبوت یا قرآن سے سرفراز فرمایا، ان میں بھی وہ ادبی محافظ امور پائے جاتے ہیں جو انسان کو نامناسب امور سے باز رکھتے ہیں اس لیے "حکمة" سے مذکورہ چیزوں کو تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اہل لغت لفظِ متشابہ کو ایسے معنی میں استعمال کرتے ہیں جس سے ایسی مماثلت اور مشابہت پر دلالت ہوتی ہو جو اکثر و بیشتر التباس اور اشتباہ کا سبب بنتی ہو۔ اہل عرب کہتے ہیں "تشابها و اشتبها" یعنی دو امور میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ ایسی مشابہت رکھتے ہیں کہ دونوں میں اب التباس پیدا ہوگیا۔ اسی طرح "امورٌ مشتبهةٌ و مشبهةٌ" کے الفاظ بولے جاتے ہیں، مطلب ہوتا ہے مشکل امور۔ اور اسی طرح لفظ "الشبهة" (شین کے ضمہ کے ساتھ) التباس اور مثل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نیز اہل عرب کہتے ہیں کہ: "شبه عليه الأمر تشبيهًا" مطلب ہوتا ہے کہ اس پر معاملہ ملتبس اور مختلط ہوگیا۔ اسی طرح جنت کا رزق بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾ (البقرہ:۲۵) اسی طرح بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا﴾ (البقرہ:۷۰) ان آیات میں یہ الفاظ مذکورہ معنی ہی میں استعمال ہوئے ہیں۔ (محکم اور متشابہ کے لیے القاموس دیکھیے)۔

قرآن محکم بھی ہے اور متشابہ بھی قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جن سے پتہ لگتا ہے کہ سارا قرآن ہی محکم ہے، جیسے فرمایا: ﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ﴾ (ھود:۱) "یہ ایسی کتاب ہے کہ جس کی آیتیں مستحکم کردی گئی ہیں۔" اور ایسی آیات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا قرآن ہی متشابہ ہے، جیسے ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا﴾ (الزمر:۲۳)

"اللہ ہی نے بہترین کلام نازل کیا ہے یعنی کتاب باہم ملتی جلتی ہے۔"

اور ایسی آیات بھی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض آیاتِ قرآنی محکم اور بعض متشابہ ہیں، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ﴾ (آل عمران: ۷)

"وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اُتاری اس میں بعض آیتیں محکم ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں، اور دوسری متشابہ ہیں۔"

ان تین طرح کی آیاتِ قرآنی میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے کہ کل قرآن کے محکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ایک منظم اور مرتب اور مستحکم کلام ہے، اس میں لفظی یا معنوی کسی طرح کا کوئی خلل نہیں ہے، گویا وہ ایک ایسی مضبوط اور پختہ عمارت ہے کہ مرورِ زمانہ کے باوجود اس میں کوئی خستگی یا کمزوری پیدا نہ ہوسکی۔ اور کل قرآن کے متشابہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم، اپنے حسن و جمال اور استحکام کے اعتبار سے اور اپنے الفاظ و معانی میں حدِ اعجاز کو پہنچنے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے اس قدر مشابہت رکھتا ہے کہ کوئی شخص قرآن کے اس حسن واستحکام اور اعجاز پر مشتمل کلمات و آیات میں باہمی فرق نہیں کرسکتا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی طویل اور کشادہ زنجیر ہو جس کے دونوں کناروں کا پتہ لگانا مشکل ہوجائے۔

اور بعض کے محکم اور بعض کے متشابہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی مرادِ خداوندی پر دلالت بالکل واضح ہے اور ایک حصہ ایسا ہے جس کی مرادِ باری تعالیٰ پر دلالت مخفی ہے، پہلا حصہ محکم اور دوسرا حصہ متشابہ کہلاتا ہے۔ علماءِ اصول کا اس بارے میں اختلاف بھی ہے۔

لیکن جس امر پر ان کا اتفاق ہے اور اس میں اختلاف ممکن نہیں وہ یہ ہے کہ کل قرآن محکم بھی ہے بایں معنی کہ قرآن ایک مستحکم کلام ہے اور کل قرآن متشابہ بھی ہے بایں معنی کہ اس استحکام و پختگی میں وہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھتا ہے اور اس کا کچھ حصہ محکم اور کچھ متشابہ بھی ہے، بایں معنی کہ یہ دو قسموں میں منقسم ہے، ایک وہ ہے جس کی مرادِ باری تعالیٰ پر دلالت بالکل واضح ہے اور ایک وہ جس کی مرادِ خداوندی پر دلالت واضح نہیں بلکہ مخفی ہے۔ غرضیکہ ان تینوں امور میں کوئی منافات اور تعارض نہیں پایا جاتا۔ بلکہ مذکورہ تقسیم قرآن کی ان تمام آیات میں پائی جاتی ہے جن میں محکم اور متشابہ ہونے کے معنی سابق پائے جاتے ہوں۔

جہاں ہم اس کی حکمت بیان کریں گے وہاں قرآنِ کریم کی مذکورہ دونوں اقسام بیان کریں گے کہ کچھ تو متشابہات ہیں جن کی مراد مخفی ہوتی ہے اور کچھ محکمات ہوتے ہیں جو واضح الدلالت ہوتے ہیں۔ آپ ان تاویلات کو سابقہ بیان کردہ لغوی اطلاقات کی طرف بھی لوٹا سکتے ہیں کہ سارا قرآن محکم ہے یعنی مستحکم ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ترکیب ایسی رکھی ہے کہ اس میں لفظی یا معنوی خلل پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور قرآن متشابہ بھی ہے کہ اس استحکام میں وہ ایک دوسرے سے ایسا مماثل ہے کہ اس کی آیات و کلمات کے درمیان امتیاز کرنا ملتبس ہوجاتا ہے، اور کچھ حصہ قرآن کا محکم ہے، یعنی ایسا واضح المراد ہے کہ خفا کے لیے مانع ہے، اور کچھ حصہ اس کا متشابہ ہے، بایں معنی کہ اس میں مماثلت کی مختلف وجوہ پائی جاتی ہیں جو مرادی معنی کے خفا کو مستلزم ہیں۔

اصطلاحی مفہوم

اصطلاحِ شرع میں "محکم" کبھی تو منسوخ کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور کبھی متشابہ کے مقابلہ میں اس کا اطلاق ہوتا ہے، پہلی اصطلاح کے مطابق اس سے مراد وہ حکمِ شرعی ہوتا ہے جس میں نسخ کا عمل دخل نہ ہو، اور دوسری اصطلاح کے مطابق اس سے مراد کتاب وسنت کی ایسی نصوص ہوتی ہیں جو اپنے معنی پر اس وضاحت کے ساتھ دلالت

کریں کہ اس میں ذرا بھی خفا نہ ہو۔ جس کی تفصیل عنقریب آ رہی ہے۔ ہمارا موضوع بحث دوسری اصطلاح ہے۔ پہلی اصطلاح کی ہم نے سابقہ بحث میں وضاحت کر دی ہے، جہاں ہم نے نسخ کی تعریف، دلائل و احکام اور اختلافی اقوال و آراء شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیئے تھے۔ اسی سے اس کا مقابل یعنی محکم معلوم ہو سکتا ہے، کیونکہ قاعدہ ہے: "وبضدها تتميز الاشياء" یعنی اضداد سے اشیاء میں امتیاز معلوم ہو جایا کرتا ہے۔

عبد بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ نے امام ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ "محکمات وہ ہیں جو منسوخ نہ ہوئے ہوں اور متشابہات وہ ہیں جو منسوخ ہو چکے ہوں" وہ بھی اسی اصطلاح مذکور پر محمول ہوگا۔

محکم اور متشابہ کے مفہوم میں علماء کی آراء

علماء کے محکم اور متشابہ کے معنی و مفہوم کی تعیین کے بارے میں بہت زیادہ اختلافات ہیں، چند اقوال پیش کیے جاتے ہیں:

① محکم ایسا واضح الدلالت حکم ہوتا ہے جس میں نسخ کا کوئی احتمال نہ ہو، اور متشابہ ایسا مخفی حکم جس کے مفہوم کا ادراک نہ عقلاً ہو سکتا ہو اور نہ نقلاً۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ہو، جیسے قیامت کا قائم ہونا، سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات کا وجود۔ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس رائے کو سادات حنفیہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

② محکم وہ حکم ہوتا ہے جس کی مراد معلوم ہو، خواہ واضح ہونے کی وجہ سے یا تاویل کے ذریعہ۔ اور متشابہ وہ ہے جس کا علم اللہ ہی کو ہے جیسے قیامت کا قائم ہونا، خروجِ دجال، سورتوں کی ابتداء میں حروفِ مقطعات وغیرہ۔ یہ قول اہلِ سنّت کی طرف منسوب ہے اور ان کے ہاں یہ قولِ مختار ہے۔

③ محکم وہ ہے جو تاویل کی صرف ایک صورت کا احتمال رکھتا ہو، اور متشابہ وہ ہے جو تاویل کی تمام وجوہ کا احتمال رکھتا ہو، یہ رائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے اور اکثر علمائے اصول کا بھی یہی مذہب ہے۔

④ محکم وہ ہے جو اپنے معنی میں مستقل بنفسہٖ ہو، کسی شرح و بیان کا محتاج نہ ہو، اور متشابہ وہ جو مستقل بنفسہٖ نہ ہو، بلکہ بیان و توضیح کا محتاج ہو، اسے مختلف طور سے بیان کیا جاتا ہو، اس کی تاویل میں اختلاف کے سبب، یہ قول امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔

⑤ محکم وہ ہے جس کا نظم و ترتیب ایسی درست ہو جس سے بغیر کسی منافات کے درست معنی معلوم ہو جاتے ہوں۔ اور متشابہ وہ ہے جو لغوی اعتبار سے اپنے مرادی معنی کا احاطہ نہ کرتا ہو، جب تک کہ کوئی قرینہ یا علامت اس کے ساتھ متصل نہ ہو۔ بایں معنی مشترک بھی متشابہ میں داخل ہوگا۔ یہ رائے امام الحرمین کی طرف منسوب ہے۔

⑥ محکم وہ ہے جس کا معنی و مفہوم ایسا واضح ہو کہ اس میں کوئی گنجھلک نہ ہو، "محکم" احکام سے ماخوذ ہے بمعنی استحکام۔ اور متشابہ وہ ہے جو اس کے برخلاف ہو، بناء بریں "محکم" ظاہر اور نص کو اور "متشابہ" اسماء مشترکہ اور حق تعالیٰ کی ذات کے بارے تشبیہ کا وہم ڈالنے والے الفاظ کو شامل ہوگا۔ اس قول کو بعض متاخرین علماء کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جبکہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے نقل کے مطابق مذکورہ قول درحقیقت امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے۔

محکم سے مراد وہ ہے جس کی مراد واضح ہو اور متشابہ وہ ہے جو اس کے برخلاف ہو، اس لیے کہ جو لفظ معنی کو قبول کرتا ہو اس کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) محتمل الغیر ہوگا (۲) یا محتمل الغیر نہیں ہوگا، اگر دوسرا امر ہو تو یہ نص ہے اور پھر دو صورتیں ہیں: (۱) دوسرے

معنی پر اس کی دلالت زیادہ راجح ہوگی (۲) زیادہ راجح نہیں ہوگی۔ اگر زیادہ راجح ہو تو یہ ظاہر ہے اور اگر زیادہ راجح نہ ہو تو پھر دو حال سے خالی نہیں۔ (۱) اس کے مساوی ہوگا (۲) یا مساوی نہ ہوگا۔ اگر مساوی ہو تو یہ مجمل ہے اور اگر مساوی نہ ہو تو یہ مؤول ہے۔ پس نص اور ظاہر کے درمیان محکم، مجمل اور مؤول کے درمیان متشابہ ہوتا ہے۔

اس تقسیم کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محکم کو متشابہ کے مقابل ذکر کیا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ محکم کی تفسیر بھی اس کے مقابل کے ساتھ کی جائے، آیت کا اسلوب بھی اس کا مؤید ہے یعنی جمع مع التقسیم کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے کتاب کے معنی میں دونوں کو جمع کیا پھر ان میں فرق کر دیا۔ فرمایا:

﴿مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۔﴾ (آل عمران: ۷)

پھر دونوں میں سے ہر ایک کی طرف ایک امر کو منسوب کرنا چاہا تو اولاً فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ ...﴾ پھر آگے جا کر فرمایا: ﴿وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ...﴾ یوں بھی دوسرے امر کے بارے میں کہا جا سکتا تھا ﴿و اما الذین فی قلوبهم استقامة فیتبعون المحکم﴾ لیکن ایسا نہیں فرمایا، بلکہ اس کی جگہ ﴿وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ....﴾ فرمایا اور لفظ رسوخ کا استعمال کیا، کیونکہ علم میں رسوخ تب ہی حاصل ہوتا ہے جب بلیغ درجہ کا اجتہاد اور کامل درجہ کی مہارت اور دسترس حاصل ہو، پھر جب قلب، راہِ ہدایت پر مستقیم ہو جاتا ہے اور علم میں رسوخ اور اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو جائے تو پھر ایسا شخص حق بات ہی زبان سے نکالتا ہے اور راسخ فی العلم لوگ بس یہی دعا کرتے ہیں: ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝﴾ (آل عمران: ۸) اب آیات کا مذکورہ اسلوب اس بات کا شاہد ہے کہ ﴿وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ اس فرمانِ خداوندی ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ ...﴾ کے مقابل ہے، نیز اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ﴿اِلَّا اللّٰهُ﴾ پر وقف تام ہے، نیز اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، جو اس کو جاننے کی کوشش کرتا ہے وہ وہی شخص ہے جس کی طرف حدیث میں ((فاحذرهم ... الخ)) کے ذریعہ اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ بڑی عمدہ بحث ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں۔

شیخین وغیرہ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیتِ مبارکہ تلاوت فرمائی: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ ... اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾ (آل عمران: ۷) تک۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو قرآن کے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تو ان ہی لوگوں کا اللہ نے نام لیا ہے پس ایسے لوگوں سے احتیاط کرو۔"①

⑦ محکم وہ ہے جس کی دلالت راجح ہو، اور وہ نص اور ظاہر ہے، اور متشابہ وہ ہے جس کی دلالت راجح نہ ہو، اور اس میں مجمل، مؤول اور مشکل آتا ہے۔

---

① اخرجه البخاری فی تفسیر سورہ ۳: و مسلم فی کتاب العلم حدیث ا لو ابوداؤد فی السنة: ۲: والدارمی فی المقدمة: ۱۹

امام رازی رحمہ اللہ کی طرف یہ قول منسوب ہے، بہت سے محققین نے اس رائے کو اختیار کیا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اس پر تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"جو لفظ ایک معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو وہ یا تو غیر معنی کا احتمال نہ رکھتا ہوگا یا احتمال رکھتا ہوگا، اگر پہلی بات ہو تو وہ نص ہے اور اگر دوسری بات ہو تو اس کی چند صورتیں ہیں، ایک معنی کا احتمال راجح اور دوسرے کا مرجوح ہوگا یا دونوں کے لیے مساوی ہوگا، جو لفظ معنی راجح کے اعتبار سے محتمل ہو اسے ظاہر کا نام دیا جاتا ہے اور معنی مرجوح کے اعتبار سے ہو اسے مؤول کہتے ہیں، دو مساوی معنی یا چند مساوی معانی کے اعتبار سے ہو تو اسے مشترک کہتے ہیں، اور ایک معنی علی التعیین کے اعتبار سے مراد ہو تو اسے مجمل کہتے ہیں اور جب لفظ کا ایک راجح معنی باطل اور دوسرا مرجوح یعنی حق ہو تو اس کا نام مشکل ہوگا۔ جب آپ نے یہ بات پہچان لی تو محکم وہ ہوگا جس کی دلالت علی المعنی راجح ہو اور یہی نص اور ظاہر ہے، کیونکہ یہ دونوں حصولِ ترجیح میں مشترک ہیں، فرق بس یہ ہے کہ نص ایسا حکم راجح ہے جو مانع من الغیر ہوتا ہے، جبکہ ظاہر ایسا حکم راجح ہے جو مانع من الغیر نہیں ہوتا، اور متشابہ وہ ہے جس کی دلالت علی المعنی راجح نہ ہو، مجمل، مؤول اور مشکل اس میں شامل ہے، کیونکہ یہ تینوں اس بات میں مشترک ہیں کہ ان سب کی دلالت راجح نہیں ہوتی۔ اور مشترک کا معاملہ یہ ہے کہ اگر تو اس کے تمام معانی مراد لئے جائیں تو وہ ظاہر کے قبیل سے ہوگا اور اگر اس کے بعض معانی علی التعیین مراد ہو تو وہ مجمل ہوگا۔ پھر یاد رہے کہ لفظ کے معنی راجح چھوڑ کر معنی مرجوح مراد لینے کے لئے کسی دلیلِ منفصل کا پایا جانا ضروری ہے، اور وہ دلیل منفصل یا تو لفظی ہوگی یا عقلی ہوگی، دلیل لفظی، قطعی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ نقلِ لغات، وجوہِ صرف و نحو، عدمِ اشتراکت، عدمِ مجاز، عدمِ اضمار، عدمِ تخصیص اور دلیل عقلی و نقلی کے معارض نہ ہونے پر موقوف ہوتی ہے اور مذکورہ تمام امور ظنی ہیں، تو جو چیز ظنی پر موقوف ہو وہ بھی ظنی ہوگی۔ بناء بریں اصولی اور اعتقادی مسائل میں لفظ کے معنی راجح کو ترک کر کے اس کے معنی مرجوح کو دلیل لفظی کی بنیاد پر مراد لینا ممکن نہ ہوگا، صرف دلیل قطعی عقلی کی موجودگی کی صورت میں معنی مرجوح کو مراد لینا جائز ہوگا جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ معنی راجح مراد لینا عقلاً محال ہے، اور جب مکلف کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے تو اسے یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ مرجوح معنی کیا ہے؟ کیونکہ اس کی تعیین کا طریق یہی ہے ایک مجاز کو دوسرے مجاز پر یا ایک تاویل کو دوسری تاویل پر ترجیح دے دی جائے، اور یہ ترجیح دلائلِ لفظیہ کے ذریعہ ہی ہوگی اور دلائلِ لفظیہ مفیدِ ظن ہوتے ہیں۔ مسائل قطعیہ میں ان پر اعتماد کرنا بے سود ہے۔ اسی بناء پر اسلاف کا مذہب یہ رہا ہے کہ متشابہ الفاظ کی تاویل کی تعیین میں زیادہ غور و خوض نہیں کرنا چاہیے، جبکہ اس سے پہلے یہ اعتقاد ہو کہ عقلی اور قطعی دلائل موجود ہونے کی وجہ سے اس لفظ کا ظاہری معنی مراد لینا محال ہے۔"

مذکورہ آراء پر ایک نظر

جب ہم مذکورہ آراء پر نظر ڈالتے ہیں اور ان میں غور کرتے ہیں کہ ہمیں ان میں کوئی تناقض یا تعارض دکھائی نہیں دیتا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک دوسرے کے مشابہ اور قریب قریب ہیں، البتہ ان آراء میں امام رازی رحمہ اللہ کی رائے ہمیں زیادہ درست اور واضح معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ کسی امر کے محکم اور متشابہ ہونے کا مرجع، شارع کے کلام کے معنی مرادی کے وضوح اور عدمِ وضوح پر ہوتا ہے، اس اعتبار سے امام رازی رحمہ اللہ کی بیان کردہ

تعریف زیادہ جامع اور مانع ہے کہ محکم میں خفی داخل نہیں ہوتا اور متشابہ میں جلی داخل نہیں ہوتا، انہوں نے جس تقسیم کی بنیاد راجح اور مرجوح پر رکھی ہے اس کو بیان کرنے میں انہوں نے مکمل طور پر وجوہِ ظہور اور وجوہِ خفا کا احاطہ کیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ راجح وہ ہے جو بالکل واضح ہو، اس میں کوئی خفا نہ ہو اور مرجوح وہ ہے جو خفی المراد ہو اس میں وضوح بالکل نہ ہو۔

امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ رائے بھی اس کے قریب قریب ہے، البتہ امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح وجوہِ ظہور اور وجوہِ خفا کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ باقی امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں بھی کچھ ابہام پایا جاتا ہے۔ اسی طرح امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بھی مبہم ہے کہ ان کی بیان سے کیا مراد ہے جس کی صرف متشابہ کو ضرورت ہوتی ہے محکم کو نہیں ہوئی ؟!

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے گرامی پر نظر ڈالی جائے تو اس کو اختیار کرنے سے ظاہر، محکم سے خارج ہو جاتا ہے اور متشابہ میں داخل ہو جاتا ہے، ہاں البتہ ان کی رائے بالکل واضح ہے، اور ان کا معنی راجح کے علاوہ دوسرے معنی کو محتمل قرار دینا ایک ضعیف احتمال ہے جس سے کلام کے ظہور اور وضوح میں کوئی قدغن نہیں لگتی۔

دوسری رائے، آیتِ مبارکہ کے برعکس ہے، اس کے مطابق محکم میں بہت سے خفی امور داخل ہو جاتے ہیں اور متشابہ بھی ایک نوع میں محدود ہو جاتا ہے، چنانچہ اس رائے میں محکم کی تعریف مانع نہیں اور متشابہ کی تعریف جامع نہیں ہے مذہبِ مختار کی بہ نسبت جو کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔

اور پہلی رائے جو ساداتِ حنفیہ کی طرف منسوب ہے اس سے محکم کی تعریف، نص پر اور متشابہ کی تعریف اللہ تعالیٰ کے علم پر منحصر اور محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور اس سے واسطہ کا وجود لازم آتا ہے جو نہ محکم میں داخل ہوگا اور نہ متشابہ میں۔ چنانچہ ان کی تعریف بھی مذہبِ مختار کی بہ نسبت جامع نہیں ہوگی۔

مزید دیگر آراء

جاننا چاہیے کہ یہاں مزید دیگر آراء بھی ہیں:

① محکم وہ ہوتا ہے جس پر عمل کیا جاتا ہو اور متشابہ وہ ہے جس پر صرف ایمان لایا جاتا ہو عمل نہ کیا جاتا اور متشابہ وہ ہے جس پر صرف ایمان لایا جاتا ہو عمل نہ کیا جاتا ہو، علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قول حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے نقل کیا ہے۔ اس تعریف کی رو سے بھی محکم ان امور میں منحصر ہو جاتا ہے جو از قبیلِ اعمال ہوں، اور متشابہ ان امور میں محدود ہو جاتا ہے جو عقائد کے قبیل سے ہوں، اس بناء پر مذکورہ قول درست نہیں ہے، اور اگر ان کی مراد محکم سے ایسا واضح امر ہو جس کا معنی متعین طور پر لیا جاتا ہو اور متشابہ سے مراد ایسا خفی المعنی امر ہو جس پر ایمان لانا ضروری ہو لیکن معنی کی تعیین نہ ہو تو ہم کہتے ہیں کہ اگر یہی مراد ہے تو ان کی ذکر کردہ عبارت اس مراد کو بتانے میں قاصر ہے، اور ان کی اس مراد سے بھی اعتراض دُور نہیں ہوتا ہے۔

② محکم وہ ہے جس کا معنی معقول ہو اور متشابہ وہ ہے جو اس کے برخلاف ہو، جیسے نمازوں کی تعداد، روزوں کا رمضان کے ساتھ خاص ہونا، شعبان وغیرہ میں نہ ہونا۔ مگر یہ تعریف بھی ہر واضح اور خفی معنی کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتی۔

③ محکم وہ ہے جس کے الفاظ مکرر نہ ہوں اور متشابہ وہ ہے جس کے الفاظ مکرر ہوں۔ اس تعریف میں بیان کردہ مفہوم، جمہور کی اصطلاحی تعریف کی بہ نسبت لغت کے زیادہ قریب لگتا ہے۔ نیز اس میں ظہور اور خفاء کا اعتبار و لحاظ بھی نہیں رکھا گیا۔

④ محکم وہ جو منسوخ نہ ہو اور متشابہ وہ ہے جو منسوخ ہو۔ یہ ایک الگ اصطلاح ہے، ہم سابق میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

ہم نے مذکورہ آراء علیحدہ طور پر ذکر کی ہیں، ان آراء کو اس سے پہلے بیان کردہ آراء کے ساتھ ذکر نہیں کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ آراء اس سے قبل پیش کردہ آراء کی بہ نسبت بہت ضعیف ہیں اور دوسرا یہ کہ ان آراء میں ان امور کا لحاظ نہیں رکھا گیا جن کا اس سے پہلے بیان کردہ آراء میں رکھا گیا تھا۔

بہرکیف! بات بالکل سہل اور آسان ہے، کیونکہ اس کا دارومدار اصطلاح یا اصطلاح کے مشابہ امر پر ہے اور اصطلاح میں بڑی وسعت و گنجائش ہوا کرتی ہے۔ ہمارے اور امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں سورۂ آل عمران کی آیتِ کریمہ کی بیان کردہ تفسیر ان مرجوح قسم کی آراء پر آسانی سے منطبق نہیں ہوتی۔ ہم نے ان آراء کے نقد و بحث اور ان میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو ترجیح دینے میں خوب جد و جہد سے کام لیا ہے۔

تشابہ کا سبب، اقسام اور امثلہ

اس سے قبل جو تحریر میں آیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشابہ کا اجمالی طور پر منشاء اور سبب شارع کے کلام کی مراد کا مخفی ہونا ہے۔ اب ہم اسے تفصیل سے ذکر کرتے ہیں کہ تشابہ کی ایک نوع وہ ہوتی ہے جس کا خفا صرف لفظ کی حد تک ہوتا ہے، اور ایک قسم وہ ہوتی ہے جس کا خفا صرف معنی کی حد تک ہوتا ہے اور تشابہ کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جس کا خفا لفظ اور معنی دونوں میں ہوتا ہے۔

پہلی قسم ○ وہ تشابہ جس کا خفا صرف لفظ کی حد تک ہو اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) مفرد (۲) مرکب۔ پھر مفرد میں خفا کبھی اس کی غربت و ندرت کے باعث ہوتا ہے اور کبھی اس کے اشتراک کے باعث ہوتا ہے، اور مرکب میں کبھی خفا اس کے اختصار کی وجہ سے، کبھی بسط و طوالت کی وجہ سے اور کبھی اس کی ترتیب کے باعث پیدا ہوتا ہے۔

مثال اس تشابہ فی المفرد کی جس میں خفا اس کی غربت اور ندرتِ استعمال کے باعث پیدا ہوتا ہے، جیسے لفظ "الاب" (باء کی تشدید کے ساتھ) جو اس آیتِ کریمہ میں آیا ہے: ﴿وَ فَاكِهَةً وَ اَبًّا ﴾ (عبس: ۳۱) لفظ ﴿اَبًّا﴾ سے مراد وہ چارہ گھاس وغیرہ ہے جسے جانور چرتے ہوں، جس کی دلیل اس کے بعد والے الفاظ ہیں ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ﴾ (عبس: ۳۲)

مثال اس تشابہ فی المفرد کی جس کا سبب متعدد معانی میں اس کا اشتراک ہوتا ہے، جیسے لفظ "الیمین" جو اس ارشادِ باری تعالیٰ میں آیا ہے: ﴿فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴾ (الصافات: ۹۳) مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کے بتوں کو دائیں ہاتھ سے نہ کہ بائیں ہاتھ سے، مارنے کے لیے آگے بڑھے، یا معنی یہ ہے کہ اس قسم کی وجہ سے ان بتوں کو مارنے کے لیے متوجہ ہوئے جو انہوں نے اس سے پہلے کھائی تھی، قرآنِ حکیم نے اس کا ذکر یوں کیا ہے: ﴿وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴾ (الانبیاء: ۵۷) یہ دونوں مطلب درست ہیں، لفظِ یمین ان میں مشترک ہے۔

مثال اس تشابہ فی المرکب کی جس کا سبب کلام کا اختصار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ ﴾ (النساء: ۳) اب اس میں کلام کی مراد اس کے اختصار کی وجہ سے مخفی ہوئی ہے، اصل عبارت اس طرح سے ہے: "اگر یتیم عورتوں سے نکاح کرنے میں تم کو بے انصافی کا اندیشہ ہو تو دیگر عورتوں سے نکاح کر لو جو تمہیں پسند آئیں۔" مطلب یہ ہوا کہ اگر تم کو یتیم عورتوں سے نکاح کرنے میں یہ ڈر ہو کہ تم ان پر ظلم و زیادتی کرو گے تو دنیا میں ان کے علاوہ اور عورتیں بھی ہیں ان میں سے جو تم کو پسند آئیں ان سے شادی کر لو۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ: لوگ یتیم بچوں کی سرپرستی کرنے سے تو اجتناب کرتے تھے لیکن بدکاری سے اجتناب نہیں کرتے تھے جس پر مذکورہ آیت کا نزول ہوا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم کو یتیم بچوں کے حق میں جوروستم کا اندیشہ ہے تو زنا اور بدکاری سے بھی تو ڈرا کرو اور اس کے بدلے میں شادی کرو جس کی اللہ نے تمہارے لئے وسعت رکھی ہے کہ عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئیں دو دو، تین تین، چار چار ان سے نکاح کرلیا کرو۔

مثال اس تشابہ فی المرکب کی جس کا سبب، اطناب اور کلام کی طوالت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱)۔ اب اس آیت میں کاف حرفِ تشبیہ کو اگر حذف کر دیں تو سامع کے لیے متکلم کی مراد زیادہ واضح ہوگی بجائے اس ترکیب کے جس کی صورت یہ بن جاتی ہے: "لیس مثل مثله شیء" اب یہاں کلام کی مراد سمجھنے میں جو دقت پیش آتی ہے وہ بہت سے اذہان پر بھاری ہوتی ہے۔

مثال اس تشابہ فی المرکب کی جس کے خفا کا سبب کلام کی ترتیب ونظم ہوتا ہے۔ جیسے فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ قَيِّمًا﴾ (الکہف:۱-۲) اب یہاں پر لفظ ﴿قَيِّمًا﴾ اور اس کے ماقبل کی ترتیب کے باعث مرادِ کلام میں خفا پیدا ہوا، اگر بالفرض یوں ہوتا: ﴿انزل علی عبده الكتاب قيما و لم يجعل له عوجا﴾ تو مرادِ متکلم پر واضح الدلالت ہوتا۔

یاد رہے کہ اس قسم میں سورتوں کے مشہور فواتح بھی داخل ہیں، کیونکہ ان میں جو خفا اور تشابہ پیدا ہوتا ہے وہ لامحالہ ان کے الفاظ ہی کے سبب ہوتا ہے۔

دوسری قسم ⬤ وہ تشابہ جس کا خفا صرف معنی کی حد تک ہو، اس کی مثال قرآنِ کریم کے وہ تمام الفاظ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی صفات، قیامت کے احوال، جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب کا ذکر آیا ہے، کیونکہ عقلِ انسانی، صفاتِ خالق کے حقائق، قیامت کے احوال، اہل جنت کی نعمتوں اور اہل دوزخ کے عذاب کا احاطہ نہیں کرسکتی، بھلا غیر محسوس اشیاء کی صورت ہمارے اذہان میں کیسے آسکتی ہے؟!

یاد رکھئے کہ اس قسم میں متشابہاتِ صفات کی معروف مشکلات داخل ہیں، کیونکہ ان میں جو تشابہ اور خفا ہوتا ہے وہ الفاظ کے غریب الاستعمال ہونے یا متعدد معانی میں لفظ کے اشتراک یا ایجاز واطناب کے سبب نہیں ہوتا، تو متعین ہوگیا کہ ان میں صرف معنی کی جہت سے خفا ہوتا ہے۔

تیسری قسم ⬤ وہ تشابہ جس کا مرجع لفظ اور معنی دونوں ہوتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں: مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ (البقرہ:۱۸۹) اب جس کو زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کی عادات سے واقفیت نہ ہو وہ اس آیت مبارکہ کا درست مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوگا۔ منقول ہے کہ انصار کے کچھ لوگوں کی یہ عادت تھی کہ جب مُحرم ہو جاتے تو گھر، دیوار یا خیمہ کے دروازے کی طرف سے داخل نہ ہوتے تھے، اگر تو شہر کا رہنے والا ہوتا تو گھر کی چھت میں نقب لگا کر داخل ہوتا اور ادھر سے ہی نکلتا اور اگر دیہاتی ہوتا تو خیمے کے پیچھے سے باہر نکلتا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا:

﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾(البقرہ:۱۸۹)

"اور نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو کوئی اللہ سے ڈرے اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔"

اس مذکورہ آیت میں پائے جانے والا خفا اختصار کے سبب راجع الی اللفظ ہے، اگر کلام کو طول دیا جائے تو یوں کہا جائے گا: ﴿ولیس البر بأن تأتوا البیوت من ظهورها إذا کنتم محرمین بحج أو عمرة﴾ اور یہ خفا راجع الی المعنی بھی ہوسکتا ہے، اس لیے کہ کلام میں بسط وطوالت فرض کرنے کی صورت میں مذکورہ نص کو سمجھنے کے لیے زمانہ جاہلیت میں اہل عرب کی عادت کا جاننا ضروری ہوگا، ورنہ اس کا فہم دشوار ہوگا۔

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ "مفردات القرآن" میں لکھتے ہیں کہ حاصل کلام یہ ہے کہ متشابہ کی تین انواع ہیں، ایک وہ متشابہ جس میں تشابہ صرف لفظ کی جہت سے، ایک وہ جس میں اشتباہ صرف معنی کی جہت سے ہو اور ایک وہ ہے جس میں اشتباہ لفظ اور معنی دونوں جہت سے ہو۔ پھر اوّل کی دو قسمیں ہیں:

① ایک وہ جس کا تعلق الفاظِ مفردہ سے ہو اور پھر اس کی وجہ یا تو غرابت ہوتی ہے جیسے لفظِ الاب اور یزفون اور یا لفظی اشتراک ہوتا ہے جیسے ید اور یمین کے الفاظ۔

② دوسری وہ جس کا تعلق جملہ مرکب سے ہو، پھر اس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) ایک قسم وہ جس کا سبب کلام کا اختصار ہوتا ہے، جیسے: ﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ﴾ (النساء:۲)

(۲) ایک قسم وہ جس کا سبب بسطِ کلام ہوتا ہے، جیسے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱) کیونکہ اگر یوں کہا جاتا ﴿لیس مثله شيء﴾ تو سامع کے لئے اس کی مراد زیادہ واضح ہوتی۔

(۳) اور ایک قسم وہ ہے جس کا سبب نظمِ کلام ہوتا ہے، جیسے: ﴿اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ؕ قَيِّمًا﴾ (الکہف: ۱-۲) تقدیری عبارت یہ تھی: ﴿انزل علی عبده الکتاب قیما و لم یجعل له عوجا﴾ وہ متشابہ جس میں تشابہ معنی کی جہت سے ہو اس کی مثال صفاتِ باری تعالیٰ، اوصافِ قیامت، کیونکہ ان اوصاف کا تصور کرنا ممکن نہیں ہے، جن امور کو ہم محسوس نہیں کر سکتے یا جو اس کی جنس میں سے نہ ہو اس کی شکل وصورت ہمارے ذہنوں میں نہیں آ سکتی۔ اور وہ متشابہ جس میں تشابہ لفظ اور معنی دونوں جہت سے ہو اس کی پانچ انواع ہیں:

(۱) تشابہ کمیت کے اعتبار سے ہو، جیسے عموم وخصوص کی مثال میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے: ﴿اقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ﴾۔

(۲) تشابہ کیفیت کے اعتبار سے ہو، جیسے وجوب وندب، مثال: ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (النساء:۳)۔

(۳) تشابہ زمانے کے اعتبار سے ہو جیسے ناسخ ومنسوخ، مثال: ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ (آل عمران:۱۰۲)

(۴) تشابہ مکان کے اعتبار سے ہو، جیسے مکان کے بارے نازل ہونے والی آیاتِ امثال: ﴿وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ (البقرہ:۱۸۹) نیز ﴿اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ﴾ (التوبہ:۳۷)، جسے زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب کی عادات سے واقفیت نہ ہوگی اس کے لئے اس آیت کی تفسیر کرنا مشکل ہو جائے گا۔

(۵) تشابہ ان شرائط کی جہت سے ہو جن سے عمل درست یا غلط ہوتا ہو۔ جیسے نماز اور نکاح کی شرائط وغیرہ۔ مفسرین نے متشابہ کی تفسیر وتشریح میں جو کچھ بھی ذکر کیا ہے یہ ان سب کا خلاصہ اور حاصل کلام ہے، مذکورہ تقسیمات سے باہر نہیں ہے۔

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ گفتگو بہت عمدہ ہے، گو اس میں کچھ اشکالات بھی ہیں۔

متشابہات کی اقسام

متشابہات کی ماقبل میں جو تشریح وتوضیح بیان ہوئی اس کی روشنی میں ہم متشابہات کو تین انواع میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

پہلی قسم ● وہ متشابہات جن کی حقیقت تک رسائی کسی بشر کے لیے ممکن نہیں ہے، جیسے اللہ کی ذات اور اس کی صفات کی حقیقت کا علم، نیز جیسے قیامت کے متعین وقت وغیرہ کا علم یعنی غیب کی وہ تمام چیزیں جنہیں صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ (الانعام:۵۹)

نیز فرمانِ باری ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ (لقمان:۳۴)

دوسری قسم ● وہ متشابہات جن کو ہر انسان بحث وتحقیق کے ذریعہ معلوم کرسکتا ہے، جیسا کہ وہ متشابہات جن میں تشابہ، اجمال، بسط اور ترتیب وغیرہ کے سبب پیدا ہو۔

تیسری قسم ● وہ متشابہات جنہیں عوام الناس نہیں جان سکتے، صرف چیدہ چیدہ اہلِ علم ہی جان سکتے ہیں، اس کی بہت مثالیں موجود ہیں، مثلاً وہ بلند معانی اور معارف وحقائق جن کا کتاب اللہ میں تدبر اور غور وفکر کے نتیجہ میں اہلِ صفا واجتہاد کے قلوب پر فیضان ہوتا ہے۔

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ”متشابہ کی تین انواع ہیں، ایک نوع تو وہ ہے جس پر آگاہی کا کوئی راستہ نہیں ہے، جیسے قیامت کا وقت، خروجِ دابہ وغیرہ، اور ایک نوع وہ ہے جسے جاننے کا راستہ انسان کے پاس موجود ہے، جیسے کلماتِ غریبہ، پیچیدہ احکام، اور ایک نوع وہ ہے جو ان دونوں امور میں متردد ہے، بعض راسخین فی العلم لوگ ہی اس سے واقف ہو پاتے ہیں۔ دوسروں پر اس کی حقیقت پوشیدہ رہتی ہے، اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے ارشاد ہوا کہ:

((اللّٰھم فقھه فِي الدّین و علّمه التأویل)).[1]

”یعنی اے اللہ! اسے دین میں فقاہت نصیب فرما اور تفسیر کا علم عطا فرما۔“

متشابہات کے ذکر کرنے کی حکمتیں

ہم نے اس سے قبل متشابہات کی تین انواع کا تعارف کروایا، اب ہم مزید یہ چاہتے ہیں کہ ان مختلف نوع کی متشابہات کی کوئی حکمت بلکہ حکمتیں بیان کریں جن کو شارع نے ذکر کیا ہے:

[1] اخرجه البخاری فی الوضوء، باب (۱) ومسلم فی فضائل الصحابة، حدیث: (۱۳۸۲)، والامام احمد ۱/۲۶۶)

پہلی قسم ○ وہ متشابہات جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اس کے بارے میں درج ذیل پانچ حکمتیں معلوم ہوتی ہیں:

① ناتواں بندے پر خدا تعالیٰ کی رحمت، جو بندہ ہر چیز کی معرفت کی طاقت نہیں رکھتا، جب کوہِ طور رب تعالیٰ کی تجلی کی وجہ سے ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش کر گر پڑے، تو کیا حال ہوتا اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی ذات اور صفات کی حقیقت انسان پر منکشف فرماتے اور اس کی تجلی ڈالتے؟ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کا علم لوگوں سے مخفی رکھا، تاکہ کہیں وہ کاہل نہ ہو جائیں اور اس کی تیاری چھوڑ نہ بیٹھیں۔ اگر لوگوں کو قیامت کی تعیین معلوم ہو جاتی تو اس کی شدت کی وجہ سے ان میں خوف وگھبراہٹ پیدا ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں سے ان کی موت کا مقررہ وقت جو مخفی رکھا ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے تاکہ وہ اپنی زندگیاں سکون سے بسر کر سکیں، سبحان اللہ! وہ ذات کس قدر حکیم اور رحمٰن ورحیم ہے۔

② ابتلاء اور آزمائش، آیا وہ سچے پیغمبر ﷺ کی خبر پر اعتماد کر کے غیبی امور پر ایمان لاتا ہے یا نہیں؟ جنہیں ہدایت نصیب ہوتی ہے وہ ایمان لانے کا اعتراف کرتے ہیں، خواہ متعین طور پر نہ جانتے ہوں، اور جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ اس کا انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ ان کے رب کی طرف سے وہ حق ہوتا ہے لیکن وہ فتنہ انگیزی اور دین سے نکلنے کی خاطر متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

③ امام رازی رحمہ اللہ نے اس کی حکمت ذکر کی ہے: "قرآن مجید خواص اور عوام دونوں کی دعوت پر مشتمل ہے۔ عوام الناس کی طبیعتیں اکثر امور میں حقائق کا ادراک نہیں کر پاتیں، کوئی عام انسان جب ابتداء میں سنتا ہے کہ ایک ایسی ذات موجود ہے جس کا نہ جسم ہے، نہ وہ کوئی جگہ گھیرتی ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے تو وہ یہی خیال کرتا ہے کہ ایسی کوئی ذات نہیں ہو سکتی وہ اس کی بالکلیہ نفی کرتا ہے، اس طرح وہ تعطل کا شکار ہو جاتا ہے، لہٰذا زیادہ مناسب یہ ہے کہ اسے ایسے الفاظ سے مخاطب کیا جائے جو اس کے خیالات واوہام سے ہم آہنگ اور مناسب ہو اور جس میں ایسی بات بھی شامل کر دی گئی ہو جو صریح حق پر دلالت کرتی ہو۔ چنانچہ پہلی قسم وہ ہے جس کے ذریعہ اول امر ہی لوگوں کو متشابہات کے ساتھ مخاطب کیا جاتا ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو صریح حق سے پردہ ہٹاتی ہے اور وہ محکم ہے۔ الخ

امام رازی رحمہ اللہ کی بیان کردہ حکمت متشابہ صفات کے بارے میں بالکل واضح ہے۔

④ انسان کی جہالت اور عجز پر دلیل قائم کرنا کہ انسان جس قدر بھی صلاحیتوں والا ہو اور اس کا علم جس قدر بھی زیادہ ہو وہ عاجز وجاہل ہی رہے گا، نیز اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ پر بھی شاہد قائم کرنا کہ وہی ذات ایسی ہے کہ ہر چیز اس کے احاطۂ علم میں ہے، جبکہ ساری مخلوق اس کے علم کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے ہاں جتنا وہ علم عطا کرنا چاہے وہ مستثنیٰ ہے۔ ایسے موقع پر انسان کے اندر خشوع اور عاجزی پیدا ہونے لگتی ہے اور اللہ کی کبریائی کا معترف ہو جاتا ہے اور پھر اس کی زبان سے وہی کلمات نکلتے ہیں جو فرشتوں نے کہے تھے:

﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (البقرۃ: ۳۲)

کسی عارف کا قول ہے کہ متشابہ کے حق ہونے کا اعتقاد رکھنے پر عقل کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا گیا ہے جس طرح کے انسانی بدن کو عبادت کی ادائیگی کی آزمائش میں مبتلا کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانا شخص جب کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے تو

بعض اوقات اس میں کوئی بات مجمل رہنے دیتا ہے تاکہ وہ مقام طالب علم کے لیے اپنے استاذ کے سامنے عاجزی اختیار کرنے اور اس کا ادب واحترام کرنے کا باعث بنے، یا جیسے بادشاہ کوئی خاص علامت اختیار کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے رازدار یا معتمد شخص کو آگاہی دینے کا شرف امتیاز بخشتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر عقل، جو بدن کا اشرف حصہ ہے، آزمائش میں مبتلا نہ ہوتی تو پھر لازماً عالم آدمی علم کے تکبر اور نشہ میں سرشار ہو کر سرکشی اور نافرمانی میں ہی برابر مبتلا رہتا۔ پس اسی وجہ سے وہ رب العزت کے حضور بندگی کے لیے سر جھکاتا ہے، اور متشابہات قرآن ہی وہ مقامات ہیں جہاں انسانی عقلیں اپنے خالق کے سامنے اعتراف قصور کرتے ہوئے سرنگوں ہوتی ہیں۔ پھر مذکورہ آیت (آل عمران: ۷) کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ﴿وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝﴾ فرما کر زائغین (گمراہ لوگ) پر تعریض اور راسخین کی مدح وتعریف فرمائی ہے۔ یعنی پروردگارِ عالم نے فرمایا کہ جو لوگ دھیان نہیں دیتے، نصیحت قبول نہیں کرتے اور خواہشِ نفسانی کو بھی ترک نہیں کرتے ان کا عقل مند لوگوں میں ہرگز شمار نہیں ہے، اسی وجہ سے راسخینِ علم نے دُعا کرتے ہوئے کہا: ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا ... الخ﴾ (آل عمران: ۸) ایسے لوگوں نے اپنے خالق و مالک سے علم لدنی کی استدعا کے لیے سرِ نیاز جھکایا اور انسانی طبیعت کی کجروی سے پناہ مانگتے ہوئے عاجزانہ عرض کی: ”اے اللہ! تو ہمیں اپنی طرف سے خاص رحمت عطا فرما اور ہمیں کجروی سے بچا لیجیے۔“

⑤ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک حکمت یہ ذکر کی ہے کہ: ”اگر سارا قرآن ہی صرف محکم ہوتا تو وہ صرف ایک مذہب کے تو مطابق ہوتا اور اپنی صراحت کے ساتھ دیگر تمام مخالف مذاہب کا ابطال کرتا، اس طرح دیگر مذاہب کے لوگوں میں تنفر پیدا ہوتا اور وہ اس میں غور وفکر نہ کرتے۔ جب قرآن میں محکم اور متشابہ دونوں طرح کی انواع موجود ہیں تو ہر مذہب والا اس کی طمع کرتا ہے کہ اسے اس قرآن میں اپنے مذہب کی تائید میں کوئی بات دستیاب ہو جائے، اس طرح وہ چار و ناچار اس میں غور کرے گا، اس کا فائدہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ باطل پرست اپنے باطل عقیدے سے خلاصی پا لیتا ہے جب وہ اس میں خوب غور کرتا ہے اور راہِ حق تک پہنچ جاتا ہے۔

ان پانچ حکمتوں کے علاوہ بھی ہم نے کتاب ہٰذا کی جلد اوّل صفحہ ۲۱۹—۲۳۰ پر سورتوں کے فواتح اور دفعِ شبہات کے ذیل میں حکمتیں ذکر کی ہیں۔

دوسری اور تیسری قسم ✿ دوسری اور تیسری قسم کے متشابہات پر قرآنِ حکیم کے مشتمل ہونے اور ان کے ذکر کرنے کی بھی پانچ حکمتیں ہیں:

① اعجازِ قرآنی کا اثبات، اس لیے کہ قرآنِ حکیم کے متشابہات میں پایا جانے والا خفا، جو حقیقت میں تشابہ کا باعث بنتا ہے، جب اس کی جستجو کی جائے گی تو لامحالہ قرآن کی بلاغت کی طرف رجوع کرنا ہوگا، کیونکہ اس میں قرآنی بلاغت کا بڑا عمل دخل ہے کہ قرآن اپنے بیان میں اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہے۔ اگر ہم اس کی تشریح کرنے لگیں گے جبکہ اس کا موقع بھی بہت کم ہے تو ہم اس میدان کو چھوڑ کر علومِ بلاغت کے میدان کی طرف نکل پڑیں گے کہ جو مختلف خواص و اسرار، ایجاز و اطناب و مساوات، تقدیم و تاخیر، ذکر و حذف اور حقیقت و مجاز وغیرہ پر مشتمل ہے۔

② قرآن کے حفظ اور محافظت کو آسان بنانا۔ اس لیے کہ وہ وجوہِ بلاغت جو خفا کو مستلزم ہیں وہ ایسے کثیر معانی پر دلالت کرتی ہیں جو

اصلِ کلام سے مستفاد معانی سے زائد ہوتے ہیں، اگر ان کثیر ثانوی معانی کو بھی الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا تو یہی قرآن کئی ضخیم جلدوں میں ہوتا جس کی وجہ سے اس کی محافظت اور اس کا حفظ کرنا مشکل ہو جاتا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکہف:۱۰۹)

اسی لئے قاریٔ قرآن، قرآن کے اسلوب کی بلندی اور نکتہ سنجی کی وجہ سے اس میں وہ حسن ولذت پاتا ہے جو اسے قرآن کی تلاوت پر برانگیختہ کرتا اور اسے اپنے سینے میں محفوظ کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

۳ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ایک حکمت یہ ذکر کی ہے کہ متشابہات کی موجودگی سے راہِ حق تک پہنچنا مشکل اور دشوار ہوتا ہے، جب اس پر زیادہ محنت ومشقت اٹھانا پڑے گی تو اجر وثواب میں بھی اضافہ ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۴۲)

۴ نیز امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: "قرآن محکم اور متشابہ پر مشتمل ہے، اس وجہ سے اس میں غور کرنے والا علومِ کثیرہ کی تحصیل پر مجبور ہوگا، جیسے لغت، نحو، اصولِ فقہ وغیرہ اور پھر یہ علوم اس کے لیے مزید نظر واستدلال پر معین ومددگار بنتے ہیں، اب غور کیجئے علومِ کثیرہ کے حصول کا سبب یہی متشابہ بنا ہے۔"

۵ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ ہی ذکر کرتے ہیں: "قرآن کے محکم ومتشابہ پر مشتمل ہونے کے باعث اس میں غور کرنے والا عقلی دلائل سے مدد لینے پر بھی مجبور ہوگا جس کا نتیجہ پھر یہ ہوگا کہ اسے بے جا تقلید سے نجات اور خلاصی حاصل ہو جائے گی، اور اس سے عقل کی عظمت اور اس پر اعتماد کا بھی پتہ چلتا ہے، اگر بالفرض سارا قرآن ہی محکم ہوتا تو نہ عقلی دلائل کی ضرورت ہوتی اور خود عقل بھی مہمل چیز قرار پاتی...... الخ۔"

اہم بات مذکورہ بعض حکمتوں کا اعتبار پہلی قسم میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ پہلی قسم کی بعض حکمتیں یہاں پر بھی معتبر ہو سکتی ہیں لیکن کچھ تکلف کے ساتھ۔ البتہ ہم نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے اور آپ کو بھی رکھنا چاہیے کہ مذکورہ بعض حکمتیں متشابہات کی خاص انواع میں ہی پائی جاتی ہیں، لیکن مجموعی اعتبار سے سب میں متحقق ہو سکتی ہیں۔ اس تحریر میں اتنے ہی کافی ہیں اور آپ بھی اس پر اکتفا کریں اور اس کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ وباللہ التوفیق

متشابہ صفات ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ متشابہات کی مختلف انواع ہیں۔ اب ہم مزید آپ کو یہ بتاتے ہیں کہ ان انواع میں سے دو قسم کے متشابہات ایسے ہیں جن پر زیادہ بحث وگفتگو کی گئی ہے۔

۱ سورتوں کے فواتح، جیسے ﴿الٓمّٓ، قٓ، طٰسٓ﴾ وغیرہ۔ اس کتاب کی جلد اوّل کی ساتویں بحث کے موقع پر ہم نے اس پر سیر حاصل گفتگو کر دی ہے۔

۲ اللہ تعالیٰ کی شان میں واردشدہ آیات مشکلہ جنہیں آیاتِ صفات یا متشابہ صفات بھی کہتے ہیں۔ ابن اللبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے: "ردّ المتشابهات إلى الآيات المحكمات" اس کی مثال جیسے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہٰ:۵) وغیرہ۔ انہوں نے اس پر مستقل کتاب اس لیے لکھی کہ اس بارے میں علماء کی بحث وگفتگو بہت زیادہ

ہے۔ اور یہ ایک فتنہ تھا جس میں بہت سے قدیم وجدید لوگ مبتلا ہوئے۔

متشابہ صفات میں درست رائے

ہمارے علماء (اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے) ان متشابہات سے متعلق تین امور پر اتفاق کرتے ہیں، البتہ ان کے علاوہ دیگر امور میں ان کا اختلاف ہے۔ جن تین امور پر ان کا اتفاقِ رائے ہے، وہ یہ ہیں:

① ایسے متشابہات کو ان کے ظاہری اور محال معنی سے پھیرنا، اور اس بات کا اعتقاد رکھنا کہ شارع کے نزدیک ان کے ظاہری معنی قطعی طور پر مراد نہیں ہیں، اس لیے کہ ان کے ظاہری معنی قطعی دلائل کی وجہ سے باطل ہیں اور خود شارع سے ایسا اعتقاد محکمات کے بارے میں معروف ہے۔

② جب ان متشابہات کی تاویل کی بناء پر اسلام کا دفاع موقوف ہوگا تو ضروری ہے کہ ان کی ایسی تاویل کی جائے جس سے اشتباہ میں پڑنے والوں کا اشتباہ بھی دُور ہو جائے اور طعنہ زنی کرنے والوں کی طعنہ زنی بھی ختم ہو جائے۔

③ اگر متشابہ کی ایک ہی تاویل ہو کہ اس سے قریبی مفہوم سمجھ میں آتا ہو تو بالاجماع اسی کو اختیار کرنا ضروری ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (الحدید: ۴) اب اللہ تعالیٰ کا بالذات مخلوق کے ساتھ ہونا قطعی طور پر محال چیز ہے، اب اس کی ایک ہی تاویل ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم، سمع، بصر، قدرت اور ارادہ کے احاطہ کے مطابق لوگوں کے ساتھ ہے۔

باقی رہا اس کے علاوہ امور میں علماء کا اختلاف تو اس میں تین مذاہب ہیں:

① مذہب اوّل:

اسلاف کا مذہب ہے، اسے مذہب مفوّضہ بھی کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان متشابہات کے ظاہری اور محال معنی ومراد سے منزہ ہے اور ان کے حقیقی معانی اللہ وحدہٗ کے سپرد کیے جائیں گے۔ اس مذہب کی دو دلیلیں ہیں:

① **دلیلِ عقلی:** ان متشابہات کی مُراد کی تعیین، قوانینِ لغت اور استعمالاتِ عرب کے مطابق ہی ہوگی، اور یہ قوانین و استعمالات مفیدِ ظن ہوتے ہیں۔ جبکہ صفاتِ باری تعالیٰ کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے جن میں ظن کافی نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لئے یقین کا ہونا ضروری ہے، اب اس کا کوئی راستہ نہیں اس لیے ہم توقف کریں گے اور علیم وخبیر ذات کے سپرد کر دیں گے۔

② **دلیلِ نقلی:** اس بارے میں ان کا استدلال متعدد امور پر مبنی ہے: مثلاً (۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سابق کہ جس میں یہ الفاظ ہیں: "جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن کے متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں تو ان ہی لوگوں کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے، تم ان سے احتیاط کرو۔"

(۲) امام طبرانی رحمہ اللہ نے الکبیر میں ابو مالک الاشجعی رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: "مجھے اپنی اُمت پر تین چیزوں کا اندیشہ ہے، ان کے مال میں بہتات ہوگی تو وہ ایک دوسرے سے حسد کریں گے اور لڑیں گے، اور یہ کہ ان کے سامنے کتاب کھلے اور مومن اس کی تاویلات کو ڈھونڈنے لگے ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (آل عمران: ۷) (الحدیث)

(۳) ابن مردویہ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
"بے شک قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تکذیب کرے۔ اس میں سے جو تمہیں معلوم ہو اس پر عمل کرو اور جو مشتبہ ہو اس پر ایمان لاؤ۔"

(۴) امام دارمی رحمہ اللہ نے سلیمان بن یسار رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص جس کا نام ابن صَبِیغ تھا، مدینہ منورہ آیا، اور لوگوں سے قرآن کے متشابہات کے بارے دریافت کرنے لگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بُلا بھیجا، آپ نے اسے سزا دینے کے لئے کھجور کی سوکھی شاخیں منگوا رکھی تھیں، وہ حاضر ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا "کہ تم کون ہو، اس نے کہا میں عبداللہ بن صبیغ ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھجور کی ایک شاخ پکڑ کر اس کے سر پر ماری جس سے اس کے سر سے خون بہنے لگا۔"

ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ: "پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے کھجور کی شاخوں سے مارا، یہاں تک کہ اس کی پُشت کو بالکل زخمی کر کے چھوڑا پھر اسے چھوڑ دیا، یہاں تک کہ جب ٹھیک ہو گیا تو دوبارہ اسی طرح مارا، جب اس بار بھی اس کے زخم ٹھیک ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے تیسری مرتبہ اسی طرح سزا دینے کا ارادہ فرمایا تو وہ شخص کہنے لگا: اگر آپ مجھے جان سے ہی مارنا چاہتے ہیں تو اچھے طریقے سے مار ڈالو" یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے ملک واپس چلے جانے کا حکم دیا، اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ اس شخص کے پاس کوئی مسلمان نشست و برخاست نہ رکھے۔ الخ "①

اس اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن صُبیغ لوگوں سے متشابہاتِ قرآنی کے متعلق کثرت سے سوالات اور بحث و مباحثہ کر کے فتنہ کا دروازہ کھولنا چاہتا تھا۔

⑤ مروی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ سے "استواء" کی حقیقت دریافت کی گئی جس کا ذکر اس فرمانِ الٰہی میں آتا ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾ (طٰہٰ: ۵) تو فرمایا:

((الاستواء معلوم والكيف مجهول والسؤال عن هذا بدعة)).

"یعنی استواء معلوم ہے لیکن اس کی کیفیت نامعلوم ہے اور اس کے بارے سوال کرنا بدعت ہے۔"

اور سائل سے فرمایا کہ: "تم مجھے کوئی بُرے انسان لگتے ہو، اسے یہاں سے نکال دو۔"

امام مالک رحمہ اللہ کی مراد یہ تھی کہ استواء عرش کا ظاہری معنی تو معلوم ہے جو لغوی طور پر معلوم ہو جاتا ہے، لیکن یہ ظاہری معنی قطعاً مراد نہیں ہے، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے لیے تشبیہ محال لازم آتا ہے جس پر دلیل قطعی دلالت کرتی ہے، اور کیفیت مجہول ہونے سے مراد یہ ہے کہ شارع کی اس سے مراد کیا ہے متعین طور پر ہمیں معلوم نہیں کیونکہ اس پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی متعین مراد، جو شارع نے مقرر کی ہو، اس کے بارے میں استفسار کرنا بدعت ہے، کیونکہ یہ دین میں ایسے طریقے کی ایجاد ہو گا جو شارع کی بتائی ہوئی ہدایات کے خلاف ہے، وہ ہدایت اور راہ نمائی یہ ہے کہ محکمات کی تقدیم کو ضروری سمجھو اور متشابہات کے پیچھے نہ پڑو، اور پھر ایسے بدعتی شخص کی سزا یہی ہوتی ہے کہ اسے بھگا دیا جائے اور لوگوں سے دُور رکھا جائے۔ تاکہ کہیں ان کو کسی فتنے میں نہ ڈال دے، کیونکہ یہ بُرا شخص ہے۔

① مسند الدارمی، المقدمة، باب: من هاب الفتيا وكره التنطع والتبدع

یہ ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات کا اصل راز اور سبب کہ: "تو مجھے بُرا شخص لگتا ہے اسے باہر نکال دو....الخ"

ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی طریقے پر اُمت کے پیشوا اور اس کے سردار چلتے رہے ہیں اور اسی کو ائمہ فقہ اور ائمہ حدیث نے بھی تسلیم کیا ہے اور اسی کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں اور ہمارے اصحاب میں سے متکلمین علماء کا بھی کوئی عالم اس سے انکار نہیں کرتا ہے۔

② مذہب ثانی:

یہ اخلاف کا مذہب ہے، اسے مذہب مؤوِّلہ بھی کہتے ہیں۔ ان میں دو گروہ ہیں: ایک گروہ تو ان متشابہات کی ایسی صفاتِ سمعیہ کے ساتھ تاویل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں لیکن ہمیں علی التعیین معلوم نہیں ہیں اور وہ اللہ کی ان صفات سے زائد ہیں جو ہمیں علی التعیین معلوم ہیں، اس کی نسبت ابوالحسن الاشعری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کی جاتی ہے۔ دوسرا گروہ ان متشابہات کی تاویل ایسی صفات یا معانی کے ساتھ کرتا ہے جو ہمیں متعین طور پر معلوم ہیں۔ چناں چہ متشابہات میں جن کلمات کے ظاہری معنی مراد لینا محال ہوں ان کو ایسے معنی پر محمول کیا جائے گا جس کی لغت میں گنجائش موجود ہو اور عقلاً و شرعاً اللہ کی شان کے بھی لائق ہو۔ اس قول کی نسبت ابن برہان رحمۃ اللہ علیہ اور متاخرین کی ایک جماعت کی طرف کی جاتی ہے۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو اختیار کیا تھا، پھر اس سے رجوع کر لیا تھا، چنانچہ وہ الرسالۃ النظامیۃ میں لکھتے ہیں کہ جس چیز کو ہم دین بنانا پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اس پر عمل کرنے کا اقرار کرتے ہیں وہ سلف کی اتباع ہے، کیونکہ وہ لوگ صفات کے معانی میں غور نہیں کرتے تھے۔

بہر حال ان مذہب والوں کی دلیل یہ ہے کہ اصل مقصود یہ ہے کہ الفاظ کو مہمل ہونے سے بچایا جائے کہ الفاظ کو بے معنی چھوڑنے کی وجہ سے تردد لازم آتا ہے، حتی الامکان کلامِ شارع کو معقول معنی پر محمول کرنا چاہیے، انسان کی عقل اس کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے، اس طرح حکیم و علیم ذات کا کلام قابل انتفاع بھی ہو سکے گا اور بے مقصدیت اور بے معنی ہونے سے بھی محفوظ ہو گا۔

④ مذہب ثالث:

یہ معتدل لوگوں کا مذہب ہے، امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مذہب کو نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ: ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ نے متوسط راہ اختیار کرتے ہوئے فرمایا کہ: جب تاویل اہل عرب کی زبان کے قریب ہو تو وہ منکر (ناپسندیدہ) نہ ہو گی اور اس سے بعید ہو تو ہم توقف کریں گے اور اس کے معنی پر اسی طرح ایمان لائیں گے کہ تنزیہ باری تعالیٰ کے ساتھ اس کی مراد پر بھی ایمان ثابت ہو جائے۔ اور اگر ایسے الفاظ کے معنی اہل عرب کے باہمی طرزِ تخاطب سے ظاہر اور عام طور پر معلوم ہوں تو ہم بغیر کسی توقف کے اس کے قائل ہو جائیں گے۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ﴿يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ﴾ (الزمر:۵۶) میں لفظ ﴿جَنْۢبِ﴾ کو اللہ کے حق اور جو کچھ اس کے لیے واجب ہے، پر محمول کریں گے۔

تطبیق و تمثیل

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہٰ:۵)

اب ہم مذکورہ مذاہب میں تطبیق دیتے ہیں، چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ علمائے اسلاف و اخلاف اس بات پر متفق

ہیں کہ "استویٰ علی العرش" کا ظاہری معنی کہ عرش پر تمکن اور تحیز کے ساتھ بیٹھنا، مراد لینا محال ہے، کیونکہ دلائل قطعیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس بات سے منزہ ہے کہ اسے مخلوق سے تشبیہ دی جائے یا وہ کسی چیز کا محتاج ہو، خواہ وہ چیز کوئی مکان ہو جس میں وہ نزول کرے یا کوئی اور چیز ہو، اسی طرح علمائے اسلاف واخلاف اس بات پر بھی متفق ہیں کہ یہ ظاہری معنی قطعاً اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں اپنی ذات سے مخلوق کی مماثلت کی نفی کی ہے اور ان سے اپنی بے نیازی کو ثابت کیا ہے، فرمایا: ﴿لَیْسَ کَمِثْلِہٖ﴾ (الشوریٰ:۱۱) نیز فرمایا: ﴿هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴾ (لقمان:۲۶) اگر ظاہری معنی مراد ہو تو کلام میں تعارض پیدا ہوگا۔

اس کے بعد علمائے سلف وخلف کا باہمی اختلاف ہوا، چنانچہ علمائے سلف کی رائے ہوئی کہ "استواء" کے معنی کی تعیین کو سپرد بہ خدا کر دیا جائے، وہ ذات خوب جانتی ہے کہ اس نے اپنی طرف کیا بات منسوب کی ہے اور اس کی شان کے کیا لائق ہے؟ ہمارے پاس اس تعیین معنی پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ جبکہ علمائے خلف تاویل کرتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے الفاظ کے ساتھ مخاطب کریں جن کا وہ مفہوم ہی نہ سمجھتے ہوں، اور لغت کا میدان جب تک تاویل کے لیے وسیع رہے گا تاویل کرنا ضروری ہوگا۔ علاوہ ازیں اس تاویل کے سلسلہ میں ان میں پھر دو گروہ ہیں، ایک اشاعر کا گروہ، جو بغیر تعیین کے تاویل کرتے ہیں کہ آیت مذکورہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا صفتِ سمعیہ سے موصوف ہونا ہے لیکن ہم اس صفت کو متعین طور پر نہیں جانتے، اس صفت کو صفتِ استواء بھی کہتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ متاخرین کا ہے کہ وہ تعیین کے ساتھ تاویل کرتے ہیں کہ یہاں "استواء" سے مراد استیلا، اور قہر وغلبہ ہے، اس میں کوئی تکلف اور مشقت بھی نہیں، کیونکہ لغتِ عرب میں اس معنی کی گنجائش موجود ہے۔ جیسا کہ اسی سے متعلق شاعر کا ایک شعر ہے:

قد استوىٰ بِشرٌ على العراق
من غير سيفٍ ودمٍ مهراق

تو "استواء" کا معنی ہے غالب آیا یا تدبیر کی اور حکومت کی، اسی طرح آیتِ مذکورہ کا مطلب یہ ہوگا کہ رحمان، عرشِ عالم پر غالب ہوا اور اس نے اپنی قدرت سے اس عالم پر حکومت کی اور اپنے ارادے اور مشیت سے اس کی تدبیر کی۔

ابن دقیق رحمہ اللہ اسی تاویل کے قائل ہیں کہ اگر تو وہ تاویل لسانِ عرب کے قریب ہو تو قبول کی جائے گی اور بعید ہو تو توقف کیا جائے گا۔

ان آیاتِ کریمہ میں بھی آپ اسی طرح کا قول اختیار کیجیے: ① ﴿وَ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ﴾ (الرحمٰن:۲۷)۔ ② ﴿وَ لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ﴾ (طٰہٰ:۳۹) ③ ﴿یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾ (الفتح:۱۰)۔ ④ ﴿وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ﴾ (الزمر:۶۷)۔ ⑤ ﴿یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ﴾ (النحل:۵۰)۔ ⑥ ﴿وَ جَآءَ رَبُّكَ﴾ (الفجر:۲۲)۔ ⑦ ﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ﴾ (الانعام:۵۹)۔

علماءِ سلف تو ان الفاظ کے ظاہری معنی کو محال قرار دیتے ہیں کہ اللہ کی ذات اس سے منزہ ہے اور اس کے ساتھ ان کے معانی کو بھی مطلقاً اللہ کے سپرد کرتے ہیں اور اشاعرہ ان کی تاویل وتفسیر صفات سمعیہ کے ساتھ کرتے ہیں جو ان صفات پر زائد ہیں جن کا ہمیں علم ہے، البتہ ان صفات کی تعیین کا معاملہ اللہ ہی کے سپرد کرتے ہیں۔ گو ایک لحاظ سے تاویل اور ایک اعتبار سے تفویض ہے۔ اور متاخرین "الوجہ" کی تفسیر ذات کے ساتھ اور ﴿وَ لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ﴾ کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی پرورش میں عنایت

خداوندی شامل ہوگی اور وہ اللہ تعالیٰ کی بہترین نگرانی میں ہوگی۔ اور لفظ "الید" کی تفسیر قدرت کے ساتھ اور فوقیت کی معنوی بلندی نہ کہ حسّی بلندی کے ساتھ، اور ﴿وَجَآءَ رَبُّكَ﴾ میں مجیئت کی تفسیر اس کے حکم کے آنے کے ساتھ اور ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ﴾ میں عندیت کی تفسیر احاطہ اور تمکن کے ساتھ یا سب میں اس طرح کی تفسیر کرتے ہیں۔

تنبیہ دورِ حاضر کے بعض لوگ صفاتِ متشابہات کے بارے میں غلو اختیار کر کے اس میں بے جا غوطہ زنی کرتے ہیں اور ان صفات کے متعلق ایسی گفتگو اور بحث کرتے ہیں کہ جن کی اللہ نے اجازت نہیں دی، ان کی باتوں میں ایسے مبہم قسم کے کلمات موجود ہیں جس سے تشبیہ تنزیہ اور کفر وایمان دونوں کا احتمال پیدا ہوتا ہے، یہاں تک بذاتِ خود وہ کلمات متشابہات کے قبیل سے محسوس ہوتے ہیں، اور قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ وہ عوام الناس کو بھی اس طرف متوجہ کرتے ہیں اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ وہ اپنی باتوں کو سلف صالحین کی طرف منسوب کرتے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہ اس بارے میں اسلاف کے پیروکار ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کی جانب حسّی طور پر اشارہ کیا جا سکتا ہے، اور اس کی چھ جہات ہیں جن میں جہتِ فوقیت بھی ہے، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بذاتِ خود حقیقی استواء کے طور پر مستوی ہے۔ بایں معنی کہ وہ عرش کے اوپر حقیقی معنی کے اعتبار سے موجود ہے، لیکن پھر کہتے ہیں کہ اس کا استقرار علی العرش ہماری طرح یا معروف معنی کے لحاظ سے نہیں ہے۔ اس طرح کی دیگر آیات کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے ہیں، ہمارے علم کے مطابق ان کے پاس کوئی مستند دلیل نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ ظاہر آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ آپ کے سامنے علماء سلف وخلف کے مذاہب واضح ہو چکے ہیں، ہم اس کا اعادہ کر کے بات کو طول نہیں دینا چاہیے، یقیناً یہ بات بھی آپ کے علم میں آ چکی ہے کہ صفاتِ متشابہات باوجودیکہ اپنی حقیقت پر باقی ہیں، مگر ان کے ظاہری معنی کسی مسلمان کے ہاں بھی مراد نہیں ہیں، ہاں بعض دیگر مذاہب جیسے یہود ونصاریٰ، ان کی رائے ہو سکتی ہے، اسی طرح گمراہ فرقوں جیسے مشبہہ، مجسمہ وغیرہ کا اعتقاد ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم مسلمانوں کا ایسا کوئی خیال نہیں ہے، ہم عقائد کے معاملہ میں دلائل قطعیہ پر اعتماد کرتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نہ جسم ہے نہ متحیز ہے، نہ متجزی ہے، نہ مرکب ہے اور نہ کسی کا محتاج ہے، نہ زمانے کا اور نہ کسی مکان کا نہ کسی اور چیز کا۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱) نیز سورۃ الاخلاص میں فرمایا ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ (الاخلاص:۱-۴) نیز فرمانِ خداوندی ہے: ﴿اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ﴾ (الزمر:۷) نیز فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝﴾ (فاطر:۱۵)۔ اس کے علاوہ بھی کتاب وسنت میں بہت سی نصوص آتی ہیں۔

لہٰذا جس نص کا ظاہری مفہوم ان قطعی اور محکم قسم کی آیات کے خلاف ہوگا وہ متشابہات میں شامل ہوگا اس کے درپے ہونا جائز نہیں، جیسا کہ ماقبل کی تحریر سے واضح ہوا۔ مزید برآں یہ کہ یہ لوگ جو خود کو اسلاف کا پیروکار بتاتے ہیں، ان کے کلام میں تناقض اور تضاد پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ اوّلاً ان متشابہات کو اپنی حقیقت پر مانتے ہیں جس سے حدوث واعراض لازم آتا ہے، جیسے جسمانیت، تجزی، حرکت کرنا، منتقل ہونا وغیرہ۔ لیکن پھر ان متشابہات کو اپنی حقیقت پر ماننے کے باوجود ان لوازم کی نفی بھی کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ قول کہ ملزوم ثابت ہے اور لوازم منتفی ہے، ایک دوسرے کے معارض ہے، کوئی عقل مند انسان بھی اپنے لیے ایسی بات پسند نہیں کرتا چہ جائیکہ وہ کوئی طالب علم یا عالم دین ہو۔

مسئلہ استواء میں ان کا یہ قول کہ "استواء" اپنے حقیقی معنی پر باقی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "استواء" سے جلوس (بیٹھنا) جو اس کا معروف معنی ہے مراد ہے، اس سے جسمانیت اور تحیز لازم آتا ہے، اس کے بعد پھر یہ کہنا کہ یہ "استواء" ہمارے عرفی معنی کے مطابق نہیں ہے، اب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلوس (بیٹھنا) جو اس کا معروف معنی ہے، مراد نہیں ہے جس سے جسمانیت یا تحیز لازم آتا ہے۔ یہ تو ایسا ہو گیا جیسے وہ کہیں کہ وہ مستوی ہے پر مستوی نہیں ہے، عرش کے اوپر مستقر ہے لیکن مستقر نہیں، متحیز ہے لیکن متحیز نہیں ہے، جسم ہے مگر جسم نہیں ہے یا یوں کہو کہ استواء علی العرش ہے اور استواء علی العرش نہیں ہے، عرش کے اوپر استقرار ہے اور استقرار نہیں ہے، اس طرح کی احمقانہ باتیں لازم آتی ہیں۔ اگر ان کی مراد "استواء اپنی حقیقت پر ہے" سے ایسی حقیقت ہے جسے صرف اللہ ہی جانتے ہیں، ہم اس سے واقف نہیں ہیں تو یہاں تک تو ہم اتفاق کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی یہ تعبیر موہم ضرور ہے، ایک مومن سے اس طرح کی موہم باتیں صادر نہیں ہونی چاہئیں۔ خصوصاً تعلیم وارشاد اور نقد و بحث کے موقعوں پر۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی لفظ کے حقیقی یا مجازی معنی مراد لینے میں علم الٰہی وغیرہ کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس بارے میں اس معنی کو دیکھا جاتا ہے جس کے لیے وہ لفظ عرفِ لغت میں وضع کیا گیا ہے۔ اب لغتِ عربیہ میں "استواء" کا لفظ اپنے ظاہری معنی کے مطابق اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر محال ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے ظاہری معنی سے پھیر دیا جائے، پھر جب لفظ اس معنی سے معدول ہو جائے جس کے لیے اس کو وضع کیا گیا تھا اور معنی غیر موضوع لہٗ میں استعمال ہونے لگے تو لامحالہ وہ حقیقت سے نکل کر مجاز کی طرف راجع ہو جاتا ہے، جب تک کہ معنی اصلی مراد لینے سے قرینہ مانعہ موجود ہو۔

علاوہ ازیں ان لوگوں کے کلام سے عوام الناس تلبیس واشتباہ اور فتنہ میں مبتلا ہو سکتے ہیں، بھلا وہ کیسے ان کو ایسی باتوں پر آمادہ کرتے ہیں؟ حالاں کہ ان باتوں سے امتِ اسلامیہ میں گمراہی اور تفرقہ پیدا ہوتا ہے، قرآنِ حکیم نے ہمیں اس سے منع کیا ہے، یہی وہ باتیں ہیں جن کے پیشِ نظر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ابن صُبیغ کی خوب درگت بنائی تھی، اور امام مالک رحمہ اللہ نے بھی استواء کے بارے میں بہت اہم بات فرمائی تھی اور استواء کی حقیقت دریافت کرنے والے شخص کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ وغیرہ ذالک

اگر یہ لوگ انصاف سے کام لیتے تو ایسی متشابہ آیات واخبار کے بارے میں سکوت اختیار کرتے اور بس یہ کہتے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر طرح کے حدوث ولوازم سے منزہ اور مقدس ہے جس کا وہم ان کے ظاہری معنی مراد لینے سے پیدا ہوتا ہے، نیز ان متشابہات کے معانی کی تعیین بھی اللہ وحدہٗ لاشریک کے سپرد کر دیتے۔ اس طرح وہ اسلاف کے سچے پیروکار کہلانے کے حق دار ہوتے، لیکن اس مقام پر انہیں کچھ شبہات پیش آئے ہیں، جس سے ان کے احوال اور افکار میں فساد پیدا ہوا۔

اس لیے اب ہم ان کے شبہات اور اس طرح کے دیگر امور آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت نصیب فرمائے اور ہم سب کو اپنی رضا و محبت عطا فرمائے۔ (آمین)

چند شبہات اور ان کے جوابات

پہلا شبہ اور اس کا جواب ✿ وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ کے لیے کوئی جہت نہیں ہے، نہ اوپر ہے، نہ نیچے، نہ دائیں جانب

ہے اور نہ بائیں جانب تو اس سے لازم آئے گا کہ اللہ کی ذات موجود ہی نہیں ہے، کیونکہ ان جہات سے متصف نہ ہونا ایسا امر ہے جس سے معدوم چیز ہی موصوف ہوسکتی ہے جو شرف وجود سے مشرف نہ ہو۔

ہم اس شبہ کے کئی طرح سے جواب دیتے ہیں: اوّلاً ہم کہتے ہیں کہ یہ غائب کو شاہد پر قیاس کرنا ہے، اور غائب کو شاہد پر قیاس کرنا فاسد اور غلط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی اپنی مخلوق کے مشابہ تو ہے نہیں کہ دونوں کا ایک جیسا حکم ہو یعنی جب تک وہ موجود ہو اس کے لیے جہاتِ ستہ کا ہونا ضروری ہو، بھلا کیسے ممکن ہے کہ جو ذات مجرد عن المادہ ہو اسے ایک مادی چیز پر قیاس کرلیا جائے۔ احکامِ مخلوق کے جاری ہونے میں خالق اور مخلوق برابر کیسے ہوسکتے ہیں؟ یعنی ایک مادی چیز کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ ان متقابلات اور جہات سے متصف ہو، لیکن ایک غیر مادی چیز سے تو یہ تمام صفات مرتفع ہوتی ہیں اور اس کے لیے ان جہات میں سے کوئی جہت ہونا ممکن نہیں ہے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ انسان کے لیے دو صفات میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے یا تو وہ عالم ہوگا یا جاہل، اب ایک حجر (پتھر) تو ان میں سے کسی صفت سے موصوف نہیں ہوسکتا کہ یوں کہا جائے جاہل ہے یا عالم ہے؟ بلکہ صفت علم و جہل اس سے مرتفع اور ممتنع ہوگی۔ کیونکہ حجر کی طبیعت جہل اور علم میں سے کسی کو قبول نہیں کرتی۔ اسی طرح تمام متقابلات اپنے محل کی قابلیت نہ ہونے کی وجہ سے منتفی ہوں گے خواہ وہ کوئی بھی متقابلات ہوں اور کوئی بھی محل ہو جو اس کے قابل نہ ہو۔ مثلاً ایک گھر کو صفتِ سماعت یا صفتِ صمیت (بہرہ پن) کے ساتھ موصوف کرنا ممتنع ہوتا ہے یا زمین کو صفتِ تکلم یا صفتِ خرسیت (گونگا پن) کے ساتھ موصوف کرنا ممتنع ہوتا ہے یا مثلاً آسمان ہے اس کی صفت میں کہنا کہ یہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ ہے یہ بات ممتنع ہے، وغیرہ ذالک۔

ثانیاً ہم کہتے کہ آپ ہمیں بتائیں کہ عرش و فرش اور زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے اللہ کہاں تھا؟ زمان و مکان اور جہات ستہ کے وجود سے پہلے اللہ کی ذات کہاں تھی۔ اگر تم کہتے ہو کہ اس وقت اس کے لیے کوئی جہت یا مکان نہ تھا تو پھر تم نے ہماری بات مان لی، ہم یہی کہتے ہیں کہ وہ ذات اب بھی اس حال میں ہے جس پر وہ پہلے تھی کہ اس کے لیے کوئی جہت ہے اور نہ مکان ہے۔ اگر تم یہ دعویٰ کرو کہ اللہ تعالیٰ کے قدیم ہونے کی وجہ سے پھر یہ عالم بھی قدیم ہے تو اس صورت میں تو تم اپنا علاج بدا کے مرض سے کرنے والے ہو اور تمہارا حال اس شخص کا سا ہوگا جو تپتی ہوئی زمین سے بھاگ کر آگ کی پناہ حاصل کرنا چاہتا ہو۔ ایسے لوگوں کو حدوثِ عالم کے اثبات کی طرف لانا بہت ضروری ہوگا۔

ثالثاً ہم کہتے ہیں کہ اگر تم ظاہر نصوص کو لے کر ان کو اپنی حقیقت پر رکھتے ہو تو اس طرح کے ارشادات کے بارے میں کیا کرو گے: ﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ﴾ (الملک:۱۶) نیز ﴿وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ﴾ (الانعام:۳) کیا تم یہاں بھی یہی کہو گے کہ اللہ کی ذات آسمان میں یا زمین میں یا دونوں میں ایک ساتھ حقیقتاً موجود ہے؟! اگر صرف زمین میں حقیقتاً ہو تو پھر اس کے لیے جہتِ فوقیت کس طرح ہوگی؟ اور اگر زمین اور آسمان دونوں میں بیک وقت حقیقتاً موجود ہو تو پھر اس کے لیے جہتِ تحیت کی بجائے جہتِ فوقیت کا قول کیوں اختیار کیا جاتا ہے؟ اور پھر اس کی طرف فوقیت کے ساتھ تو اشارہ کیا جاتا ہے، تحیت کے ساتھ نہیں کیا جاتا؟ اور کیا یہ لوگ جانتے نہیں کہ جہات اصل میں نسبتی امور ہیں، کہ جو چیز ہماری نسبت سے فوق (اوپر) ہے اور دوسروں کی نسبت سے تحت (نیچے) ہوگی۔ پھر یہ لوگ کہاں بہکے جارہے ہیں۔

رابعاً ہم کہتے ہیں کہ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾(الفتح:۱۰) میں لفظ (ید) مفرد استعمال ہوا ہے، اور ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾(ص:۷۵) میں تثنیہ اور ﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ﴾(الذاریات:۴۷) میں جمع استعمال ہوا ہے۔ تم اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ جب تم نصوص کو ان کے ظاہر پر رکھتے ہو اور حقیقی معنی لیتے ہو تو ہمیں بھی بتاؤ کہ اس ذات کا ایک ہاتھ ہے جیسا کہ پہلی آیت بتا رہی ہے یا دو ہاتھ ہیں جیسا کہ دوسری آیت سے پتہ چلتا ہے، یا کئی ہاتھ ہیں جیسے تیسری آیت اس پر دلالت کر رہی ہے؟!۔

خامساً ہم کہتے ہیں کہ: صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ہمارا پروردگار ہر رات آسمانِ دُنیا پر نزول فرماتا ہے جس وقت رات کا دوسرا تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے، اور یہ اعلان کرتا ہے کہ کون ہے جو مجھ سے دعا کرے میں اس کی دعا قبول کرو، کون ہے جو مجھ سے سوال کرے میں اس کو عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مغفرت مانگے میں اس کو معاف کر دوں؟[1]

اس حدیث کے ظاہر پر تم کیسے عمل کرتے ہو؟ حالانکہ رات، مشارق و مغارب کے مختلف ہونے کی بناء پر مختلف ملکوں میں مختلف ہوتی ہے۔ پھر اگر ہر اُفق پہ رہنے والوں کے لیے رات کے تہائی حصہ میں حقیقی نزول ہوتا ہے تو پھر تمہارے قول کے مطابق عرش پر حقیقی طور پر مستوی کون ہوتا ہے، اس وقت آسمان پر تمہارے قول کے مطابق حقیقی طور پر کون ہوگا؟ جبکہ یہ بات اپنی جگہ ثابت شدہ ہے کہ کسی بھی وقت زمین رات سے خالی نہیں ہوتی، اب اس بارے میں کوئی جاہل شخص ہی جھگڑے گا۔

سادساً ہم ان سے امام غزالی رحمہ اللہ کی بات ذکر کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا: ہم ظاہر الفاظ پر عمل کرنے والوں سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا آسمانِ دنیا پر نزول فرمانا اگر اس لیے ہوتا ہے کہ وہ ہمیں اپنی آواز سنائیں، لیکن وہ تو اپنی آواز نہیں سناتے، پھر نزول سے کیا فائدہ؟ اس کے لیے تو عرش پر یا آسمان پر رہتے ہوئے بھی ہمیں آواز دینا ممکن ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول سے ظاہری معنی مراد نہیں ہے، کوئی اور چیز مراد ہے۔ اس کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو مشرق میں بیٹھا ہو اور مغرب میں بیٹھے ہوئے شخص کو اپنی آواز سنانا چاہتا ہو، اس لیے وہ مغرب کی طرف چند قدم اٹھاتے ہوئے اس شخص کو پکارنا شروع کر دے، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اسے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی، اب اس کا عملی طور پر قدم اٹھانا مغرب کی جانب چلنا بے سود اور بے فائدہ ہوگا۔ ایک عقل مند آدمی کے لیے اس طرح کی مثال کافی ہے۔" الخ

دوسرا شبہ اور اس کا جواب ✿ استاذ شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ، العقائد العضدیہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ: "اگر آپ سوال کریں کہ جب اللہ کا کلام اور نبی کریم ﷺ کا کلام الفاظِ عربیہ سے مرکب ہے اور ان الفاظ کے مدلولات بھی اہلِ لغت کو معلوم ہیں تو پھر لفظ کا مدلول کوئی بھی ہو اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا؟

میں جواب میں کہتا ہوں کہ ایسی صورت میں تو پھر فرقہ مجسمہ کے علاوہ کوئی بھی ناجی نہ ہوگا جو ظاہر پرست اور تمام نصوص پر عمل کے وجوب کے قائل ہیں او طریق استدلال کو بالکل ترک کر دیتے ہیں، حالانکہ اس فرقہ کی آراء کا ضال اور مضل ہونا بالکل واضح ہے، اس کے علاوہ وہ ایسے طریق کو اختیار کرتے ہیں جو کسی بھی طرح یقین کا فائدہ نہیں دیتا، کیونکہ کلام میں کچھ ایسی مناسبات موجود ہوتی ہیں کہ وہ کلام ان پر منطبق ہوتا ہے تو کلام کا صحیح معنی سمجھنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ عقلی استدلال کیا جائے اور جو کلام

---

① رواہ البخاری فی کتاب التھجد، باب (۱۴) و مسلم فی کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا، حدیث (۱۶۸)، و ابو داؤد فی کتاب السنۃ، باب (۱۹) و الترمذی فی کتاب الصلاۃ، باب (۲۱۱)

بظاہر نقص کا فائدہ دے رہا ہے اس کی ایسی تاویل کر دی جائے کہ وہ مفید کمال ہو جائے، جب برہان کی تاویل ایک امر میں صحیح ہوگی تو تمام باقی امور میں بھی صحیح ہوگی، اس لیے کہ دو برہانوں میں بحیثیت برہان اور دو لفظوں میں باعتبارِ لفظ کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ﴾ (النور: ۳۴)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ پر وحی کا درجہ بدرجہ نزول، مرتبہ ربوبیت کی بلندی بیان کرنے کے لیے ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایک بلند جگہ سے پست جگہ پر نزولِ حسّی ہوتا ہو، اور قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ وہ لوگ اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ اللہ کی اپنی مخلوق پر علویت حقیقی طور پر ہے، اس ذات نے اس کو خود اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے۔ اس کی تاویل مرتبہ ربوبیت کے ساتھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب جب ہم اس کی تاویل مرتبہ ربوبیت کی بلندی سے نہ کریں گے تو پھر اس سے کیا مراد ہے؟ اس کے بعد تو حسّی طور پر بلندی ہی باقی رہ جاتی ہے جس سے جہت اور تحیز لازم آتا ہے۔ حسّی طور پر بلندی مراد لینے سے ان لوازم کی نفی کرنا ممکن نہ ہوگا، کیونکہ حسّی بلندی سے تحیز کی نفی کرنا غیر معقول بات ہے، اور لازم آنے کا یہی تو مطلب ہے۔ لیکن وہ لوگ ان لوازم کی نفی کرتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ لوازم فرض کرنے کے بعد اس کی نفی کیسے کرتے ہیں؟! یہ تو اپنی ہی بات کو رد کرنا ہے، یہ لوگ اہل منطق نہیں ہیں جو شخص ان کے کلام کو دیکھتا ہے تو اسے اس میں ایسی صریح عبارتیں ملتی ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کے لیے جہت کا اثبات ہوتا ہے۔

عراقی وغیرہ نے تو اللہ کے لئے جہت ماننے والوں کی تکفیر کی ہے، اور یہ بات بالکل واضح ہے، کیونکہ جو جہت کو مانے گا اُسے تحیز اور جسمانیت بھی ماننا ہوگی اور یہ چیز اس کے بغیر حاصل نہ ہوگی، اگر تم اس کے سوا کوئی بات ان لوگوں سے سنو تو وہ متعارض قول ہوگا اور بے معنی بات ہوگی.... الخ

تیسرا شبہ اور اس کا جواب ○ امام سیوطی رحمہ اللہ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ جو ذات اپنے بندوں کی ہدایت و بیان کا ارادہ رکھتی ہو اس کا متشابہ آیات نازل کرنے میں کیا حکمت ہے؟

ہم جواب دیں گے کہ اگر تو وہ متشابہ آیات ایسی ہوں کہ ان کا جاننا ممکن ہو تو اس کے بھی چند فائدے ہیں: مثلاً یہ کہ:

(۱) علماء کو ترغیب دینا کہ وہ اس میں غور کر کے اس سربستہ راز اور اس کے دقائق و حقائق کو تلاش کریں۔ کیونکہ ان امور کی معرفت کے لئے اپنی ہمتوں کو متوجہ کرنا بھی عظیم نیکیوں میں سے ہے۔

(۲) نیز اس طرح درجات اور مراتب کا تفاوت بھی ظاہر ہوگا۔ اس لیے کہ اگر سارا قرآن محکم ہوتا تو کسی تاویل یا نظر و استدلال کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ اس طرح تمام مخلوق درجے میں برابر ہو جاتی، عالم کی غیر عالم پر کوئی فضیلت ظاہر نہ ہوتی۔ اور اگر وہ متشابہ آیات وغیرہ ایسی ہوں کہ ان کا معلوم ہونا ممکن ہی نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے لیے خاص کر لیا ہو تو اس کے بھی فائدے ہیں، مثلاً یہ کہ لوگوں کی آزمائش کہ اس موقع پر توقف اختیار کرتے ہیں اور تفویض و تسلیم سے کام لیتے ہیں یا نہیں؟ نیز آیا وہ ان آیات کی تلاوت میں مشغول ہو کر فریضہ عبادت بجالاتے ہیں جن کا حکم تو منسوخ ہے لیکن صرف تلاوت باقی ہے یعنی ان پر عمل تو جائز نہیں لیکن صرف تلاوت باقی ہے۔ اسی طرح ایسی آیات کے نزول میں ایک حکمت لوگوں پر حجت قائم کرنا بھی ہوتا ہے۔ وہ اس وجہ سے کہ جب یہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے اور وہ فصیح و بلیغ ہونے کے باوجود اس کے معنی جاننے سے عاجز و قاصر ہو رہے ہیں تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ قرآن منجانب اللہ نازل شدہ ہے اور اسی ذات نے ان کو اس کے معنی جاننے

سے عاجز کیا ہے.....“

ہم آپ کی توجہ گزشتہ تحریر میں ذکر کردہ حکمتوں کی طرف مبذول کرواتے ہیں، نیز ابن اللبان رحمۃ اللہ علیہ کی بات کی طرف بھی جو انہوں نے اپنی کتاب ”رد المتشابہات الی الآیات المحکمات“ کے مقدمہ میں لکھی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ”اس کائنات میں حقیقی فاعل اللہ ہے۔ بندوں کے افعال کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، جس میں اس کا کوئی شریک یا معین نہیں ہے، وہ افعال حقیقت میں اسی ذات کا فعل ہے اور ان ہی افعال کی وجہ سے بندوں پر اس کی حجت بھی قائم ہوتی ہے:

﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ۝۲۳﴾ (الانبیاء: ۲۳)

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ افعالِ عباد میں جوارح واعضاء کا عمل اور دخل ہوا کرتا ہے اس کے باوجود ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی تجلی کے دو مظہر ہیں، ایک مظہر عبادی جس کی نسبت بندوں کی طرف ہوتی ہے اور وہ مظہر صورتوں اور جوارحِ جسمانی سے عبارت ہے، اور ایک مظہر حقیقی ہے جو ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، اسی پر مظاہر عبادیہ جو کہ بندوں کی طرف منسوب ہوتے ہیں، ان کے اسماء جاری ہوتے ہیں، اس سے مقصد محض انسان کے فہم کے قریب کرنا اور اس کے دل کو اس سے مانوس کرنا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قسموں پر اپنی کتاب مبین میں متنبہ فرمایا ہے، نیز اس بات پر بھی کہ وہ ذات دونوں حالتوں میں جوارح سے منزہ اور مقدس ہے۔ چنانچہ قسم اوّل پر اس ارشاد میں متنبہ فرمایا: ﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ﴾ (التوبہ: ۱۴) اس آیت مبارکہ سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بندوں کے ہاتھ سے جو چیز بھی ظاہر ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی جائے گی۔ اور دوسری قسم پر اس ارشادِ نبوی ﷺ میں متنبہ فرمایا گیا ہے، صحیح مسلم میں یہ ارشادِ نبوی ﷺ یوں منقول ہے:

”میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔“ ①

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے لیے اس کو یوں ثابت کیا ہے کہ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ (الفتح: ۱۰) نیز اس فرمان سے بھی اس کی تائید واثبات کیا ہے: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ (الانفال: ۱۷) ان نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ جوارح سے سرزد ہونے والے افعال کی اللہ کی طرف نسبت کی جا سکتی ہے۔ پھر اس نسبت کرنے سے تشبیہ یا تجسیم کا مفہوم نہیں نکلتا، کیونکہ اس سے مقصد محض فہم کے قریب کرنا اور دلوں کو اس سے مانوس کرنا ہوتا ہے۔ امر ضروری یہ ہے کہ متشابہ کو محکم کی طرف لوٹایا جائے قواعدِ لغویہ اوضاعِ عربیہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ نے کتاب وسنت کا جو مفہوم سمجھا اس کو بنیاد بناتے ہوئے۔

چوتھا شبہ اور اس کا جواب ● امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ: ”بعض ملحدین قرآنِ کریم میں نکتہ چینی اس وجہ سے کرتے ہیں کہ اس میں متشابہات پائے جاتے ہیں اور یہ اعتراض کرتے ہیں کہ تم کہتے ہو کہ اس قرآن کے ساتھ لوگوں کی

---

① اخرجه البخاری فی الرقاق، باب: (۳۹)

تکالیف (احکام) کا تعلق تا قیامت ہے، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب کے لیے اسی قرآن سے استدلال کرتا ہے، فرقہ جبریہ والے بھی آیاتِ جبر سے استدلال کرتے ہیں مثلاً اس ارشادِ باری سے کہ ﴿وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ (الانعام: ۲۵) اور فرقہ قدریہ والے کہتے ہیں کہ یہ تو کفار کا مذہب ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کی بات کو مقام ذم میں نقل فرمایا ہے کہ: ﴿وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَ فِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ﴾ (فصلت: ۵) اور ایک دوسری جگہ پر فرمایا ﴿وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ (البقرہ: ۸۸)۔ اسی طرح جو رؤیتِ باری تعالیٰ کے منکر ہیں وہ بھی اس فرمانِ الٰہی سے استدلال کرتے نظر آتے ہیں کہ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام: ۱۹۲) نیز اس فرمان سے کہ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ (القیامہ: ۲۲-۲۳)۔[1] اور جو حضرات، اللہ کے لیے جہت کا اثبات مانتے ہیں وہ اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں کہ ﴿يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ﴾ (النحل: ۵۰) نیز اس فرمان سے ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾ (طٰہ: ۵) اور اس کے مقابلے میں دوسرے حضرات اس آیت سے استدلال کرتے ہیں ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)۔ پھر ہر ایک اپنے مذہب کے موافق آیات کو محکم اور مخالف مذہب آیات کو متشابہ قرار دے دیتے ہیں، جس کا نتیجہ اور مآل یہ ہوتا ہے کہ مخفی ترجیحات اور ضعیف وجوہات کے ذریعہ ترجیح دے دیتے ہیں۔ پھر یہ حکم لگانا کہ یہ کتاب، جو ہر مذہب والے کا مرجع ہے، تا قیامت اس طرح قائم رہے گی۔"

اس کا جواب یہ ہے کہ علماء نے قرآن میں متشابہات کے وقوع کے کئی فوائد ذکر کیے ہیں: مثلاً یہ کہ اس سے اصل مراد تک رسائی حاصل کرنے میں مشقت زیادہ کرنا پڑتی ہے، اور قاعدہ ہے کہ زیادہ مشقت اٹھانے سے اجر و ثواب بھی زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے متشابہات کے ذیل میں اس کی حکمتوں اور اسرار کا ذکر کر دیا ہے، لہٰذا اس شبہ کے رفع کے لیے اسی کو حرزِ جان بنائیے۔ علاوہ ازیں ابن اللبان رحمہ اللہ کی بات جو ابھی نقل کی ہے اور سابقہ شبہات کے جوابات کے ضمن میں جو تفصیل سے گفتگو کی ہے اس کو بھی دیکھ لیجیے۔ اس طرح کے مقام کے لیے کتاب ہذا کی ساتویں بحث کی طرف مراجعت کر لیجیے۔

پانچواں شبہ اور اس کا جواب ● امام سیوطی رحمہ اللہ اپنی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں رقم طراز ہیں کہ: "بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا محکم کو متشابہ پر کوئی فضیلت حاصل ہے یا نہیں؟ اگر تم کہو کہ کوئی فضیلت یا برتری حاصل نہیں ہے تو یہ خلاف اجماع ہے، اور اگر تم کہو کہ محکم کو متشابہ پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے تو تم نے خود ہی اپنا قاعدہ اور اصول توڑ دیا کہ اللہ تعالیٰ کا سارا کلام درجہ میں برابر ہے اور یہ کہ حکمت کے ساتھ نازل شدہ ہے؟!۔

ابو عبداللہ النکر باذی رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ محکم ایک اعتبار سے متشابہ کی مانند ہے اور ایک اعتبار سے ان سے مختلف ہے۔ محکم اور متشابہ دونوں اس امر میں متفق ہیں کہ دونوں سے استدلال تب ہی ممکن ہوتا ہے جب واضع کی حکمت معلوم ہو، نیز اس پر بھی اتفاق ہے کہ واضع قبیح امر کو پسند نہیں کرتا، اور محکم و متشابہ دونوں اس امر میں مختلف ہیں کہ محکم کو سننے اس کے لیے اسی وقت اس سے استدلال کرنا ممکن ہوتا ہے، جبکہ متشابہ میں فکر و نظر کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ درست صورت پر اسے محمول کیا جا سکے، نیز اس لیے کہ محکم اصل کی حیثیت رکھتا ہے اور اصل کا علم سابق ہوتا ہے، نیز محکم کا علم تفصیلی طور پر اور متشابہ کا اجمالی طور پر ہی ہوا کرتا ہے۔"

---

① یہاں بظاہر غلطی ہے، یوں ہونا چاہیے کہ رؤیت کے قائلین مذکورہ آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

میں (مصنف رحمۃ اللہ علیہ) کہتا ہوں کہ اس شبہ کا زیادہ قابلِ فہم جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ محکم کو متشابہ پر فضیلت حاصل ہے، اس لیے کہ نصِ قرآنی سے اس کا اُم الکتاب ہونا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اس کی توضیح پہلے ہو چکی ہے۔ اور اس پر یہ اعتراض کہ اس طرح آپ کا اتفاقی اصول مخدوش ہو جاتا ہے کہ اللہ کا سارا کلام مرتبہ اور درجہ میں برابر ہے اور یہ حکمت کے ساتھ نازل کردہ ہے؟ یہ اعتراض بے بنیاد ہے کیونکہ کلام اللہ میں مساوات تو قرآن کی عمومی خصوصیات کے اعتبار سے ہے، جیسے قرآن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حق و حکمت کے ساتھ نازل ہونا، تلاوتِ کلام مجید کا امر تعبدی ہونا، قرآن کا سب سے چھوٹی سورت کے ذریعہ چیلنج دینا، مصاحف میں مکتوب ہونا، تواتر کے ساتھ منقول ہونا، جُنبی شخص کے لیے اس کا اٹھانا اور مَس کرنے کا حرام ہونا وغیرہ۔ ان خصوصیات میں قرآن کا مساوی ہونا اس شرف و امتیاز کے منافی نہیں ہے جو محکماتِ قرآنیہ کو حاصل ہے، بھلا ان میں منافات ہو بھی کیسے سکتا ہے، حالانکہ محکم اور متشابہ میں سے ہر ایک کے لیے حکمتیں اور خصائص ہیں۔

چنانچہ محکم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُم الکتاب کا درجہ رکھتا ہے، تمام متشابہات اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ اور متشابہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابتلاء و آزمائش کا معیار اور کسوٹی ہے، اور اجتہاد و مسابقت کا میدان ہے، اس کے علاوہ بھی بہت سے فوائد ہیں جو آپ کو پہلے معلوم ہو چکے ہیں، پھر ان میں منافات کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ قرآنِ حکیم تو اپنے احوال اور موضوعات کی وجہ سے مختلف ہے کہ اس کا ایک حصہ عقائد و احکام پر مشتمل ہے، ایک حصہ اوامر و نواہی پر مشتمل ہے، ایک حصہ عبادات و قصص اور پیشین گوئیوں پر مشتمل ہے، کہیں وعدہ و وعید کی آیات ہیں اور کہیں ناسخ و منسوخ پر مشتمل آیات ہیں، قرآن کے موضوعات و احوال بہت زیادہ ہیں اس کا ذکر طویل وقت کا متقاضی ہے۔ بہرکیف! قرآن کی انواع میں سے ہر نوع ایک مستقل خصوصیت کی حامل ہے جو دوسری نوع کے بالکل مغایر ہے، گو سارا قرآن اس امر میں مشترک درجہ رکھتا ہے کہ یہ تمام قرآن کے ہی اجزاء ہیں جو قرآنیت اور عمومی خصوصیات میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ محکم، متشابہ پر چند امور میں ممتاز درجہ رکھتا ہے اور چند دیگر امور میں اس کے مساوی ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی تعارض یا تضاد نہیں پایا جاتا، جس طرح انسان کے اعضائے جسم میں سے ہر عضو اپنی جگہ مستقل طور پر خصوصیت رکھتا ہے جس کی بناء پر وہ ایک عضو کہلاتا ہے، لیکن اس کے علاوہ ہر عضو دوسرے کے مساوی بھی ہے اس امر میں کہ وہ انسان کا جزو ہے اپنی عمومی خصوصیات میں جیسے حسن، حیات۔

چھٹا شبہ اور اس کا جواب ◎ ان کا اعتراض یہ بھی ہے کہ متشابہ کی بابت علمائے سلف و خلف کے مؤقف میں غور کیا جائے تو یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ بھی سب کے سب تاویل ہی کرتے ہیں، اس لئے کہ الفاظِ متشابہات کو ان کے ظواہر سے پھیرنے میں سب متفق ہیں، الفاظ کو ان کے ظواہر سے پھیرنا ہی تاویل کہلاتا ہے۔ جب وہ سب تاویل کرنے والے ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے ممنوع کردہ امر میں مبتلا ہوئے یعنی تاویل کر کے متشابہات کے درپے ہونا، اللہ تعالیٰ نے ان کا حال یہ بیان فرمایا ہے کہ ان کے دلوں میں کج روی (ٹیڑھا پن) ہے، فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ﴾ (آل عمران: ۷)۔

ہم اس شبہ کا اوّلاً جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ کہنا کہ متشابہ کی تاویل پر علمائے سلف و خلف کا اتفاق ہے، یہ بات ایک لحاظ سے درست ہے یعنی لغوی معنی کے اعتبار سے صحیح ہے۔ لیکن اصطلاحی معنی کے مطابق درست نہیں ہے، کیونکہ تاویل میں گو دونوں متفق ہیں

لیکن لفظ کو ظاہری معنی سے پھیرنے کے بعد اس کے معنی مراد کی تعیین میں ان کا آپس میں اختلاف ہے، علمائے سلف تو لفظ کو اپنے ظاہر سے پھیرنے کے بعد معنی مراد کی تعیین کی بجائے اس کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں اور علماء خلف اس کی تعیین کی نسبت تاویل کو اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ کہنا کہ اس طرح تمام علمائے سلف وخلف اللہ تعالیٰ کے ممنوع کردہ امر میں مبتلا ہو جاتے ہیں" یہ غلط بات ہے، اور ان کا مذکورہ آیت سے استدلال کرنا بھی فاسد ہے، کیونکہ اس آیت میں ایسی تاویل ممنوع قرار دی گئی ہے جو ناشی عن الزیغ ہو یعنی جس کا منشا خواہشِ نفس کی پیروی ہو، جس کا قرینہ یہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ﴾ ﴿زَیْغٌ﴾ اصل میں کہتے ہیں استقامت اور حجت کو چھوڑ کر خواہشِ نفس کی طرف مائل ہو جانا، لیکن جس تاویل کی بنیاد مستحکم براہینِ قاطعہ اور اتباعِ ہدایتِ راشدہ پر استوار ہو وہ اس ممانعت کے قبیل سے نہیں ہے، بھلا ایسی تاویل سے اللہ تعالیٰ ہمیں کیسے منع فرما سکتے ہیں، حالانکہ ضمناً اس کا ہمیں حکم دیا ہے کہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹانا واجب اور ضروری قرار دیا ہے، اس لیے کہ محکمات کو ام الکتاب قرار دیا ہے، جیسا کہ پہلے اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ مزید برآں یہ کہ ایسی درست تاویل کو ممنوع کیسے کیا جا سکتا ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مشہور حدیث میں ایسی تاویل کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو دُعا دیتے ہوئے فرمایا ہے:

((اللّٰھم فقھه فی الدین و علّمه التأویل)).

یعنی "اے اللہ! اسے دین کی سمجھ بوجھ بھی عطا فرما اور قرآن کی تاویل بھی سکھا دے۔"

اس شبہ سے خلاصی اس طرح حاصل ہوگی کہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں تاویل کی ایک نوع کی طرف ہماری راہ نمائی فرمائی یعنی جس کے ذریعہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹایا جائے اور تاویل کی ایک نوع سے منع فرمایا یعنی جس کا منشا خواہشِ نفس ہو جس تاویل کی بنیاد برہان و حجت پر ہو وہ ممنوع نہیں ہے۔ ممنوع وہ تاویل ہے جس سے مقصد فتنہ انگیزی اور ضلالت و گمراہی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ دونوں بالکل مختلف نوعیت کی اقسام ہیں، ایک کو دوسرے سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لفظ متشابہ کو اس کے ایسے ظاہری معنی سے نہ پھیرے جو تشبیہ یا محال کا وہم ڈالتا ہو وہ گمراہ ہے، جیسے فرقہ ظاہریہ اور مشبہہ۔ اور جو شخص لفظِ متشابہ کی ایسی تفسیر کرتا ہے جو حجت و برہان سے کوسوں دُور ہو اور اس کی تفسیر کی بنیاد کج روی اور بہتان پر ہو وہ بھی گمراہ ہے، جیسے فرقہ باطنیہ اور اسماعیلیہ۔ ان سب کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ وہ فتنہ انگیزی کی خاطر متشابہات کے درپے ہو رہے ہیں۔

لیکن جو لوگ متشابہ کی تاویل کرتے ہیں یعنی حجتِ قاطعہ کے ساتھ لفظ کو اس کے ظاہر سے پھیرتے ہیں، ان کا مقصد بھی اس سے فتنہ انگیزی نہ ہو بلکہ لوگوں کو اس سے منع کرنا اور دین کے معروف امور پر اُنہیں قائم رکھنا ہو اور ان کی کتاب اللہ کے محکمات اور واضح امور کی طرف راہ نمائی کرنا ہو تو ایسے لوگ یقیناً ہدایت یافتہ اور رہنما و رہبر ہیں۔ اُمت کے تمام ائمہ اور علماء سلف و خلف اسی طریق پر کاربند ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہنے لگا کہ: میں قرآن میں چند امور دیکھتا ہوں جو مجھ پر مشتبہ ہوتے جاتے ہیں! پوچھا کہ وہ کیا ہیں؟ اس شخص نے کہا کہ ایک جگہ فرمایا: ﴿فَلَآ اَنْسَابَ

بَیۡنَھُمۡ یَوۡمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴾ (المؤمنون:۱۰۱) اور ایک جگہ اس کے برخلاف فرمایا: ﴿ وَ اَقۡبَلَ بَعۡضُھُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ یَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴾ (الصافات:۲۷) اسی طرح ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ وَلَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا ﴾ (النساء:۴۲) اور دوسری جگہ اس کے مقابلے میں فرمایا ﴿ قَالُوۡا وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشۡرِکِیۡنَ ﴾ (الانعام:۲۳)۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ﴿ فَلَاۤ اَنۡسَابَ بَیۡنَھُمۡ ﴾ اور ﴿ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴾ کا تعلق نفحۂ اولیٰ سے ہے، پھر نفحۂ ثانیہ ہوگا تو اس کے بارے میں فرمایا ﴿ وَ اَقۡبَلَ بَعۡضُھُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ یَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴾ اور ﴿ وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشۡرِکِیۡنَ ﴾ کی وضاحت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مخلصین کے گناہ معاف فرما دیں گے تو مشرکین کہیں گے کہ آؤ ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے شرک نہیں کیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر ثبت کر دیں گے تو ان کے اعضاء و جوارح ان کے اعمال کے بارے میں بولنے لگیں گے، تو اس وقت کے بارے میں فرمایا ﴿ وَلَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا ﴾ یعنی پھر وہ کوئی بات چھپا نہ پائیں گے۔ (الحدیث)

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں سیدھا راستہ دکھائے، ہماری حفاظت بھی فرمائے۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمدن النبی الامی وعلی الہ وصحبہ وسلم۔ (آمین)

بحث ⑯

قرآنِ کریم کا اسلوب

اسلوب کا لغوی معنی

لغتِ عرب میں "اسلوب" کا لفظ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے:
① درختوں کے درمیان کا راستہ ② فن ③ چہرہ ④ مذہب ⑤ ناک کا چڑھانا اور مغرور ہونا ⑥ شیر کی گردن ⑦ متکلم کا طرز وطریق۔

ان معانی میں سے آخری معنی اصطلاحی معنی کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے، یا فن اور مذہب کا معنی بھی لیا جا سکتا ہے لیکن قید وشرط کے ساتھ۔

اسلوب کا اصطلاحی معنی

ادباء اور علمائے عربیت کا "اسلوب" کی اصطلاحی تعریف میں اس پر اتفاق ہے کہ: اسلوب، وہ طرزِ کلام ہے جسے متکلم اپنے کلام کی تالیف وترکیب اور الفاظ کے چناؤ میں اختیار کرتا ہے یا "اسلوب" وہ مذہبِ کلامی ہے جسے متکلم معانی کی ادائیگی اور اپنے کلام کے مقاصد کے حصول کے لیے منفرد ہو یا "اسلوب" کلام کا وہ طرز اور انداز ہے جس میں متکلم منفرد ہو۔

اسلوبِ قرآن کا معنی

بناء بریں اسلوبِ قرآن سے مراد اس کا وہ طرز ہے جس میں وہ اپنے الفاظ کے انتخاب اور کلام کی ترکیب میں منفرد ہو۔

یہ بات بھی قابلِ تعجب نہیں کہ قرآنِ کریم کا ایک ایسا اسلوب ہو جو اسی کے ساتھ مخصوص ہو کیونکہ ہر کلام کا خواہ انسانی ہو یا خُدائی ہو ایک اسلوب ہوتا ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے، متکلمین کے اسالیب اپنے شعری یا نثری کلام کو پیش کرنے میں متعدد ہوتے ہیں اشخاص کے تعدد کی وجہ سے، بلکہ بسا اوقات وہ اسالیب، موضوعات اور فنون کے تعدد کی بناء پر ایک ہی شخص کے لیے متعدد ہوتے ہیں۔ ہم آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرواتے ہیں کہ وہ مفردات اور مرکبات جن سے کلام مرکب ہوتا ہے، اسلوب اس کے مغایر چیز ہے، اسلوب اصل میں وہ طرز وطریق ہے جسے کوئی مؤلف اپنے کلام کے مفردات ومرکبات کے انتخاب میں اختیار کرتا ہے۔

یہ ہے اصل وہ نکتہ جس کی بناء پر اسالیب مختلف ہوتے ہیں متکلمین کے مختلف ہونے کی وجہ سے جو نثر یا نظم کی صورت میں اپنا کلام پیش کرتے ہیں، حالانکہ وہ مفردات جن کو تمام متکلمین استعمال کرتے ہیں وہ ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔

یہی وہ نکتہ اور راز ہے کہ اہلِ عرب اپنی عربی زبان کے جن مفردات ومرکبات اور عمومی قواعد سے واقف اور شناسا تھے، قرآن اس سے ہٹ کر نہیں آیا بلکہ اس پہلو کے اعتبار سے اہلِ عرب کے مانوس طریقے کے مطابق عربی زبان میں آیا، ان ہی حروف سے قرآن کے کلمات کی تالیف وترکیب ہوئی اور ان ہی کلمات سے قرآن کے جملے بنائے گئے، سارے قرآن کی تالیف اہلِ عرب

کے عام قواعد کے مطابق ہوئی کہ اس کے مفردات و مرکبات ان قواعد کے مطابق ڈھالے گئے، لیکن سب سے عجیب اور حیران کن بات یہ تھی کہ باوجودیکہ اہل عرب کے پاس یہ قرآن ان ہی کے مفردات و مرکبات کے مطابق آیا جن کو وہ بخوبی جانتے تھے بلکہ اس بارے میں اعلیٰ مقام اور بلند مرتبہ پر فائز تھے، مگر اس سب کے باوجود اس قرآن نے اپنے بے مثل اسلوب اور معجزانہ طرزِ کلام کے ذریعہ ان کو عاجز کر دیا اگر قرآن اہل عرب کے طریقے کے مطابق نہ آیا ہوتا تو ممکن تھا کہ ان کو کوئی عذر اور بہانہ مل جاتا اور طعن و تشنیع کا موقع ہاتھ آ جاتا۔ جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:

﴿وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْ لَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّ عَرَبِيٌّ ؕ﴾ (فصلت: ۴۴)

"اور اگر ہم اسے عجمی زبان کا قرآن بنا دیتے تو کہتے کہ اس کی آیتیں صاف صاف بیان کیوں نہیں کی گئیں، کیا عجمی کتاب اور عربی رسولؐ؟"۔

اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں اس قرآن کا ایک وصف "عربیت" بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ یوسف میں فرمایا:

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (یوسف: ۲)

"ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو"

نیز سورۃ الزخرف میں فرمایا:

﴿اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (الزخرف: ۳)

"ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا تاکہ تم سمجھ سکو۔"

اور سورۃ الزمر میں ارشاد ہے:

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (الزمر: ۲۸)

"یہ عربی قرآن ہے کجی والا نہیں ہے تاکہ یہ اللہ کی نافرمانی سے بچیں۔"

دو حسّی مثالیں چونکہ بعض لوگوں پر امور مشتبہ ہو جاتے ہیں جس سے وہ گمراہ ہونے لگتے ہیں، اس لیے ہم اسلوب اور مفردات و تراکیب میں دو حسّی مثالوں کے ذریعہ یہ فرق بیان کرتے ہیں: ایک مثال درزی کی صنعت اور دوسری مثال دوا سازی یا ادویہ سازی کی ہے۔

درزیوں کو لیجیے ان کا باہمی کس قدر اختلاف ہوتا ہے، کوئی تو اپنی صنعت میں بے عقل ہوتا ہے اور کوئی ہوشیار اور عقلمند ہوتا ہے، کوئی اپنے پیشہ میں ماہر ہوتا ہے اور کوئی اس میں کمزور ہوتا ہے۔ اب یہ درزیوں کا اختلاف سلے ہوئے کپڑوں کے اعتبار سے بھی نہیں ہے اور نہ ہی سلائی کے آلات اور اس کے طریقوں کے پہلو سے ہے جنہیں درزی استعمال کرتے ہیں، بلکہ ان کا یہ اختلاف اس خاص طرز و طریقے کی بناء پر ہے جسے کپڑوں کے جوڑنے بنانے کے لیے اپنایا گیا ہے۔ نیز اس صنعت کے اصول و قواعد کی وجہ سے ہے جنہیں اختیار کر کے کپڑوں کی شکل و صورت تیار کی جاتی ہے۔

اسی طرح دوا ساز بھی عقلمندی، بے عقلی، مہارت اور نالائقی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ادویات کے

عناصر یا دوا سازی کے فنی قواعد کی حیثیت سے ان میں اختلاف نہیں ہوتا، بلکہ ان ادویات کے تیار کرنے میں مقررہ اصول وقواعد کے پورا پورا خیال رکھنے اور عناصر کے حسنِ انتخاب کی حیثیت سے اختلاف ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہم کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان ادویات میں عمدہ دوا کا مزاج، اثر اور نفع اس دوا کے مقابلے میں بالکل مختلف اور جداگانہ ہوتا جو ردی قسم کی ہو، اثر انگیز بھی نہ ہو مفید ہونے کی بجائے مضر ہو۔

آپ کے گرد و پیش بہت سی صنعتیں ہوں گی جن کے صنعت کار اور ان کی مصنوعات جودت اور رداءت میں مختلف ہوں گی، جبکہ صنعت کے مواد وعناصر اور عام قواعد سب میں یکساں ہوتے ہیں۔

یہی صورتِ حال ہوتی ہے کسی بھی زبان کے لغوی بیان کی کہ وہ بھی ایک صنعت اور حرفت کی مانند ہے، کہ اس کے اصول و قواعد اور مواد وعناصر تو ایک جیسے ہوتے ہیں جن کا مفردات اور مرکبات میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود طرق واسالیب کے مختلف ہونے کے سبب بیان مختلف ہوتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس مسئلہ کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ: ذوق اور صلاحیت جو ان مفردات ومرکبات کا چناؤ کرتے ہیں، ان کے مختلف ہونے کے سبب بیان وکلام مختلف ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ آپ دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات اہلِ لغت اپنی ایک ہی غرض کو مختلف وجوہ سے بیان کر لیتے ہیں خواہ اس کا تعلق مفردات سے ہو یا مرکبات سے۔ انہوں نے لغت کا مواد افراد وترکیب کے اعتبار سے اختیار کرنے میں جو طرز وطریق اپنایا وہ جس قدر مختلف ہوگا اسی قدر ان کے کلام میں جودت ورداءت، حسن وقباحت اور قبول ورد کا تفاوت پایا جائے گا۔ علاوہ ازیں اس طرزِ کلام میں جس قدر انہوں نے مناسبات کا اعتبار کیا ہوگا اسی قدر اس کلام کا وزن ہوگا۔

چنانچہ جب متکلم کا ذوق، ذوقِ سلیم ہو اور اس کا حاسۂ بیانیہ بھی اعلیٰ اور بلند ہو تو اس کا انتخاب بھی خوب ہوگا اور کلام بھی بلندی پر فائز ہوگا کہ مخاطب کے دل ودماغ پر اپنی تاثیر ڈالے گا۔ اسی طرح جب متکلم کا ذوق، فاسد ہو اور اس کا حاسۂ بیانیہ بھی درجے میں کمتر ہو تو اس کا انتخاب بھی برا ہوگا اور اس کا کلام بلاغت کے اعتبار سے بھی ایسی پستی کا شکار ہوگا کہ مخاطب اس کو سننے سے گھِن کھائے گا اور اس کی سمع خراشی ہوگی، بلکہ بسا اوقات متکلم شاعر کا یہ شعر پڑھتا ہوا راہِ فرار اختیار کرے گا۔ ؎

عوی الذئب فاستأنست بالذئب إذعوی
وصوّت انسانٌ فکدت أطیر

عربی زبان میں اس کی توضیح

ہماری محبوب عربی زبان میں اس امر کی توضیح اس طرح ہے کہ عربی زبان کے بعض مفردات تو ایسے ہیں کہ طبیعتیں ان سے مانوس ہوتی ہیں اور بعض متنافر اور بعض اپنی مراد پر واضح اور مانوس الاستعمال ہوتے ہیں، اور کچھ مفردات قوتِ سماعت پر خفیف اور ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور کچھ اس کے بالمقابل ثقیل قابلِ کراہت ہوتے ہیں کہ ان کو سن کر سمع خراشی سی ہونے لگتی ہے اور بعض مفردات، لغت کے قواعد کے موافق اور بعض مخالف ہوتے ہیں، پھر علاوہ ازیں کچھ مفردات عام اور کچھ خاص ہوتے ہیں، بعض مطلق اور بعض مقید ہوتے ہیں، اور کچھ مجمل اور کچھ مبین ہوتے ہیں، اسی طرح بعض مفردات معروف تو بعض منکر ہوتے ہیں اور بعض اسم ظاہر اور بعض اسم ضمیر ہوتے ہیں اور اسی طرح کچھ تو حقیقت اور کچھ مجاز ہوتے ہیں

یہی صورتِ حال عربی زبان کے مرکبات کی ہے کہ بعض مرکبات حقیقت اور بعض مجاز ہوتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے کلمات مانوس ہوتے ہیں اور کچھ کے متنافر ہوتے ہیں، اسی طرح بعض مرکبات کے معانی واضح الدلالت ہوتے ہیں اور بعض کے معانی میں تعقید اور پیچیدگی ہوتی ہے، اسی طرح کچھ مرکبات ایسے ہوتے ہیں کہ جو قیاسِ لغوی کے موافق ہوتے ہیں اور کوئی اس کے مخالف ہوتے ہیں۔

پھر ان میں اسمیت، فعلیت، خبریت، انشائیت، نفی و اثبات، ایجاز و اطناب، تقدیم و تاخیر فصل اور وصل وغیرہ کئی امور پائے جاتے ہیں جس کی تفصیل علومِ لغت اور کتبِ لغت میں بیان ہوتی ہے۔ مذکورہ انواع وغیرہ جن کی معروف لغت سے تائید ہوتی ہے یہی وہ عام طریقہ ہے جسے متکلمین اپنی اغراض و مقاصد کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ لیکن ان انواع میں سے کوئی نوع ایسی نہیں ہے کہ جس کا استعمال مطلقاً اچھا یا بُرا ہو یعنی تمام احوال و مقامات میں یکساں ہو، بلکہ ہر موقع اور مقام کے لئے ایک خاص کلام ہوتا ہے۔ ایک ہی چیز ایک موقع پر اچھی اور دوسرے موقع پر بُری ہوتی ہے، ایک ہی چیز ایک جگہ لانا ضروری اور وہی چیز دوسری جگہ لانا ممتنع ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بلاغت کی طرفِ اعلیٰ تک رسائی بالکل آسان امر ہو جاتا اور لوگوں کا کلام بھی ایک ہی نوع اور رنگ کا ہو جاتا، لیکن حقیقتِ امر یہ ہے کہ احوال اور مقامات کے مناسب انواع کلام میں کسی نوع کا انتخاب کرنا ہوتا ہے، ظاہر ہے ذہین شخص کو مخاطب بنانے کا مقام اور ہوگا اور غبی اور نابلد شخص کو مخاطب بنانے کا مقام اور ہوگا، عقائد کا موضوع جس میں لوگوں کے اندر جوش و ولولہ پیدا کیا جاتا ہے اس کا مقام قصص و واقعات کے مقام سے مغایر ہوگا۔ اسی طرح جو میدان اور مقام جدل اور مخاصمت کا ہوگا وہ اس میدان و مقام سے جداگانہ ہوگا جو تعلیم و تہذیب کا ہوگا۔ اسی طرح وعدہ و بشارت کی زبان و لہجہ مختلف ہوگا وعید اور انذار کے مقابلے میں۔ وغیرہ ذالک، مگر ان مناسبات اور مواقع کا انتخاب اور لحاظ رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ بسا اوقات مخاطبین کے تمام احوال کا احاطہ کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ کبھی ایک ہی لفظ کا ایک جگہ استعمال چمکتے روشن ستارے کی طرح ہوتا ہے لیکن وہی لفظ دوسری جگہ لایا جائے تو تاریک سیاہ نکتہ کی مانند ہوتا ہے، کلمہ واؤ اور کلمہ فا دونوں حرفِ عطف ہیں، لیکن ان میں کچھ دقیق قسم کے فرق ہیں جنہیں علماء نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مستنبط کیا ہے۔

علماءِ سابقین میں سے ایک خطیب اسکافی (۴۱۲م) بھی ہیں، وہ اپنی کتاب "درۃ التنزیل وغرۃ التأویل" میں اسی استنباط کے سلسلہ میں لکھتے ہیں اور وہاں ایک مثال ذکر کرتے ہیں جس کا ہماری گفتگو سے تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادِ عالی ﴿وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ﴾ (البقرہ:۵۸) میں لفظ ﴿كُلُوْا﴾ میں فاء کا استعمال ہوا ہے، اور دوسری جگہ پر اس لفظ ﴿كُلُوْا﴾ کے ساتھ فاء کی بجائے کلمہ واؤ کا استعمال ہوا ہے فرمایا: ﴿وَ اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ﴾ (الاعراف:۱۶۱) امام اسکافی رحمہ اللہ دونوں جگہ تعبیر کا اسلوب جداگانہ ہونے کی حکمت بیان کرتے ہیں، حالانکہ دونوں جگہ قصہ ایک ہی بیان ہو رہا ہے اور حرفِ واؤ اور فاء کا مدخول بھی ایک ہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "قاعدہ یہ ہے کہ ہر وہ فعل جس پر ایک ایسی چیز کا عطف کیا گیا ہو جس کا اس سے ایسا تعلق ہو جیسا جواب کا ابتداء کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور اوّل، ثانی کے لئے شرط و جزا کے معنی میں ہو تو وہاں ثانی کا اوّل پر عطف فاء کے ذریعہ لانا اصل ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا﴾ (البقرہ:۵۸) کیونکہ یہاں پر اکل کا وجود دخول سے متعلق ہے اور دخول کا تعلق اکل سے ہے۔ لہٰذا اکل کا وجود اس کے وجود سے مشروط اور معلق ہوا اس لیے فاء کے

ذریعہ عطف لایا گیا ہے۔ جبکہ اس کے برخلاف اس آیت کریمہ ﴿وَ اِذۡ قِیۡلَ لَہُمُ اسۡکُنُوۡا ہٰذِہِ الۡقَرۡیَۃَ وَ کُلُوۡا ...﴾ (الاعراف:۱۶۱) میں "سکنیٰ" طویل عرصہ کے لیے ٹھہرنے کے ساتھ کسی جگہ قیام کرنے کے معنی میں آتا ہے، یہاں "اکل" کا وجود اس سکنیٰ کے وجود کے ساتھ مختص نہیں ہے، کیونکہ جب کوئی شخص کسی باغ میں داخل ہوتا ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ وہاں سے گزرتے ہوئے کھالیتا ہے، لہٰذا جب امر ثانی کا اوّل کے ساتھ ایسا تعلق نہیں ہے جیسا جواب کا ابتداء کے ساتھ ہوتا ہے تو یہاں فاء کی بجائے واؤ کے ساتھ عطف لانا ضروری ہوا۔

انسانی قوتوں کا متفاوت ہونا

جن احوال و مناسبات سے ہم شناسائی رکھتے ہیں ان کی بابت انسانی قوتیں اور قدرتیں بہت مختلف اور متفاوت ہوتی ہیں۔ میدانِ انتخاب بڑا وسیع اور کشادہ ہے، مفردات اور مرکبات کی متفرق صورتوں اور انواع سے بھرپور ہے، ایک انسان کی قدرت سے یہ بات باہر ہے کہ وہ ان تمام انواع و صور کو پیش کر سکے، اور ان متقاضی احوال و مناسبات کی روشنی میں اپنے حسنِ انتخاب کی خاطر ان انواع کے جانچنے اور انہیں تولنے کے لیے کوئی دقیق قسم کی میزان قائم کر سکے۔ کیونکہ اس کا میدان بہت ہی وسیع ہے، کبھی تو ایک متکلم اس سے بہرہ یاب ہو جاتا اور کبھی اس سے غفلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک لکھاری کبھی تو اس کے لئے بیدار ہوتا ہے اور کبھی غافل رہ جاتا ہے، اسی طرح ایک شاعر کبھی تو اس کا ادراک کر پاتا ہے اور کبھی نہیں کر پاتا، بلکہ ایک ہی انسان کبھی تو ایک جگہ پر اس کا ادراک کر لیتا ہے اور اس کے سوا دوسری جگہ پر اس سے وہ بات چوک جاتی ہے۔

ہمارا مقصد یہاں پر ان تمام احوال و مناسبات کا احاطہ کرنا نہیں ہے اور نہ ہی ہر حال اور اس کے مناسب امر کی مثالیں اور شواہد پیش کرنا ہے کیونکہ اس کا موقع علومِ لغت اور کتبِ لغت ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے۔ بلکہ ہمارا یہاں پر مقصد یہ ہے کہ آپ کے سامنے یہ بات پیش کریں کہ اسلوب، جو کسی بھی کلامِ بلیغ کا ہو، اس کا معنی ہوتا ہے اس کلام کی فنی صورت یا خاص طرز و انداز یا اس کا شخصی مزاج جو کہ کلام میں جملہ احوال و مناسبات کی رعایت رکھ کر تیار ہوتا ہے، کلام کے اسالیب جس قدر احوال و مناسبات کو حاوی ہوں گے اسی قدر کلام میں بلندی یا پستی کے اعتبار سے بلاغت کے درجات پائے جائیں گے، اور اسی قدر وہ کلام قبول یا رَد میں سے حصہ پائے گا۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو بلاغت کے مرتبہ اعلیٰ اور اعجاز کی بلندی پر کوئی بھی کلام قرآنِ کریم کے سوا فائز نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے کہ اس کتاب کا موجد وہ وحدہٗ لاشریک ذات ہے جس کا ارادہ ہوا کہ یہ قرآن، پیغمبرِ اسلام ﷺ کے لیے اس طرز و اسلوب اور اس حکمت کے سبب معجزہ قرار پائے جس کی ہم تشریح پہلے کر چکے ہیں اور کچھ آئندہ صفحات میں پیش کریں گے۔ نیز اس لیے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی مخلوق کے تمام احوال کا احاطہ کرنے پر قدرت رکھتی ہے، وہی ذات اس بات پر قادر ہے کہ وہ اپنے کلام میں ان تمام مناسبات کو ملحوظ رکھے کہ وہ احوالِ کثیرہ جن کا تقاضا کرتے ہیں جن کا احاطہ اس ذات کے سوا نہ کبھی کوئی کر سکا ہے اور نہ آئندہ کر سکے گا۔ بھلا کون اس بات کی طاقت رکھتا ہے کہ مخلوق کے تمام احوال کا احاطہ کر لے جبکہ ان احوال میں مخفی امور بھی ہوتے ہیں جنہیں اس ذات کے سوا کوئی نہیں جانتا جو پوشیدہ اور علانیہ تمام امور سے باخبر ہے! پھر کون طاقت رکھتا ہے کہ وہ مخلوق کے تمام احوال کا احاطہ کر سکے، حالاں کہ مخلوق متعدد نسلوں میں تقسیم ہے، کچھ لوگ نزولِ قرآن کے وقت ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، نزولِ قرآن کو دسیوں صدیاں بیت گئیں ایسے بھی لوگ ہیں جن سے کوئی شناسائی ہی نہیں ہے۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ کتاب اللہ،

تاقیامت رہنے والی کتاب ہے، جو تمام نسلوں اور قوموں سے خطاب کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو زمین کا اور اس پر بسنے والوں کا وارث اور مالک بنا دیں۔

لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ قرآن، قوموں اور نسلوں کے اختلاف کے باوجود ان کے مناسب تمام احوال کو متضمن ہے جن کی ان کو حاجت پیش آتی ہے۔ اب یہ بات اس ذات کے سوا کسی کی قدرت اور طاقت میں نہیں جو مخلوق کے تمام سربستہ رازوں اور آسمان و زمین میں پوشیدہ تمام چیزوں تک سے واقف ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الفرقان:۶)

اسی طرح فرمایا:

﴿تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰی ؁ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ۝ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰی ۝﴾ (طٰہٰ:۴-۶)

ہماری مذکورہ بات پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ہم قرآنِ حکیم کے بہت سے الفاظ میں یہ بات دیکھتے ہیں کہ ان الفاظ کا چناؤ ایسا کیا گیا ہے کہ اس سے وجہ اعجاز نمایاں طور پر سامنے آتا ہے، اور یہ وہی الفاظ ہیں کہ نزولِ قرآن کے زمانہ سے لے کر آج تک صدیاں ان میں بیت گئیں اور کئی نسلیں اور قومیں گزر گئیں ہیں، اور پھر ان قوموں اور نسلوں میں بعض ایسی تھیں جو ان الفاظ قرآنی کو اپنے ذوق، فکر اور معلومات کے مناسب سمجھتی رہیں اور بعض دیگر اقوام بعینہٖ ان ہی الفاظ کے کچھ اور مفہوم سمجھتی ہیں جو دوسروں سے مختلف ہیں، اگر بالفرض قرآن کے الفاظ کو دوسرے الفاظ سے تبدیل کر دیا جائے تو قرآن، تمام قسم کے لوگوں سے خطاب کرنے کے لائق نہ ہو سکے گا۔ اور پھر اس قرآن کو عالمگیر اور سروری دین کی کتاب کہنا اور ہر دور اور ہر زمانہ کا انسانی دستور کہنا قابلِ اعتراض ہو جائے گا۔

سبحان اللہ! دیکھئے اللہ تعالیٰ نے ایسی کتاب اتاری جو تمام لوگوں کی حاجات کو پورا کرتی ہے اور تمام نسلوں کے تجربات کا جواب، تمام انسانوں کے ذوق کے ملائم و مناسب اور تمام انسانی معارف کو حاوی ہے جس سے یہ بات واشگاف انداز میں معلوم ہوتی ہے کہ یہ اللہ وحدہٗ لاشریک کا کلام ہے، اسی نے اس کو اُتارا ہے، فرشتے اس وقت حاضر اور موجود تھے۔ ﴿وَ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾

اب ہم کسی اور موقع پر اس طرح کی گفتگو کا اعادہ کریں گے اور اس میدان میں مزید جولانی دکھانے سے اپنے قلم کو روک لیتے ہیں، اور اسلوب قرآن کا دوبارہ ذکر کرتے ہیں، اور اسلوب قرآن کے چند امتیازات وخصائص بیان کرتے ہیں جن کی وجہ سے قرآن منفرد حیثیت رکھتا ہے، اور یہ خصائص ہی حقیقت میں قرآن کے لغوی یا بلاغی یا اسلوبی اعجاز کا اصل راز ہے۔

اسلوبِ قرآن کے خصائص

جن خصوصیات کے سبب قرآن کا اسلوب امتیازی شان رکھتا ہے اور اس کے وہ اوصاف وامتیازات جو اس میں کثرت سے موجود ہیں، اس چیز نے اس قرآن حکیم کو اپنی زبان اور بلاغت میں معجزانہ کلام بنا دیا ہے، علماء نے بھی ان خصائص کو کم وبیش بیان کیا ہے، لیکن اس میدان میں رنج ومحنت اور تلاش بسیار کے باوجود وہ بھی اتنا ہی اضافہ کر سکے ہیں کہ وہ علماء خود معترف ہیں کہ وہ دریا کا ایک قطرہ ہی یا کثیر چیز سے بہت قلیل چیز ہی پیش کر سکے ہیں اس کا حق ادا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ جو بات ان پر ظاہر ہوئی وہ بس ذکر کر دی ہے اس سے کہیں زیادہ

امور ان سے مخفی رہے ہیں، اس سے زیادہ کوئی اضافہ نہیں کر سکے ہیں کہ بیان و فصاحت کے لیے از نوع تمثیل ایک بعید چیز کو ہمارے کچھ قریب کر دیا ہے، باقی رہا قرآنی اسلوب کے امتیازات و خصائص کا مکمل طور پر احاطہ تو یہ ایک ایسا امر ہے کہ جو اس ذات کے ساتھ خاص ہے جس کے پاس کتاب اللہ کا پورا علم ہے۔

چنانچہ ہم یہاں پر بطورِ تمثیل و تقریب کے چند ایک خصائص اسلوب قرآن کے ذکر کیے دیتے ہیں کیونکہ کہتے ہیں، اگر کسی چیز کا مکمل ادراک نہ ہو سکے تو کم از کم تو ضرور حاصل کرنا چاہیے بالکل ترک نہیں کرنا چاہیے۔

پہلی خصوصیت

① قرآن کریم کی لفظی تاثیر، یہ تاثیر بڑی سحر انگیز اور عجیب ہوتی ہے اس سے قرآن کا صوتی نظام اور لغوی حسن و جمال نمایاں ہوتا ہے۔

قرآن کے صوتی نظام سے ہماری مراد یہ ہے کہ قرآن، اپنی حرکات، سکنات، مدّات، غنات، اتصالات اور سکتات میں حیرت انگیز اور شاندار قسم کی ترتیب اور ترکیب کا حامل ہے کہ کانوں اور دلوں کو اپنی طرف اس طرح سے متوجہ کرتا ہے کہ کوئی اور کلام خواہ منظوم ہو یا منثور، اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ جو بھی شخص قرآن کے نظام صوتی پر توجہ دے گا جبکہ سادہ انداز میں اور حروف و کلمات سے خالی ہو تو سامع کو ایسا لگے گا جیسے وہ قاری و مجود سے دور بیٹھا ہے کہ اس کے کانوں تک اس کے حروف و کلمات اس طرح نہیں پہنچ رہے ہیں کہ وہ ان میں امتیاز کر سکے بلکہ محض مدات، غنات، حرکات، سکنات، اتصالات اور سکتات سے مرکب سادہ آواز ہے، ہم کہتے ہیں کہ جو شخص قرآن کے اس سادہ صوتی نظام پر کان دھرتا ہے، وہ خواہ عجمی ہو، عربی زبان سے واقف نہ ہو، وہ اپنے دل میں یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ ایک حیران کن نغمے اور ترنم کے روبرو کھڑا ہے جو اپنے حسن و جمال میں تمام قسم کے موسیقی سروں اور شعری ترنم سے فائق ہے۔ اس لیے کہ موسیقی کے نغمہ جات اور اس کی سُریں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہوتی ہیں کہ انسان کی طبیعت اور قوت سماعت اسے مسلسل اور برابر سننے سے اکتاہٹ محسوس کرتی ہے۔

اسی طرح کلام منظوم میں اوزان کی یکسانیت ہوتی ہے، اور ایک ہی قصیدہ خواہ کتنا ہی طویل ہو اس میں قوافی بھی ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں، ایک ہی ڈھنگ پر ہونے کی وجہ سے سامع بوریت کا شکار ہونے لگتا ہے۔

جبکہ قرآنی ترنم ایسا ہے کہ اس سے انسان کبھی اکتاتا نہیں، بور نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس میں ہمیشہ مختلف اوضاع پر نئے سے نئے نغمہ جات اور نوع بہ نوع طرز وادا بدلتے رہتے ہیں کہ ان میں سے ہر وضع، دلوں کے تار کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

یہ وہ صوتی حسن و جمال یا نظام ہے جس سے نزول قرآن کے ایام میں عرب کے کانوں نے پہلے پہل محسوس کیا، جس منثور کلام سے وہ واقف تھے اس میں اس جیسا کلام انہوں نے کبھی پایا ہی نہیں تھا، خواہ وہ نثر مرسل ہو یا نثر مسجع۔ یہاں تک کہ اہل عرب کو قرآن کی بہ نسبت یہ خیال ہوا کہ شاید کوئی شعری کلام ہے؟ کیونکہ انہیں اس کی نغمہ سرائی اور ترنمات میں لذت اور لطف محسوس ہوتا تھا۔ جو انہیں جھنجوڑتا تھا، وہ اس طرح کی چیز اشعار میں پاتے تھے۔ لیکن بہت جلد انہیں پتہ چل گیا کہ ان کا خیال غلط تھا۔

حتیٰ کہ ان کے ایک شاعر ولید بن مغیرہ نے کہا کہ یہ کلام شعر نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ قرآن، شعر کے عروض پر مبنی نہیں ہے، نہ رجز میں اور نہ قصیدہ ہیں۔ مگر وہ فحش غلطی میں مبتلا ہوا کہ ضد اور عناد کی وجہ سے اسے سحر گمان کر لیا، اس لیے کہ اس میں نثر کا جلال

وہیبت اور نظم کا جمال وحسن جمع ہے، یعنی نثر وشعر کی قیود واوزان سے آزاد ہے، اور یہ سب کچھ انسانی قدرت کی حد متعارف سے فروتر ہے۔ اگر یہ لوگ انصاف سے کام لیتے تو سمجھ لیتے کہ یہ کلام منثور ہے، لیکن ایسا معجز کہ اس جیسا کوئی کلام نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ ایسی متکلم ذات سے صادر ہوا ہے کہ اس کے مثل کوئی نہیں، اور یہ قرآن نہ شعر ہے اور نہ سحر، کیونکہ شعری کلام میں قافیہ بندی، اوزان اور اصول وقوانین کی پابندی ہوتی ہے جن سے اہل عرب خوب واقف تھے، اور قرآن کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا، اور سحر نام ہے چند ایسے بُرے اعمال کے مجموعہ کا کہ جن کا صدور خبیث انسان سے ہی ممکن ہے۔

قریش کے لوگ، حضور ﷺ کے دل کی پاکیزگی اور بلندی کے بارے میں دوسروں سے زیادہ واقف تھے، وہ آپ ﷺ کی سیرت وکردار سے سب سے زیادہ واقف کار تھے کہ آنحضور ﷺ نے ان ہی کے اندر پرورش پائی تھی اور ان ہی میں رہ کر جوان رعنا ہوئے تھے۔ یہ سب چیزیں بتا رہی تھیں کہ سارا قرآن ایک پاکیزہ دعوت کے سوا کچھ نہیں ہے جو پاکیزہ مقاصد کے لیے دی جا رہی ہے، اس میں خبث ورجس کا کوئی عمل ودخل نہیں ہے، بلکہ یہ قرآنی دعوت، سحر اور خبث ورجس سے مقابلہ کرتی ہے اور اسے کفر قرار دیتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۰۲)

مزید برآں کہ سحر کے مقدمات اور وسائل تو معروف ہیں، سب ان سے واقف تھے۔ لہٰذا وہ معجز نہیں ہوسکتا، قرآن جیسا کلام کبھی بھی لانا ممکن نہیں رہا اور نہ کبھی ممکن ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: (ایک مرتبہ) ولید بن مغیرہ، رسول ﷺ کے پاس آئے تو جب آنحضور ﷺ نے اسے قرآن پڑھ کر سنایا تو اس کا دل کچھ نرم سا ہوگیا، یہ بات ابوجہل کو پتہ چلی تو وہ ولید کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا کہ: اے چچا! تیری قوم کی یہ رائے بنی ہے کہ وہ تجھے دینے کے لیے کچھ مال جمع کرے، کیونکہ آپ محمد ﷺ کے پاس گئے تھے تا کہ ان کی قبول کردہ چیز میں سے کچھ حاصل کریں۔ ولید نے کہا: قریش کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے پاس سب سے زیادہ مال ہے، ابوجہل نے کہا: پھر آپ ان (محمد ﷺ) کے بارے میں ایسی بات کہہ دیں جس سے آپ کی قوم کو معلوم ہو کہ آپ ان کے منکر ہیں اور ان کو ناپسند کرتے ہیں۔ ولید کہنے لگے کہ: میں کیا بات کہوں! اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی شخص بھی مجھ سے زیادہ شعر، رجز، قصیدے اور جنات کے اشعار کو جاننے والا نہیں ہے، قسم ہے اللہ کی! محمد ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ ان میں سے کسی چیز سے بھی مشابہت نہیں رکھتا۔

خدا کی قسم! اس کلام میں بلا کی شیرینی اور حسن ورونق ہے، اس کا اوپر والا حصّہ پھل دار اور نچلا حصّہ سرسبز وشاداب ہے، وہ غالب ہی رہے گا کبھی مغلوب نہ ہوگا، اور یقیناً وہ کلام ان چیزوں کو کچل کر رکھ دے گا جو اس کے نیچے آئیں گی۔ ابوجہل ولید سے کہنے لگے کہ: آپ کی قوم اس وقت تک آپ سے راضی نہیں ہوگی جب تک کہ آپ ان کے بارے میں نازیبا کلمات نہیں کہہ دیں گے۔ ولید نے جواب دیا کہ مجھے کچھ سوچنے دو! جب اس نے سوچا تو کہنے لگا کہ! یہ ایک سحر اور جادو ہے جو دوسروں سے چلا آرہا ہے۔ اسی کے متعلق یہ آیات اُتریں:

﴿ذَرْنِیْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًاۙ وَّ جَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًاۙ وَّ بَنِیْنَ شُهُوْدًاۙ وَّ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًاۙ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَۗۙ كَلَّاؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًاؕ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًاؕ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَۙ فَقُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَۙ ثُمَّ قُتِلَ كَیْفَ قَدَّرَۙ ثُمَّ نَظَرَۙ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَۙ ثُمَّ اَدْبَرَ وَ اسْتَكْبَرَۙ فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِؕ﴾ (المدثر:۱۱-۲۵)①

غور کریں کہ جب اس (ولید) نے عربی زبان کی فطری ہدایت اور اس کی اصل طبیعت پر اپنے آپ کو آزاد چھوڑا تو اس کلام نے کیسا منصفانہ فیصلہ کر دکھایا جبکہ وہ ایک لمحہ کے لیے اپنے کفر اور ضد و عناد سے دور رہا۔

اس نے اعتراف کیا کہ: خدا کی قسم! آنحضور ﷺ کا پیش کردہ کلام سحر وغیرہ سے مشابہت نہیں رکھتا، پھر اس نے کہا کہ وہ اپنے پاؤں کے نیچے آنے والی تمام چیزوں کو پاش پاش کر دے گا۔ پھر مزید غور کریں کہ جب اس کی بدبختی اس پر غالب آئی اور تعصب اور عناد کا شکار ہوا تو اس نے اپنی فطرت سے ہی کیسے مقابلہ بازی کی اور خود کو اپنے شعور اور وجدان کی مخالفت پر مجبور کیا!

اور پھر وہ بات کہی جو اس نے کہی۔ جس کی بدولت اس نے پوری طرح کی گمراہی اور سرگردانی اپنے سر لے لی، قرآن حکیم اسی مقابلہ بازی، حیرانی و سرگردانی اور جبر واکراہ کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَۙ﴾ (المدثر:۱۸)

ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل وکرم کے ذریعہ حفاظت وہدایت کے طلبگار ہیں۔ (آمین)

② اور قرآن کے لغوی جمال سے ہماری مراد اس کی وہ عجیب کیفیت ہے جس کے ذریعہ قرآن، اپنے حروف کے بیان اور کلمات کی لوگوں میں رائج شدہ تراتیب میں سب سے عمدہ ترتیب رکھنے کی وجہ سے امتیازی مقام رکھتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ قرآن کے حروف کو اپنے درست مخارج سے نکلتے ہوئے سماعت کریں گے تو آپ کو عمدہ لذت محسوس ہوگی کہ کس طرح ان کلمات و آیات میں حروف ایک دوسرے سے مرکب ہیں کہ کوئی حرف سیٹی کی آواز دے رہا ہے، اور کسی میں اخفاء ہے اور کسی میں اظہار، کوئی مہموسہ ہے تو کوئی مجہورہ وغیرہ۔

جیسا کہ علم تجوید کے باب مخارج وصفات حروف میں اس کے قواعد بیان کیے جاتے ہیں۔

یوں قرآن مجید کا لغوی جمال آپ پر منکشف ہوگا کہ جب یہ قرآن کریم اس لین وشدت، خشونت ورقت اور جہر واخفاء وغیرہ۔ سے مرکب مختلف انواع کے مجموعے کی صورت میں لوگوں کے سامنے آئے گا اور اسے پائیدار اور بلیغ انداز میں پیش کیا جائے گا کہ آپ ہر ہر حرف اور اس کے مقابل صفات کو ایک میزان میں رکھ کر ایک مجموعہ کلام ترکیب دے کہ اسے لفظی سانچے میں ڈھالیں گے جو حیرت انگیز بھی ہو اور اس کی سطحی صورت ایسی دل کش ہو کہ اس میں بداوت کی سی فصاحت اور حضارت کی سی رقت کا حسین امتزاج ہو جو ہر طرح کی خشونت اور تلون سے خالی ہو۔ اور اس طرح وہ بآسانی عرب کے قبائل کے ہاں باوجود یکہ ان کے ذوق مختلف تھے، قبولیت حاصل کر لے۔

یہ لغوی حسن وجمال اعجاز کی چوٹی تک پہنچ چکا ہے، بایں طور کہ اگر اس قرآن میں لوگوں کے کلام میں سے کوئی چیز داخل ہو جائے تو اس کا لطف اس کے قارئین کے منہ میں کرکرا ہو جائے گا، اور اس کا یہ نظام اس کے سامعین کے کانوں میں ابتر ہو جائے گا۔

① رواہ الحاکم وقال: صحیح علی شرط البخاری

اس لغوی جمال اور صوتی نظام کے عجائب میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ یہ دونوں جس طرح ایک پہلو سے اعجاز کی دلیل ہیں تو دوسرے پہلو سے حفاظت قرآن کے لیے مضبوط چار دیواری کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لغوی جمال اور صوتی نظام کی شان یہ ہے کہ وہ کانوں کو اپنی طرف متوجہ، بیداری کو برانگیختہ اور ہر انسان کے اندر رجوع الی القرآن کے داعیہ اور جذبہ کو ابھارتا ہے۔ اسی لیے وہ مخلوق کی زبانوں اور ان کے کانوں پر ہمیشہ کے لیے باقی اور قائم رہے گا۔ اور وہ لوگوں کے درمیان اپنی ذات اور خصوصیات سے پہچانا جائے گا، لہٰذا کوئی شخص بھی اس میں تغیر وتبدیلی کی جرأت نہیں کرسکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝﴾ (الحجر:۹)

"ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

دوسری خصوصیت

قرآن حکیم کا ہر عام وخاص کو مطمئن کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ عام لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت کرتے ہیں یا ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ اس کی عظمت اور شان وشوکت کا احساس وادراک کرتے ہیں اور اس کی حلاوت وشیرینی کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی استعداد کے مطابق اس کا فہم حاصل کرتے ہیں جس سے ان کے اذہان اور جذبات مطمئن ہوتے ہیں۔

یہی حال خواص کا ہے کہ جب وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں یا ان کے سامنے وہ پڑھا جاتا ہے تو وہ بھی اس کی عظمت کو محسوس کرتے ہیں اور اس کی حلاوت سے لطف واندوز ہوتے ہیں اور عوام سے بڑھ کر اس کا فہم حاصل کرتے ہیں۔ اور انہیں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کے سامنے ایسا کلام ہے کہ اس جیسا کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ جیسا یہ کلام اپنے طرز اور انداز میں حسین اور خوبصورت ہے ایسا کوئی اور نہیں ہوسکتا، کوئی کلام بشر بھی اس جیسا نہیں ہوسکتا کہ اگر اس سے ذہین لوگ اور خواص مطمئن ہوں کہ اس میں بڑی ندرت، مجازیت اور استعارات واشارات پائے جارہے ہیں تو عوام کے لیے قابل اطمینان نہیں ہوگا، کیونکہ وہ ان امور کو سمجھ نہ پائیں گے، اور اگر اس کلام بشر سے عوام کو تسلی ہوگی کہ اس میں صریح اور واضح انداز میں کلام کیا گیا ہے اور بالکل کھلے انداز میں حقائق کا تذکرہ پایا جاتا ہے تو پھر دوسری طرف خواص مطمئن نہیں ہوں گے، کیونکہ ایسا کلام اس معیار تک پہنچ چکا ہے جس میں ان خواص کے ذوق ومشرب اور اذہان کے لیے کوئی سامان تسلی موجود نہیں ہے۔

تیسری خصوصیت

قرآن مجید کا عقل اور جذبہ دونوں کو مطمئن کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کا اسلوب، عقل ودل دونوں کو بیک وقت مخاطب کرتا ہے اور حق وجمال کو ایک ساتھ جمع کرتا ہے۔ مثلاً آپ قرآن کریم میں غور کریں کہ جب وہ منکرین کے سامنے حشر ونشر پر دلیل عقلی قائم کرنے کی گرماگری میں ہو تو اپنے استدلال کو لاجواب اور فیصلہ کن دلائل کے ضمن میں وارد مثالوں کے ذریعہ دلوں کو خوب جھنجوڑتا اور جذبوں کو بہترین تسکین بخش طریقے سے بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ فصلت میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِيْۤ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۝﴾ (فصلت:۳۹)

"اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ دبی ہوئی پڑی ہوتی ہے، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے جس ذات نے اس کو زندہ کر دیا وہی مردوں کو زندہ کرے گا، بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اسی طرح سورۂ قٓ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝ وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝﴾ (قٓ:۶-۱۱)

"پس کیا انہوں نے غور سے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے کس طرح اسے بنایا اور آراستہ کیا ہے اور اس میں کوئی بھی شگاف نہیں، اور ہم نے زمین کو بچھا دیا اور اس میں مضبوط پہاڑ ڈال دیئے اور اس میں ہر قسم کی خوشنما چیزیں اُگائیں ہر رجوع کرنے والے بندے کے لیے بصیرت اور نصیحت ہے، اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اُتارا پھر ہم نے اس کے ذریعے سے باغ اُگائے اور اناج جن کے کھیت کاٹے جاتے ہیں اور لمبی لمبی کھجوریں جن کے خوشے تہ بہ تہ ہیں، بندوں کے لیے روزی اور ہم نے اس سے ایک مردہ بستی کو زندہ کیا دوبارہ نکلنا اسی طرح ہے۔"

اس عمدہ اسلوب میں غور کریں جو ایک ہی وقت میں عقل کو قائل کرتا اور جذبے کو تسکین پہنچاتا ہے، اس جملے میں بھی غور کریں جو دلائل کے مقدمات کے لیے بمنزلہ نتیجہ کے ہے۔ اس لیے کہ آیت اولیٰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ﴾ (فصلت:۳۹)

اور آخری آیت میں فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝﴾ (قٓ:۱۱) یہ کیا ہی سحر انگیز حسن و جمال ہے! اور زبردست قسم کا اعجاز ہے جو انسان کی عقل اور دل دونوں کو ایک ساتھ ان معدودے چند کلمات میں واضح دلائل اور دلچسپ بیان کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے!۔

پھر آپ قرآن حکیم کی جانب دیکھیں کہ جب وہ مثلاً قصہ یوسف علیہ السلام بیان کرتا ہے تو وہ اس کے ضمن میں کیسے زبردست نصیحت آمیز کلمات لاتا ہے اور اس کے ذیل میں وہ پاک دامنی، شرافت اور امانت کو مضبوطی سے تھامنے کے لازم ہونے پر بلند دلائل سے مطلع کرتا ہے، اس شاندار قصہ کے مناظر میں سے ایک منظر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ رَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَ قَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ (یوسف:۲۳)

"اور جس عورت کے گھر میں یوسف رہتے تھے وہ ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کو ان کو پھسلانے لگی اور سارے دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی کہ آ جاؤ تم ہی سے کہتی ہوں۔ یوسف نے کہا، اللہ بچائے، وہ میرا مربیّ ہے کہ مجھ کو کیسے اچھی طرح رکھا، ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی۔"

سو آپ اس آیت میں غور کریں کہ گمراہی کے تین اسباب کا پاک دامنی کے تین دواعی کے ساتھ کس طرح موازنہ کیا گیا

ہے! جو رحمانی لشکر اور شیطانی لشکر کے درمیان دل کش بیان کے ساتھ ساتھ مقابلہ بازی کی منظر کشی کرتا ہے۔

اور ان دونوں کو عقلِ منصف کے سامنے ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ دیتا ہے۔؟ اس طرح آپ پورے قرآن مجید کو شیریں اور مزیدار مشروب کی طرح پائیں گے جو نفوس انسانی پر عقلی دلائل کے جام کو یکبارگی نوش کرنا آسان بنا دیتا ہے، اور عقلوں کو جذباتی توجہات کے ذریعہ تسکین بہم پہنچاتا ہے!۔

سو کیا آپ کسی انسان کے کلام میں اس طرح پا سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں، کیونکہ اگر انسان کا کلام اگر عقل کا حق ادا کرے گا تو جذبے کی حق تلفی کرے گا۔ جیسا کہ یہ عرف عام ہو گیا ہے کہ انسانی اسلوبوں کی دو قسمیں ہیں۔

تیسری قسم نہیں، ایک اسلوب علمی ہے اور دوسرا اسلوب ادبی ہے، چنانچہ طالبانِ علم کو ادبی اسلوب نہیں بھاتا اور طالبانِ ادب کو علمی اسلوب پسند نہیں آتا، اس طرح آپ علماء اور محققین کے کلام میں بھی روکھا پن اور پھیکا پن پائیں گے جو نہ دلوں کو متحرک کرتا ہے اور نہ نفوس کو جھنجوڑتا ہے۔ نیز آپ ادباء اور شعراء کے کلام میں بھی وہ علمی لاغر پن اور کمزوری دیکھیں گے جو نہ افکار غذا فراہم کرتا ہے اور نہ اذہان کو مطمئن کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بنی نوع انسانی میں عقلی قوتیں اور شعوری قوتیں برابر درجہ کی نہیں ہوتیں اگر بالفرض ایک شخص میں یہ دونوں قوتیں یکساں درجہ کی موجود بھی ہوں تو وہ یکبارگی کام نہیں کر سکتیں بلکہ بطور بدلیت کام کریں گی، چنانچہ ایک انسان کا کلام یا تو اس کی فکر اور سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے اور یا اس کے جذبات کا ثمرہ ہوتا ہے اور یا پھر پیوند زدہ کپڑے کی مانند ہوتا ہے کہ چند نظریاتی جملوں، جو کہ ثمرہ فکر ہوتے ہیں، اور چند جذباتی جملوں، جو کہ شعور کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتے ہیں، سے مرکب ہوتا ہے۔ اگر تو آپ ہر ایسا جملہ لے آئیں جو دونوں غایات کا جامع ہو تو یہ ممکن نہیں، بھلا یہ امر ایک انسان کے لیے کیسے سہل ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اسے یہ دونوں قوتیں یکساں طور پر عطا نہیں ہوئی ہیں، اگر بالفرض اسے یہ دونوں قوتیں یکساں طور پر عطا بھی ہو جائیں تو اس میں طاقت ہی نہیں ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں ان دونوں قوتوں کی طرف ایک بار توجہ دے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ﴾ (الاحزاب: ۴)

"اللہ نے کسی آدمی کے دو دل نہیں بنائے۔"

لیکن قرآن اس خصوصیت میں انواع کلام کے اندر منفرد مقام رکھتا ہے، کیونکہ وہ اس قادر ذات کا نازل کردہ ہے جسے ایک حالت دوسری حالت سے مشغول نہیں کرتی، اور جس نے قرآن حکیم میں روح و جسم کو جمع کر دیا ہے:

﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾

چوتھی خصوصیت

قرآنی ترتیب کی عمدگی اور اس کی روانی کی پختگی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم اپنے اجزاء کے مربوط ہونے اور کلمات و آیات اور سورتوں کے مرتب ہونے میں اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ کوئی اور کلام اس کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا، اس کے علاوہ قرآن، ایک ہی موضوع میں مقاصد

کا تنوع اور تفنن اور کلام پر پوری قدرت کا حامل ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب آپ قرآن کریم میں غور کریں گے تو آپ کو ایسا لگے کہ جیسے اس کا ایک پورا جسم ہے، اعصاب، جلد اور پردے اپنے اجزائے بدن کے ساتھ مربوط ہیں اور آپ کو اس میں ایک عام روح محسوس ہوگی جو حیات اور حس کو اس کے اعضاء میں اتحاد واتصال پر ابھارتی ہے، وہ ایک ایسی وحدت ہے جو باہم مالوف ومربوط ہے باوجودیکہ وہ کثرت سے مختلف اور متنوع مضامین پر مشتمل ہے، چنانچہ اس کے ایک ہی جملے میں ایسا باہمی ربط وتعلق ہے جس نے اس کو دلکش اور مانوس کلام بنا دیا ہے، اور ایک ہی سورت کے جملوں کو کا باہمی ربط واتصال ایسا ہے جس نے اس کو ایک ایسی چھوٹی وحدت اور اکائی بنا دیا ہے جو باہمی اجزاء اور آیات کے ساتھ پیوستہ اور ہم آغوش ہے۔ اور قرآن کی سورتوں کے مابین ایسی مناسبت پائی جاتی ہے جس نے اسے ایسی کتاب بنا دیا ہے جو اخلاق سے آراستہ اور نیک عادات سے پیراستہ ہو۔ فرمایا کہ:

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ﴾ (الزمر: ۲۸)

گویا قرآن ایک سانچے میں ڈھلا ہوا ٹکڑا ہے جو آنکھوں کو خیرہ کرتا اور عقول وافکار سے کھیلتا ہے۔ جبکہ وہ (سانچہ) چند زنجیروں سے مرکب ہے، ہر زنجیر اپنی ذات میں مستقل وحدت رکھتی ہے جو اجزاء والی ہے، اور زنجیر کے ہر جزو کے لیے ایک مخصوص وضع ہے، اور سانچے کی ہر زنجیر کے لیے بھی ایک خاص وضع ہے، لیکن ترتیب کی عمدگی اور روانی کی پختگی نے ان منتشر اور متفرق اجزاء کو ایک عمدہ اور مانوس وحدت بنا دیا ہے کہ ہر ہر جزو میں کمال کا ربط پایا جاتا ہے، اسی طرح ہر ہر زنجیر اور سانچے کے اوّل، وسط اور آخر تمام حصوں میں بھی باہم ربط واتصال موجود ہے۔

قرآن حکیم کے اس باہمی ربط اور اس کی پختگی کو ہر وہ شخص پہچانتا ہے جو اس میں پھیلے ہوئے تناسب کی طرف قلبی طور پر متوجہ ہو اور قرآن، مختلف اور متنوع موضوعات رکھتا ہے، جیسے احکام، قصص وواقعات، بحث وجدل اور دنیا اور اس کے خالق کی توصیف وغیرہ، لیکن اس کے باوجود اس میں ذرہ بھی جدائی، بیگانگی، تفرق اور تنافر نہیں پایا جاتا، اور کتب تفسیر، وجوہ مناسبت کی تشریح وتوضیح کے بارے میں بھری پڑی ہیں۔

مزید آگاہی کے لیے ان کتب کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔ اس مقام پر ہم ایک چھوٹا سا نمونہ اور مختصر کلام پر اکتفاء کرتے ہیں۔ یہ نمونہ دراصل سورۃ الفاتحہ ہے، اس میں خوب غور کیجئے کہ یہ سورت، نحوی مناسبت میں ایک معنی کی دوسرے معنی سے اور ایک مقصد کی دوسرے مقصد سے ہم آہنگی کے اعتبار سے کیسی باہم مربوط ہے!

آپ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ کی تاج پوشی کے ساتھ آغاز کرتے ہیں، جیسے ایک قاضی اپنے ہر حکم کو جلالت ملک کے نام کا تاج پہناتا ہے کہ وہ اس طرح اس جہت کا اعلان اور اظہار کرتا ہے جہاں سے وہ احکامات صادر کرنے کے لیے مدد لیتا ہے، پھر سورت ہذا میں کلام تیزی سے اس بات پر استدلال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ استعانت صرف اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے، اور یہ استدلال اسم کی لفظ اللہ کی طرف اضافت کر کے حاصل ہوتا ہے جو اسم ذات اور جامع صفات کمالیہ ہے، نیز لفظِ اللہ کی صفت اس طرح لائی گئی کہ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پھر کلام اس بات کی طرف چلا گیا ہے کہ وہ ذات تمام محامد کی مستحق ہے، جب تک کہ وہی اکیلا دلیل کے ساتھ لائق استعانت ہے۔

اس کے بعد کلام اس استحقاق پر تین دلائل کے بیان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو لفظ اللہ پر مقامِ حمد میں اوصاف کے قائم مقام ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ (الفاتحہ:۱-۳)

بعد ازاں کلام اس ذات کی الوہیت و ربوبیت کے بارے میں اعلان وحدانیت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے:

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ (الفاتحہ:۴)

یعنی جب تک وہی اکیلا مددگار اور تمام محامد کا مستحق ہے، پھر کلام اپنی فصاحت کے جلو میں انسان کے مقصد اعلیٰ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اس مقصد اعلیٰ سے مراد صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا حاصل ہونا ہے، اس اعلیٰ مقصد تک رسائی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے صرف اللہ کا راستہ، جس پر سابقہ دلائل توحید وتمجید دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لیے فرمایا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ (الفاتحہ:۵)

پھر کلام شعوری یا غیر شعوری کی حیثیت سے اس بات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس ہدایت کے اعتبار سے مخلوق تین اقسام میں منقسم ہے، تاکہ اصل مقصود پر تنبیہ اور ترغیب ہو جائے اور جو مقصود کے خلاف ہے اس میں مبتلا ہونے سے ڈرایا جائے اور اس سے نفرت پیدا ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ (الفاتحہ:۸)

یہ بات آپ کی نظروں کے سامنے ہے کہ کچھ لوگ وہ ہیں جن پر معرفت حق اور اتباع حق کا انعام کیا گیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن پر دیدہ دانستہ حق کی مخالفت کے سبب غضب خداوندی کا نزول ہوا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو گم گشتہ راہِ حق ہیں اور جہالت وضلالت اور حیرانگی وسرگردانی کی زندگی میں بھٹکتے ہوئے جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر راضی اور خوش ہیں۔ حق کی تلاش میں اپنے آپ کو کلفت میں نہیں ڈالنا چاہتے تاکہ معرفت حق سے بہرہ یاب اور اتباع حق کی سعادت سے فیضیاب ہو سکیں۔

پھر آپ سورۃ البقرۃ میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ اور اس کا مابعد سورۃ الفاتحہ سے ایسا مربوط ہے جیسے مفصل کا مجمل سے ارتباط ہوتا ہے۔ صراط مستقیم کی ہدایت سے مراد وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، اس ہدایت کی تشریح سورۃ البقرۃ اور اس سے متصل دوسری قرآنی سورتیں اس طرح سے کرتی ہیں کہ اس ہدایت کی تفاصیل مکمل بیان اور وضاحت ہمارے سامنے آشکار ہو جاتی ہیں۔

بعض جہلاء کا خیال یہ ہے کہ قرآن کی یہ فنی بیانی وحدت ایک معمولی سی چیز ہے، کوئی قابل اعتناء امر نہیں ہے، چہ جائیکہ اسے ایسا منظم ومرتب کلام شمار کیا جائے کہ وہ اعجاز کا مدار بن جائے۔

ان جہلاء کی تردید کرتے ہوئے ہم ان سے مطالبہ کریں گے کہ وہ بلغاء اور حاملین قلم کے کلام میں ہی ذرا غور کر لیں، اگر ان میں غور کرنے کی صلاحیت یا ذوق کا فقدان ہو تو کلام کے ناقدین اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے والوں کا فیصلہ ہی ملاحظہ کر لیں کہ ان

سے اپنے مقاصد کی تنظیم وترتیب میں اکثر و بیشتر غلطی ہی ہو جاتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کلام کے اندر بے ربط اور بے جوڑ متفرق امور جمع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے شعراء کو بُرے القاب کے ساتھ معیوب قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ وہ ایک ہی قصیدے میں ایک غرض کو چھوڑ کر دوسری غرض کی طرف منتقل ہو جایا کرتے ہیں، پھر ایسے انشا پرداز، اہل علم اور مؤلفین اپنے اغراض کی منتقلی کے اس نقص وعیب کی تلافی کے لیے مختلف امور کا استعمال کرتے ہیں جیسے، اسمائے اشارہ، حروف تنبیہ، حدیث نفس، تقسیم وترقیم اور تبویب کی کثرت، عنوانات کی بھرمار، لفظ امابعد، یہ، اگر، یاد رہے، اگر ہم یوں کہیں، ہم یوں کہتے ہیں، کتاب چند مباحث میں تقسیم ہے، پہلی بحث اس میں...... پھر یہ بحث چند نکات میں منقسم ہے پہلا نقطہ یہ ہے۔ نوٹ، تنبیہ، خلاصہ، امابعد وغیرہ۔ یہ صورت حال تو انسانی کلام کی ہے، لیکن اس کے مقابلے میں قوتوں اور قدرتوں کا مالک (اللہ تعالیٰ) اغراض کلام کے تنوع، سورتوں اور آیتوں میں قدرت علی الکلام کے باوجود ایک مقصد سے دوسرے مقصد کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، بلکہ ان مقاصد کے بیان میں مخاطب کو بھی ساتھ ہی منتقل کرتا ہے، اور پھر وہ ذات مذکورہ وسائل عجز کا سہارا یا مدد نہیں لیتی بلکہ سحر انگیز طریقے سے منتقل ہوتا ہے جس کا کبھی تو مخاطب کو شعور ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہو پاتا۔ غور کرنے کے لیے سورۃ الفاتحہ کی مذکورہ مثال میں کافی ہے۔ قرآن کی طویل ترین سورت، سورۃ البقرۃ، میں غور کرو تو کیا خوب ہے! اس میں غور کرو گے تو تم جھوم اٹھو گے اور انگشت بدنداں ہوں گے اور پھر یہ طرب واعجاب تمہیں زبردست اعجاز تک پہنچتے ہوئے حدِ ذوق تک لے جائے گا۔

میں آپ کی راہ نمائی "النبأ العظيم" کتاب کی طرف کروں گا، اس کے مصنف نے اعجاز کے انواع کو بڑی عمدگی اور انوکھے انداز میں بیان کیا ہے اور اس سورت کی آیات کے مابین ربط ومناسبت کو پیش کر کے قلوب واذہان کو سیر کر دیا۔

پانچویں خصوصیت

قرآن کی تکرار کلام میں مہارت اور انواع کلام میں تفنن، یعنی وہ ایک معنی کو مختلف الفاظ اور مختلف طریقوں سے لاتا ہے اور وہ تمام کے تمام عمدہ اور ممتاز ہوتے ہیں۔ اس میدان میں بڑے بڑے باصلاحیت فصحاء اور بلغاء دم بخود ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں پر ان کے کلام کا احاطہ یا استیعاب کرنا نہیں چاہتے، صرف چند مثالیں اور نمونے پیش کرتے ہیں جو آپ کے لیے کافی ہیں۔

(ا) مخاطبین سے درج ذیل وجوہات کے ساتھ فعل کا طلب کرنا:

① صریح طور پر لفظ امر کا لانا۔ جیسے فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸)

"بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچا دو۔"

② اس امر کی خبر دینا کہ یہ فعل، مکلفین پر لکھ دیا گیا ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (البقرۃ: ۱۸۳)

"تم پر روزہ لکھ دیے گئے ہیں۔"

③ اس بات کی خبر دینا کہ یہ فعل، لوگوں پر لازم کر دیا گیا ہے: جیسے فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (ال عمران:۹۷)

"اور لوگوں پر اس کے گھر کا حج کرنا اللہ کا حق ہے، جو شخص اس تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔"

④ مکلف کے بارے مطلوب فعل کی خبر دینا۔ جیسے فرمایا:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ (البقرۃ:۲۲۸)

"اور طلاق دی ہوئی عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔"

اس میں عورتوں کو روکے رکھنے کا فعل طلب کیا گیا ہے۔

⑤ مبتداء کی خبر دینا بایں معنی کہ دوسروں سے اس فعل کے ثبوت کو طلب کیا جائے، جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ (ال عمران:۹۷)

"جو اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے۔"

اس آیت میں مخاطبین سے حرم میں داخل ہونے والوں کو امن دینے کا فعل طلب کیا گیا ہے۔

⑥ صیغۂ فعل امر سے کوئی فعل طلب کرنا۔ جیسے فرمایا:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ (البقرۃ:۲۳۸)

"سب نمازوں کی حفاظت کیا کرو اور خاص کر درمیانی نماز کی۔"

یا لامِ امر کے ذریعہ کوئی فعل طلب کرنا، جیسے فرمایا:

﴿ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ (الحج:۲۹)

"پھر چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور قدیم گھر کا طواف کریں۔"

⑦ کسی فعل کے خیر کا باعث ہونے کو بتانا۔ جیسے فرمایا:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ﴾ (البقرۃ:۲۲۰)

"اور یتیموں سے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں کہہ دو ان کی اصلاح کرنا بہتر ہے۔"

⑧ کسی فعل کے وصف کو نیکی کا عنوان دے کر بیان کرنا، جیسے فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى﴾ (البقرۃ:۱۸۹)

"اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو کوئی اللہ سے ڈرے۔"

⑨ کسی فعل کو فرضیت کے ساتھ موصوف کرنا، جیسے فرمایا:

﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ﴾ (الاحزاب:۵۰)

"ہمیں معلوم ہے جو کچھ ہم نے مسلمانوں پر ان کی بیویوں کے بارے میں فرض کیا ہے۔"

⑩ کسی فعل پر وعدہ اور ثواب کو مرتب کرنا، جیسے فرمایا:

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝﴾ (الحدید:۱۱)

"ایسا کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے پھر وہ اس کو اس کے لیے دگنا کر دے اور اس کے لیے عمدہ بدلہ ہے۔"

⑪ فعل کو سابقہ شرط پر مرتب کرنا: جیسے ارشاد ہے:

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (البقرۃ:۱۹۶)

"پس اگر تم رو کے جاؤ تو جو قربانی سے میسر ہو۔"

⑫ استفہام کے بعد فعل منفی لانا: جیسے فرمایا:

﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (النحل:۱۷)

"پھر کیا جو شخص پیدا کرے اس کے برابر ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کرے کیا تم سوچتے نہیں۔"

⑬ ترجی کے بعد فعل لانا، جیسے فرمایا:

﴿وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

"اور شاید کہ تم شکر ادا کرو۔"

⑭ ترکِ فعل پر وصف قبیح کو مرتب کرنا، جیسے فرمایا:

﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ (المائدہ:۴۴)

"اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں یہی لوگ کافر ہیں۔"

(ب) کلام کو درج ذیل وجوہات کے ذریعہ نہی سے تعبیر کرنا:

① فعل کی جانب میں نہی کا صیغہ لانا، جیسے فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰۤى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ﴾ (الممتحنہ:۹)

"تمہیں اللہ انہیں سے منع کرتا ہے کہ جو دین میں تم سے لڑے اور انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے پر (لوگوں) کی مدد بھی کی۔"

② فعل کی جانب میں صیغہ تحریم لانا، جیسے فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ

يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف:۳۳)

”کہہ دو میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام کیا ہے خواہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ اور ہر گناہ کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو بھی اور یہ کہ اللہ کا ایسی چیز کو شریک کرو جس کی اس نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی اور یہ کہ اللہ پر وہ باتیں کہو جو تم نہیں جانتے۔“

③ مکلف سے حلت کی نفی کرنا، جیسے فرمایا:

﴿لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا﴾ (النساء:۱۹)

”تمہیں یہ حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کو میراث میں لے لو۔“

④ لفظ”لا“ کے ذریعہ فعل سے ممانعت کرنا، جیسے فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (الانعام:۱۵۲)

”اور سوائے کسی بہتر طریقے کے یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ۔“

⑤ کسی فعل کے بارے میں بتانا کہ یہ کوئی نیکی نہیں ہے، جیسے فرمایا:

﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ (البقرة:۱۸۹)

”اور نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے آؤ۔“

⑥ کسی فعل کے بارے میں یہ بیان کرنا کہ وہ باعث شر ہے، جیسے فرمایا:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ﴾ (آل عمران:۱۸۰)

”اور جو لوگ اس چیز پر بخل کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے وہ یہ خیال نہ کریں کہ بخل ان کے حق میں بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بُرا ہے۔“

⑦ کسی فعل کو وعید سے متصل ذکر کرنا، جیسے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (التوبہ:۳۴)

”اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجیے۔“

⑧ کسی فعل کی طرف گناہ کی نسبت کرنا، جیسے فرمایا:

﴿فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ﴾ (البقرة:۱۸۱)

”پس جو اسے اس کے سننے کے بعد بدل دے اس کا گناہ ان ہی پر ہے جو اسے بدلتے ہیں۔“

⑨ - ⑮ کسی امر کو ایسے فعل میں شامل کرنا جو حد درجہ کا گناہ اور حرمت والا ہو، نیز کسی فعل کے ناپاک ہونے کی خبر دینا، کسی فعل کو شیطانی عمل بتانا، اس سے اجتناب کرنے کا حکم دینا، اس فعل کے ترک کرنے پر کامیابی کی امید دلانا، اس فعل کے ارتکاب پر مضرت رساں اور اذیت ناک امر کو مرتب کرنا، استفہام کے انداز میں اس فعل سے باز رہنے کا حکم دینا۔ ہم ان تمام صورتوں کی مثال خمر اور میسر کی حرمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان عالی سے دیتے ہیں۔

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝﴾ (المائدۃ:۹۰-۹۱)

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور فال کے تیر سب شیطان کے گندے کام ہیں سو ان سے بچتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تم میں دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روکے سو اب بھی باز آ جاؤ۔"

(ج) فعل کی اباحت کو درج ذیل طریقوں سے تعبیر کرنا۔

① فعل کی جانب میں حلت کا صیغہ صراحت کے ساتھ لانا، جیسے فرمایا:

﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ (المائدہ:۱)

"تمہارے لیے چوپائے مویشی حلال ہیں۔"

② کسی فعل کا حکم دینا اور اس کے ساتھ طلب فعل سے مانع کوئی قرینہ بھی موجود ہو، جیسے فرمایا:

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

"کھاؤ اور پیو۔"

③ کسی فعل سے گناہ کی نفی کرنا، جیسے فرمایا:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ:۱۷۳)

"پس جو لاچار ہو جائے نہ سرکشی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔"

④ حرج (گناہ) کی نفی کرنا، جیسے فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ﴾ (الفتح:۱۷)

"نہ اندھے پر کچھ گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر ہی کچھ گناہ ہے اور نہ بیمار پر ہی کچھ گناہ ہے۔"

یعنی ترک قتال یا مذکورہ گھروں سے کھانے کے بارے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

⑤ جناح (گناہ) کی نفی کرنا، لیکن حرمت قرار نہ دینا، جیسے فرمایا:

﴿لَیۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوۡا وَّ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (المائدہ: ۹۳)

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان پر اس میں کوئی گناہ نہیں جو پہلے کھا چکے جبکہ آئندہ کو پرہیز گار ہوئے اور ایمان لائے اور عمل نیک کیے۔"

اور کبھی نفی جناح کے ساتھ حرمت کا بھی دعویٰ ہوتا ہے، کیونکہ جناح کی نفی سے حرمت کا وجوب لازم آتا ہے، جیسے فرمایا:

﴿فَمَنۡ حَجَّ الۡبَیۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِ اَنۡ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (البقرۃ: ۱۵۸)

"پس جو کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان کے درمیان طواف کرے۔"

⑥ استفہام کی صورت میں حرمت کا انکار کرنا، جیسے فرمایا:

﴿قُلۡ مَنۡ حَرَّمَ زِیۡنَةَ اللّٰهِ الَّتِیۡۤ اَخۡرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزۡقِ﴾ (الاعراف: ۳۲)

"کہہ دو اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے واسطے پیدا کی ہے اور کس نے کھانے کی ستھری چیز میں (حرام کیں)۔"

⑦ کسی چیز کا احسان جتانا اور اسے عمدہ رزق سے تعبیر کرنا، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِیۡلِ وَ الۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡهُ سَکَرًا وَّ رِزۡقًا حَسَنًا﴾ (النحل: ٦٧)

"اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے نشہ اور عمدہ رزق بناتے ہو۔"

یوں آپ دیکھیں گے کہ قرآن، ایک ہی معنی کو مختلف الفاظ اور متعدد طریقوں سے تعبیر کرتا ہے، کبھی انشاء کا طریقہ اور کبھی اخبار کا، کبھی اظہار اور کبھی اضمار اور کبھی تکلم، کبھی غیبت، اور کبھی خطاب اور کبھی ماضی، کبھی حال اور کبھی مستقبل کا صیغہ اور انداز استعمال کرتا ہے، کبھی جملہ اسمیہ اور کبھی جملہ فعلیہ اور کبھی استفہام وامتنان کی صورت اور کبھی وصف اور وعدہ ووعید وغیرہ کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔

تعجب خیز امر یہ ہے کہ جب اس میں کلام ایک طرز سے دوسرے طرز کی طرف منتقل ہوتا ہے تو اکثر وبیشتر تو دیکھے گا کہ اس انتقال اسلوب میں سرعت اختیار کی جاتی ہے جس کا مقابلہ ممکن نہیں، پھر مزید یہ کہ قرآن، اس سرعت عجیبہ کو مضطربانہ یا عاجزانہ انداز میں اختیار نہیں کرتا بلکہ دائمی طور پر بلاغت کے بلند مرتبے کی محافظت کرتے ہوئے اختیار کرتا ہے۔

﴿یَّمۡشِیۡ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ﴾ (الملک: ۲۲)

"جو سیدھے راستے پر سیدھا چلا جاتا ہے۔"

پھر اس تفنن اور تنوع نے قرآن کو حسن وجمال اور شان وشوکت کا کشادہ لباس پہنا دیا ہے اور اسے حلاوت وطراوت سے ایسا مزین اور آراستہ کر دیا ہے کہ اس کلام کا قاری اور سامع ذرا بھی اکتاتا نہیں ہے چاہے جس قدر بھی اس کی قراءت یا اسے سماعت کرے۔

بلکہ ان دونوں امور میں وہ ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف ایسا چلا جاتا ہے جیسا کوئی پرندہ سرسبز باغ میں کبھی

ایک شاخ پر اور کبھی دوسری شاخ پر اور کبھی ایک پھول پر اور کبھی دوسرے پھول پر آتا جاتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ اس طریقے پر قرآن میں تکرار کلام بھی اعجاز اسلوبی کے فنون میں سے ایک فن ہے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ احسان جتانا بھی ہے کہ جو اللہ، لوگوں پر احسان فرماتا ہے، تاکہ لوگ، اس طریقے سے مستفید ہو کر قرآن میں زیادہ سے زیادہ غور و تدبر بھی کریں اور اس کی قراءت وسماعت اور تدبر وعمل کے ذریعے اس پر توجہ بھی دیں، اور اس کے موجود ہوتے ہوئے اب اس شخص کے لیے کوئی عذر مسموع نہیں ہوگا جو اس نعمت سے غفلت برتے یا خود کو سفاہت میں مبتلا کرے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھ لیجیے:

﴿وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ٘ فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۸۹)

"اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر ایک قسم کی مثال بھی کھول کر بیان کر دی ہے پھر بھی اکثر لوگ انکار کئے بغیر نہ رہے۔"

نیز ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ١ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا﴾ (الکھف: ۵۴)

"اور البتہ تحقیق ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر ایک مثال کو کئی طریقوں سے بیان کیا ہے، اور انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے۔"

نیز فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَؕ﴾ (الرعد: ۱۷)

"اسی طرح اللہ مثالیں بیان کرتا ہے۔"

چھٹی خصوصیت

قرآن کا اجمال اور تفصیل کو ایک ساتھ جمع کرنا۔

جبکہ اجمال اور تفصیل دو متقابل غرض وغایت پر دلالت کرتے ہیں جو انسانوں کے کلام میں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے، کیونکہ انسانی کلام یا تو مجمل ہوگا یا مفصل، اس لیے کہ کلمہ کا معنی یا تو ایسا واضح ہوگا کہ بیان و وضاحت کا محتاج نہ ہوگا اور یا اس کا معنی مخفی المراد ہوگا کہ وضاحت کا محتاج ہو۔ لیکن اس کے مقابلے میں صرف قرآن کی یہ شان اعجازی ہے کہ آپ اس کا کوئی جملہ سماعت کرتے ہیں تو وہ ایک ہی وقت میں مجمل بھی ہوتا ہے اور مفصل اور مبیّن بھی۔ وہ اس طرح کہ وہ جملہ اپنی مراد اور مقصد میں ایسا واضح ہوتا ہے کہ نفس انسانی کو اوّل وہلہ میں ہی بحث وکرید کی مشقت سے بے فکر کر دیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب اس جملہ میں مزید غور وتدبر سے کام لیا جائے تو وہاں پر بہت سے نئے معانی ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں جو تمام کے تمام درست ہوتے ہیں یا قابل احتمال ہوتے ہیں کہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ درست ہوں۔ پھر جس قدر غور اور تدبر بڑھتا ہے اور استعداد ولیاقت موجود ہوتی ہے اسی قدر اس کے معارف واسرار منکشف ہوتے جاتے ہیں۔ جیسے ایک شاعر کہتا ہے۔

یزیدك وجهه حسنًا   إذا ما زدته نظرًا

”جب تم اسے دیکھتے جاؤ گے اس کے چہرے کا حسن بڑھتا ہی جائے گا۔“

یہی وہ دلیل اور راز ہے جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ سے استفادہ کرنے کے لیے بنی نوع انسانی کے تمام پیروانِ مذاہب اور مختلف مشارب کے لوگوں کے قلوب واذھان کے لیے اسے باعث شفا بنا دیا ہے، اور اس کے دریائے سخاوت سے مختلف نسلوں نے وہ استفاضہ کیا جس نے ان کو اس کے قریب کر دیا اور اس پر عمل پیرا کر دیا۔

جبکہ انسانی کلام ایسا نہیں ہے، کیونکہ انسان جب اپنی اغراض ومقاصد کی وضاحت کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو الفاظ کی تنگی آڑے آجاتی ہے اور کسی استنباط وتاویل کے لیے اس کے الفاظ میں وسعت موجود نہیں ہوتی، اگر اپنی مراد کو مجمل طور پر بیان کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو مقصد واضح نہیں ہو پاتا بلکہ بسا اوقات وہ انسانی کلام لغو اور بے فائدہ اور پہیلیوں کے ساتھ لاحق ہو جاتا ہے۔

کلام اللہ کے اسلوب کی یہ خصوصیت بالکل واضح ہے اسے کسی تمثیل کی ضرورت نہیں ہے، اس کے لیے بس کتب تفسیر کی طرف مراجعت کافی ہوگی کہ اس میں بہت کچھ موجود ہے:

﴿وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴾ (فاطر: ۱۴)

”یعنی حق تعالیٰ جیسی خبردار ذات کی طرح تجھے کوئی نہ بتائے گا۔“

ساتویں خصوصیت

لفظ کے قصد کے ساتھ ساتھ معنی کی تکمیل کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مخاطب، قرآن کریم کے تمام جملوں میں ایسا متوسط ومعتدل بیان پاتا ہے۔ جو انسانی ضرورت یعنی ہدایت الٰہیہ کو پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی لفظ معنی مرادی پر زائد ہو جائے یا مخلوق کی ضروریات یعنی ہدایت خداوندی کی تکمیل نہ کرتا ہو۔

یہ لفظی توسط واعتدال جو ہر طرح کے اسراف وبخل سے مبرا ہے، اس کے ساتھ ساتھ مخاطب کے سامنے ایک کامل صورت میں اس کا معنی بھی آشکار ہوتا ہے جس میں نہ تو ایسی چیز کی کمی پائی جاتی ہے جس کو اس کا عنصر اصلی یا کامل زیور شمار کیا جاتا ہے اور نہ ایسی چیز کی زیادتی موجود ہے جسے دخیل یا غریب سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس کی کیفیت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے:

﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴾ (ھود: ۱)

چنانچہ قرآن حکیم میں جس طرح کی چیز پائی جاتی ہے اس طرح کی دوسرے کلام میں نہیں پائی جاتی، بلکہ ہر بلیغ وفصیح شخص خواہ وہ بلاغت وبیان میں کتنا ہی فائق ہو وہ ان دو مقاصد کے مابین ایسا ہے جیسے ایک شوہر دو سوتنوں کے درمیان ہوتا ہے کہ ایک کو خوش کرتا ہے تو دوسری ناراض ہوتی ہے، یعنی اگر ایک بلیغ آدمی لفظ کا قصد کرتے ہوئے اسے فضولیات سے بچاتا ہے تو عموماً اس کو یہ چیز اس پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ معنی کے بارے میں چشم پوشی اختیار کرے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معنی کی صورت ناقص اور خفی المرادرہ جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کے الفاظ اس صورت کے ساتھ ایک پہیلی یا معما بن جاتے ہیں، اور اگر وہ بلیغ آدمی معنی کا قصد کرتے ہوئے اسے کامل زیور سے آراستہ کرتا ہے اور اس کی تکمیل کرتا ہے تو اسے یہ چیز اس پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ الفاظ کے بارے میں حد اعتدال سے باہر نکل جائے، کلام کو طول دینے اور پھیلانے کی غرض سے اور اس مقصد سے کہ کہیں معنی مقصود میں سے کوئی چیز رہ نہ جائے، لیکن اس صورت میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ الفاظ اسراف وبخل کے مرض سے محفوظ رہ جائیں جو کلام کی رونق اور اس کے حسن

کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

اور سامع کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے ضمن میں لغزش کھاتا اور زائد معنی اور اصل معنی میں فرق بھی نہیں کر پاتا ہے۔

اگر بالفرض کسی بلیغ آدمی کو ان دونوں اغراض یعنی لفظ کے قصد کے ساتھ ساتھ معنی کی بھی تکمیل، کی کلام کے ایک یا دو جملوں میں توفیق حاصل ہو جائے، ہاں وقتاً فوقتاً ایسا ہو سکتا ہے۔ جیسے کوئی انسان مٹی کھود رہا ہو یا چٹانوں میں سوراخ کر رہا ہو تو اچانک اس وقت اسے سونے یا ہیرے کا ٹکڑا مل جائے۔

اگر آپ کو اس بارے میں کوئی شک ہو تو ائمہ بلاغت سے پوچھ لیجئے؟ کہ کیا تمہیں کبھی نثر کا کوئی قطعہ یا اشعار پر مشتمل قصیدہ ملا ہے جو کہ تمام کا تمام یا اس کا اکثر و بیشتر حصہ لفظ کے قصد کے ساتھ ساتھ تکمیل معنی کو بھی جامع ہو؟!

وہ ائمہ بلاغت صراحتہً اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ کسی ماہر ترین شاعر کو بھی ایسی مہارت اور دسترس حاصل نہیں ہوئی کہ وہ لفظ اور معنی دونوں کو جامع کوئی قصیدہ وغیرہ کہہ سکے، سوائے اس کے کہ محدود قصیدے کے چند ایک اشعار ایسے لے آئے، اور بقیہ اشعار کچھ متوسط اور کچھ ردی قسم کے ہوں گے۔ تمام علمائے بلاغت علی الاعلان کہتے ہیں کہ نثر کہنے والے خطباء اور کاتبین کا یہی حال ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس خصوصیت کو محسوس کریں تو ایک مرتبہ قرآن شریف کھولیے اور کتاب اللہ کا کوئی جملہ لے کر اس کے کلمات کی تعداد کو شمار کریں پھر کسی دوسرے کلام کے ان ہی کلمات کی تعداد کو لے کر دونوں جملوں میں تقابل کریں اور دونوں کلاموں کے درمیان موازنہ کریں اور دیکھیے کہ ان میں سے کون سا کلام ایسا ہے جو لفظ کے قصد کے ساتھ ساتھ معانی کی بھی پوری تکمیل کرتا ہے؟

پھر دیکھیے کہ کس کلمہ کو حذف کر کے اس کی جگہ اس سے بہتر کوئی کلمہ کلام الٰہی میں لا سکتے ہیں؟

اسی طرح کلام انسانی میں کتنے کلمات حذف کر کے یا تبدیل کر کے اس کی جگہ کوئی دوسرے کلمات لا سکتے ہیں؟ جب آپ یہ کوشش کریں گے تو اس حقیقت تک جا پہنچیں گے جسے بقول امام سیوطی رحمہ اللہ کے ابن عطیہ رحمہ اللہ نے صاف طور پر بیان کیا ہے، قرآن کریم کے بارے میں وہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"اگر تم اس کلام کا کوئی لفظ حذف کر کے اس کی جگہ زبان عرب کا اس سے بہتر لفظ لانا چاہیں تو تمہیں نہیں ملے گا۔"

لیکن انسانی کلام کا حال اس کے برخلاف ہے خواہ وہ کتنا ہی بلند و بالا ہو جائے، حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بھی جنہیں جوامع الکلم سے سرفراز فرمایا گیا اور جن کا دل نور نبوت و وحی سے منور ہوا اور جنہیں تمام مخلوق میں اکمل طور پر تخلیق کیا گیا تو باوجود یکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بیان و بلاغت کی بلندی پر فائز ہے اور ہر انسان کے کلام پر فائق و بلند ہے لیکن قرآن اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے درمیان بڑا فرق رہے گا۔

سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

توضیح و تمثیل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں پر ایک قیمتی بات، جو ہمارے موضوع کے لیے توضیح و تمثیل کا درجہ رکھتی ہے، ذکر کر دوں اور وہ قیمتی بات ہمارے دوست بڑے عالم شیخ محمد عبداللہ دراز کی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "النباء العظیم" میں لکھی ہے، ہم نے اعجاز قرآن کی بحث میں اس سے بہت اقتباسات لیے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں: ہم

کہتے ہیں کہ: قرآن کریم دائمی طور پر کم سے کم ممکنہ الفاظ کی صورت میں زیادہ سے زیادہ ممکنہ معانی کا استنباط کرتا ہے، یہ عجیب اور نمایاں انداز سارے کلام میں پایا جاتا ہے، جس میں اجمال کے مواقع جنہیں لوگ مقام ایجاز سے تعبیر کرتے ہیں اور تفصیل کے مواقع، جنہیں وہ مقام اطناب سے موسوم کرتے ہیں، سب یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہم اسے پورا کا پورا ایجاز ہی کہتے ہیں، اس لیے کہ ہم اس کلام کو دونوں جگہوں پر دیکھتے ہیں کہ راہِ اعتدال سے متجاوز بھی نہیں ہوتا اور اسراف کی طرف بھی ذرا بھی مائل نہیں ہوتا، نیز ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں مواقع پر اس کے مقاصد کی تعبیر وادائیگی کامل طور پر اس سے کم الفاظ سے بھی ممکن نہیں ہے، اور اس کے مساوی الفاظ سے بھی ممکن نہیں ہے۔ ہر کلمہ ایک عظیم فائدہ کے لیے کنجی کی مانند ہے، اور ہر حرف ضرور کسی معنی کے لیے آیا ہے۔

جو شخص بعض قرآنی کلمات کے متعلق جو یہ کہتا ہے کہ وہ تو نامانوس ہیں، اور اس کے بعض حروف میں معنوی زیادتی موجود ہے، اور اس کی اس بات کی طرف توجہ نہ دو، اسی طرح اس شخص کی اس بات کی طرف بھی التفات کی ضرورت نہیں جو کلمہ تاکید کو معمولی خیال کرتا ہے اور جس جگہ بھی اسے اس کے زائد ہونے کا وہم ہوتا ہے اسے پھینک دیتا ہے، وہ اس بات کی کوئی پروانہیں کرتا کہ اس میں لفظ کی زیادتی کے کوئی مزید معنی موجود ہیں جو تاکید کی صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں ہیں۔

اور نہ ہی اس بات کی پرواہ کرتا ہے کہ اس جگہ اس تاکید کی ضرورت ہے اور اس جگہ ضرورت نہیں ہے، دونوں باتیں چھوڑ دو، اس لیے کہ قرآن کی اس نوع کے بارے میں زیادتی وغیرہ کا حکم لگانا جہل کی ایک قسم ہے (خواہ پوشیدہ ہو یا آشکارا) اس میزانِ بلاغت کی بہ نسبت جس پر قرآن کا اسلوب وضع کیا گیا ہے۔ آپ کو بس اس چراغ کی روشنی میں اس کے بیانی اور بلاغی اسرار کی طلب میں غور وخوض کرنا چاہیے، اگر اس کے کسی کلمہ یا حرف کے بارے میں وجہ حکمت معلوم نہ ہو تو ان گمان کرنے والوں کی طرح جلد بازی میں کوئی حکم نہ لگائیں بلکہ درست بات کہیے جو امانت وانصاف کے قریب تر ہے۔ یعنی یوں کہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے اسرار سے بخوبی واقف ہے، ہمیں اس کے بتانے سے ہی علم حاصل ہوسکتا ہے، اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بھی نہیں بیٹھ جانا چاہیے کہ ناامید ہو جاؤ کہ اب ہمیں ان اسرار سے آگاہی نہ ہوگی یہ کہتے ہوئے کہ میں کہاں اور فلاں کہاں؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات ایک ادنیٰ درجے کا انسان وہ بات سمجھ لیتا ہے جو فاضل انسان بھی نہیں سمجھ پاتا۔

کیا آپ کو مشہور پہیلی کے بارے میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ معلوم نہیں؟ لہٰذا طلب وجستجو میں خوب کوشش کیجیے!

﴿وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾ (طٰہٰ:۱۱۴)

عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ فہم کا دروازہ کھول دے اور ایسی باتیں جو دوسروں پر مخفی ہیں، وہ آپ پر منکشف ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دوست ہے کہ انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔

ہم ایک مثال اللہ تعالیٰ کے فرمان سے بیان کرتے ہیں:

﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

اب اس آیت میں لفظِ کاف کے زائد ہونے بلکہ اس زیادتی کے وجوب پر اکثر اہل علم کا اتفاق ہے، کیونکہ تشبیہ جو ایک محال عقلی ہے اس سے لازم آتی ہے، اگر ہم اسے اپنے معنی اصلی پر باقی رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ اس صورت میں اللہ کے مثل

سے تشبیہ کی نفی ہوگی، اور اللہ کے لیے مثل کا ثبوت ماننا لازم آتا ہے یا کم از کم ثبوت اور نفی کا احتمال رہے گا، جیسا کہ علماء منطق کہتے ہیں کہ قضیہ سالبہ، عدم موضوع کی تصدیق کرتا ہے یا جیسے علماء نحو کہتے ہیں کہ کبھی نفی قید اور مقید دونوں طرف متوجہ ہوتی ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ: لیس لفلانٍ ولد یعاونہ (فلاں کا کوئی لڑکا نہیں ہے جو اس کی مدد کرے) یہ تب کہیں جب کہ اس کی بالکل کوئی اولاد نہ ہو یا اولاد ہو لیکن اس کی مدد نہ کرتی ہو۔ اسی طرح آپ کہتے ہیں: لیس محمد اخا لعلیٍ (محمد علی کا بھائی نہیں ہے) یہ اس وقت کہیں جب محمد، علی کے علاوہ کسی اور کا بھائی ہو یا پھر وہ کسی کا بھی بھائی نہ ہو۔

بہت کم ایسے اہل علم ہیں جو اس بات کے قائل ہوں کہ مذکورہ آیت میں کاف تشبیہ کو اپنے اصل معنی پر رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ یہ چیز نہ تو نصا محال کو لازم کرتی ہے اور نہ احتمالاً، کیونکہ مثل کے مثل کی نفی سے بھی عقلا مثل کی نفی ہوگی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بالفرض اللہ کا کوئی مثل ہو تو اس مثل کا بھی لازماً مثل ہوگا تو وہ بذات خود خدائے برحق ہے، کیونکہ دو متماثل چیزوں میں سے ہر ایک کو اپنے صاحب کا مثل شمار کیا جاتا ہے، پتہ چلا کہ مثل کے مثل کا انتفاء تام ہی تب ہوتا ہے جب مثل کی نفی ہو، اور یہی مقصود ہے۔

اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ توجیہ کو ہم زیادہ سے زیادہ مصحح کہہ سکتے ہیں مرجح نہیں کہہ سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ اس توجیہ سے حرفِ کاف سے لازم آنے والا ضرر تو دور ہو جاتا ہے لیکن اس سے کوئی فائدہ ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی خاص ضرورت بھی واضح نہیں ہوتی ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اس توجیہ کے ساتھ بھی کلام کا معنی ومفہوم وہی رہتا ہے جو اس کے بغیر رہتا ہے۔

اگر بالفرض اس سے آیت میں کوئی زائد معنی حاصل بھی ہوتا ہے تو تکلف اور دوران ہی کا معنی زائد حاصل ہوتا ہے اور کلام میں پیچیدگی اور تکلف پیدا ہوتا ہے اس توجیہ کی بنیاد پر آیت کا مضمون ایسا ہو گیا جیسے کوئی شخص کہنا چاہے کہ یہ فلاں کا بھائی ہے تو اس مضمون کو یوں ادا کرے کہ یہ فلاں کی خالہ کی بہن کا بیٹا ہے! بس اس توجیہ کا مال ونتیجہ الفاظ کی زیادتی ہوگا جسے وہ نوعِ تاکید کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ اب یہ اسم ایسا ہے کہ ہم اس کے مسمّی کو نہیں جانتے، کیونکہ مماثلت کی تاکید تو بالکل مقصود نہیں ہے اور کسی حرف کے ذریعہ نفی کی تاکید کرنا تشبیہ پر دلالت کرتا ہے جو کہ خود کلمہ کو اپنے مقتضی سے پھیرنا ہے۔

اگر آپ مزید تھوڑا سا غور کر لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ حرف خود اپنی جگہ میں دلالت کی قوت سے ثابت اور جملہ سے مفہوم ہونے والے معنی مقصود کے بڑے حصّہ کو شامل ہے۔ اگر آیت مذکورہ سے اس حرفِ کاف کو حذف کر دیا جائے تو اس کے ساتھ ہی معنی کی اساس اور اس کی ایک بنیاد بھی منہدم ہو جاتی ہے۔

ہم اس امر کو دو طریقوں سے واضح کرتے ہیں، جن میں سے ایک دوسرے سے زیادہ دقیق ہے۔

پہلا طریقہ: یہ طریقہ کے اعتبار سے فہم عموم سے قریب تر ہے، کیونکہ اگر کہا جائے کہ: لیس مثلہ شیء تو یہ مثلِ مکافی کی نفی ہوگی اور اس سے مراد مثل تام ہے جو دوسرے سے مماثلت کاملہ رکھتا ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے یہی مفہوم معلوم ہوتا ہے اور اس سے پھر دل میں طرح طرح کے وساوس اور اوہام پیدا ہونے لگتے ہیں کہ شاید اس مقام پر ایک ایسا درجہ اور رتبہ موجود ہے جو رتبہ الوہیت کے مشابہ تو نہیں ہے لیکن اس کے متصل ضرور ہے، اور ممکن ہے کہ یہ مقام

ملائکہ اور انبیاء کا ہو یا کواکب اور قوی الطبیعت اشیاء کا ہو یا جنات، بتوں اور کاہنوں کا ہو! اس طرح خدائے برحق کے ساتھ علم وقدرت میں ان چیزوں کی مشابہت ہوگی اور انہیں اللہ کے خلق وامر میں شراکت حاصل ہوگی!

چنانچہ یہ حرف کلام میں وضع ہی اس لیے ہوا ہے کہ سارے عالم کو مماثلت سے بھی، مماثلت کی مشابہت سے بھی بلکہ جو چیز اس کے قریب ہو اس سے بھی دُور کردے، گویا یہ بات اس طرح کہی گئی کہ کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کا مثل بننے کی مشابہت بھی رکھتی ہو، چہ جائیکہ وہ چیز حقیقت میں اس کے مثل ہو! یہ ادنیٰ کے ذریعہ اعلیٰ پر تنبیہ کرنے کے قبیل سے ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا﴾ (الاسراء ۲۳)

کہ معمولی اذیت سے سے صراحتہ ممانعت ہے تو معمولی سے زیادہ اذیت رسانی سے بطریق اولیٰ ممانعت ہوگی۔

دوسرا طریقہ

یہ طریقہ زیادہ دقیق ہے، وہ یہ ہے کہ اس مذکورہ جملے سے مقصود اوّل تشبیہ کی نفی کرنا ہے، اگرچہ اس مضمون کو یوں کہہ کر بھی ادا کیا جاسکتا ہے "لیس کاللہ شیء" یا "لیس مثلہ شیء" لیکن یہ جملہ آیت کریمہ کے مقصد کو پورا ادا نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ آیت ایک حکم کا افادہ دینے کے ساتھ ساتھ مخاطب کی توجہ اس کی عقلی وجہ اور توجیہ کی طرف بھی مبذول کراتی ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب آپ کسی شخص سے کسی اخلاقی نقص وعیب کی نفی کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ "فلان لایکذب ولایبخل" فلاں شخص جھوٹ نہیں بولتا یا بخل سے کام نہیں لیتا۔ تو یہ ایسا کلام ہوگا جو دعویٰ بلا دلیل پر مشتمل ہے، لیکن اگر آپ ایک لفظ کا اضافہ کرتے ہوئے کہیں کہ: "مثل فلان لا یکذب ولا یبخل" یعنی فلاں جیسا انسان جھوٹ نہیں بولتا یا بخل نہیں کرتا۔ تو یہ لفظ "مثل" صرف دوسرے شخص کی طرف مشیر نہیں ہوگا کہ جو ان نقائص سے مبرا ہونے میں اس کے مماثل ہو بلکہ یہ برہان کلی کے ساتھ اس کی نقائص سے براءت پر دلالت کرتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جو شخص اس طرح کی عمدہ صفات واخلاق کا حامل ہوتا ہے وہ اس طرح کا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان صفات کی طبیعت اور موہوم نقص کے درمیان منافات پائی جاتی ہے۔

اس بلیغ اسلوب پر آیت کریمہ وحکیمہ کو رکھتے ہوئے کہا گیا کہ: "مثلہ تعالیٰ لایکون لہ مثل" مراد یہ ہے کہ جس ذات کی ایسی صفاتِ حسنیٰ ہوں اور وہ مثلِ اعلیٰ ہو تو اس ذات کی کوئی شبیہ نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس کی جنس سے دو چیزوں کو وجود دینے کی گنجائش ہوسکتی ہے، لہٰذا ضروری ہوا کہ آیت ہذا میں دو لفظ لائے جائیں کہ ہر ایک مماثلت کے معنی کو ادا کرے تاکہ ان میں سے ایک دعویٰ کے بارے میں رکن کے اور دوسرا دلیل وبرہان کے قائم مقام ہوجائے۔ چنانچہ تشبیہ جس پر حرف کاف دلالت کرتا ہے، اس پر جب نفی داخل ہوئی تو اس سے توحید کا اصل مقصود حاصل ہوا اور لفظ "مثل" جس کی تصریح لفظ اللہ یا اس کی ضمیر کے مقام پر کی گئی ہے یہ اس مطلوب ومقصود کی برہان ودلیل ہے۔

جاننا چاہیے کہ اس توجیہ کی بنیاد پر آیتِ ہذا جس برہان ودلیل کی طرف راہ نمائی کرتی ہے وہ صانع عالم (اللہ تعالیٰ) کی وحدت کے اثبات پر بڑی عمدہ دلیل ہے، ہمارے علم میں نہیں ہے کہ کسی ماہرِ علم کلام نے اس کے متعلق کوئی گفتگو کی ہو، کیونکہ علم کلام کے علماء کے تمام تر دلائلِ وحدانیت اس بات پر قائم ہیں کہ لوازم اور آثارِ عملیہ کے باطل ہونے کی بناء پر تعددِ الٰہ کا قول باطل ہے۔

جیسا کہ اس فرمانِ الٰہی سے معلوم ہوتا ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ (الانبیاء:۲۲)

"اگر زمین وآسمان میں کئی معبود ہوتے اللہ کے سوا تو زمین وآسمان میں فساد آجاتا۔"

لیکن سورۃ الشوریٰ کی مذکورہ آیت سے اس کے علاوہ ایک ایسا معنی معلوم ہوتا ہے جس سے تعدد کا مفروضہ بنیاد سے ہی مخدوش ہوجاتا ہے، اور اس سے آثارِ عملیہ سے قطع نظر استحالہ ذاتی ثابت ہوتا ہے۔ گویا کہ اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ: الٰہ کی حقیقت، ان حقائق میں سے نہیں ہے جو اپنے مفہوم میں تعدد، اشتراک اور مماثلت کو قبول کرتی ہو، ایسا ہرگز نہیں ہے، کیونکہ ان امور کو قبول صرف کمالِ اضافی ناقص ہی کرتا ہے، لیکن کمال تام مطلق، جو معنی الٰہیت کی اساس اور بنیاد ہے، عقل اسے قبول کرنے سے انکاری ہے کہ وہ اس میں مشابہت اور مماثلت کو قبول کرے، اس لیے کہ جب بھی معنی الٰہیت کا تحقق ہوگا تو اس سے اس ذات کا ہر چیز پر تقدم اور ہر امر کی تخلیق وانشاء ﴿فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الشوریٰ:۱۱) ہر چیز پر اس کی سلطنت وغلبہ اور ہر چیز پر اس کی فوقیت اور علومرتبت بھی ثابت ہوگا۔

اگر ان صفات مذکورہ میں دو اشخاص کا اشتراک فرض کرلیا جائے تو ان میں تناقض پیدا ہوگا، اس لیے کہ اس طرح ان دونوں میں سے ہر ایک کا سابق ہونا بھی اور مسبوق ہونا بھی، خالق بھی اور مخلوق ہونا بھی اور برتر بھی اور فروتر ہونا بھی ثابت ہوگا۔ یا پھر کمال مطلق، کمال مقید میں تبدیل ہوجائے گا، اس لیے کہ اس صورت میں ہر ایک دوسرے کی نسبت سے نہ سابق ہوگا اور نہ مسبوق، پھر ان میں سے کسی کو بھی مقام الٰہیت کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔ ﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ آپ نے ملاحظہ کیا کہ ہم نے اس حرف کاف کے بارے میں کتنے وجوہ معانی بیان کیے ہیں، تمام کے تمام کافی اور شافی ہیں، پس اس مثال کو یاد رکھیں اور اس کے ذریعہ اس میزان کی دقت ونزاکت کو جانیں کہ جس پر اس حکیمانہ نظام کی حرف بہ حرف بنیاد رکھی گئی ہے"۔

ڈاکٹر عبداللہ دراز کی یہ گفتگو بہت نفیس اور عمدہ ہے، پس آپ اس کے حصول کی خوب کوشش کریں۔

اسلوبِ قرآن پر ہونے والے شبہات

خدا کے دشمن، قرآن حکیم کے بارے میں نکتہ چینی اور بدخلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ایمان کی راہ میں مختلف اوہام وخیالات کی رسیاں ڈالتے ہیں (یعنی روڑے اٹکاتے ہیں)، ان میں ان کے وہ شبہات بھی شامل ہیں جو انہوں نے قرآن کے اسلوب پر کیے ہیں، اس کتاب کی جلد اوّل صفحہ نمبر ۷۲ تا صفحہ ۷۴ نیز صفحہ ۱۹۹ تا صفحہ ۲۳۲ پر وہ شبہات مع ان کے جوابات شرح وبسط کے ساتھ ذکر کردیے ہیں۔

اس کے لیے اس مقام کو دیکھ لیجیے۔

(واللہ یتولّی بتوفیقہ ھدانا وھداك وھو حسبنا ونعم الوکیل)

بحث ⑰

اعجاز قرآن اور اس سے متعلقہ مسائل

"اعجاز القرآن" ترکیب اضافی کے ساتھ ہے، لغت کے اعتبار سے اس کے معنی ہوتے ہیں: قرآن کا مخلوق کو اس چیز کے پیش کرنے سے عاجز ثابت کرنا جس کا اس نے ان کو چیلنج دیا ہے۔ یہ اصل میں مصدر کی اس کے فاعل کی طرف اضافت ہے، اور اس کا مفعول اور متعلق بالفعل معلوم ہونے کی بناء پر محذوف ہے، اصل عبارت یوں تھی: "اعجاز القرآن خلق الله عن الاتیان بما تحداھم به" لیکن مذکورہ تعجیز مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ اس کا لازم معنی مقصود ہے اور وہ اس بات کا اظہار ہے کہ کتاب اللہ برحق ہے اور اس کتاب کے لانے والے رسول ﷺ بھی سچے ہیں، انبیائے کرام علیہم السلام کے تمام معجزات کا حال ایسا ہی ہوتا ہے کہ ان سے مقصود مخلوق کو بالذات عاجز کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا لازم معنی مراد ہوتا ہے، یعنی ان معجزات کا اس بات پر دلالت کرنا کہ وہ انبیاء ورسل علیہم السلام ان امور میں بالکل سچے ہیں جن کی وہ اللہ کی طرف سے دعوت وتبلیغ کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ جان لیتے ہیں کہ وہ ان معجزات کا مقابلہ کرنے سے عاجز اور بے بس ہیں، اس طرح انہیں معلوم ہو جاتا ہے اور اس پر ایمان لے آتے ہیں کہ یہ تمام تر معجزات قادرِ مطلق ذات کی طرف سے کسی حکمت بالغہ کے تحت صادر ہو رہے ہیں جس کا مقصد ان معجزات کے پیش کرنے والے پیغمبر ﷺ کی تصدیق کی طرف رہنمائی کرنا ہوتا ہے، تا کہ اس پیغمبر کی اتباع واطاعت سے دنیا وآخرت کی سعادت حاصل کر سکیں۔

ہم نے اس کتاب کی تیسری بحث میں معجزہ کی حقیقت، معجزہ اور سحر وغیرہ میں فرق بھی بیان کر دیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ معجزہ حق کی تائید اور رسولوں کی تصدیق پر کس طرح دلالت کرتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس کی مثالیں اور شبہات مع جوابات بھی ذکر کر دیئے ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے کتاب کی جلد اوّل صفحہ ۵۶ تا ۸۴ کی طرف مراجعت کیجیے۔

اس سے قبل کہ ہم اپنے اس موضوع پر بحث کا آغاز کریں آپ کو یہ بتادیں کہ ہم یہاں پر نسبتِ قرآن کی نفی کرنے کے بارے میں صرف سیدنا محمد ﷺ کا خاص طور سے ذکر کریں گے، اوّلاً اس لیے کہ یہ بات واضح ہے کہ ابتداء سے ہی یہ امر اکثر لوگوں کے ہاں اشتباہ اور نزاع کا محل رہا ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ قرآن کی طبیعت اس بات سے انکاری ہے کہ آنحضور ﷺ جو افضل الخلق ہیں، ان کی جانب اس کی تالیف کی نسبت کی جائے، تو دوسروں کی طرف نسبت کرنے سے بطریق اولیٰ اس کی طبیعت انکاری ہوگی۔

جب اس بات پر دلیل سالم ومحفوظ ہے کہ قرآن، اللہ وحدہ کا کلام ہے پیغمبر اسلام کی نبوت اور قرآن کی تمام تعلیمات وہدایات محفوظ ہیں، اسلام بھی بلکہ تمام مذاہب صحیحہ اور کتب الٰہیہ محفوظ ہیں، اس لیے کہ روئے ارض پر اس کتاب کے سوا اور کوئی مقبول شہادت باقی نہیں رہی جسے اللہ تعالیٰ نے تمام سابقہ انبیاء علیہم السلام کے ادیان ونبوت کے لیے دلیل بنایا اور تحریف وتغلیط کرنے والوں کی اغلاط کے لیے مصحح بنایا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ﴾ (المائدہ:۴۸)

"اور ہم نے تجھ پر سچی کتاب اتاری جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کے مضامین پر نگہبانی کرنے والی ہے۔"

ایک شاعر کہتا ہے:

الله اکبر، إن دین محمد — وکتابه أهدی وأقوم قیلا

لاتذکروا الکتب السوالف عنده — طلع الصباح فأطفؤا القندیلا

"اللہ اکبر! بلاشبہ دین محمدی ﷺ اور ان کی کتاب سب سے زیادہ ہدایت دینے والی اور درست بات کہنے والی ہے، اب سابقہ کتابوں کا ذکر مت کرو، کیونکہ صبح کی روشنی طلوع ہو چکی ہے پس چراغ بجھا ڈالو۔"

وجوہِ اعجازِ قرآن

جو شخص اس کتاب مقدس میں بنظر انصاف غور کرتا ہے اسے اعجاز کی مختلف بہت سی وجوہات دکھائی دیتی ہیں جس طرح ایک ہیرے کے ٹکڑے کو مختلف زاویوں سے دیکھو تو اس کے متعدد اور عجیب رنگ نظر آتے ہیں اور ہر دیکھنے والے کا انداز دیکھنے کا بھی مختلف ہوتا ہے اور ہیرے کے ٹکڑے کے زاویے بھی مختلف ہوتے ہیں۔

اب ہم ایسے وجوہ اعجاز بیان کرنے لگے ہیں جو ہماری نظر میں تمام معائب سے محفوظ ہیں، اس کے بعد ان وجوہات کو لائیں گے جو ہماری نظر میں نقائص وعیوب سے محفوظ نہیں ہیں۔

پہلی وجہ: زبان واسلوب

قرآن کے اعجاز کی پہلی وجہ اس کی زبان اور اسلوب ہے۔ جیسا کہ ہم سابقہ بحث میں اس کی تفصیل ذکر کر آئے ہیں۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ قرآن نے ایسا دلکش اور سحر انگیز اسلوب پیش کیا ہے جو ان بلند خصوصیات پر مشتمل ہے جن کو ہم نے بیان کیا ہے، اس طرح کی کوئی ایک خصوصیت بھی کسی دوسرے کلام میں موجود نہیں ہے جو اس قرآن میں موجود ہے، اور جو چیز اس قبیل سے ہو وہ یقیناً معجز ہوا کرتی ہے، خاص طور پر جب نبی کریم ﷺ نے بھی اس کا لوگوں کو چیلنج دیا ہو اور اساطینِ فصحاء اور شہسوارانِ فصاحت کو عاجز اور ماہرینِ فن بیان وبلاغت کو گونگا بنا دیا ہو اور پھر یہ چیلنج بھی ایسے دور میں کیا گیا ہو جب اس میدانِ مسابقت میں لوگوں کی مہارت ودسترس بھی کامل طور پر موجود تھی، اور ایسی قوم کو وہ چیلنج کیا گیا ہو جو اس پہلو کے اعتبار سے فائق ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہو۔

جب ایسے ایسے ماہرین معارضہ قرآن سے عاجز آ گئے تو دوسرے تو عجز اور بے بسی میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں۔

مزید برآں کہ اس عربی زبان پر زمانہ نزولِ قرآن سے دورِ حاضر تک کئی مختلف ادوار گزرے ہیں، جن میں عروج وزوال کا دور بھی ہے، وسعت وتنگی کا زمانہ بھی ہے، حرکت اور جمود کا بھی دور ہے، حضاریت اور بدویت کا دور بھی ہے لیکن قرآن ان تمام ادوار میں اپنی بلندی پر قائم رہا ہے، تمام لوگوں پر شبنم برساتا ہے، نور وہدایت کو پھیلاتا رہا اور اپنی شیرینی اور عظمت کا فیضان بہاتا رہا، اپنی فصاحت وبلاغت کا دریا بہاتا رہا، اپنا حسن اور رونق سے عالم کو دوبالا کرتا رہا، آئندہ بھی تازہ اور ہری شاخ کی طرح اعجاز کا علم اٹھائے رکھے گا، اور ببانگ دہل پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ تمام عالم کی امتوں کو چیلنج کرتا رہے گا اور حق بات پوری صراحت وقوت سے اور اعجاز کی قوت وشوکت سے یہ کہہ کر بیان کرتا رہے گا کہ:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ

ظَهِيرًا﴾ (الاسراء:۸۸)

"کہہ دو اگر تمام انسان اور جن مل کر بھی ایسا قرآن لانا چاہیں تو ایسا نہیں لا سکتے اگرچہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار کیوں نہ ہو۔"

قرآن کی معجزانہ مقدرات

پھر اس قرآن اور اہل عرب کا معاملہ بڑا عجیب ہے کہ قرآن سے ان کو مقابلہ کے لیے مہلت فراہم کی، پہلے پورے قرآن جیسا کلام لانے کا چیلنج کیا پھر اس کو چھوڑ کر دس سورتیں اس جیسی لانے کا چیلنج کیا، پھر اس سے کم درجے میں آ کر اس طرح کی ایک سورت ہی پیش کرنے کا چیلنج کیا، لیکن وہ لوگ اس کے باوجود اپنی عاجزی اور ہزیمت وشکست میں ہی بڑھتے گئے اور قرآن، اس چیلنج اور مہلت کے ہر عرصے میں کامیابی اور کامرانی ہی میں بڑھتا گیا اور اس کی فتح ونصرت میں ہی اضافہ ہوتا گیا۔

ذرا تصور کیجیے! قرآن نے سورۃ الطور میں پہلی بار چیلنج کرتے ہوئے ان سے کہا کہ:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (الطور:۳۳-۳۴)

"یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے خود بنا لیا ہے بلکہ وہ ایمان ہی نہیں لاتے پس کوئی کلام اس جیسا لے آئیں اگر وہ سچے ہیں۔"

جب وہ اس سے عاجز آ گئے تو ان کی طرف رسی مزید دراز کی، اور سورۃ ھود میں فرمایا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾

"کیا وہ کہتے ہیں کہ تو نے قرآن خود بنا لیا ہے کہہ دو تم بھی ایسی دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکو بُلا لو اگر تم سچے ہو پھر اگر تمہارا کہنا پورا نہ کریں تو جان لو کہ قرآن اللہ کے علم سے نازل کیا گیا ہے اور یہ بھی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس کیا تم فرماں برداری کرنے والے ہو۔" (ھود:۱۳-۱۴)

پھر جب وہ اس بار بھی عاجز رہے تو قرآن نے ایک اور بار ان کو مہلت اور ڈھیل دی اور رسی بالکل ڈھیلی چھوڑ دی اور سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (البقرۃ:۲۳-۲۴)

"اور اگر تمہیں اس چیز میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو ایک سورت اس جیسی لے آؤ اور اللہ کے سوا جس قدر تمہارے حمایتی ہوں بُلا لو اگر تم سچے ہو بھلا اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"

اب تو ان لوگوں کی عاجزی بہت قبیح ہو گئی اور اللہ نے ہمیشہ کے لیے ان پر ہزیمت وشکست کی مہر لگا دی کہ وہ ایسا نہ کر سکے اور نہ کبھی کر

سکیں گے۔ان کی دلیل وحجت بے بنیاد ثابت ہوئی اور وہ پوری طرح رسوا بھی ہوئے، اور اللہ کا حکم غالب آ گیا اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس سے ناگواری محسوس کر رہے ہیں۔

اس تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ قرآن مجید کی معجزانہ مقدار تو مختصر ترین چھوٹی سورت تھی، معتزلہ جو یہ کہتے ہیں کہ معجز پورا قرآن تھا نہ کہ اس کا بعض حصہ یا معجز ہر وہ چیز ہے جس پر قرآن کا اطلاق درست ہوتا ہو، خواہ ایک سورت سے بھی کم حصہ ہو، یہ سب باتیں راہ صواب سے ہٹی ہوئی ہیں اور ایسے لوگ ان آیات سے غافل ہیں۔

معارضۂ قرآن

کیا آپ کو مخالفین کی خبر ہے کہ جب انہوں نے قرآن کا معارضہ کرنے کی ٹھانی، انہوں نے معارضہ کے نام پر جو کچھ بھی پیش کیا اس کی حیثیت مضحکہ خیز امر کی تھی اور وہ شرمندگی کا ہی باعث بنی کہ لوگوں کے سامنے ان چیزوں نے ان کو پانی پانی کر دیا اور ہنسنے پر مجبور کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کے غضب اور لوگوں کی ناراضگی سے دو چار ہوئے، ان کا حق کے مقابلے میں پچھڑنا ایک نئی کامیابی اور اس امر کی مادی دلیل ہے کہ قرآن اللہ وحدہ لاشریک کا کلام ہے جو قادر مطلق ذات ہے، کوئی انسان اور جن اس کا معارضہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، جسے کوئی شک ہو وہ آ جائے میدان میں!۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دعویٰ کیا کہ اسے قرآن کی طرح کا کلام وحی کے ذریعہ پہنچتا ہے، پھر لوگوں کے رو برو ان بیہودہ کلام کو لے کر کھڑا ہوا: "ان اعطیناك الجماهر، فصل لربك وجاهر"

نیز اس طرح کا نامعقول کلام پیش کیا کہ: "والطاحنات طحنًا، والعاجنات عجنًا، والخابزات خبزًا۔" آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طرح کا پھسپھسا کلام معارضہ اور مقابلے سے ذرا بھی تعلق نہیں رکھتا ہے۔ ایک طرف طوطے کا نقل اتارنا اور دوسری طرف ایک انسان کی شستہ گوئی! ایک جانب قرآن کے بلند الفاظ اور معانی اور دوسری طرف اس طرح کے سوقیانہ اور گرے پڑے الفاظ!

معارضہ تو زبان واسلوب اور معانی کے اعتبار سے یا تو اصل کے برابر، امر پیش کر کے ہوتا ہے یا اس سے اعلیٰ اور برتر امر پیش کر کے ہوتا ہے، ادبِ عربی کے بڑے عالم وحجت امام رافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: مسیلمہ کذاب نے قرآن سے معارضہ اس کے بلاغی پہلو سے کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا، اس لیے کہ یہ پہلو اس پر خوب واضح تھا، ایسا نہیں تھا کہ یہ پہلو اس پر مشتبہ ہو یا وہ کسی عرب کے آدمی پر اس پہلو کو مشتبہ کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔ بلکہ وہ ایک دوسرے پہلو سے اپنی قوم کو بہکانا چاہتا تھا اور اس کو وہ آسان خیال کرتا تھا اور اس پہلو کو لوگوں کے لیے پر تاثیر سمجھتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اہل عرب کو دیکھا تھا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کاہنوں کی بڑی تعظیم کیا کرتے تھے اور کاہنوں کا عام اسلوب بڑا مقفّٰی قسم کا ہوتا تھا، لوگ سمجھتے کہ یہ کوئی جنات کا کلام ہے، جیسے وہ کہتے: "یاجلیح، أمر نجیح، رجلٌ فصیح: یقول لا اله الا الله"① (اے چست و چالاک شخص، کامیابی کی طرف لے جانے والا ایک امر ظاہر ہونے والا ہے اور ایک فصیح شخص کہے گا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے)۔ وہ مسیلمہ قرآن کی نقل اتارنے میں اس طرح کے مسجع کلام بنا کر لوگوں کو یہ وہم ڈالتا کہ یہ بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی کی طرح ہے جو مجھ پر آتی ہے، گویا نبوت اور کہانت ایک ہی نوع ہے، اس کے باوجود وہ اس تدبیر اور حیلہ سازی میں ناکام رہا، اس کے بہت سے پیروکار بھی اس کی کذب بیانی اور حماقت سے

① رواہ البخاری فی المناقب، اسلام عمر رضی اللہ عنہ

واقف تھے اور یہ کہتے تھے کہ: اسے کہانت میں مہارت حاصل نہیں ہے اور نہ ہی وہ دعویٰ نبوت میں سچا ہے۔ اس کے باوجود وہ مسیلمہ کے پیچھے بس اس طرح سے لگے ہوئے تھے جس طرح کہنے والا کہتا ہے کہ: قبیلہ ربیعہ کا کذاب، مصر کے صادق اور سچے آدمی کے مقابلے میں ہمیں زیادہ محبوب ہے۔

نیز تاریخ نقل کرتی ہے کہ ایک مرتبہ ابو العلاء المعری، ابو الطیب المتنبی اور ابن المقفع کو بھی سوجھا کہ وہ قرآن کا معارضہ کریں، لیکن انہوں نے اس کے لیے کوشش کا آغاز کرتے ہی اپنے قلم توڑ کر اور کاغذ پھاڑ کر اس کا اختتام کر دیا، اس لیے کہ انہوں نے خود کو دیکھا لیا تھا کہ ان کے لیے یہ کوشش کرنا محال ہے، میرا اور مجھ سے پہلے لوگوں کا غالب گمان یہ ہے کہ وہ لوگ قرآن کی بلاغت اور اس کے اعجاز کا شروع سے اعتقاد رکھتے تھے، وہ بس یہ چاہتے تھے کہ ایک نئی دلیل ان دلائل کے ساتھ شامل کر دیں جن کا انہوں نے حاسہ بیانیہ کے ذریعہ لطف اٹھایا ہے، اگر اس طرح کے لوگ قرآن کی بلاغت اور اس کے اعجاز سے لطف اندوز نہ ہوتے تو پھر ان کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں؟!

قریب زمانہ میں پتہ چلا ہے کہ فرقہ بہائی اور قادیانی نے چند کتابیں وضع کی تھیں جن کے بارے ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کے ذریعہ قرآن کا معارضہ کریں گے، لیکن پھر انہیں کچھ اندیشہ ہوا اور ان کتابوں کو لوگوں کے سامنے لانے سے خجالت و شرمندگی کا شکار ہو گئے، اور ان کو چھپا لیا، لیکن امید ہے کہ حالات تبدیل ہونگے اور لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا جب اس طرح کی نامعقول چیزیں ظاہر ہونگی جب لوگ عربی زبان اور اس کے آداب و علوم سے خوب واقف ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں اور ان کی امیدوں کو ناکام کریں!۔

قرآن میں ہزارہا معجزات ہیں

اس سے پہلے یہ بات ہمارے علم میں آئی تھی کہ قرآن میں چھ ہزار دو سو سے زائد آیات ہیں، نیز ابھی یہ معلوم ہوا کہ چیلنج کی رسی دراز ہوتے ہوتے ایک سورت تک جا پہنچی، اور سورت کا اطلاق سورۃ الکوثر پر بھی ہوتا ہے جس کی محض تین چھوٹی آیات ہیں۔ ایک آیت یا چند طویل آیات کا بھی ایک سورت کے برابر حکم ہوتا ہے، اور اسلوب قرآن کی سات خصوصیات ایسی ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی بدرجہ کمال کسی دوسرے کلام میں نہیں پائی جاتی جیسا کہ ابھی سابقہ بحث میں ہم اس پر شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ قرآن ہزارہا معجزات پر مشتمل ہے، کسی ایک معجزہ پر مشتمل نہیں جیسا کہ بعض سادہ لوح اور سطحی قسم کے لوگ کہتے ہیں!

جب ہم اس پر آئندہ بیان ہونے والے وجوہِ اعجاز کا اضافہ کریں گے جو قرآن کے مقام کو مزید بلند کرتی ہیں تو ہمارے سامنے متنوع اور متفرق معجزات آئیں گے جو تعداد و شمار سے باہر ہونگے، اللہ کی ذات پاک ہے کہ جس نے فرد سے امت اور شے واحد سے کثیر اشیاء بنا دیں! فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ۧ﴾ (العنکبوت: ۵۱)

"کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب نازل کی جو ان پر پڑھی جاتی ہے بے شک اس میں رحمت ہے اور ایمان والوں کے لیے نصیحت ہے۔"

نیز فرمایا: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الحشر:۲۱)

"اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ اسے دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے جھک کر پھٹ جاتا۔"

نیز فرمایا:

﴿وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ﴾ (الرعد:۳۱)

"اور اگر تحقیق کوئی ایسا قرآن نازل ہوتا کہ جس سے پہاڑ چلتے یا اُس سے زمین کے ٹکڑے ہو جاتے یا اس سے مُردے بول اُٹھتے۔"

قرآن کے معجزات لازوال ہیں

یہاں پر ہم اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ قرآن کے لیے بمع ان کثیر معجزات کے جن پر وہ مشتمل ہے ابدیت کی مہر لگ چکی ہے، چنانچہ وہ گردش ایام کے ساتھ نہ ہی ختم ہوا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے وصال سے اس کا خاتمہ ہوا بلکہ وہ اب بھی دُنیا کے روبرو کھڑا ہے، ہر جھٹلانے والے سے جھگڑتا ہے، ہر منکر کو چیلنج دیتا ہے اور تمام اقوام عالم کو اپنے اندر سموئی ہوئی اسلام کی ہدایت اور بنی آدم کی سعادت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اور اس سے حضور نبی کریم ﷺ کے معجزہ اور آپ ﷺ کی انبیاء برادری کے معجزات کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے معجزات صرف قرآن ہی میں ہزاروں کی تعداد میں ہیں، اور قرآن آج بھی اور آج کے بعد بھی صفت بقاء سے موصوف رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ زمین اور اُس پر بسنے والوں کا مالک ہو جائیں۔

لیکن تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات محدود تعداد میں اور قلیل مدت کے لیے تھے، ان کے زمانہ بعثت کے ختم ہونے سے وہ بھی گزر گئے اور ان کے چلے جانے سے انہیں بھی موت آ گئی، اور جو شخص اب بھی ان کا طلبگار ہو تو وہ ماضی کے خبروں میں ہی انہیں پا سکتا ہے اور ان کا واحد شاہد صرف قرآن اب باقی ہے، اور یہ ایک ایسا احسان ہے جو اس قرآن نے تمام کتابوں، انبیاء علیہم السلام اور صحیح مذاہب پر فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ (المائدۃ:۴۸)

"اور ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف ہے اور اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی بھی تصدیق کرتی ہے اور ان کی محافظ ہے۔"

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟﴾ (البقرۃ:۲۸۵)

"اعتقاد رکھتے ہیں رسول اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور مومنین بھی سب کے سب

اعتقاد رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں اور رسولوں کے ساتھ، ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔"

اس انتخاب کی وجہ حکمت

یہاں ہم کچھ توقف کرتے ہیں تا کہ ہم یہ بات جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اس امر کی متقاضی ہوئی کہ اسلام کا یہ معجزہ ابدی طور پر باقی رہے، تا قیامت اسلام کو قوت وشوکت عطا کرتا رہے، تا کہ کسی کو بھی اس آخری دین کے ترک کرنے پر کوئی عذر یا بہانہ نہ مل سکے، جو دین تمام ادیان وشرائع کا خاتم کرنے والا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ارادہ فرمایا کہ اسلام کا معجزہ ایک ایسی چیز ہو جس میں بقا کی صلاحیت موجود ہو جو دوسرے کلام کے مقابلہ میں ایسا کلام ہو جس کی زمانہ بھر تلاوت ہوتی رہے، ہر دور میں اسے پڑھا جاتا رہے، اور اس میں اعجاز کے بعض اسرار فصاحت وبلاغت کے ایسے مرتبہ فائز ہیں کہ تمام مخلوق ان کا مقابلہ کرنے سے بالکل عاجز ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی رحمت ہے کہ جس زبان سے اس معجزہ کی ساخت وپرداخت ہوئی ہے وہ یہی عربی زبان ہے دیگر زبانیں نہیں ہیں۔ اس لیے کہ عربی زبان، بعثت نبوی ﷺ کے وقت قوم عرب میں اپنے اہتمام فخر ومباہات اور ماہرین کی دستیابی کے اعتبار سے اوج کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ قوم عرب کو اس بات پر کامل دسترس حاصل تھی کہ وہ کلام پر نقد وتبصرہ اور ان میں موازنہ بآسانی کر کے اس کے کھرے کھوٹے کو پرکھ سکتے تھے، اور ہر کلام کو اس کے مقررہ درجے یعنی اعلیٰ یا ادنیٰ مقام پر رکھ سکتے تھے، اور اس پہلو سے ان کی مہارت اس تک لوٹ آئی کہ وہ اپنی زندگی میں اس سے واقف ہوئے اور اس کے پس پردہ پائی جانے والی عظمت کو تلاش کر چکے تھے اور اس پر اپنی امیدیں لگا چکے تھے۔

یہ بات واضح رہے کہ قوم عرب کی طبیعت اور سرشت میں تھا کہ وہ ببانگ دُھل اپنی رائے کا اظہار کرتے، وہ نفاق یا تذبذب کے نام سے بھی واقف نہ تھے، وہ اس سے بڑھ کر بہادر تھے، ذلت سے انہیں نفرت تھی اور ظلم وزیادتی سے گھن کھاتے تھے، چاہے اس کے لیے انہیں کس قدر مال خرچ کرنا پڑتا یا خون ریزی کرنا پڑتی۔ لیکن جب قرآن نازل ہوا تو یہ آزاد خود دار اور اپنی زبان پر غیور قوم کو اس کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے اور اس کلام اللہ کی سلطنت وبلاغت کے سامنے جھکنا ہی پڑا، اور اس کلام کی شیرینی سے لطف اندوز ہونے اور اس کے اعجاز کے چھو لینے کے بعد پورے ہوش وحواس کے ساتھ اس پر ایمان ویقین کرنے لگے۔

اور اس قوم نے اپنی ناقدانہ عربی صلاحیت اور روشن اور واضح صاف گوئی کی بدولت اور اپنی نادر ونایاب اور فائق وبرتر شجاعت وبہادری کے سبب یہ فیصلہ کیا کہ یہ ذکر حکیم بشر اور غیر بشر میں سے کسی بھی مخلوق کا کلام نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ محض حکیم وحمید ذات کا نازل کردہ کلام ہے۔ یہ شہادت اور خود اس کے مشاہدین اس لائق ہیں کہ سارا عالم اسے قبول کر کے اس کے ذریعہ کامیابی پا سکتے ہیں، کیونکہ اس دور کے فیصلہ کرنے والی کمیٹی نے اسے قبول کر کے اس کے حق میں شہادت دی، وہ لوگ اہل فن تھے، دو کلاموں میں مقابلہ اور موازنہ کرنا خوب جانتے تھے، اس لحاظ سے ان کی یہ بات قابل اعتبار تھی اور لائق اطمینان بات یہ تھی کہ وہ سب عادل اور منصف مزاج تھے، مداہنت اور چاپلوسی سے واقف نہ تھے، بلکہ ان لوگوں کی یہ شہادت سب زیادہ پاکیزہ ومطہر اور مضبوط وقوی ہے، کیونکہ یہ شہادت، نزول قرآن کے وقت اعدائے قرآن سے صادر ہوئی جس سے قبل وہ تمام تر کوششیں اور طاقتیں آزما چکے تھے جس نے ان کو پوری طرح لاجواب اور خوب جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ دشمن کا گواہی دینا ہی باعث فضیلت ہوا کرتا ہے۔

قرآن اور حدیث کا اسلوب

اس موقع پر مفید اور دافع اشتباہ ایک بات یہ ہے کہ آپ قرآن کا اسلوب اور حدیثِ نبوی ﷺ کا اسلوب جاننے کے بعد اس قرآن کے مقام اعجاز کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اور اس بات پر اس سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ روز اوّل سے لے کر آج تک ہزاروں کتب سنت زیور تحریر سے آراستہ ہوئیں جن کا مشرق ومغرب میں بڑا کردار ہے، جسے بھی عربی بلاغت سے کوئی تعلق اور ذوق ہوگا وہ پکار پکار کر کہے گا کہ آیئے قرآن وحدیث کے حد انتہاء کو پہنچے ہوئے اسالیب کو اپنے ذوق بلاغت سے محسوس کیجیے اور اپنے وجدان سے یقین کر لیجیے کہ قرآن حکیم کا اسلوب، احادیث نبویہ ﷺ کے اسلوب کے مقابلہ میں اعلیٰ وبرتر ہے، ایسا بلند ہے کہ خارق عادت ہے، طاقت بشری سے باہر ہے، گو کلام رسول ﷺ اپنے حسن وجمال، عظمت وجلالت اور جودت وندرت کے اعتبار سے ایسا ہے کہ اس نے بہترین انسان کے لیے اس کو بہترین اور فصیح ترین کلام بنا دیا ہے۔

ان فروق کے علاوہ ان میں کچھ فنی فروق بھی ہیں جن کا ادراک صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں عربی زبان کی معرفت اور عربی ذوق سے حصہ وافر عطا ہوا ہو، جن کی طبیعت ہی فصیح زبان پر ڈھلی ہو اسی کی ترقی اور ترویج میں گوشہ نشیں ہو گئے ہوں، جو فصاحت لسانی اور علو بیانی کے بارے میں خود کو فائق اور برتر خیال کرتے ہیں۔

وہ خود کو اس میدان میں اس قدر بلند وبرتر خیال کرتے تھے کہ وہ اپنے فصاحت سے پر کلام منظوم اور بلاغت سے بھرپور کلام منثور کے ذریعہ دوسروں پر اپنا فخر ومباہات ظاہر کرنے کے لیے مقابلہ بازی کی مجالس لگا لیا کرتے تھے، حتیٰ کہ قصیدے کا ایک ہی شعر جو مدح وتعریف میں شاندار ہوتا قبیلے کا رتبہ بلند کر دیتا اور اسی طرح ایک ہی شعر جو اس کی مذمت میں کہا جاتا وہ اسے مقام سے گرا دیتا تھا۔

اہل عرب تو نزول وحی سے پہلے سے ہی پیغمبر علیہ السلام اور آپ ﷺ کی قدرت کلامی سے خوب واقف تھے اس لیے کسی بھی منصف مزاج کے دل میں یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ قرآن محمد ﷺ کا کلام ہے، اس لیے کہ وہ قرآن کی لغت اور رسول کریم ﷺ کی لغت میں واضح فروق کو جانتے تھے۔

مزید برآں کہ آنحضور ﷺ دوران پرورش لوگوں میں خطابت، کتابت اور شعر گوئی جیسے کسی وصف سے معروف نہ تھے۔ اس طرح آپ ﷺ کے بارے میں کہیں منقول نہیں کہ آپ ﷺ ان لوگوں کے ان عام بازاروں اور میدانوں میں شریک ہوئے ہوں جو وہ بیان وبلاغت میں مسابقت کے لیے قائم کیا کرتے تھے، بلکہ آپ ﷺ کا حال یہ تھا کہ عزلت نشیں رہتے، اپنے حال میں مگن رہتے، لوگوں سے بے رغبت رہتے تھے۔ نبوت سے قبل آپ ﷺ صادق مشہور تھے، کبھی کسی نے آپ ﷺ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا، آپ ﷺ ایسے امانت دار تھے کہ کبھی خیانت نہیں کی، ممتاز اور بلند اخلاق کے مالک تھے، مبارک رائے اور مشورہ والے تھے۔

کیا یہ بات معقول ہو سکتی ہے کہ جس شخص نے اس طرز پر اپنی جوانی اور بڑھاپے کا دور گزارا ہو وہ شیخوخت کی عمر میں پہنچ کر سارے عالم کو ایک چیز کی ترغیب اور چیلنج دیدے اور اس سے قبل اس نے کسی کو اس کی ترغیب اور چیلنج نہ دیا ہو، بلکہ حیا وتواضع اس میں موجود ہو اور خلقِ خدا سے جس نے کبھی زبان درازی نہ کی ہو؟

نیز کیا یہ بات تصور میں بھی آ سکتی ہے کہ ایسا انسانِ کامل بچپن میں جوانی میں اور بڑھاپے میں ہر زمانے میں کذب بیانی سے پرہیز کرتا ہو اور پھر سن شیخوخت کو پہنچ کر جھوٹ بول سکتا ہے اور وہ بھی خدائے تعالیٰ پر قبیح ترین جھوٹ؟! (نعوذ باللہ)

جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَ لَمْ یُوْحَ اِلَیْہِ شَیْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ﴾ (الانعام: ۹۳)

"اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا کہے کہ میری طرف وحی کی گئی ہے حالانکہ اس کی طرف کوئی چیز بھی وحی کے ذریعہ نہیں بھیجی گئی اور جو کہے کہ میں بھی اللہ کی طرح نازل کرسکتا ہوں۔"

قرآن مجید میں کلامِ متلو پایا جاتا ہے جس میں کوئی کلمہ یا حرف ناقص نہیں ہے۔ اللہ کی اپنے بندوں پر وسیع رحمت ہے کہ اس کتاب کے سوا کسی بھی امت کی کوئی بھی کتاب اس مقام ورتبہ کو حاصل نہ کرسکی، یہ اللہ کی یہ ایسی کتاب ہے کہ ہر دور میں اس بحر ناپیدا کنار سے پیاسے سیراب ہوتے ہیں، اور تمام منصف مزاج لوگ ہر علاقے میں اسی ہدایت ربانی کو اپنا ہادی بناتے ہیں، اور اس میں موجود الوہیت کی علامات سے کسب کرتے رہے ہیں اس کے ہر افق کی پیروی کرتے ہوئے، قرآن اس کی تصدیق میں کہتا ہے:

﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾ (فصلت: ۵۳)

"ہم اپنی نشانیاں ان کو افق عالم میں اور خود ان کی جانوں میں دکھائیں گے یہاں تک ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ کلام برحق ہے۔"

نیز فرمانِ نبوی ﷺ ہے: "انبیاء میں سے ہر نبی کو کچھ نشانیاں عطا ہوئیں اس کے مثل پر لوگ ایمان نہیں لائے اور مجھے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی جو کچھ عطا فرمایا ہے مجھے امید ہے کہ میں قیامت کے روز تابعداروں کے اعتبار سے ان میں سب سے زیادہ ہوں گا۔"[۱]

دوسری وجہ: طرزِ تالیف

اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن، ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا بلکہ واقعات اور پیش آمدہ اسباب ودواعی کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے بیس سال سے زیادہ عرصہ میں نازل ہوا، جیسا کہ کتاب ہذا کی تیسری بحث میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ جب بھی قرآن حکیم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو رسول کریم ﷺ فرماتے کہ: اس کو فلاں سورت کی فلاں جگہ پر رکھ دو، آپ ﷺ ظاہری بات ہے کہ ایک بشر تھے، آپ کو معلوم نہ تھا کہ کس قسم کے دن آنے والے ہیں، آئندہ زمانے میں کیا ہونے والا ہے؟ اس امر کا آپ ﷺ کو ادراک نہیں تھا کہ کیا کیا اسباب اور دواعی پیدا ہونے والے ہیں؟ چہ جائیکہ آپ کو اس کے بارے میں نازل ہونے والے احکام معلوم ہوتے! پھر طویل عمر گزر گئی آنحضور ﷺ اسی صورت حال میں رہے اور قرآن رفتہ رفتہ نازل ہوتے ہوتے مکمل ہو جاتا ہے جس کی شان یہ ہے کہ اس کے کلمات باہمی مربوط ومتصل ہیں، اس کے اندر کسی قسم کا تفاوت اور تضاد موجود نہیں ہے، بلکہ اس میں الفاظ کی یکسانیت، اور ہم آہنگی جیسی انواع

---

[۱] (رواہ البخاری فی فضائل القرآن، باب(۱)، ومسلم فی الایمان، حدیث (۲۳۹)

اعجاز موجود ہیں، حتیٰ کہ وہ شخص جسے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا، اس کے دل میں اس بات کا خیال بھی نہیں آ سکتا کہ اس کا نزول نجماً نجماً ہوا ہے۔ آپ جس قدر اس میں غور کر لیں اور جستجو اور تلاش کر لیں آپ کو ان سورتوں میں جو ایک ہی بار نازل ہوئیں اور جو تھوڑی تھوڑی کر کے نازل ہوئیں ان دونوں میں فرق نہیں کر سکتے کہ دونوں میں اس قدر مستحکم ربط و تعلق موجود ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ تو سال میں اَسّی سے زائد مرتبہ مختلف حصوں میں نازل ہوئی اور اس کے مقابلہ میں سورۃ الانعام مفسرین کے قول کے مطابق ایک ہی بار نازل ہوئی ہے۔

اب آپ ان دونوں سورتوں کے درمیان الفاظ وکلمات کے نظم، معانی کی دقت و بلاغت اور فنی وحدت و یکسانیت کی حیثیت سے فرق نہیں پائیں گے۔ اسی طرح اگر آپ سورۃ الضحیٰ، سورۃ اقراء اور سورۃ الماعون کی تلاوت کریں گے تو ان میں اور ان کی طرح دیگر چھوٹی سورتوں کے درمیان بھی وحدت و یکسانیت اور استحکام کے اعتبار سے کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا حالانکہ مذکورہ تینوں سورتیں متفرق طور پر نازل ہوئی ہیں۔

اب ان امور کے پیش نظر اپنے رب کو حاظر وناظر جانتے ہوئے بتایئے کہ کوئی عقل و دانش رکھنے والا انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ محمد ﷺ کا یا کسی اور کا کلام ہے! حالانکہ آپ کو معلوم ہے اس کے نزول کے اوّل حصے اور آخری حصے کے درمیان کس قدر زمانی بُعد اور فاصلہ موجود ہے، نیز جبکہ آپ کو پتہ ہے کہ ہر نازل ہونے والے حصے کا اس وقت کے کسی واقعہ سے ربط و تعلق ہوتا ہے! اور پھر جبکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن کے متفرق نازل ہونے والے ان حصوں کی ترتیب بھی موجودہ ترتیب کے مطابق نہیں ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کا سب سے اوّل نازل ہونے والا حصہ (سورۃ اقراء کی ابتدائی آیات) قرآن میں سب سے آخر میں جا کر مندرج ہے، اور اس کا سب سے آخر میں نازل ہونے والا حصہ آیت قرآنی: ﴿وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ﴾ (البقرۃ:۲۸۱) موجودہ قرآن پاک میں اس کے شروع میں موجود ہے؟!

اگر آپ اس کتاب محکم کے بارے میں جو معجزانہ طرز تالیف رکھتی ہے، کسی تردّد اور شک میں مبتلا ہیں تو ساری دنیا کو اکٹھا کر دو وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں اور ان سے مطالبہ کرو کہ قرآن کی تمام سورتیں نہیں بلکہ صرف سورۃ البقرۃ کے حجم کے برابر کوئی ایسی کتاب لکھ کر دکھائیں بشرطیکہ اس کتاب کا طرزِ تالیف بھی وہی ہو جو سورۃ البقرۃ کا ہے؟! یعنی اس کی طرح کا زمانے کے واقعات سے ارتباط، مختلف حصوں کا پوری کتاب میں بکھرے ہوئے ہونا لیکن واقعات زمانہ کی ترتیب کے مطابق نہ ہونا، اور پھر کتاب کا اختتام بھی ایسی فنی وحدت پر ہونا کہ جو اس کتاب کے اوّل متوسط اور آخری تمام اجزاء کو باہم مربوط اور ہم آہنگ بھی کرتا نظر آئے۔

اگر وہ ایسا نہ کر سکیں بلکہ کبھی بھی نہ کر سکیں گے تو پھر ان کے سامنے یہ مطالبہ کرو کہ وہ پھر حدیث نبوی ﷺ کا قصد کریں جو اپنے حسن وجمال بلاغت وطہارت اور علو مرتبت میں اپنی نظیر آپ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مختلف اوقات میں وہ احادیث ارشاد فرمائی ہیں، اس کے بعد ان سے پوچھو کہ کیا ان کی قدرت میں یہ بات ہے کہ وہ اس حدیث کی طرح کا بلند و بالا اور معیاری کلام کسی کتاب کی شکل میں جمع کر سکتے ہیں جو قرآن کی طرح صفت وحدت واستر سال سے آراستہ و پیراستہ ہو؟ اور اس میں کوئی کمی زیادتی یا تصرف نہ کیا گیا ہو! یہ وہ چیز جو کبھی کسی کی قدرت میں نہیں آ سکے گی اور نہ ہی اس کا کوئی امکان ہے! مخلوق میں سے جو بھی اس کی

کوشش کرے گا وہ حقیقت میں فعل عبث کی ہی کوشش کرے گا اور لوگوں کے سامنے اپنی کاوش کو پیوند زدہ کپڑے اور تشویشناک کلام کی صورت میں پیش کرے گا جس میں باہمی ربط وہم آہنگی ناقص درجے کی ہوگی، صفت وحدت واسترسال ناپید ہوگا اور اسے سن کر سمع خراشی ہوگی اور وہ قابل فہم بھی نہیں ہوگا!۔ چنانچہ قرآن کریم اپنا طرز تالیف بیان کرتا ہے کہ ایسا کلام اسی ذات کی طرف سے صادر ہو سکتا ہے جسے تمام افلاک ومدارات پر کامل درجے کی سلطنت حاصل ہو، جس کا علم تمام زمانوں اور ان کے حوادث وواقعات پر محیط ہو اور جسے ابدی اور سرمدی بقاء حاصل ہو اور اس کی مراد اور ارادہ ومشیت ہر حال میں نافذ اوز پورا ہوتا ہو، وہ بس اللہ وحدہٗ کی ذات ہے جو آسمان سے زمین تک تمام امور کی تدبیر کرتا ہے، جو آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ چیزوں سے پوری طرح باخبر ہے، جسے نہ موت آسکتی ہے اور نہ نیند اور اونگھ چھو سکتی ہے، اس کے فیصلہ کو کوئی ٹالنے والا نہیں اور اس کے حکم کو کوئی ہٹا نہیں سکتا۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۱﴾ (یوسف:۲۱)

"اللہ اپنے حکم پر غالب ہیں، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

تیسری وجہ: علوم ومعارف

اس کی توضیح یہ ہے کہ قرآن حکیم، مخلوق کی حق کی طرف راہ نمائی کے لیے مختلف علوم ومعارف پر مشتمل ہے، جو اعتدال کی بلندی، وضاحت حجت ودلیل، حسن تاثیر اور نفع کی عمومیت میں اس مقام ومرتبہ پر فائز ہیں کہ محمد ﷺ (جو خود بھی امی تھے اور امیوں میں ہی پرورش پائی) کے لیے خود اپنی جانب سے ایسے علوم ومعارف پیش کرنا ناممکن ہے۔ بلکہ تمام روئے زمین کے علماء ادباء، فلاسفہ، بزرگانِ دین اور صوفیاء کے لیے بھی ناممکن ہے کہ وہ خود اپنی جانب سے اس طرح کے علوم ومعارف پیش کر سکیں۔

یہ قرآن ہی ایسا پر حکمت کلام ہے جسے آپ پڑھتے ہیں تو علوم ومعارف کا ٹھاٹھے مارتا سمندر امڈ آتا ہے، اصلاح وتربیت کی روح اور جذبہ خوب شدت سے اُبھر آتا ہے، کمال کی تمام اطراف کو جمع کرتا نظر آتا ہے، بسا اوقات آپ دیکھیں گے کہ فلاسفہ کے فلسفہ نے جن امور کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا قرآن اس کی اصلاح کرتے دکھائی دیتا ہے، بت پرست لوگ اپنے شرک کی جو چادر اوڑھے ہوئے تھے اسے بوسیدہ کرتا ہے، اہل مذاہب نے اپنے مذاہب میں جو تحریفات کر دی تھیں۔ قرآن اس کی اصلاح کرتا ہے، قرآن، انسانیت کے سامنے درست عقائد، جو بندوں کو بلند ہمتی عطا کرتے ہیں، اور اعتدال پر مبنی عبارت وبندگی جو انسانی نفوس کو پاکیزہ کرتی ہے اور بلند اخلاق، جو انسان کو خلیفہ فی الارض بننے کی اہلیت پیدا کرتے ہیں، ان سب کا صالح مرکب پیش کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن ایسے انفرادی، اجتماعی اور تمدنی احکامات پیش کرتا ہے جو معاشرہ کی فتنہ وفساد سے حفاظت کی کفالت کرتے ہیں، نیز انسان کو اطمینان بخش زندگی، امن وسلامتی اور نظم وضبط اور سعادت وکامیابی کی ضمانت دیتے ہیں۔ قرآن، ایسا دین قیم پیش کرتا ہے جو فطرت وطبیعت کے ملائم ومناسب بھی ہے اور قلب وعقل کی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے۔

اور روح وجسم اور دین ودنیا کے مصالح میں جمع وتطبیق اور دونوں جہاں کی عزتوں کو جمع کرتا ہے۔ پھر مذکورہ ہر چیز پورے توسط واعتدال کے ساتھ اور ایسے واضح اور بے مثل ولاجواب دلائل سے مدلل ہوتی ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور قلب متاثر ہوتا ہے، اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ایک جلد بلکہ کئی جلدوں کی متقاضی ہے۔

ہم یہاں پر چند مثالیں اور اشارے کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں اور ان مثالوں میں اصول اور عقائد کا انتخاب کریں گے

کیونکہ وہ اصل کے اعتبار سے اللہ کے تمام ادیان میں ایک ہی ہیں۔ اور ہم ان مثالوں میں کچھ اسلام کی تعلیمات اور یہود نصاریٰ کی تعلیمات کے درمیان تقابل پیش کریں گے، پھر قرآن نے جو ان کی اغلاط کی تردید و تصحیح کی ہے اور ان کے عقائد باطلہ کو رد کیا ہے کچھ اس کا ذکر کریں گے۔ اس ساری بحث سے ہمارا مقصد ان لوگوں کی افترا پردازی کو رد کرنا ہے جو یہ زعم رکھتے ہیں کہ محمد (ﷺ) نے اپنے دور کے بعض اہل کتاب سے استفادہ کر کے قرآنی تعلیمات کی شکل میں پیش کر دیا ہے اور ان تعلیمات کو رب تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا ہے، تاکہ اس نسبت سے ان تعلیمات کے تقدس کو حاصل کر سکیں۔ اللہ کا فرمان ہے:

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾ (الکھف: ۵)

"کیسی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے، وہ لوگ بالکل جھوٹ کہتے ہیں۔"

① عقیدہ ایمان باللہ کی چند مثالیں

قرآن کریم میں ایمان باللہ کا عقیدہ بالکل واضح صورت میں مذکور ہے، اللہ نے اس میں تمام نقائص سے خود کو منزہ قرار دیا ہے، اولاد کے محال ہونے پر تصریح کی ہے، اسی طرح ہر اس چیز کے محال ہونے کو بیان کیا ہے جس سے خالق کی مخلوق کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے خود کو کمال مطلق سے موصوف کیا ہے اور الوہیت و ربوبیت میں اپنی وحدانیت و یکتائی کا ذکر کیا ہے، بایں معنی کہ وہ ذات اپنی مخلوق کے امور کی تدبیر کرنے اور عبادت کے استحقاق میں اکیلی اور تنہا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات کریمہ اس عقیدہ ایمان پر صریح طور پر دلالت کر رہی ہیں۔

① ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

"کوئی چیز اس کے مثل نہیں ... سننے والا دیکھنے والا ہے۔"

② ﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۱۱۱)

"اور کہہ دو سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی سلطنت میں شریک ہے اور نہ کوئی کمزوری کی وجہ سے اس کا مددگار ہے اور اس کی بڑائی بیان کرتے رہو۔"

③ ﴿قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ﴾ (الانعام: ۱۴)

"کہہ دو جو اللہ آسمان و زمین کا بنانے والا ہے کیا اس کے سوا کسی اور کو اپنا مددگار بناؤں اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اسے کوئی نہیں کھلاتا۔"

④ ﴿قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (المومنون: ۸۸)

"ان سے پوچھو کہ ہر چیز کی حکومت کس کے ہاتھ میں ہے اور وہ بچا لیتا ہے اور اس سے کوئی نہیں بچا سکتا اگر تم جانتے ہو۔"

⑤ ﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ (الجن: ۱۸)

"پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔"

۶ ﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (یونس:۱۰۶-۱۰۷)

"اور اللہ کے سوا ایسی چیز کو نہ پکار جو نہ تیرا بھلا کرے اور نہ برا پھر اگر تو نے ایسا کیا تو بے شک ظالموں سے ہو جائے گا اور اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے کوئی ہٹانے والا نہیں اور اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا نہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔"

۷ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (الزمر:۵۳)

"بے شک اللہ سب گناہ بخش دے گا بے شک بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

۸ ﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪﴾ (آل عمران:۱۳۵)

"اللہ کے سوا اور کون گناہ بخشنے والا ہے۔"

۹ ﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ﴾ (الانعام:۵۰)

"کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔"

۱۰ ﴿وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝﴾ (فاطر:۱۳-۱۵)

"اور جنہیں تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ ایک گٹھلی کے چھلکے کے مالک نہیں اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو نہیں سنتے اور اگر وہ سن بھی لیں تو تمہیں جواب نہیں دیتے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تمہیں خبر رکھنے والے کی طرح کوئی نہیں بتائے گا اے لوگو! تم اللہ کی طرف محتاج ہو اور اللہ بے نیاز تعریف کیا ہوا ہے۔"

۱۱ ﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝﴾ (بنی اسرائیل:۵۶-۵۷)

"کہہ دو انہیں پکارو جنہیں تم اس کے سوا سمجھتے ہو وہ نہ تمہاری تکلیف دور کر سکیں گے اور نہ اسے بدل سکیں گے وہ لوگ جنہیں یہ پکارتے ہیں جو ان میں سے زیادہ مقرب ہیں وہ اپنے رب کی طرف نیکیوں کا ذریعہ تلاش کرتے ہیں اور اس کی مہربانی کی

امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شک تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔"

اس کے علاوہ بھی قرآن مجید میں بہت سی آیات موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہود گمراہی میں مبتلا ہوئے کہ انہوں نے بچھڑے کو پوجا شروع کر دی اور اپنے کسی دور میں یہ گمان کیا کہ نصاریٰ کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ خدا کی اولاد ہے۔ ان یہود نے اللہ تعالیٰ کو انسان کے ساتھ تشبیہ دے کر یہ کہا کہ خدا زمین وآسمان کی تخلیق کے بعد تھک گیا تھا اس لیے (نعوذ باللہ) ہفتہ کے دن آرام کیا، ان یہود کے بڑوں نے یہاں تک کہا کہ:

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسانی شکل میں نمودار ہوئے اور اسرائیل کے ساتھ کشتی کی، ان سے خود کو چھڑا نہ سکے تو گھٹنوں کے بل اس نے گرا دیا، پھر چھوڑ دیا۔"

انہوں نے اس طرح کی نامعقول باتیں اور غلط بے بنیاد باتیں بنائیں۔

دوسری جانب نصاریٰ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد گمراہ ہوئے کہ انہوں نے عقیدہ تثلیث اختیار کیا، ان کے عبادت خانے قسطنطین کے دور سے بت خانوں کی شکل کے ہو گئے تھے، ان لوگوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کو قانون سازی اور تحلیل وتحریم کا حق، جو کہ خاص اللہ کا حق تھا، دے دیا، یہاں تک عرب کے بت پرست لوگ خود کو ان سے منسوب کرنے لگے اور یہ خیال کرنے لگے کہ وہ بت پرستی میں مبتلا ان مسیحیوں سے زیادہ افضل ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۞ وَ قَالُوْٓا ءَ اٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ﴾ (الزخرف: ۵۷-۵۸)

"اور جب ابن مریم مثال بیان کی گئی تو اسی وقت آپ کی قوم کے لوگ اس سے کھل کھلا کر ہنسنے لگے اور کہا کہ کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ؟۔"

پھر ان لوگوں نے اپنی شرک پر اس طرح استدلال کیا کہ انہوں نے کہا کہ ہم نے اس دعوت توحید کا ذکر آخری دین (نصرانیت) میں نہیں سنا جسے دین اسلام پیش کر رہا ہے۔ فرمایا:

﴿وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۞ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ (ص: ۶-۷)

"اور ان میں سے سردار یہ کہتے ہوئے چل پڑے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو بے شک اس میں کچھ غرض ہے، ہم نے یہ بات اپنے پچھلے دین (عیسائیت) میں نہیں سنی۔"

غور کیجیے! کس قدر فرق ہے قرآن کریم کے پیش کردہ حق اور ان لوگوں کے لائے ہوئے باطل کے درمیان! اس کے باوجود کتاب اللہ نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان باطل پرستوں کا اپنے بلند براہین اور قطعی دلائل سے رد بھی کیا ہے۔

سنیے! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ

بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾ (آل عمران:۶۴)

"کہہ دو اے اہل کتاب! ایک بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ سوائے اللہ کے اور کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور سوائے اللہ کے کوئی کسی کو رب نہ بنائے پس اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو فرماں بردار ہونے والے ہیں۔"

نیز فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡنِكُمۡ وَلَا تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ ؕ اِنَّمَا الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلۡقٰٮهَاۤ اِلٰى مَرۡيَمَ وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنۡتَهُوۡا خَيۡرًا لَّـكُمۡ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبۡحٰنَهٗۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۱۷۱﴾ لَنۡ يَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَلَا الۡمَلٰۤـئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَمَنۡ يَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَيَسۡتَكۡبِرۡ فَسَيَحۡشُرُهُمۡ اِلَيۡهِ جَمِيۡعًا ﴿۱۷۲﴾﴾ (النساء:۱۷۱-۱۷۲)

"اے اہل کتاب تم اپنے دین میں حد سے نہ نکلو اور اللہ کی شان میں سوائے پکی بات کے نہ کہو بے شک مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا اللہ کا رسول ہے اور اللہ کا ایک کلمہ ہے جسے اللہ نے مریم تک پہنچایا اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہے تم اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ خدا تین ہیں اس بات کو چھوڑ دو تمہارے لیے بہتر ہوگا بے شک اللہ اکیلا معبود ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کارساز کافی ہے مسیح خدا کا بندہ بننے سے ہرگز عار نہیں کرے گا اور نہ مقرب فرشتے اور جو کوئی اس کی بندگی سے انکار کرے گا اور تکبر کرے گا تو وہ ان سب کو اپنی طرف اکٹھا کرے گا۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيۡقَةٌ ؕ كَانَا يَاۡكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الۡاٰيٰتِ ثُمَّ انۡظُرۡ اَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ ﴿۷۵﴾ قُلۡ اَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمۡلِكُ لَـكُمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۷۶﴾ قُلۡ يٰۤـاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ غَيۡرَ الۡحَـقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا كَثِيۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ ﴿۷۷﴾﴾ (المائدہ:۷۵-۷۷)

"مسیح مریم کا بیٹا تو صرف ایک پیغمبر ہی ہے جس سے پہلے اور بھی پیغمبر گزر چکے ہیں اور اس کی ماں ولی ہے دونوں کھانا کھاتے تھے دیکھ ہم انہیں کیسی دلیلیں بتلاتے ہیں پھر دیکھ کہ وہ کہاں الٹے جاتے ہیں کہہ دو تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی بندگی کرتے ہو جو تمہارے نقصان اور نفع کے مالک نہیں اور اللہ وہی ہے سننے والا جاننے والا، کہہ دو اے اہل کتاب تم اپنے دین میں ناحق زیادتی مت کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے دور ہو گئے۔"

نیز ارشاد خداوندی ہے:

﴿ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَنّٰى یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ ﴾ (الانعام:۱۰۱)

"آسمانوں اور زمین کو از سرِ نو پیدا کرنے والا ہے اس کا بیٹا کیونکر ہو سکتا ہے حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز کو بنایا ہے اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔"

یہود نے جو الزام لگایا تھا کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد تھک گیا تھا اس کی نفی اور تردید کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ۖۗ وَّ مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ ﴾ (قٓ:۳۸)

"اور بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے چھ دن میں اور ہمیں کچھ بھی تکان نہ ہوئی۔"

اللہ جل شانہٗ ان کی گوسالہ پرستی کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ ۝ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَ رَبَّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ۝ ﴾ (الصّٰفّٰت:۱۲۵-۱۲۶)

"کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور سب سے بہتر بنانے والے کو چھوڑ دیتے ہو اللہ کو جو تمہارا پروردگار ہے اور تمہارے پہلے باپ دادوں کا رب ہے۔"

نیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایک دوسرے بہتان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿ وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ یُنْفِقُ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ ﴾ (المائدۃ:۶۴)

یہود و نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کے لیے جس نبوّت کا دعویٰ کیا تھا اس کی تردید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ یُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ۚ وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ یَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ (التوبہ:۳۰-۳۲)

"اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں وہ کافروں کی سی باتیں بنانے لگے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں اللہ انہیں ہلاک کرے یہ کدھر الٹے جا رہے ہیں انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا ہے اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی حالانکہ انہیں حکم یہی ہوا تھا کہ ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی

کو اپنے مونھوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں۔"

(ب) عقیدہ بعث وجزا کی چند مثالیں

قرآن حکیم میں بعث بعد الموت کا عقیدہ بھی واشگاف انداز میں ذکر کیا گیا ہے جو انسان کی روح اور جسم کو شامل ہے اور اس بارے میں عدل واعتدال کی راہ کو اختیار کیا گیا ہے کہ اعمال کی جزا وسزا کے سلسلہ میں وہاں کوئی ظلم وزیادتی نہ ہوگی اور نہ ہی غلط مفہوم کے اعتبار سے کوئی سفارش ہوگی، کسی بھی شخص اور جماعت کو جو اللہ کا فضل حاصل ہوگا وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہوگا۔

پڑھ لیجیے ان آیات کریمات کو جو مختلف مقامات پر آئی ہیں:

① ﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝﴾ (نوح: ۱۷-۱۸)

"اور اللہ ہی نے تمہیں زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا پھر وہ تمہیں اسی میں لوٹائے گا اور اسی میں سے باہر نکالے گا۔"

② ﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝﴾ (القیامۃ: ۳۶-۴۰)

"وہ کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا کیا وہ ٹپکتی منی کی ایک بوند نہ تھا پھر وہ لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اسے بنا کر ٹھیک کیا پھر اس نے مرد وعورت کا جوڑا بنایا پھر کیا وہ اللہ مُردے زندہ کر دینے پر قادر نہیں ہے۔"

③ ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء: ۴۷)

"اور قیامت کے دن ہم انصاف کی ترازو قائم کریں گے پھر کسی پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا، اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا تو اسے بھی ہم لے آئیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔"

④ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ (الزلزال: ۷-۸)

"پھر جس نے ذرہ بھر بھی نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا۔"

⑤ ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ: ۱۲۳)

"اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی بھی کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ اُسے کوئی سفارش نفع دے گی اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے۔"

⑥ ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَاۗءَلُوْنَ ۝﴾ (المومنون: ۱۰۱)

"پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن اُن میں نہ رشتہ داریاں رہیں گی اور نہ کوئی کسی کو پوچھے گا۔"

یہود اس طرح گمراہ ہوئے کہ انہوں نے زعم کیا کہ وہ روئے زمین کی اقوام میں سب سے پسندیدہ قوم ہیں اور یہ کہ وہ خدا

کی اولاد اور اس کے چہیتے ہیں، اور دار آخرت صرف ان ہی کے لیے ہے اور یہ کہ دوزخ کی آگ انہیں چھوئے گی بھی نہیں، مگر چند روز کے لیے، یعنی چالیس روز تک جو انہوں نے بچھڑے کی پوجا کر لی تھی بس اتنے دن چھوئے گی۔

اسی طرح نصاریٰ بھی گمراہ ہوئے کہ انہوں نے بھی دعویٰ کر لیا کہ وہ خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بالکل ایسا ہی عقیدہ اختیار کر لیا جیسا کہ ہندوؤں نے کرشنہ کے بارے میں اختیار کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام (نعوذ باللہ) قتل ہو کر سولی پر لٹکا دیئے گئے تھے، تاکہ ہر انسان کو اس کے گناہ سے نجات دلائیں اور اس کی جگہ خود قربان ہو گئے۔ ان کا یہ زعم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بڑے نجات دہندہ اور قربانی دینے والے ہیں کہ انہوں نے لوگوں کو ان کے گناہوں کی سزا سے نجات دلا دی اور اپنی جان اس کے بدلے میں دے دی۔ اور وہ آپ کو تین خداؤں میں سے ایک خدا کہتے ہیں، یعنی تین اقانیم میں سے دوسرے اقنوم، جو پہلے اور تیسرے کا عین ہیں اور پھر ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کا عین ہے۔ ہندو بھی کرشنہ کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

پھر بعد میں آنے والے نصاریٰ نے اس غلط اور بے بنیاد نظریہ کی پیروی کی جسے کوئی بھی انسان اور عقل قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، اور اللہ کا عدل، اور اس کی حکمت اعمال کی جزا اور مسئولیت کے بارے میں ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کرتی مخبوط العقل لوگ اس گمراہی کو اسی صورت میں رواج دے سکتے ہیں کہ اپنے بچوں کو بچپن ہی میں اس کی تربیت دیں اور بغیر کسی بحث ونظر کر کے اس گمراہ کن عقیدے کی سماعت واعتقاد کی بنیاد پر پرورش کریں بلکہ یوں کہیں کہ بس اعتقاد رکھو اور اندھے بنے رہو۔

نصاریٰ میں درویش اور عابد وزاہد لوگ بھی ہندوؤں کی پیروی میں راہ راست سے بھٹک گئے کہ انہوں نے بھی مادی لذات کو حقیر جانا، اپنے نفوس کو مباح چیزوں سے محروم رکھ کر اور اپنے جسم کو سزا دے کر تربیت دیتے ہیں، انہوں نے مٹی کو ترک کر کے بڑھا دیا۔ کہنے لگے کہ: بعث بعد الموت صرف روحانی طور پر ہوگا جس میں جسم کا اعادہ نہیں ہوگا اُنہیں غلط فلسفیانہ نظریہ سے دھوکہ لگا ہے، یعنی مادی لذات کو حقیر جاننا اور اسے حیوانی کہہ کر اس کی مذمت کرنا، لیکن ان سے یہ بات مخفی رہی کہ مادّی لذات اسی صورت میں باعث نقص ہوتی ہیں جب انسان اپنی عقل اور قویٰ کو اس کے تابع کر دیتا ہے اور اس میں پھر ایسا اسراف کرتا ہے جو اسے عقلی اور روحانی لذات سے غافل کر دیتا ہے جس کی بنیاد علم نافع اور علم صالح پر استوار ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ ان مادّی لذات میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لیتا ہے اور روحانی اور جسمانی مقاصد میں مطابقت پیدا کرتا ہے تو یہی چیز انسان کے لیے باعث فخر اور نوع انسانی کے لیے باعث فضیلت بن جاتی ہے۔ اسی کی بدولت ایک عجیب عالم وجود میں آتا ہے جس میں فرشتوں جیسی روحانیت اور حیوانات ونباتات جیسی جسمانیت جمع ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کو اپنی بے مثال تخلیق واقتدار کا مظہر بنایا ہے، پھر بھلا ایسا عجیب مظہر، ملکوت آخرت میں باعث نقص کیسے ہو سکتا ہے جبکہ آخرت تو عجائب وغرائب کا گھر ہے کہ اس میں ایسی اشیاء ہونگی جو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھیں اور نہ کسی کان نے کبھی سنیں اور نہ کسی قلب بشر پر اس کا خیال تک گزرا؟!

ارشاد فرمایا: ﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾ (العنکبوت: ۶۴)

"اصل زندگی عالم آخرت کی ہے کاش وہ سمجھتے۔"

یہی حال یہود میں حد اعتدال سے تجاوز کر جانے والے لوگوں کا ہے کہ انہوں نے اس معاملہ میں برعکس صورت حال کو اختیار کرتے

ہوئے اسی مادی لذات میں افراط سے کام لیا،حتیٰ کہ انہوں نے اپنی ذات کے لیے ہر طرح کی لذت کو حلال جانا، اور پورے عالم کا خون سودی کاروبار کے ذریعے نچوڑ کر اور باطل اور ناجائز طریقے سے لوگوں کے مال ہتھیانے میں خوب مبالغہ سے کام لیا، اور زعم یہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی غریب آدمی مصیبت میں پڑتا ہے تو اس میں کوئی گناہ والی بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ﴾ (آل عمران:۷۵)

”یہ اس واسطے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر اَن پڑھ لوگوں کا حق لینے میں کوئی گناہ نہیں۔“

لیکن قرآن ان سب کی تردید کرتے ہوئے راہ اعتدال کی تعلیم دیتا ہے اور معتدل موقف اختیار کرتا ہے جو افراط و تفریط میں مبتلا لوگوں کا مرجع ہے، اور قرآن حکیم اس بارے میں مذکورہ مسئلہ کی طرح واضح طور پر اپنا نظریہ پیش کرتا ہے اور ان لوگوں کی مذکورہ اغلاط کی تصحیح کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن ان کے اس خیال کی کہ وہ پسندیدہ اور چنیدہ قوم ہیں، تردید کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ وَ لَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝﴾ (البقرۃ:۹۴-۹۵)

”کہہ دو اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر خصوصیت کے ساتھ سوائے اور لوگوں کے تمہارے ہی لیے ہے تو تم موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو وہ کبھی بھی اس کی ہرگز آرزو نہیں کریں گے ان گناہوں کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔“

نیز اس موقع پر فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ۝﴾ (الحجرات:۱۳)

”اے لوگو ہم نے تمہیں ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہارے خاندان اور قومیں جو بنائی ہیں تاکہ تمہیں آپس میں پہچان ہو بے شک زیادہ عزت والا تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اخبردار ہے۔“

نیز فرمایا:

﴿لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ۝ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ۝﴾ (النساء:۱۲۳-۱۲۴)

”نہ تمہاری امیدوں پر مدار ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر جو کوئی برا کام کرے گا وہ اس کی سزا دیا جائے گا اور اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں پائے گا اور جو کوئی اچھے کام کرے گا مرد ہے یا عورت جبکہ وہ ایمان دار ہو تو وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور کھجور کے شگاف کے برابر بھی ظلم نہیں کیے جائیں گے۔“

نیز اللہ تعالیٰ اس بہتان تراشی کی کہ وہ اللہ کے محبوب اور بیٹے ہیں، تردید کے ضمن میں فرماتے ہیں:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿۱۸﴾ (المائدۃ:۱۸)

"اور یہود ونصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں کہہ دو کہ پھر تمہارے گناہوں کے باعث وہ تمہیں کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم بھی اور مخلوقات کی طرح ایک آدمی ہو جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے سزا دے اور آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی سلطنت اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

نیز اللہ تعالیٰ ان کے اس دعویٰ کی کہ ہمیں بس چند روز ہی آگ چھوئے گی، تردید میں فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۸۰﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۸۲﴾﴾ (البقرۃ:۸۰-۸۲)

"اور کہتے ہیں کہ ہمیں چند گنتی کے دنوں کے سوا آگ نہیں چھوئے گی کہہ دو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے کہ ہرگز اللہ اپنے عہد کا خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر وہ باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ہاں جس نے کوئی گناہ کیا اور اسے اس کے گناہ نے گھیر لگا سو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے وہی بہشتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

نیز اللہ جل شانہ نصاریٰ کے اس زعم کی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر کے سولی پر لٹکا دیا گیا، تردید کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۵۸﴾ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿۱۵۹﴾﴾ (النساء:۱۵۷-۱۵۹)

"حالانکہ انہوں نے نہ اسے قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا اور جن لوگوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں ان کے پاس بھی اس معاملہ میں کوئی یقین نہیں ہے محض گمان ہی کی پیروی ہے انہوں نے یقیناً مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ زبردست حکمت والا ہے اور اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لائے گا اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔"

نیز اللہ تعالیٰ، نصاریٰ کے عقیدہ نجات کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ﴿۱۸﴾﴾ (فاطر:۱۸)

”اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی بوجھ والا اپنے بوجھ کی طرف بلائے گا تو اس کے بوجھ میں سے کچھ بھی اٹھایا نہ جائے گا اگرچہ قریبی رشتہ دار ہی ہو بے شک آپ انہیں لوگوں کو ڈراتے ہیں جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو پاک ہوتا ہے تو وہ اپنے لیے ہی پاک ہوتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“

نیز فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۴۶)

”جو کوئی نیک کام کرتا ہے تو اپنے لیے اور برائی کرتا ہے تو اپنے سر پر اور آپ کا رب تو بندوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا۔“

قرآن مجید کی سورۃ اللھب بھی افضل الخلق حضرت محمد ﷺ کے ایک چچا ابولہب، کے بارے میں نازل ہوئی۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں قرآن میں واضح آیات آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا کہ قرآن، اس گمراہانہ نظریہ کو کہ ”بس اعتقاد رکھو، آنکھیں بند رکھے ہوئے“ پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ غور وفکر سے کام لینے کی ترغیب دیتا ہے، عقائد اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں عقل سلیم کی طرف رجوع کرنے کا کہتا ہے اور اندھا دھند تقلید کرنے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے اس کے لیے مثالوں کی ضرورت نہیں۔

نیز قرآن حکیم نے مادی لذات کو مخصوص مفہوم میں حقیر جاننے کے شبہ کو بھی حل کیا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الاعراف:۳۲)

”کہہ دو اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے واسطے پیدا کی ہے اور کس نے کھانے کی ستھری چیزیں (حرام کیں)۔“

نیز فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ﴾ (المائدۃ:۸۷-۸۸)

”اے ایمان والو ان ستھری چیزوں کو حرام نہ کرو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اللہ کے رزق میں سے جو چیز حلال ستھری ہو کھاؤ اور اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔“

اللہ تعالیٰ، رہبانیت اور اس کے ایجاد کرنے والوں کی مذمت بیان فرماتے ہیں:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ (الحدید:۲۷)

”اور ترک دنیا جو انہوں نے خود ایجاد کی ہم نے وہ ان پر فرض نہیں کی تھی مگر انہوں نے رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے

ایسا کیا پس اسے نباہ نہ سکے جیسا نباہنا چاہیے تھا۔"

اللہ تعالیٰ نے یہود کی خیانت اور اقوام پر ظلم کرنے کی مذمت میں فرمایا:

﴿ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾ (آل عمران: ۷۵-۷۷)

"اور بعضے ان میں سے وہ ہیں کہ اگر تو ان کے پاس ایک اشرفی امانت رکھے تو بھی تجھے واپس نہیں کریں گے ہاں جب تک کہ تو اس کے سر پر کھڑا رہے یہ اس واسطے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر ان پڑھ لوگوں کا حق لینے میں کوئی گناہ نہیں اور اللہ پر وہ جھوٹ بولتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں گناہ کیوں نہ ہوگا جس شخص نے اپنا عہد پورا کیا اور اللہ سے ڈرا تو بے شک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور قسموں کے بدلے میں حقیر معاوضہ لیتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور ان سے اللہ کلام نہیں کرے گا اور قیامت کے دن ان کی طرف نہیں دیکھے گا اور انہیں پاک بھی نہ کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

نیز فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ ﴾ (البقرۃ: ۲۷۵)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں قیامت کے دن وہ نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح کہ وہ شخص اٹھتا ہے جس کے حواس جن نے لپٹ کر کھو دیے ہیں، یہ حالت ان کی اس لیے ہوگی کہ انہوں نے کہا تھا کہ سوداگری بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا حالانکہ اللہ نے سوداگری کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔"

نیز فرمایا:

﴿ وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ: ۱۸۸)

"اور ایک دوسرے کے مال آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور انہیں حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ حالانکہ تم جانتے ہو۔"

اس کے علاوہ اس موقع کی بہت سی آیات مبارکہ ہیں۔

جو بات اس موقع پر قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہدایت تام بھی ہے اور عام بھی، اس کے ذریعہ ان پڑھ لوگوں کی بھی اصلاح ہوتی ہے، وہ فلاسفہ جو ہر وقت بحث ونظر میں مبتلا رہتے ہیں ان کے علم کی تصحیح بھی ہوتی ہے، اسی طرح جس کا کسی وجہ

سے علم سے رشتہ وتعلق نہ ہو اس کے لیے بھی قرآن کی ہدایت موجب علم ہے، نیز اہل کتاب کے یہود ونصاریٰ کی اغلاط کی تصحیح اور بت پرستوں اور پتھروں کے پجاریوں کی اغلاط کی بھی اصلاح اسی قرآنی ہدایت سے ہوگی۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عقلی طور پر بھی یہ بات درست نہیں ہے کہ یہ قرآنی ہدایات اللہ کی وحی میں سے نہیں ہیں بلکہ محمد (ﷺ) کی خود ساختہ ہیں جوان پڑھوں میں سے ایک ان پڑھ تھے (نعوذ باللہ)۔ نیز یہ بات کسی طرح بھی معقول نہیں ہے کہ حضور ﷺ نے یہ قرآنی تعلیمات وہدایات بعض اُن اہل کتاب سے حاصل کی تھیں جن سے ان کی ملاقات جزیرۂ عرب میں ہوئی تھی۔ اگر بالفرض یہ باتیں درست ہوتیں تو وہ لوگ دعویٰ نبوت ورسالت کے زیادہ حق دار تھے۔ بھلا یہ کیسے درست ہوسکتا ہے حالانکہ قرآن ہی نے ان کو دین کے وہ حقائق بتائے جن سے وہ ناواقف تھے۔ کیا بھلا کوئی تہی دست انسان بھی دوسرے کو کچھ دے سکتا ہے!

ہم نے اس سے پہلے جو مثالیں دی ہیں وہ آپ کے لیے کافی ہیں ان مثالوں سے ادیان کی بنیاد سے ربط وتعلق پیدا ہوتا ہے اور عقائد کی حقیقت سے گہری وابستگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا منظر ایسا ہے کہ جیسے قرآن کل جہاں کی کرسیٔ استاذیت پر جلوہ افروز ہو کر ان یہود نصاریٰ اور دیگر تمام اہل مذاہب کو تعلیم دے رہا ہو، ایسا نہیں کہ جیسے کوئی شاگرد بیٹھ کر اِدھر اُدھر سے خوشہ چینی کر رہا ہو۔ اگر مذکورہ باتیں کافی نہیں تو قرآن پاک کی ورق گردانی کیجیے اور اس سے بلندیوں کی ذرا سیر کیجیے؟ اس کے لیے یہ ایک فرمان الٰہی ہی کافی ہے:

﴿يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ (المائدۃ:۱۵-۱۶)

"اے اہل کتاب تحقیق تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو بہت سی چیزیں تم پر ظاہر کرتا ہے جنہیں تم کتاب سے چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں سے درگزر کرتا ہے بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور واضح کتاب آئی ہے اللہ سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اُسے جو اس کی رضا کا تابع ہو اور انہیں اپنے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور انہیں سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔"

اسی طرح فرمایا:

﴿يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ ۬ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (المائدۃ:۱۹)

"اے اہل کتاب تحقیق تمہارے پاس ہمارا پیغمبر آیا جو تمہیں صاف صاف بتلاتا ہے ایسے وقت میں کہ رسولوں کا سلسلہ موقوف تھا تاکہ یوں نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا ڈرانے والا نہیں آیا سو تمہارے پاس خوشخبری دینے والا ڈرانے والا آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اگر آپ کو اس سے بھی زیادہ دلائل کی ضرورت ہو تو غور کیجیے اور دیکھئے کہ قرآن نے کس طرح صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ اہل کتاب کے اختلافی امور کی وضاحت کرنا اس کے اولین مقاصد میں سے ہے، جیسا کہ سورۃ النحل میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (النحل: ۶۴)

"اور ہم نے اسی لیے تجھ پر کتاب اُتاری ہے کہ تو انھیں وہ چیز کھول کر سنا دے جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں اور ایمان داروں کے لیے ہدایت اور رحمت بھی ہے۔"

قرآن نے اہل کتاب کے اختلاف کے بارے میں یہ بات پہلے بیان کی کہ وہ ان کے اختلافی امور کے لیے بیان ہے اس کے بعد مومنوں کے لیے باعث ہدایت ورحمت ہونا بیان کیا ہے۔

اسی طرح سورۃ النمل میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝﴾ (النمل: ۷۶-۷۹)

"بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل پر اکثر ان باتوں کو ظاہر کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور بے شک وہ ایمانداروں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، بے شک تیرا رب ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کرے گا اور وہ غالب علم والا ہے، سو اللہ پر بھروسہ کر بے شک تو صریح حق پر ہے۔"

قرآن نے لوگوں کی توجہ اس کے اعجازی پہلو کی طرف بھی دلائی ہے اور اس بات پر دلیل قائم کی ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، محمد (ﷺ) کا کلام نہیں ہوسکتا، چنانچہ سورۃ العنکبوت میں ارشاد عالی ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۝ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت: ۴۷-۴۹)

"اور اسی طرح ہم نے تیری طرف کتاب نازل کی ہے پھر جنہیں ہم نے کتاب دی تھی وہ تو اس پر ایمان لائے ہیں اور ان میں سے بھی کچھ لوگ اس پر ایمان لائے ہیں اور ہماری آیتوں کا کافر ہی انکار کیا کرتے ہیں اور اس سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا اس وقت البتہ باطل پرست شک کرتے بلکہ وہ روشن آیتیں ہیں ان کے دلوں میں جنہیں علم دیا گیا ہے اور ہماری آیتوں کا صرف ظالم ہی انکار کرتے ہیں۔"

نیز سورۃ الشوریٰ میں بھی فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝﴾ (الشوریٰ: ۵۲-۵۳)

"اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے قرآن نازل کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے

اور لیکن ہم نے قرآن کو ایسا نور بنایا ہے کہ ہم اس کے ذریعہ سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔ اور بے شک آپ سیدھا راستہ بتاتے ہیں اس اللہ کا راستہ جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی سب چیزیں ہیں خبردار اللہ ہی طرف سب کام رجوع کرتے ہیں۔"

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائیں، وہ کہتے ہیں ؎

كفاك بالعلم فى الامى معجزةً فى الجاهلية و التأديب فى اليُتُم

"تیرے لیے ایک معجزہ کافی ہے کہ ایک امی کو علم عطا ہوا، جاہلیت کے زمانہ میں اور یتیمی کے دور میں ادب کی بلندیوں پر پہنچا دیا گیا۔" (صلی اللہ علیہ وسلم ومجد وعظم وشرف وکرم ورزقنا کمال الایمان بہ وکمال اتباعہ، آمین)

چوتھی وجہ: انسانی حاجات کی تکمیل

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی ہدایات ایسی کامل اور مکمل ہیں کہ ہر دور اور ہر علاقے میں بسنے والے انسانوں کی تمام ضروریات کی کفالت اور کفایت کرتی ہیں، کسی دوسرے دین یا مذہب میں ایسی مکمل ہدایات موجود نہیں ہیں، اس ہدایت کے اعلیٰ مقاصد جو قرآن حکیم نے بیان کئے ہیں، جب آپ کے سامنے آئیں گے تو اس کی حقیقت آپ پر واضح اور آشکار ہو گی۔

ہم درج ذیل اس کے مقاصد کی تھوڑی سی تفصیل ذکر کرتے ہیں:

① "عقائد کی اصلاح" اللہ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، کتابوں اور رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان، اس عنوان کے تحت انسانوں کو مبدا و معاد اور اس کے مابین کی زندگی کے بارے ہدایات وحقائق دے کر مخلوق کی رہنمائی کی گئی ہے۔

② "عبادات کی اصلاح" اس مقصد کے لیے تزکیہ نفوس، روح کو غذا کی فراہمی، ارادہ کی پختگی اور فرد اور جماعت کو مفید بنا کر مخلوق کی رہنمائی کی گئی ہے۔

③ "اخلاق کی اصلاح" اس مقصد کے حصول کے لیے اچھے اخلاق کی ترغیب برے اخلاق سے نفرت دلائی گئی ہے مگر اس میں راہ اعتدال کو اختیار کیا گیا ہے کہ جس میں نہ افراط ہو اور نہ تفریط۔

④ "معاشرہ کی اصلاح" اس سلسلہ میں اپنی صفوں میں اتحاد، ہر طرح کے تعصبات سے پرہیز، ایک دوسرے سے دوری پیدا کرنے والے امتیازات اور فرق کو مٹا کر راہنمائی فراہم کی گئی ہے، اس مقصد کے لیے لوگوں میں یہ شعور اجاگر کیا گیا ہے کہ وہ ایک ہی جنس، ایک ہی نفس اور ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی ان سب کے باپ آدم علیہ السلام اور ماں حوا علیہا السلام ہیں۔ نیز کسی قوم کو دوسری قوم پر بلکہ کسی فرد کو دوسرے فرد پر کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے، وہ سب اللہ کے سامنے، اس کے دین اور شریعت کے سامنے برابر ہیں، بغیر کسی استثناء اور امتیازی فرق کے سب کے سب حقوق وفرائض اور افضلیت میں یکساں رکھتے ہیں۔

اسلام نے آ کر لوگوں میں جو بھائی چارے کا سلسلہ قائم کیا ہے وہ حسب ونسب اور خاندانی عصبیت کے قائم کردہ سلسلہ سے زیادہ مضبوط ہے۔ اسی طرح لوگوں کی عام زبان وہی ہے جو ان کے دین اور کتاب کی زبان ہے یعنی عرب کی زبان۔ نیز سب لوگ ایک امت کا درجہ رکھتے ہیں جن کو ان کا مبداء جوڑتا ہے، ان کو علاقائی حدود یا سیاسی اور قانونی فاصلے اور حد بندیاں متفرق نہیں

کر سکتیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ﴾ (المومنون:۵۲)

"اور بے شک تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں پس مجھ سے ڈرو۔"

⑤ "سیاسی یا حکومتی امور کی اصلاح" اس کے لیے لوگوں میں عدل و مساوات قائم کر کے، احکام و معاملات میں امور خیر جیسے حق وعدل، ایفائے عہد، باہم ہمدردی، محبت و خیر خواہی وغیرہ کی پاسداری کر کے اور امور شر جیسے ظلم و زیادتی، دھوکہ فریب، عہد شکنی، کذب بیانی، خیانت گری، ناجائز طور پر لوگوں کا مال ہتھیانے جیسے رشوت ستانی، سود خوری، قرض کے معاملات اور دیگر خرافات سے اجتناب اور پرہیز کر کے لوگوں کی راہنمائی کی گئی ہے۔

⑥ "مالی امور کی اصلاح" اس مقصد کے لیے لوگوں کی راہنمائی کی گئی کہ وہ میانہ روی اختیار کریں، مال کی حفاظت کریں اسے تلف ہونے اور برباد ہونے سے بچائیں اور نیک کاموں میں ضرور خرچ کریں اور ہر طرح کے عام و خاص حقوق ادا کرنے اور جائز کام کاج کے لیے ضرور اکتسابِ مال کریں۔

⑦ "خواتین کی اصلاح و تربیت" اس کے لیے حکم دیا گیا کہ عورت کا ہر طرح سے احترام اور اس کی حفاظت کی جائے اور اسے تمام انسانی، مذہبی اور تمدنی حقوق دیئے جائیں۔

⑧ "جنگی اصلاحات" اس کے لیے راہنمائی فراہم کی گئی کہ امور حرب میں مہارت پیدا کی جائے، اور اس کی بنیاد ایسے اصول و ضوابط پر رکھی جائے جو سراسر ابتداء انتہاء تک انسانیت کی خیر و فلاح کی ضامن ہو۔

اور اس سلسلہ باہمی ہمدردی کا التزام، معاہدات کی پاس داری، صلح و صفائی کو ترجیح دینے اور نصرت و فتح حاصل ہو جانے کی صورت میں جزیہ پر اکتفاء وغیرہ امور کو لازم جانا جائے۔

⑨ آئندہ کے لیے غلام بنانے سے پرہیز کرنا اور موجودہ غلاموں کو مختلف طریقوں سے آزادی دینا، مثلاً لوگوں کو غلام آزاد کرنے کی خوب ترغیب دینا، قتل و ظہار کے کفارے میں غلام دینا، اسی طرح فحش طریقے سے روزے کو فاسد کرنے یا حانث ہونے والی قسم یا غلام کو مارنے پیٹنے پر غلام آزاد کرنا۔

⑩ عقل و فکر کی آزادی اور جبر و اکراہ اور ظلم و استبداد پر مبنی مذہبی تسلط کو روکنا۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۙ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۙ﴾ (الغاشیۃ:۲۱-۲۲)

"پس آپ نصیحت کیجیے بے شک آپ نصیحت کرنے والے ہیں آپ ان پر کوئی داروغہ نہیں ہیں۔"

اعجازِ قرآن کی مذکورہ وجہ پر دلیل یہ ہے کہ غیر مسلم اس روشنی کی تلاش میں برابر حیران و سرگردان رہے اور ایسی چیز کی جستجو میں مسلسل لگے رہے جس سے زندگی کے اکثر گوشوں میں پائے جانے والی ضروریات کی کفایت ہو سکے مگر وہ اس ضرورت کے دباؤ کے تحت زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے، لیکن سخت تجربات اور طویل عرصہ تک زمانے کی گرد چھاننے کے بعد وہ بالآخر قرآن کی تجویز کردہ ہدایت کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر لوٹ آئے، اس پر چند شواہد پیش کیے جاتے ہیں۔

① بالآخر امریکہ نے شراب کو ممنوع قرار تو دے دیا لیکن پھر بھی ناکام رہے، کیونکہ اس حرمت شراب کے سلسلہ میں اسلام نے جو طریقہ حکمت اپنایا تھا اسے انہوں نے اختیار نہیں کیا۔

② امریکا نے طلاق دینے کی اجازت دیدی، اگرچہ اس میں نقصان کی حد تک اسراف سے کام لیا گیا ہے۔

③ اسپین کی حکومت نے اپنے علاقوں میں قانونی زناکاری پر پابندی کا احکامات جاری کر دیئے اور عورتوں کو دریا اور سمندر کے کناروں پر نہانے والے کپڑے پہن کر نکلنے سے منع کر دیا ہے۔

④ اب یہود بھی تعدد ازدواج کا مطالبہ کرنے لگے ہیں، اس تحریک کی قیادت ایک یہودی شخص جس کا نام مورشہ لکفرمان، کر رہے ہیں، اور اس نے اس پر دلیل یہ دی ہے کہ اس سے یہودی مذہب کو استحکام حاصل ہوگا، اس نے یہود سے مطالبہ کیا ہے کہ الحاخام غرشون، جس نے ایک سے زیادہ شادیاں ممنوع قرار دے کہ مذہب یہودی کی حدود سے تجاوز کیا ہے، اس کے قانون کو کالعدم قرار دیا جائے۔ بلکہ ان کی بعض عورتیں بھی اس مطالبہ میں شریک ہیں۔ اور بہت سے لوگ اس کے پیروکار بھی بن گئے ہیں۔

⑤ یورپ کے اصلاح پسند لوگ تعدد ازدواج کی ضرورت پر اپنی آواز بلند کر رہے ہیں، ان کی کچھ عورتیں بھی اس کا مطالبہ کر رہی ہیں۔

⑥ فرانس کے لیڈر نے موجودہ جنگ میں ہزیمت اٹھانے کے بعد اعلان کرتے ہوئے کہا کہ: ہماری حکومت کے زوال وسقوط کا اصل سبب یہ ہے کہ لوگ جنسی خواہشات میں مبتلا ہو گئے ہیں اور فتنہ وفساد میں ڈالنے والے امور میں حد سے زیادہ پڑ گئے ہیں۔

پانچویں وجہ: کائناتی علوم کے بارے قرآن کا مؤقف

مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں کائناتی علوم کے بارے میں پانچ طرح کے اعتبارات کا لحاظ رکھا گیا ہے، کسی مخلوق سے اس طرح کے امور کا صادر ہونا ناممکن ہے، چہ جائیکہ، کسی ای شخص سے ان کا صدور ہو جس کی پرورش بھی امیوں میں ہوئی ہو!

① قرآن نے ان کائناتی علوم کو اپنا موضوع نہیں بنایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے علوم قانونِ ارتقاء کے تابع ہوتے ہیں، اس کی تفصیلات ایسی مخفی اور پوشیدہ ہیں کہ عام لوگوں کے ذہنوں تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہے، علاوہ ازیں ان علوم کا حال بھی قرآنی مقاصد یعنی گمراہ انسانیت کو راہ حق پر لانا، جن وانس کو دونوں جہاں کی سعادت سے بہرہ یاب کرنا، کے مقابلے میں معمولی اور کم حیثیت کا ہے۔ جیسا کہ کتاب ہذا کی پہلی بحث (کتاب ہدایت واعجاز) میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ چنانچہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ ہم ہدایت واعجاز کی حدود سے تجاوز کریں حتیٰ کہ یہاں پر ان کائناتی علوم کا کچھ ذکر بھی اسی ہدایت اور مخلوق کی خالق کی جانب راہ نمائی کرنے کی وجہ سے ہے۔ قرآن کا مقصد ان کائناتی امور سے صرف یہ نہیں کہ وہ ہیئت وفلکیات یا کیمیا وطبیعات کے بارے میں سائنسی حقائق کی تشریح کرے اور نہ یہ مقصد ہے کہ کوئی حساب کا یا الجبرے کا مسئلہ یا انجینئرنگ کا نظریہ حل کرے، اور نہ ہی یہ کہ علم طب میں کسی باب یا تشریح الاعضاء کے بارے میں کسی فصل کا اضافہ کرے اسی طرح قرآن کا مقصد علم حیوانات یا نباتات یا طبقات الارض وغیرہ کے بارے میں گفتگو کرنا نہیں ہے۔

لیکن بعض اہل علم وتحقیق کو یہ بات پسند آئی کہ وہ قرآن کے علوم ومعارف میں وسعت پیدا کریں، چنانچہ انہوں نے چند

کائناتی علوم کو بھی اس کی لڑی میں پرو دیا، اور وہ اس معاملہ میں یا تو غلطی کرنے والے ہیں یا حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ گو ان کی نیتیں اچھی ہونگی اور شعور بلند ہوگا، لیکن نیت اور علم وشعور خواہ کتنا ہی اچھا ہو مگر یہ چیزیں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ کوئی انسانی خلاف واقع امر کو نقل کرنا شروع کردے اور کتاب اللہ کو ان امور پر محمول کرنے لگے جو اس کتاب کا اصل کام اور مقصد نہیں ہے۔ بالخصوص جب اس کتاب نے ازخود اپنا اصل مقصد متعدد بار کئی مقام پر واضح اور متعین بھی کردیا ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (البقرۃ:۲)

"یہ کتاب ایسی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں، پرہیز گاروں کے لیے ہدایت ہے۔"

نیز ایک جگہ فرمایا:

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾ (المائدۃ:۱۵-۱۶)

"بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور واضح کتاب آئی ہے اس کے ذریعہ اللہ سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اسے جو اس کی رضا کا تابع ہو اور انہیں اپنے حکم سے اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور انہیں سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔"

نیز ایک بات جو سمجھنے کے قابل ہے کہ قرآن حکیم کی عظمت اس امر پر موقوف نہیں ہے کہ ہم اس کے لیے کوئی نیا مقصد نکالیں یا کسی ایسے مقصد پر محمول کریں کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، کیوں کہ قرآن کا ہدایت عالم کا مقصد اس کائنات میں سب سے اعلیٰ مقصد ہے اور گمراہ انسانیت کو راہ راست پر لانا اس زندگی کا بلند ترین وظیفہ ہے۔ ان کائناتی علوم کی قرآنی ہدایت کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے؟! کیا ان ہی علوم کی وجہ سے آج بھی سارا عالم فتنہ وفساد میں مبتلا نہیں ہے، آپس میں برسرپیکار اور دست وگریباں نہیں ہے؟ نیز کیا آجکل ان ہی علوم نے لوگوں کو موت کے گھاٹ نہیں آتار دیا، اور بر وبحر اور فضا اور پانی میں خوفناک اور خطرناک قسم کی توپیں، تباہ کن ٹینک، گونج دار طیارے، مہلک بم اور جلا دینے والی گیسیں اور دیگر تباہی اور بربادی کے آلات ان ہی علوم کا شاخسانہ ہے؟

جب ایک انسان ہدایت زبانی اور وحیِ آسمانی سے بہرہ یاب نہیں ہوتا تو اس کی حالت ان وحشی اور ضرر رساں درندوں اور جانوروں کے دانتوں اور پنجوں کی سی ہوتی ہے جو کسی گھنے اور خطرناک جنگل میں بستے ہوں!!۔

② قرآن کریم نے کائنات میں موجود نعمتوں اور عبرتوں سے انتفاع اور ان میں غور وتدبر کرنے کی جو دعوت دی ہے ان میں سے ایک مذکورہ کائناتی علوم بھی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (یونس:۱۰۱)

"کہہ دو دیکھو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے۔"

نیز ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ (الجاثیہ:۱۳)

"اور اس نے آسمانوں اور زمین کی سب چیزوں کو اپنے فضل سے تمہارے کام پر لگا دیا ہے بے شک اس میں غور کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔"

③ قرآن جب ان کائناتی امور کو پیش کرتا ہے تو ہمیں اس بات کا شعور بھی دیتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی زیر تسلط اور اس کے ارادے اور مشیت کے تابع ہیں، اس طرح ان چیزوں سے بہت سے گمراہ لوگوں کے اس ذہنی اور نظریاتی تعلق کی نفی کرتا ہے جو ان کو معبود خیال کرتے ہیں، حالانکہ وہ چیزیں خود مخلوق و عاجز ہیں، اور وہ لوگ ان کو مؤثر اور قادر خیال کرتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ ۚ﴾ (فاطر: ۴۱)

"بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل جائیں اور اگر وہ دونوں اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو ان کو کوئی بھی اس کے بعد روک نہیں سکتا۔"

اسی طرح قرآن نے ہمیں یہ بتایا کہ کائنات ایک روز ختم ہو جائے گی، فرمایا:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ﴾ (القصص: ۸۸)

"ہر چیز ہلاک ہو جانے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔"

نیز فرمایا:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ ۖ وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِينِهِ ۚ﴾ (الزمر: ۶۷)

"اور انہوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے اور یہ زمین قیامت کے دن سب اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہونگے۔"

نیز فرمایا:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ (ابراہیم: ۴۸)

"جس دن اس زمین سے اور زمین بدلی جائی گی اور آسمان بدلے جائیں گے۔"

④ قرآن جس وقت کسی ہدایت کے موقع پر کوئی کائناتی نشانی پیش کرتا ہے تو اس کے بارے میں ایسے گفتگو کرتا ہے جیسے کوئی ذات تمام علوم کائنات اور آسمان و زمین کے جملہ اسرار سے پوری طرح باخبر ہو، جس پر کوئی چیز مخفی نہ ہو نہ بر و بحر کی، نہ نجوم و کواکب کی، نہ بادل و آب کی اور نہ ہی انسان، حیوان اور نباتات کی! یہ وہ چیز ہے جس نے بعض ان لوگوں کو جو کائناتی علوم میں مشغول رہتے ہیں، حیرت زدہ کر دیا ہے اور کچھ کو ایسا کر دیا ہے کہ وہ حد سے تجاوز کرتے ہوئے ان علوم کو بھی علوم قرآن میں سے شمار کرنے لگے ہیں۔

⑤ قرآن حکیم نے اللہ تعالیٰ کی کائناتی نشانیوں کو بیان کرنے کے لیے جس اسلوب اور انداز کو اختیار کیا ہے وہ بھی بڑا جامع اور حیران کن ہے کہ ایک ہی لڑی میں اجمال اور تفصیل کو جمع کر دیا ہے کہ جب بھی نظم قرآن کا سامعین کے سامنے مرور ہوتا ہے، خواہ

وہ کسی بھی قوم ونسل سے تعلق رکھتے ہوں تو وہ اپنے بلند مقصد (یعنی انسان کی اللہ تعالیٰ کی طرف ہدایت وراہ نمائی) میں بالکل مفصل واضح اور آشکار ہوتا ہے، پھر وہ انہی تفصیلات کو اجمالاً بیان کرتا نظر آتا ہے کہ لوگ پھر اپنی صلاحیتوں، علوم وفنون اور وسائل کے مختلف ہونے کے اعتبار سے اس کی تفریعات ودقائق کے اخذ کرنے میں مختلف ہوتے ہیں۔

ایک مثال ہم پیش کرتے ہیں، ایک حکیمانہ آیت ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (الذاریات:۴۹)

"اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم نصیحت حاصل کرو۔"

اب یہ آیت نزول کے وقت سے اب تک تمام لوگوں کے سامنے آتی رہتی ہے۔ اور تمام لوگ اس کا مطلب یہی سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف اشیاء کو مختلف اشکال اور خصوصیات کے ساتھ پیدا فرمایا، جس سے اس ذات کی قدرت وکمال کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن پھر ان کا اختلاف ہوا کہ "زوجین" سے کیا مراد ہے، چنانچہ متقدمین علماء سے منقول یہ ہے کہ آیت کریمہ میں "زوجین" سے مراد دو متقابل امور ہیں خواہ کسی بھی طرح کا تقابل ہو، خصوصیت سے ذکوریت اور انوثیت مراد نہیں ہے۔ حضرت حسن رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے "زوجین" کی تفسیر لیل ونہار، زمین وآسمان، آفتاب وماہتاب، بر وبحر اور موت وحیات سے کی ہے، اسی طرح انہوں نے چند چیزیں شمار کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں سے ہر دو زوج ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات فرد اور بے مثال ہے۔ اور متاخرین علماء نے "زوجین" کا مطلب ذکوریت اور انوثیت دو متقابل امور سمجھے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ کائنات میں ہر چیز کے اندر ذکوریت اور انوثیت موجود ہے، (یعنی ایک نر اور ایک مادہ)۔ خواہ وہ انسان ہو یا حیوان یا جمادات وغیرہ جن کا ہمیں علم نہیں ہے، اس پر استدلال اس فرمانِ الٰہی سے کرتے ہیں۔

﴿سُبْحٰنَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ﴾ (یٰسٓ:۳۶)

"اور پاک وہ ذات جس نے زمینی نباتات میں سے بھی اور خود ان کی ذات سے بھی جوڑے بنائے اور ان چیزوں کے بھی جن کو وہ نہیں جانتے۔"

وہ کہتے ہیں کہ، اصول کائنات کے جدید ترین نظریہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ساری کائنات کے اصول دو دو جوڑوں سے بنتے ہیں، جدید سائنس کی زبان میں ان کو الیکٹرون (Electron) اور پروٹون (Proton) کہتے ہیں۔ ہم اس مسئلہ کو طول دینا نہیں چاہتے، ہمارے سامنے بہت سی مثالیں اور کتابیں موجود ہیں جو قرآن سے علوم کائنات کے استنباط میں لبریز ہیں۔ یا پھر جن میں قرآن کی تفسیر وتشریح علوم کائنات کے ذریعہ کی گئی ہے۔

ان کتابوں میں تازہ ترین کتاب جو میرے علم میں ہے، اور جو ابھی زیر طبع ہے، وہ ایک عالم وفاضل نوجوان کی تالیف کردہ ہے، جس کا نام انہوں نے "بین القرآن والعلم" رکھا ہے، انہوں نے اس کتاب میں عمرانیات، علم نفسیات، دراثت وزراعت، غذا رسانی اور ماورائے طبیعات کی متفرق ابحاث کا ذکر کیا ہے۔ اب یہاں ان کو ذکر کرنے کا بھی موقع نہیں ہے اور ضرورت بھی ہم نہیں سمجھتے۔ خاص طور پر جب یہ بات ہمارے سامنے واضح ہو چکی ہے کہ کائناتی علوم مد وجزر کی طبیعت کے تابع ہیں اور اس کی بہت سی

ابحاث ہمیشہ سے نفی اور اثبات کے اعتبار سے مضطرب اور پریشان کن رہی ہیں، کل کو علماء ہیئت جس چیز کے قائل تھے آج کے علماء ہیئت اس کی تردید کرتے نظر آتے ہیں، علماء طبیعات کل کو جو بات ثابت کرتے آئے آج وہی علماء اس کی نفی کر رہے ہیں، اسی طرح مؤرخین ایک بات زمانہ قدیم میں ثابت کرتے آئے ہیں آج وہی مؤرخین اس کی نفی اور تردید کرتے ہیں، مادیت پرست لوگ جس چیز کا انکار کرتے تھے اور اس کا انکار میں بھی سائنس کا نام لے کر انہوں نے حد سے تجاوز کیا تھا آج وہ اس چیز کا اثبات کرنے لگے ہیں اور وہ اس میں بھی سائنس کا نام لے کر حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں جس نے موجودہ سائنس پر ہمارا اعتماد کمزور کر دیا ہے۔ اور جس چیز کو سائنس کے نام پر ثابت کیا جاتا ہے اس کی طرف سے ہمارا اطمینان اب ختم ہو رہا ہے۔

یہاں تک کہ مطبوعات کی دنیا میں ایک عظیم کتاب لوگوں کے ہاں قابل قدر سائنسی مرکز سے شائع ہوئی ہے، وہ کتاب عظیم شان واہمیت کی حامل ہے، اس کتاب نے اس سائنس کی بنیاد کو ہی ہلا کر رکھ دیا ہے اور اس پر اعتماد کے ستونوں کو جھنجوڑ دیا ہے، نیز اس کتاب نے برہان ودلیل سے بہت سی ایسی مسلمات کو مخدوش قرار دیا ہے جن کو لوگ یقینی درجے کا خیال کرتے تھے، اس کتاب کا قاری اس کے آخر میں اس بات پر پہنچتا ہے کہ یہ کائنات ایک سربستہ راز ہے جو پردہ خفا میں پوشیدہ ہے، کتاب کا نام بھی اسی وجہ سے "الکون الغامض" رکھا گیا ہے، اور اس کے مؤلف سر جیمس جینز ہیں۔

کیا اس تفصیل کے بعد بھی ہم دھوکے اور فریب میں پڑے رہیں گے اس سائنس کی وجہ سے جسے لوگوں نے مقرر کر لیا ہے اور جسے انہوں نے اپنا ثالث بنا رکھا ہے، بلکہ لوگوں نے اس کے ساتھ اپنی ذات کو ایک تنگ وتاریک قید خانے یعنی مادیت کے دائرے میں محبوس کر لیا ہے، اور وہ قید نما دائرہ بھی ان کی عقل اور تجربات کے فہم کے مطابق ہے، حالانکہ کبھی ان کی عقلیں اور تجربات ناکامی سے بھی دوچار ہو سکتی ہیں، تو کیا ایسی صورت حال میں ہم قرآن کا محاکمہ ان متحیر اور مضطرب مادی علوم سے کروائیں، جبکہ خود قرآن ایسے بلند وبالا، ثابت ومضبوط حقائقِ الٰہیہ سے عبارت ہے جس کا نزول اس اعلیٰ وبرتر ذاتِ حق کی طرف سے ہوا ہے جو ہر طرح کی ظاہر وپوشیدہ باتوں کا جاننے والا ہے!۔

یاد رہے کہ قرآن، علم کی کسی بھی صورت سے راہ فرار اختیار نہیں کرتا، بلکہ وہ تو علم کا مشتاق اور اس کا داعی اور اس کا بانی ہے، لیکن پہلے علم کا اثبات ضروری ہے، اس پر اعتماد بحال کرو، اس کی تحقیق کرو، پھر اسے قرآن میں تلاش کرو، کسی نہ کسی دن ضرور اس میں پالو گے۔

یہ کوئی دانائی یا انصاف کی بات نہیں ہے کہ اس کے بلند علوم کے لیے دنیا کے علوم کی طرف رجوع کریں یا اس قرآن کو اس تنگ پنجرے میں بند کر دیں جس میں لوگوں کا ایک فریب خوردہ گروہ محبوس ہو کر رہ گیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ضروری ہے کہ ہم اس تاریک مادیت کے طوق سے آزادی حاصل کریں اور قرآن کی ان بلند فضاؤں میں پرواز کریں جہاں پر ہم نورانی علوم ومعارف اور روشن حقائق الٰہیہ کا نظارہ کر سکیں، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی پوری توجہ ہمیشہ کے لیے اس کتاب کی بلند ہدایات اور موعظت ونصیحت کے حصول پر مبذول رکھیں، نیز قرآن سے جو کائناتی امور معلوم ہو رہے ہوں ان کی تفصیلات کے بارے میں قطعی رائے نہ دیں، ہاں جس امر پر ہمارے پاس دلیل وبرہان موجود ہو جس میں کسی قسم کا شک وشبہ بھی نہ ہو اور کوئی ممانعت وغیرہ نہ ہو، وہ الگ بات ہے۔ بصورت دیگر ضروری ہے کہ ہم ان کی تفصیلات کے بارے میں توقف اختیار کریں۔ اور ان کی حقیقت اور علم عالم وخبیر ذات کے سپرد کر

دیں، وہی بات کہتے ہوئے جو فرشتوں نے اس وقت کہی تھی جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی زبانی لوگوں پر ظاہر کی تھی، یعنی:

﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝﴾ (البقرۃ: ۳۲)

موضوع سے متعلق ایک اہم بات

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں پر علامہ شیخ عبد العزیز جاویش کے اس موضوع سے متعلق چند قیمتی اقتباسات نقل کر دوں، لیکن میں ان کو کچھ تصرفات کے ساتھ پیش کرتا ہوں!۔

① قرآن کا مقصد دیگر آسمانی کتب کی طرح کائناتی سائنسی اور فنی امور سے بحث کرنا نہیں ہے جن میں وہ امور خاص موضوعی کتب میں مروج کے مطابق بیان کیے جاتے ہیں۔

② جب قرآن کریم دنیا میں آیا اس وقت جزیرہ عرب میں غلط عقائد بھی رائج تھے اور جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکالا تھا اس وقت ان لوگوں کے پاس کائناتی امور سے متعلق بہت غلط معلومات تھیں، پھر حکمت خداوندی کا تقاضا ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ان عقائد و معلومات کی تصحیح کے سلسلہ میں اس سے کئی گنا بڑھ کر نزول ہو جو سفر تکوین میں موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا۔ اور اس بارے میں اللہ کی حکمت بالغہ یہ تھی کہ خالق کی توحید درست عقائد اور اس سے متعلق احکام واخلاق کی طرف دعوت دینے کا کوئی ایسا راستہ میسر نہیں تھا جو ان کے قلوب کو متاثر کرتا جو قلوب اجرام علویہ کے لیے الوہیت اور کائنات کے وجود اور اس کے نظام میں اس کے مؤثر ہونے سے آشنا تھے، اور ان کے عقائد کا حال یہ تھا کہ مصر اور یونان میں عقل قدیم ان کو مبنی پر حقیقت خیال کرتی تھی اور وہ جزیرہ عرب اور اس کے اطراف وجوانب میں آشوری، بابلی اور کلدانی کے طریق سے پھیلے ہوئے تھے، بنا بریں ضروری تھا کہ قرآن لوگوں کی توجہ ان کے عقائد کے غلط ہونے کی وجہ کی طرف مبذول کرواتا اور جس باطل کی وہ پیروی کر رہے تھے اس بارے میں انہیں تردد اور شک میں ڈالتا، کیونکہ انہوں نے اپنے باپ دادوں کو اسی راستے پر پایا تھا اور یہ کہ ان کو اس قرآن کے ذریعے اس پتھر (کی پرستش) سے نجات دلائے جس نے ان کو بدبخت بنا دیا تھا اور جانوروں سے ملا دیا تھا۔

③ قرآن کا مقصد یہی تھا کہ خالق کائنات کے تعارف کا راستہ ہموار ہو، اسی خاطر قرآن انسانی عقول کی مثالیں بیان کر کے راہنمائی اور مدد کرتا ہے کہ تم کیوں اور کیسے اور کس بارے میں غور کرتے ہو؟ قرآن نے اپنے اس جہاد میں علم کے میدان کا نقشہ تیار کیا تا کہ بشری عقول اس میں اپنے بلند و مضبوط محلات قائم کر سکیں، اور صورتوں کے اساسی خطوط کی نقشہ سازی کریں تا کہ نقشہ ساز ان کو رنگوں، سایوں اور حسن و جمال کی علامات جیسے لوازمات سے بھر سکیں۔

④ قرآن کریم نے بعض کائناتی حقائق کے اسرار و رموز کو بیان کرنے میں صرف مثالیں ذکر نہیں کیں، بلکہ اس بارے میں علم و دانش سے بے بہرہ لوگوں کو اس کے قبول کرنے اور اس کا فہم جو حاصل کرنے کا حکم بھی دیا ہے، جس طرح پختہ اور قدرت یافتہ اہل عقل کو اس کے دقائق سے واقفیت اور آگاہی اور اس کے متعلق درست وجوہ کا علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے۔ علاوہ بریں دونوں قسم کے گروہوں کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ اپنی عقلوں کے عجز کا اعتراف کریں اور ان امور کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہ دیا کریں جن تک ان کی ابحاث اور محنت و کوشش کی رسائی نہ ہو۔

بلکہ خود کو ناتواں اور عاجز وقاصر جانا کریں۔ اور جو بات معلوم نہ ہو وہ اہل علم سے دریافت کیا کریں اور جس چیز کا ادراک نہ کر پائیں اس کو اس ذات کے سپرد کر دیں جس نے پیدا کیا اور وہ ذات لطیف وخبیر ہے۔

۵ مسیحی نے جب یورپ میں علم اور سیاسی نظام کے سامنے تجدیدی انقلاب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس وقت ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ کسی اسلامی جہاں سے مشابہت اختیار کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کی متشددانہ تحریک اور خونی انقلاب کا اصل سبب یہ تھا کہ کنیسا کے لوگوں نے دین کے نام پر لوگوں کی عقلوں اور ذہنوں پر پابندی لگا رکھی تھی، کنیسا نے ایک فلسفہ گھڑ لیا تھا، لوگوں کے لیے اس کی تشریح کرنا حرام کر دی تھی حتیٰ کہ جو امور لوگوں کے لیے مشتبہ ہوتے ان کی وضاحت پوچھنا بھی ممنوع تھا، پھر اس فلسفہ کے علاوہ جو شخص کسی اور چیز کا قائل ہوتا اس کی تکفیر کی جاتی، چاہے وہ اپنی رائے کی بنیاد محسوس اور مشاہد چیز پر رکھتا۔ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ کنیسا کے بعض لوگوں جیسے میلانشتون اور کیز مونیتی، نے تلسکوپ کے ذریعہ آسمان کو دیکھنے کو حرام قرار دے دیا۔

گلیلیو سے منقول ہے کہ مکتبِ ارسطو کے بعض شاگرد عملی طور پر اجسام مرئیہ کا انکار کرتے ہیں اور وہ فلسفہ ارسطو کو ایک ایسا مجموعہ مانتے ہیں جو قابل تجزی نہیں ہے کہ اگر اس کا ایک پتھر بھی ٹوٹ گیا تو اس کے نتیجہ میں ساری عمارت ہی زمین بوس ہو جائے گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس فلسفہ پر عمل پیرا ہونے پر مصر تھے اور اس کے دفاع وحفاظت کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

اس کے بعد علامہ عبد العزیز جاویش زمین کے تعدد کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: متقدمین نے زمین کے تعدد کے بارے میں کوئی بات بھی ذکر نہیں کی ہے، صرف ابن سینا نے قدیم حکماء فارس سے یہ بات نقل کی ہے کہ ہماری زمین کے علاوہ بھی بہت سی زمینیں موجود ہے، لیکن یہ رائے تمام حکماء اور فلاسفہ میں برابر مروج رہی یعنی وہ تعدد ارض کے قائل نہ تھے، حتیٰ کہ گلیلیو (۱۶۴۲ء م) نے دوربین اور تلسکوپ ایجاد کی، اسی طرح کچھ لوگ اس کے بعد آئے جنہوں نے اپنے چشم دید مشاہدات سے یہ امر ثابت کیا کہ ہماری زمین کی طرح تمام سیارات کی بھی زمینیں ہیں، اور ہماری اس زمین کی طرح وہاں پر بھی پہاڑ، غاریں، پانی، ہوا، آبادی اور مخلوقات موجود ہیں، البتہ انہوں نے اس جواز وامکان میں اپنی آنکھ اور اپنے تخمینہ اور گمان پر اعتماد کیا تھا، کیونکہ اس وقت تک ان کی دوربینوں سے یہ امور ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔

لیکن اس کے مقابلے میں قرآن حکیم نے زمینوں کے متعدد ہونے کی اس آیت کریمہ میں صراحت فرمائی:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾ (الطلاق: ۱۲)

"اللہ ہی ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور زمینیں بھی اتنی ہی۔"

نویں صدی ہجری کے ایک مفسر قرآن، علامہ ابو السعود اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ: جمہور مفسرین کی رائے یہ ہے کہ سات زمینیں موجود ہیں جو ایک دوسرے کے اوپر ہیں۔ تفسیر نیشاپوری میں ہے کہ سات زمینیں موجود ہیں کہ ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ہر زمین میں مستقل ایک مخلوق بھی آباد ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ وہ اپنی زمین کی جانب سے آسمان کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور اس کی روشنی بھی دیکھتے ہیں۔

قرآنی آیات میں سے صریح ترین آیت جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ تمام سیارات اصل میں قابل رہائش زمینیں ہیں وہ سورۃ الشوریٰ کی یہ آیت کریمہ ہے:

﴿وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ﴾ (الشوریٰ:۲۹)

"اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آسمانوں اور زمین کو بنایا اور اس پر ہم ہر قسم کے چلنے والے جانور پھیلائے۔"

آئندہ ذکر کردہ تاویل کے مطابق مذکورہ "سماوات" سے مراد سیارات ہیں۔ نیز اس موضوع پر ایک اور واضح آیت یہ ہے:

﴿وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِیْهِنَّ بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (المومنون:۷۱)

"اور اگر حق ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا تو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے درہم برہم ہو گیا ہوتا بلکہ ہم نے تو ان کی نصیحت انہیں پہنچادی ہے سو وہ اپنی نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں۔"

جن کی عقلیں ناقص ہیں وہی اجرام سماویہ میں مخلوقات کے وجود کو بعید از عقل خیال کیا کرتے ہیں، لیکن زمخشری اور بیضاوی وغیرہ نے اس بات کو بعید از عقل قرار نہیں دیا کہ ان آسمانوں میں اس طرح کے انواع حیوانات موجود ہوں جو اسی طرح چلتے پھرتے ہوں جیسے انسان اس زمین پر چلتے پھرتے ہیں، اللہ کی ذات ان چیزوں کی بھی خالق ہے جو ہمارے علم میں ہیں اور ان کی بھی جو ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ (یہاں تک ہم نے شیخ جادیش کا کلام نقل کیا ہے)۔

چھٹی وجہ: طریقِ اصلاح وتربیت

مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم نے مخلوق کی اصلاح وتربیت کے لیے انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے اور اس بارے میں حکیمانہ طرز وطریق کو اپنایا ہے اور اس طریقہ کو اختیار کر کے اپنے اصل مقصد یعنی ہدایت خلق، تک پوری رسائی حاصل کر لی ہے، چنانچہ قرآن نے اس کامل اصلاح کے لے وہ تمام وسائل وذرائع فراہم کر دیے ہیں جن کی انسانوں کو ضرورت ہوتی ہے، جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآن اپنے اس طریق اصلاح میں بھی ایسا کلام ہے جس کا صدور نہ خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات بابرکات سے ممکن ہے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا صادر ہونا ممکن ہے۔ اس کی توضیح کی چند صورتیں ہیں:

① کتاب اللہ کا متفرق طور پر نازل ہونا اور اس طرح دیگر کتب الٰہیہ کے خلاف ہونا، یہ لوگوں کی فطرت وعقل کے بہت قریب بھی ہے اور اس کی تحصیل کے لیے انتہائی آسان بھی اور اس کی پیش کردہ تعلیمات کو قبول کرنا بھی بہت سہل ہے، جسا کہ ہم اس سے پیشتر کتاب ہذا کی تیسری بحث میں متفرق طور پر اس کے نزول کے اسرار بیان کر چکے ہیں۔

② کتاب اللہ کا اس قدر شان دار اور دلچسپ اسلوب وانداز بیان اختیار کرنا جو دلوں کو موہ لینے والا ہے، اس طرح لوگ اس کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں اور اس کی تعلیمات سے مانوس بھی ہوتے ہیں، اگرچہ اس کی تعلیمات اس چیز کے خلاف تھیں جس پر وہ پہلے سے کاربند تھے۔

③ کتاب اللہ کا احکام وقوانین، علوم وفنون اور دیگر آداب کی ترتیب وتالیف میں غیر معروف طریقہ اور طرز اختیار کرنا، جیسے عام دیگر

کتابوں میں موضوعات کی تقسیم وتبویب ہوتی ہے کہ کتاب کا ہر باب ایک متعین موضوع کے ساتھ مختص ہوتا ہے، فصول میں سے ہر فصل کسی مسئلہ یا چند مسائل وغیرہ کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے، (یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ) یہاں کتاب اللہ میں آپ دیکھیں گے کہ عام طور پر قرآن کی ہر سورت، چند مشترک مقاصد اور موضوعات کو جامع ہوتی ہے، قاری اور ناظر اس سے بڑا لطف اور لذت محسوس کرتا ہے، جب بھی آپ ایک ہی سورت کے مختلف مقاصد میں بڑھتے جاتے ہیں تو آپ کو ایسے ہی لذت آتی ہے جیسے کسی کھانے والے شخص کو لذت اور لطف محسوس ہوتا ہے جب اس کے سامنے ایک ہی دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے رکھے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کے اس اختیار کردہ اسلوب کے دو فائدے ہیں: (۱) کتاب اللہ کے قاری اور ناظر کی اکتاہٹ اور طبعی ملال کو دور کرنا۔ (۲) انسانی نفوس کو خوش اسلوبی سے اس کی ہدایات کی طرف لانا۔ اس طرح سے کہ وہ کوئی ذلت محسوس نہ کریں، اس کے علاوہ اس میں وہ امور بھی پائے جاتے ہوں جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یعنی پوری سورت یا اس کے کسی حصے میں فنی وحدت کا ہونا، تمام انسانی ضروریات کی اس میں تکمیل کا ہونا وغیرہ۔ باوجودیکہ قرآن ہدایت اس طرح منتشر اور بکھری ہوئی ہیں کہ عام طور پر تالیف یا مؤلف کی غرض اور مقصد کے نہ پائے جانے کی وجہ سے ہم آہنگی کلام کے اندر باقی نہیں رہتی ہے، لیکن پھر بھی وجوہ اعجاز میں سے ایک بالکل نئی صورت معلوم ہو رہی ہوتی ہے، جسے بھی تالیف وتصنیف یا مصنفین کی کتابوں کی چھان بین سے واسطہ پڑا ہو وہ اپنے احساس اور تجربہ کی بناء پر ہماری اس بات کی تصدیق کرے گا!۔

④ اہم امور کو مکرر لانا، کتاب اللہ ہر اس بات کو جو واقعی قابل تکرار ہوتی ہے اس کو اس لیے مکرر لاتا ہے تاکہ ایسے نفوس جو ابھی مانوس نہیں ہوئے یا ایسی طبیعتیں جو اس سے متنافر ہیں، بار بار ذکر کر کے انہیں مانوس اور قریب کیا جائے، اور وہ اس طرح تابع دار اور فرماں بردار ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن، توحید کے عقیدے کو بڑی تاکید کے ساتھ بیان کرتا ہے اور شرک کو جڑ سے اکھاڑتا ہے، اور ان دونوں امور کو مکرر انداز سے بار بار بیان کرتا ہے، کبھی صراحت سے اور کبھی اشارے سے، کبھی اختصار کے ساتھ اور کبھی تفصیل کے ساتھ اور کبھی ایک عقیدے کو مدلل طریقے سے اور کبھی اس عقیدے کو بیان کرتے وقت اس کے ساتھ ایک دلیل لے آتا ہے اور کبھی کئی دلائل ذکر کرتا ہے، کبھی اس کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، اور کبھی اس کے متعلق قصص و واقعات ذکر کرتا ہے، اور کبھی اس عقیدے کے ساتھ کسی وعدے کو بھی لے آتا ہے اور کبھی کسی وعید کو، اسی طرح مختلف انداز اختیار کرتا ہے۔

⑤ کتاب اللہ کا انسانی فکر وعقل کو مخاطب کرنا اور اسے غور وفکر کی دعوت دینا اور دلیل و برہان کا مطالبہ کرنا، اور عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کی مذمت کرنا اور اندھی تقلید واتباع کو پسند کرنے والوں اور جمود رائے میں مبتلا لوگوں کی برائی کرنا۔

اللہ تعالیٰ کے ان فرامین کو پڑھیے:

﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا﴾ (لقمان:۲۱)

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کی اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ بلکہ ہم تو اس کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔"

نیز فرمایا:

﴿ اَوَ لَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ شَیۡـًٔا وَّ لَا یَهۡتَدُوۡنَ ﴾ (البقرۃ:۱۷۰)

"خواہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔"

نیز فرمایا:

﴿ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الۡبُكۡمُ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴾ (الانفال:۲۲)

"بے شک سب جانوروں میں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہی بہرے گونگے ہیں جو نہیں سمجھتے۔"

نیز فرمایا:

﴿ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَهُوۡنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا یَسۡمَعُوۡنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

"ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں اور آنکھیں ہیں کہ ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی گمراہی میں زیادہ ہیں یہی لوگ غافل ہیں۔"

اس طرح کی بہت سی مثالیں قرآن کریم میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں: مثلاً درج ذیل آیات بھی ہیں:

﴿ اَفَلَا یَسۡمَعُوۡنَ ﴾ (السجدۃ:۲۶)

"کیا وہ سنتے نہیں ہیں۔"

﴿ قَلِیۡلًا مَّا تَذَكَّرُوۡنَ ﴾ (الحاقۃ:۴۲)

"بہت کم تم نصیحت قبول کرتے ہو۔"

﴿ اَنّٰی یُؤۡفَكُوۡنَ ﴾ (المنافقون:۴)

"وہ کہاں الٹے پھیرے جا رہے ہیں۔"

﴿ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴾ (البقرۃ:۱۱۱)

"کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل لے آؤ۔"

﴿ اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ كَیۡفَ خُلِقَتۡ ۟ وَ اِلَی السَّمَآءِ كَیۡفَ رُفِعَتۡ ۟ وَ اِلَی الۡجِبَالِ كَیۡفَ نُصِبَتۡ ۟ وَ اِلَی الۡاَرۡضِ كَیۡفَ سُطِحَتۡ ۟ ﴾ (الغاشیۃ:۱۷-۲۰)

"پھر کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسے بلند کیے گئے ہیں اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے کھڑے کئے گئے ہیں اور زمین کی طرف کہ کیسی بچھائی گئی ہے۔"

﴿قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ﴾ (یونس:۱۰۱)

"کہہ دو دیکھو کہ کیا ہے آسمانوں اور زمین میں۔"

اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جو انسانی کرامت وشرافت کو بلندی عطا کرتی ہیں، اور اہم امور میں حتیٰ کہ عقیدہ توحید کے بارے میں بھی انسانی کی عقل وفکر کو متوجہ کرتی ہیں، تا کہ انسان کا ضمیر وقلب مطمئن بھی ہو، اس کے اندر یقین کی برودت اور ایمان کی حرارت پیدا ہو سکے۔

⑥ دلائل وبراہین سے نفس کی اصلاح وتہذیب کر کے اس کے اندر صالح اور نیک خصائص پیدا کرنا۔ انسان کے اندر ایسی خصلتیں دوسروں کی تقلید واتباع سے پیدا ہوتی ہیں، قرآن نے انسانی نفس کو جہالت اور فسق وفجور جیسی بری مثالوں سے دور رکھتے ہوئے اسے اچھی مثالوں اور ان حضرات کی اتباع کی طرف متوجہ کیا ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی جماعت کی پیروی کو لازم قرار دیا۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء:۶۹)

"اور یہ رفیق کیسے اچھے ہیں۔"

نیز فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ (الاحزاب:۲۱)

"البتہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ میں اچھا نمونہ ہے اس کے لیے جو اللہ اور قیامت کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔"

نیز فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ (آل عمران:۳۱)

"کہہ دو اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔"

نیز فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (الانعام:۹۰)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی سو تو ان کے طریقے پر چل۔"

انسان کی جبلت میں خود کو بلند رتبہ اور بقا وخلود کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔

قرآن نے اسے بھی ظلم وزیادتی سے دور رکھتے ہوئے اس جذبے کو اپنے نفس، اپنی عزت اور دین ووطن کے دفاع کی طرف پھیر دیا اور اسی خصلت کے ذریعہ مخلوق خدا کی حق اور خیر کی جانب راہنمائی کی کہ ان سے ایک اور زندگی کا جہاں خلود اور بقاء ہو گا، وعدہ کیا، جہاں وسیع اور کشادہ ملک وسلطنت اور عادلانہ بلند مرتبی حاصل ہوگی۔ فرمایا:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّ مُلْكًا كَبِیْرًا﴾ (الانسان:۲۰)

"اور جب تو وہاں دیکھے گا تو نعمت اور بڑی سلطنت دیکھے گا۔"

قرآن نے لوگوں کی اس طریقے سے اصلاح کی ہے کہ اپنے اوامر کو لوگوں کے مصالح سے اور نواہی کو ان کے مفاسد سے وابستہ کیا ہے۔ اور اسے عام ضابطہ قرار دیا ہے، اس کے بارے میں فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا﴾ (فصلت:۴۶)

"جو نیک عمل کرے گا تو اپنے فائدے کے لیے اور جو برا عمل کرے گا تو اپنے نقصان کے لیے۔"

نیز ایک جگہ فرمایا:

﴿اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا﴾ (الاسراء:۷)

"اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنے لیے کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو اپنے لیے۔"

اگر آپ اس بارے میں تفصیل اور تمثیل معلوم کرنا چاہیں تو قرآن میں بیان کردہ مومن اور کافر کے مابین دلچسپ موازنہ ملاحظہ کریں۔ قرآن کہتا ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (الزمر:۲۹)

"اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے ایک غلام ہے جس میں کئی ضدی شریک ہیں اور ایک غلام سالم ایک ہی شخص کا ہے کیا دونوں کی حالت برابر ہے سب تعریف اللہ ہی کے لیے مگر ان میں سے اکثر نہیں سمجھتے۔"

آپ اس آیت کریمہ میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ایک مشرک جس کے کئی معبود ہوں اس کی مثال ایسے غلام کی ہے جس میں بہت سے لوگ شریک ہوں جو آپس میں لڑتے جھگڑتے ہوں، ہر ایک کا دعویٰ ہو کہ وہ اس کا غلام ہے، وہ تمام شرکاء اسے اپنی طرف کھینچ رہے ہوں، اس غلام سے باری باری مختلف کام لیتے ہوں۔ اِدھر وہ غلام حیران و پریشان اور مشقت سے تھکا چور ہوا ہو اور اسے سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ خدمت کر کے کسے خوش کرے؟! اپنی حاجات کی براری کے لیے کس پر اعتماد کرے؟ کس سے روٹی روزی مانگے؟ اسباب معاش کس سے مانگے؟ وہ فکری طور پر متحیر ہو، ذہنی انتشار کا شکار ہو! اس کے مقابلے میں مومن کی مثال ایک ایسے غلام کی ہے جس کا ایک ہی مالک ہو، اس غلام کی حالت یہ ہو کہ اس کا ضمیر مطمئن ہو، اسے خاطر جمعی حاصل ہو، فکری و عملی طور پر راحت و سکون حاصل ہو! ارشاد فرمایا:

﴿ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (یوسف:۳۹)

"کیا متفرق رب بہتر ہیں یا اللہ جو ایک ہے اور قہار ہے۔"

اگر آپ ایک اور مثال سننا چاہتے ہیں تو قرآن کریم کی اس آیت کو ملاحظہ کریں جس میں نماز کی فرضیت کے بارے میں

ارشاد ہو رہا ہے:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۙ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ..... ﴾ (المعارج:۱۹-۲۲)

"بے شک انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو چلا اٹھتا ہے اور جب اسے مال ملتا ہے تو بڑا بخیل ہے مگر وہ نمازی......"

نیز فرمایا:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؕ﴾ (الرعد:۲۸)

"سن لو! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔"

اگر مزید مثالیں ملاحظہ کرنی ہوں تو ان آیات کو پڑھیے: زکوۃ کی فضیلت کے بارے میں فرمایا:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾ (التوبہ:۱۰۳)

"ان کے مال صدقہ کے طور پر لے کر ان کو پاک کریں اور اس کے ذریعہ ان کا تزکیہ کریں۔"

روزے کی فرضیت کے بارے میں فرمایا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴾ (البقرۃ:۱۸۳)

"تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم پرہیز گار بنو۔"

حج کی فرضیت کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۙ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (الحج:۲۷-۲۸)

"اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے کہ تیرے پاس پا پیادہ اور پتلے دبلے اونٹوں پر دور دراز راستوں سے آئیں تا کہ اپنے فائدوں کے لیے آ موجود ہوں۔"

نیز ایمان اور عمل صالح کے بارے عمومی طور پر حکم دیا کہ:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (النحل:۹۷)

"جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی دیں گے اور ان کے اعمال کی بہترین جزا دیں گے۔"

⑦ لوگوں کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق اوامر و نواہی کی ایسی ترتیب دینا جو تمام لوگوں کو شامل ہو۔ چنانچہ دینی اوامر کے چند درجات ہیں: یہ ایمان اور یہ اسلام ہے، یہ رکن ہے، یہ فرض ہے اور یہ امر واجب ہے، یہ مندوب مؤکد ہے، یہ مندوب غیر مؤکد

ہے۔ اسی طرح نواہی کے درجات ہیں: یہ نفاق ہے، یہ شرک اور یہ کفر ہے، یہ گناہ کبیرہ یہ صغیرہ ہے، یہ کچھ مباحات ہیں یعنی وہ کام جن کے کرنے کا اور نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس طریقے سے قانون سازی کرنا ہر فرد کے لیے سہولت کا ذریعہ ہوتا ہے، نیز اس سے کمزور اور کم ہمت لوگوں کو ترغیب بھی ہوتی ہے کہ وہ اسلام قبول کریں خواہ کم سے کم درجے میں کیوں نہ ہو، کیونکہ جب کسی کا نفس اس سے مانوس ہوگا، اس کی حلاوت وشیرینی سے لطف اندوز ہوگا تو درجہ درجہ ترقی کی منازل طے کرے گا، ایمان کے درجے سے اسلام کے مقام تک، پھر ایک رکن سے دوسرے فرض کی طرف، پھر امر واجب کی طرف، پھر مندوب مؤکد کی ادائیگی کی جانب، پھر مندوب غیر مؤکد کی ادائیگی کی طرف بڑھے گا، اس طرح نفاق کو ترک کرے گا تو درجہ بدرجہ شرک وکفر کو چھوڑے گا، پھر کبیرہ گناہوں کو چھوڑے گا، پھر صغیرہ گناہوں کو چھوڑتے ہوئے مکروہ تحریمی پھر مکروہ تنزیہی اور پھر بے فائدہ کاموں کو ترک کردے گا، نیز اسی طرح محض نوافل ادا کرتے کرتے پھر اس میں اضافہ کرنے لگے گا، حتیٰ کہ اس مقام تک رسائی حاصل کرلے گا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ (ایک حدیث قدسی میں) فرماتے ہیں کہ: میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب برابر حاصل کرتا رہتا ہے، حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں، پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اور اگر مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے ضرور عطا کرتا ہوں اور اگر مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور پناہ دیتا ہوں۔ ①

اس حکیمانہ اور شرعی طرز وطریق کی روشنی میں کہ جس پر قرآن کا نزول ہوا ہے، خود آنحضرت ﷺ بھی لوگوں کی اصلاح وتربیت فرماتے تھے، یعنی تدریجی طریقہ اختیار فرماتے تھے، لوگوں کے دل موہ لیتے، ان کی خاطر داری کے لیے کہ کسی طرح وہ قبول اسلام کی طرف مائل ہو جائیں حضور ﷺ ان کے ساتھ نرم برتاؤ فرماتے تھے۔

اس طرح کا ایک واقعہ امام احمد نے نقل کیا ہے کہ: نصر بن عاصم اللیثی ایک شخص سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس شرط پر مسلمان ہوا کہ وہ (پانچ کی بجائے) دو نمازیں پڑھے گا، حضور ﷺ نے ان کی شرط کو قبول فرمایا، ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے: اس شرط پر اسلام قبول کیا کہ وہ ایک ہی نماز پڑھے گا تو آپ ﷺ نے قبول فرمایا۔ ② وہب کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے قبیلہ ثقیف کے بارے میں پوچھا کہ انہوں نے بیعت اسلام کیسے کی تھی؟ انہوں نے کہا کہ قبیلہ ثقیف نے حضور ﷺ سے شرط رکھی کہ وہ نہ صدقہ دیں گے اور نہ جہاد کریں گے، نیز انہوں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: وہ بعد میں صدقہ بھی ادا کرنے لگے تھے اور جہاد بھی کرتے تھے۔ ③

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا کہ: اسلام قبول کرو، اس نے کہا کہ مجھے یہ بات ناپسند ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام لاؤ، خواہ تجھے ناگوار ہو۔ ④

---

① رواہ مسلم فی صحیحہ عن ابی ہریرۃ ② مسند امام احمد ۵/۲۵

③ رواہ ابوداؤد فی کتاب الامارۃ: باب (۲۶)، واحمد: ۳/۳۴۱

④ مسند امام احمد ۳/۱۰۹۔

امام شوکانی رحمۃ اللہ علیہ ان احادیث کے بعد نیل الاوطار میں لکھتے ہیں کہ مذکورہ احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ کافر کی بیعت اور اس کا قبول اسلام شرط کی بنیاد پر جائز ہے خواہ وہ باطل شرط لگائے۔

جو شخص نزول قرآن اور اسلامی قانون سازی کا مطالعہ کرتا ہے اسے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نزول قرآن کے دوران ایسی بہت سی حکمت وتدبیر اختیار کی گئی ہے، معجزانہ انداز میں اصلاح کا طریقہ اپنایا گیا ہے، عقیدہ توحید ہی کو دیکھ لیں کہ دعوت کی ابتداء صرف توحید کے عقیدے سے کی گئی۔ پانچ نمازیں تو بعثت سے تقریباً دس سال بعد فرض ہوئیں ہیں، اس کے بعد یکے بعد دیگرے دوسری عبادات آہستہ آہستہ فرض ہوئیں، معاملات تو بہت بعد میں ہجرت کے بعد آئے ہیں؟ اوامر کے علاوہ نواہی کا بھی یہی حال ہے، شراب کی حرمت کا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس میں اللہ نے کیا تدریجی طریقہ اختیار کیا ہے۔

⑧ قرآن حکیم کا روح اور جسم دونوں کے مقاصد کو ایک ساتھ ذکر کرنا، کہ کوئی ایک دوسرے کی حد سے تجاوز نہیں کرتا ہے، اس بارے میں بہت سی آیات ہیں، دیگر مناسب مواقع پر اس کی اہمیت وغیرہ بیان ہو چکی ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان ایک معتدل امت ہے، نہ تو یہود کی طرح ان پر مادیت اور جسمانی مصالح کا غلبہ ہے اور نہ ہی ہندوؤں اور نصاریٰ کی تعلیمات کی طرح ان پر صرف روحانیات کا غلبہ اور جسم کو اذیت دینا اور نفس کی تذلیل ہے، گو ان کی اکثریت اس کے خلاف بھی ہے۔

⑨ قرآن کریم کا دنیا اور آخرت دونوں کے مقاصد کو ایک ساتھ بیان کرنا، جس کے لیے طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ اس کی تعلیمات وہدایات کو لازم قرار دیا گیا، جس کو ہم نے سابق میں اجمالی طور پر ذکر کر دیا ہے، قرآن اس کے لیے غلط اعتقادات، جھوٹی خواہشات اور توکل اور ترک عمل کا طریق طرز اختیار نہیں کیا ہے، اس مضمون پر قرآن کی آیات کثیر ہیں، ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

⑩ قرآن کا یسر و سہولت کا معاملہ کرنا اور لوگوں سے حرج اور تکلیف کو دور کرنا۔ اس پر مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ دلالت کرتی ہیں۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج:۷۸)

"اس نے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔"

﴿مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ﴾ (المائدۃ:۶)

"اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں لیکن وہ تم کو پاک کرنا چاہتا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کرتا ہے۔"

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت کے مطابق ہی مکلف بناتے ہیں۔"

﴿يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

"اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے تمہارے ساتھ تنگی نہیں چاہتا۔"

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (المائدۃ:۳)

"جو ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر یہ کہ اس کو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل مطمئن ہو۔"

یہ ایک وسیع باب ہے، علماء نے اس سے بہت سے قواعد وضوابط وضع کیے ہیں۔ جیسے "المشقة تجلب التيسير" یعنی مشقت آسانی کا سبب بنتی ہے۔" الضرورات تبيح المحظورات" یعنی ضرورتیں، ممنوع چیزوں کو مباح کر دیتی ہیں۔ نیز ان قواعد کی بنیاد پر انہوں نے بہت سے فروعات کا بھی ذکر کیا ہے بلکہ ان میں مزید وسعت ہوتی جا رہی ہے۔

ساتویں وجہ: انبائے غیب

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ایسی بہت سی غیب کی خبروں پر مشتمل ہے جس کا محمد مصطفیٰ ﷺ کو علم نہیں تھا اور نہ ہی آپ ﷺ کو اس طرح کی چیزوں کے علم کی کوئی صورت تھی، جو اس امر پر واضح دلیل ہے کہ ان امور غیبیہ پر مشتمل قرآن نہ تو حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے صادر ہوا ہے اور نہ ہی کسی دوسری مخلوق کا بنایا ہوا ہے، بلکہ یہ اس ذات کا کلام ہے جو علام الغیوب اور قیوم الوجود ہے، جس کے ہاتھ میں سارے عالم کی لگام ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ﴾ (الانعام:۵۹)

"اسی کے پاس ہے غیب کی کنجیاں جسے وہ ہی جانتا ہے اور بر و بحر میں جو کچھ بھی ہے اسے وہ ہی جانتا ہے۔"

ان انبائے غیب میں وہ قصص بھی شامل ہیں جن کا تعلق زمانہ قدیم اور سابقہ زمانے سے ہے، اور وہ قصص بھی شامل ہیں جن کا تعلق حاضر امور سے ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ان کو بیان کرنا تو دور کی بات ہے، آپ ﷺ کے لیے ان کے معلوم ہونے کی بھی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس طرح ان میں زمانہ مستقبل کے متعلق خبریں اور واقعات بھی شامل ہے جو سربستہ اور پوشیدہ ہیں کہ اس کے جاننے کا کوئی ذریعہ اور سبیل نہیں ہے، انسان کی فراست اور ذہانت بھی اس کے ادراک سے قاصر ہے، اور پھر ان سب میں اعجاز کا راز یہ ہے کہ وہ تمام خبریں اس طرح واقع ہوئیں جس طرح کہ ان کو بیان کیا گیا تھا اور پھر اسی اجمال و تفصیل کے ساتھ وقوع پذیر ہوئیں جیسے خبر دی گئی تھی۔ اگر قرآن نے زمانہ ماضی سے متعلق کوئی غیب کی خبر دی تو تاریخ نے اس کی تصدیق اور گواہی دی، اور اگر امور حاضرہ سے متعلق غیب کی کوئی خبر دی تو انبیائے کرام علیہم السلام اور دنیا کے علوم اور تجربات نے ان کی شہادت دی اور اگر زمانہ مستقبل سے متعلق کوئی غیبی امر بتایا تو گردشِ ایام نے اس کی تصدیق و تائید کی۔

زمانہ ماضی سے متعلق غیبی خبریں

قرآن حکیم میں زمانہ ماضی سے متعلق غیبی امور کا ذکر بہت زیادہ ہے، قرآن ان کو شاندار قصوں کی شکل میں بیان کرتا ہے، آنحضور ﷺ کے لیے ان کے جاننے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

مثلاً ① قصہ نوح علیہ السلام جس کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۖ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا ۖ﴾ (ہود:۴۹)

"یہ غیب کی خبریں ہیں جس کو ہم آپ ﷺ کی طرف بطور وحی بھیجتے ہیں، آپ ﷺ اس سے پہلے ان کو نہ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔"

② اسی طرح قصہ موسیٰ علیہ السلام جس کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَ مَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۙ۝ وَ لٰكِنَّاۤ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَ مَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَ لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ وَ مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَ لٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (القصص: ۴۴-۴۶)

"اور آپ غربی جانب نہیں تھے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف حکم بھیجا اور نہ اس واقعہ کو دیکھنے والے تھے لیکن ہم نے بہت سی نسلیں پیدا کیں پھر ان پر مدت دراز گزری اور تو مدین والوں میں نہیں رہتا تھا کہ انہیں ہماری آیتیں سناتا، لیکن ہم رسول بھیجتے رہے اور تو طور کے کنارے پر نہ تھا جب ہم نے آواز دی لیکن تیرے رب یہ کا انعام ہے۔ تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔"

③ اسی طرح قصہ مریم علیہا السلام جس کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝﴾ (آل عمران: ۴۴)

"یہ غیب کی خبریں ہیں ہم بذریعہ وحی تمہیں اطلاع دیتے ہیں اور تو ان کے پاس نہیں تھا جب اپنا قلم ڈالنے لگے تھے کہ مریم کی کون پرورش کرے اور تو ان کے پاس نہیں تھا جبکہ وہ جھگڑتے تھے۔"

امورِ حاضر سے متعلق غیبی خبریں

اس سے ہماری مراد وہ امور اور خبریں ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات، فرشتوں، جنات، جنت دوزخ وغیرہ سے ہے کہ جنہیں دیکھنے یا جاننے کی آنحضرت ﷺ کے لیے کوئی صورت نہیں تھی، چہ جائیکہ آنحضور ﷺ اس کے متعلق اس طرح واضح طور پر کچھ بیان کرتے جس کی تائید انبیاء کی تعلیمات اور ان کی کتب کرتیں، قرآن میں اس نوع کی بھی بہت مثالیں موجود ہیں جسے بیان یا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مثلاً ① آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں منافقین کے اندرونی حال کو جس کو وہ چھپائے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے طشت ازبام کر دیا، چنانچہ فرمایا:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝﴾ (البقرۃ: ۲۰۴-۲۰۵)

"اور بعض ایسے بھی ہیں جن کی بات دنیا کی زندگی میں آپ کو بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنی دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ کرتا ہے حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو ملک میں فساد ڈالتا اور کھیتی اور مویشی کو برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔"

۴ مسجد ضرار جسے منافقین نے تعمیر کیا تھا، اس کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِیْقًۢا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰی ؕ وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (التوبہ:۱۰۷)

"اور جنھوں نے نقصان پہنچانے اور کفر کرنے اور مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کے لیے مسجد بنائی ہے اور واسطے گھات لگانے کے ان لوگوں کے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے لڑ چکے ہیں اور البتہ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا مقصد تو صرف بھلائی تھی اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ جھوٹے ہیں۔"

زمانہ ماضی اور حاضر کی بعض خبریں جو قرآن کے ضمن میں بیان ہوئی ہیں ان پر پڑے ہوئے پردے جدید سائنس نے ہٹائے ہیں، اس کی مثالیں عنقریب آ رہی ہیں۔

زمانہ مستقبل سے متعلق غیبی خبریں

ہم اس کی دس مثالیں بیان کرتے ہیں۔

پہلی مثال ❁ قرآن کریم کا رومیوں سے متعلق یہ خبر دینا کہ وہ چند سالوں کے اندر غالب آئیں گے، اس اعلان اور عظیم خبر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ یَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۙ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (الروم:۲-۶)

"روم مغلوب ہو گئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آئیں گے چند ہی سال میں پہلے اور پچھلے سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اس دن مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہ غالب رحم والا ہے اللہ کا وعدہ ہو چکا اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرے گا لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔"

اس کی وضاحت یہ ہے کہ سلطنت روم جو کہ مسیحی تھی، اہل فارس کے مقابلہ میں شکست سے دو چار ہوئی، اہل فارس بت پرست تھے اور یہ گھمسان کی لڑائی دونوں کے درمیان ۶۱۴ء میں ہوئی تھی، مسلمان اس وجہ سے غمناک سے ہوئے کہ رومی سلطنت دیندار تھی جو کہ ایک بت پرست سلطنت کے آگے شکست سے دو چار ہوئی، اور اس طرف مشرکین مکہ خوش ہوئے اور مسلمانوں کو طعنہ دیتے ہوئے کہنے لگے: رومی خود کو اہل کتاب کہتے ہیں، مجوسی ان پر غالب آ گئے، اور تم کہتے ہو کہ اس کتاب کی رو سے تم ہم پر غالب آ ؤ گے جو تم پر نازل ہوئی ہے، ایسا نہیں ہوگا بلکہ جس طرح روم کو فارس نے مغلوب کیا اسی طرح ہم بھی عنقریب تم پر غالب آ جائیں گے، اس پر مذکورہ آیات اُتریں، اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مسلمانوں کو اس بات کی خوشخبری سنائی کہ رومی اس شکست کے بعد چند سالوں میں فاتح ہونگے یعنی اس مدت کے دوران جو تین سے سات اور نو سال کے درمیان ہے غالب آئیں گے۔

اس بشارت کے زمانے میں یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ روم کے لوگ اس مختصر مدت کے دوران فارس والوں پر غالب آ جائیں گے بلکہ ظاہری اسباب و حالات اس کے بالکل خلاف تھے۔

اس لیے کہ اس سے قبل کی گھمسان کی جنگ نے ان کو شکست وریخت سے ایسا نہال کر دیا تھا کہ وہ عاجز آ چکے تھے۔ آیت کریمہ کے یہ الفاظ ﴿فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ﴾ (الروم: ۳) اس پر دلالت کرتے ہیں، نیز سلطنت فارس بڑی طاقت ور تھی اور پھر اس آخری فتح یابی نے ان کو قوت وطاقت میں اور اضافہ کر دیا تھا، اس وجہ سے عادۃً محال تھی یہ بات کہ روم کے لوگ ان پر کبھی غالب آئیں گے، اسی بناء پر بعض مشرکین نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے قرآن کی اس پیش گوئی کے وقوع پر شرط لگائی تھی، لیکن اللہ نے اپنے وعدے کو پورا کر دیا اور ۶۲۲ء میں یہ قرآنی پیش گوئی پوری ہوگئی، اس وقت ہجرت محمدیہ کا دوسرا سال تھا۔

ایک بات قابل ذکر یہ بھی ہے کہ اس آیت مذکورہ میں ایک اور بشارت بھی شامل تھی، اور وہ بشارت یہ تھی کہ جس وقت رومی لوگ غالب اور فاتح ہو رہے ہونگے عین اس وقت مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت سے (میدان بدر میں) فتحیاب ہو کر خوش ہو رہے ہوں گے، ارشاد فرمایا:

﴿يَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ﴾ (الروم: ۴-۵)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں وعدے پورے فرما دیئے کہ مسلمان بھی غزوہ بدر میں اسی دوران ظفر یاب ہوئے جس دوران رومی کامیاب وفاتح ہوئے۔ اس طرح ایک ہی وقت میں دو پیشین گوئیاں پوری ہوئیں، جبکہ رومیوں کے فتحیاب ہونے کے بظاہر اسباب موجود نہ تھے، اسی طرح اس بشارت کے وقت مشرکین کے مقابلے میں مسلمانوں کے غالب وفاتح ہونے کے بھی بظاہر اسباب ناپید تھے۔ کیونکہ مسلمان ابتدائے اسلام میں مکہ مکرمہ میں تعداد میں بھی کم تھے اور انہیں کمتر بھی خیال کیا جاتا تھا، مشرکین مکہ ان پر ظلم ڈھاتے تھے، انہیں کسی عہد یا رشتہ داری کی پرواہ نہ تھی، لیکن اس کے باوجود کہ عام حالات اس کے برخلاف تھے اور عقل سے بھی یہ بات بعید تھی، پھر بھی مذکورہ آیات بشارت نازل ہوئیں جن میں بڑی تاکید کے ساتھ اور زوردار انداز میں خوشخبریاں سنائی گئیں کہ انسان کو اس بارے میں کوئی تردد اور شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔

اگر آپ کسی تردد میں مبتلا ہیں تو ان کلمات کو دوبارہ سماعت فرمایئے:

﴿بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (الروم: ۵-۶)

"اللہ کی مدد سے مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور غالب رحم والا ہے۔ اللہ کا وعدہ ہو چکا اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرے گا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

پھر کیا آپ نے مزید غور نہیں کیا کہ آیت کریمہ کا یہ حصہ ﴿فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ﴾ (الروم: ۴) کس طرح حکمت وفصاحت کے ساتھ ان دونوں قسم کی پیش گوئیاں کا احاطہ کر رہا ہے کہ کوئی شبہ اشتباہ یا کسی مخالف کے لیے کوئی موقع ہی باقی نہیں رہتا، اس لیے کہ لفظ ﴿بِضْعِ﴾ کا اطلاق تین سے نو تک کے عدد کے لیے ہوتا ہے اور لوگ مہینوں اور سالوں کا حساب کرنے میں مختلف ہوا کرتے ہیں، کچھ لوگ تو سورج سے اور کچھ چاند سے وقت مقرر کرتے ہیں، پھر ان میں کچھ وہ ہیں جو حساب وشمار کے وقت کسور کا بھی اعتبار کرتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ مزید برآں یہ کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انتقام کا زمانہ طویل ہو جاتا ہے، چنانچہ اس کی بشارتوں کی ابتداء کسی سال میں ہوگی اور اس کے فیصلہ کے مواقع ایک یا ایک سے زائد سالوں پر منتہی ہوں گے، اب اس انتقام کے وقت کی تعیین میں حساب کرنے

والوں کا خیال مختلف ہوگا، کچھ تو وہ ہونگے جوان بشارتوں کی وقت کی طرف اس کی نسبت کریں گے اور کچھ اس کی نسبت فیصلہ کے دن کی طرف کریں گے اور کچھ لوگ ان دو کے درمیان کے وقت کی طرف اسے منسوب کریں گے، ان سب کی تعبیر کے لیے یہ الفاظ یہ لائے گئے: ﴿سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ؕ﴾ یہ ایسا فصیحانہ اور جامع جملہ ہے کہ کسی طعنہ زن یا حساب کرنے والے کے لیے کوئی موقع باقی نہیں رہنے دیتا۔ اور اللہ رب العزت کی بات غالب آئی اور ہر اصطلاح اور اعتبار سے اس کا کیا ہوا وعدہ سچا ثابت ہوا۔

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝﴾ (النساء: ۱۲۲)

"اللہ سے بڑھ کر سچا کون ہوگا۔"

دوسری دلیل ○ قرآن کا یہ خبر دینا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کی حفاظت فرمائیں گے، مخالفین کو آپ ﷺ کے قتل تک رسائی حاصل نہ ہوگی۔ انہیں کبھی بھی آپ ﷺ کی حیات طیبہ کو معدوم کرنے کی قدرت حاصل نہ ہو سکے گی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ﴾ (المائدة: ۶۷)

"اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔"

قرآن مجید کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، کسی کو بھی اعدائے اسلام میں سے قدرت حاصل نہ ہوسکی کہ وہ آپ ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کر سکے۔ حالانکہ وہ تعداد و استعداد میں بھی زیادہ تھے اور آنحضور ﷺ پر حوادثات کے نزول کا انتظار کیا کرتے تھے، بلکہ وہ آپ ﷺ کو گزند پہنچانے کے لیے ہمہ وقت موقع کی تاک میں رہتے تھے کہ کس طرح آپ ﷺ کو اور آپ کی دعوت کا خاتمہ کر دیں! آنحضور ﷺ استعداد اور لشکر کے لحاظ سے ان سے کمزور تھے، ایسے حالات میں نصرت کا وعدہ اور اسے پھر پورا کرنے کا کون مالک اور مختار ہو سکتا ہے؟ وہ صرف اللہ تھا جو سب پر غالب ہے، کوئی اسے مغلوب نہیں کر سکتا، اس کی مراد کی تکمیل میں کوئی چیز مائل نہیں ہو سکتی۔

﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ﴾ (الانعام: ۱۸)

"وہی اپنے بندوں پر غالب ہے۔"

اگر یقین نہ آئے تو تاریخ اور مؤرخین سے دریافت کر لیجیے کہ کتنے امراء، سلاطین اور فراعین ایسے ہوئے ہیں کہ اپنے کثیر لشکر اور خدام وحشم کے ہونے کے باوجود ان کے خون سے زمین لت پت ہوگئی!۔

کیا اب بھی یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ قرآن، جو اس حفاظت پر مشتمل ہے، محمد (ﷺ) کا خود ساختہ کلام ہے! حالاں کہ ان دنوں آپ ﷺ کے دشمن بڑے قوی تھے اور آپ ﷺ ناتواں تھے، حتیٰ کہ مذکورہ آیت کے نزول سے پہلے آپ ﷺ کو پہرے دار رکھنا پڑتے تھے۔ جب آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ ﷺ کا اعتماد اور بھروسہ پہرے داروں سے کہیں بڑھ کر اس آیت پر تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بہت جلد اس آیت کے نزول کے وقت اپنے پہرے داروں کو یہ فرماتے ہوئے ہٹا دیا کہ: لوگو! اب تم چلے جاؤ! اللہ نے میری حفاظت فرما دی ہے۔ [1]

[1] کما رواہ الطبرانی عن ابی سعید الخدری ورواہ الترمذی فی تفسیر سورۃ (۵) حدیث رقم ۳۰۴۶

نیز امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب ہم کسی سفر میں سایہ دار درخت کے پاس پہنچتے تو ہم اس درخت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھوڑ دیتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ہم غزوہ ذات الرقاع میں موجود تھے، اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا اور اپنی تلوار اس پر لٹکا دی، اتنے میں ایک مشرک آدمی آ گیا، اس نے تلوار سونتتے ہوئے کہا: کیا آپ مجھ سے ڈرتے ہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں" پھر اس نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون مجھ سے بچائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ مجھے تجھ سے بچائے گا۔ تلوار رکھ دو، اس نے تلوار رکھ دی۔

قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ اس غزوہ میں پیش آیا تھا جس میں نماز خوف کی مشروعیت ہو چکی تھی۔

حفاظت الٰہی اور وعدۂ خداوندی کی تکمیل کی ایک شہادت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب لڑائی شدت اختیار کر لیتی اور میدان جنگ خوب گرم ہو جاتا تو ہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنا بچاؤ کرتے، ہم میں سے کوئی ایک بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ دشمن کے قریب نہ ہوتا تھا۔

نیز اس پر اعلیٰ درجہ کی شہادت یہ ہے کہ جب غزوہ حنین کے موقع پر مسلمانوں کو اپنی عددی کثرت پر فخر ہوا تو اللہ نے انہیں ہزیمت دے کر ادب سکھایا اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر سکینت نازل فرمائی، یہاں تک کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا خچر دشمن کی جانب دوڑانے لگے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن مطلب خچر کی لگام کو پکڑ پکڑ کر روک رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف تیزی سے نہ چلیں، چنانچہ اس طرح مشرکین رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل سامنے آ گئے، جب مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھاگے نہیں اور نہ ہی اُلٹے پاؤں پھرے، بلکہ اپنے خچر سے اس طرح (اطمینان سے) اترے جیسے ان کو اپنی جان پر قدرت دے رہے ہوں اور یہ فرمانے لگے:

((انا النبی لا کذب، انا عبد المطلب)).

"یعنی میں خدا کا نبی ہوں، اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے اور میں عبدالمطلب کا بیٹا بھی ہوں۔"

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو چیلنج کر رہے ہوں اور انہیں اپنی جگہ تبار رہے ہوں! خدا کی قسم! دشمن پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذرا بھی گزند نہیں پہنچا سکا، بلکہ اللہ نے اپنے لشکر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد فرمائی اور اپنے دست قدرت سے دشمن کے ہاتھوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے باز رکھا۔[①]

تیسری دلیل ⭘ قرآن کے چیلنج کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا﴾ (البقرۃ:۲۴)

"بھلا اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے۔"

نیز فرمایا:

﴿قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۝﴾ (الاسراء:۸۸)

---

① رواہ البخاری فی کتاب الجهاد، باب (۵۲)، ومسلم فی کتاب: الجهاد حدیث:۷۸

”کہہ دو اگر سب آدمی اور سب جن مل کر بھی ایسا قرآن لانا چاہیں تو ایسا نہیں لا سکتے اگرچہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مددگار کیوں نہ ہو۔“

ان مذکورہ دو آیات میں قطعی طور پر اس بات کی نفی کی گئی کہ تمام مخاطبین اور جن وانس اس جیسا قرآن پیش نہیں کر سکتے، یہ چیلنج مستقبل کے تمام ادوار کو شامل ہے جس کا اختیار نہ آنحضور ﷺ کو ہے اور نہ یہ کسی دوسرے انسان کو۔ قرآن کی یہ پیشینگوئی جو مستقبل کے غیبی امور سے ہے، ثابت ہوئی اور ہمیشہ ثابت رہے گی، کیونکہ اس کے مخاطبین کا طبقہ بھی ختم ہو گیا مگر وہ چھوٹی سورت بھی اس کے مثل لانے سے قاصر رہا، پھر اس کے بعد بھی کئی نسلیں گزر گئیں کیا عرب اور کیا عجم پر سب کے سب عاجز ہی آئے، آج تک کسی کو مقابلہ کی طاقت نہ ہوئی، حالانکہ اس آخری ادوار میں تو اسلام کے دشمن زیادہ پائے جاتے ہیں جو اوّل دور کے دشمن کے مقابلہ میں اس دین کی عمارت کو ڈھانے کے زیادہ خواہش مند ہیں!۔ ملاحظہ کریں کہ اس طویل وعریض جرات مندانہ چیلنج نے کس قدر زیادہ ادبی حمیت کو ان لوگوں کے نفوس میں برانگیختہ کیا ہوگا جنہیں اس جیسا قرآن لانے کا چیلنج دیا گیا تھا، پھر دیکھیے کہ ان متاخرین میں جو نقد واعتراض کرنے والے ہیں وہ عام طور پر متقدین سے جو امور بیان کرنے سے رہ جاتے ہیں ان کی تلافی ضرور کیا کرتے ہیں، کمی رہ جائے تو اسے مکمل کرتے ہیں اور مکمل ہونے کی صورت میں مزید تکمیل کیا کرتے ہیں۔

اگر ہم فرض کریں کہ کوئی ایک فرد اس سے عاجز آ گیا تو یہ بات بعید از عقل ہے کہ ایک پوری جماعت اس سے عاجز آ جائے، اگر بالفرض ایک جماعت اس سے عاجز آ جائے تو ایک اُمت کا عاجز آ جانا بعید از عقل ہے۔ اور اگر ایک امت عاجز آ جائے تو ایک پوری نسل کا عاجز آ جانا عقل سے بعید ہے، پھر ایک نسل کی عاجزی بھی فرض کر لیں تو اتنی زیادہ نسلوں کا عاجز آ جانا بعید از عقل ہے! پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس طرح کا چیلنج اس آدمی سے صادر ہو جو عام پڑھا لکھا ہو، پھر کسی عظیم انسان سے اس کا صادر ہونا تو دُور کی بات ہے، چہ جائیکہ کسی معزز پیغمبر ﷺ سے اس کا صدور ہو یا پھر افضل المرسلین ﷺ سے اس چیلنج کا صدور تو بہت بعید ہے۔

اور پھر کیا یہ ممکن ہے کہ اس جرأت مندانہ طویل وعریض چیلنج کی تفسیر آسمانی وحی کی مدد کے بغیر یا اس ذات کی امداد کے بغیر ہو جائے جو ہماری آنکھوں اور کانوں کا مالک ہے یا اس ذاتِ کی امداد کے بغیر ہو جائے جو ہماری آنکھوں اور کانوں کا مالک ہے یا اس ذاتِ عالی کے بتائے بغیر اس کی تشریح ہو جائے جس کے دستِ قدرت میں ہر چیز کی سلطنت ہے وہی دوسروں کو پناہ دیتا ہے کوئی اس کو پناہ نہیں دیتا۔

چوتھی دلیل • اسلام کے مستقبل اور اس کے غلبہ کے بارے میں جو پیشین گوئی دی گئی قرآن نے اس وقت اس کی خبر دی جب مسلمان مکہ مکرمہ میں تعداد کے اعتبار سے بھی کم تھے اور کمزور وناتواں بھی تھے، ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ ان کو اچک نہ لیں، خبر یہ دی کہ اسلام عنقریب غالب آئے گا اور باقی رہے گا اور کتاب اللہ کو خلود اور حفاظت حاصل رہے گی جو ایک ایسی امتیازی صفت ہے جو دیگر آسمانی کتب میں نہیں پائی جاتی، قرآن کی سورۃ الرعد کی اس آیت کو پڑھیے:

﴿ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ ﴾ (الرعد: ۱۷)

”اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے پھر جو جھاگ ہے وہ یونہی جاتا رہتا ہے اور جو لوگوں کو فائدہ دے وہ زمین میں ٹھہر

جاتا ہے۔"

سورۃ ابراہیم میں ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا﴾ (ابراہیم: ۲۴-۲۵)

"اللہ نے کلمۂ پاک کی ایک مثال بیان کی ہے گویا وہ ایک پاک درخت ہے کہ جس کی جڑ مضبوط اور اُس کی شاخ آسمان میں ہے وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا ہے۔"

نیز سورۃ الحجر میں ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ (الحجر: ۹)

"ہم نے یہ نصیحت اُتاری ہے اور بے شک ہم اس کے نگہبان ہیں۔"

ان تین مکی سورتوں میں قرآن نے اپنی باوثوق زبان میں اس پیشین گوئی کو قطعی انداز میں بیان کیا، ان دنوں اسلام کو مکہ معظمہ میں دشواریوں کا سامنا تھا، مسلمانوں کی تعداد بھی کم تھی، کمزور تھے انہیں ڈر تھا کہ کہیں لوگ اُنہیں اُچک نہ لیں۔ اس نومولود دین کی کامیابی کی کوئی اُمید نظر نہیں آ رہی تھی، اگر بالفرض کسی داعی کے دل میں اس کی دعوت کی طبیعت کی وجہ سے ایسی امید پیدا بھی ہوتی تو بھی یقین وپختگی کی حد تک نہ پہنچتی اور اگر بالفرض حد یقین تک بھی پہنچتی تو جب تک صاحب دعوت زندہ رہتا تو وہ اس کی خبر گیری کرتا اور اپنی مستعدی کی وجہ سے اس کی غذا رسانی کرتا رہتا لیکن اپنے مرنے کے بعد اس کے پاس ایسے عوامل نہ ہوتے جو اسے اس دین کے غلبہ ونجاح کے بارے میں مطمئن کرتے، باوجودیکہ یہ بات ہر طرف معروف تھی کہ اس کا مستقبل مختلف حوادثات اور دشوار گزار زمانوں سے بھرپور ہے اور تاریخ بھی سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کے قتل کے واقعات، آسمانی وحی اور کتب میں تحریف وضیاع کے قصے اور حق کی دعوت کا انحطاط اور باطل کی دعوت کا ارتقاء وغیرہ ہمیشہ سے لوگوں سے بیان کرتی آئی تھی۔

اس طرح کے تمام حالات موجود تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے باوجود کبھی بھی اس بے عقل آدمی کی طرح نہیں رہے جو اوہام وخیالات کی راہ کا راہ رو ہوتا ہے یا جو جھوٹی خوابوں اور میٹھی آرزوؤں کے ذریعہ رفعت و بلندی کا طالب ہوتا ہے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نشوونما کے زمانہ سے ہی تواضع وانکساری، عقلمندی اور متانت وسنجیدگی جیسی صفات سے معروف تھے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات میں اس قدر پختہ اور مضبوط تھے کہ لوگوں میں صادق وامین کے لقب سے مشہور ہونے لگے۔ قرآن خود اس بات کا شاہد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت ملنے سے پہلے نہ نبوت کی کوئی طمع رکھتے تھے اور نہ ہی وحی الٰہی کی امید رکھتے تھے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ﴾ (القصص: ۸۶)

"اور تمہیں امید نہ تھی کہ تم پر کتاب اتاری جائے گی مگر تمہارے رب کی مہربانی ہوئی۔"

بلکہ نبوت کے مل جانے کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بقاء وحفاظت کی ضمانت دینے والا کوئی نہ تھا، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ

فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴾ (الاسراء: ۸۶-۸۷)

"اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تیری طرف وحی کی ہے اُسے اُٹھالیں پھر تجھے اس کے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی نہ ملے مگر یہ صرف تیرے رب کی رحمت ہے بے شک تجھ پر اس کی بڑی عنایت ہے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ایسی پختہ تاکیدات اور باوثوق امورِ عہد کا منبع و مصدر اُفق آسمانی ہی ہوسکتا ہے یعنی اس مالک و قاہر و غالب ذات کی جانب سے ہی ہوسکتی ہیں جس کے حکم کو کوئی مسترد نہیں کرسکتا، اسی ذات کا بیان کردہ کلام ہے جو کل عالم کا مالک ہے ماضی، حاضر اور مستقبل ہر زمانے میں اسی کا حکم جاری و نافذ ہوتا ہے۔

ان پیشین گوئیوں کی صداقت پر ایک مؤید یہ ہے کہ اسلام کو طویل زمانوں اور مختلف ادوار میں متعدد بار کئی انواع کی مشقتیں پیش آئی ہیں جو اس کو ختم کرنے اور مٹانے کے لیے کافی تھیں، لیکن ان سخت گیر ادوار کے باوجود اسلام اپنی جگہ قائم و دائم اور پہاڑ کی طرح بلند ہے، اس کی رفعت و بلندی آسمان کو چھو رہی ہے، اسی طرح قرآنِ عزیز کو بھی لوگوں کے مختلف قسم کے طعن و تشنیع اور خطرناک کوششوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، کسی دور کا بھی کوئی انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا، بلکہ اس سے پہلے کی کسی کتاب کو بھی اس تہمت اور الزام کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو اس آخری کتاب کو کرنا پڑا، ان تمام مخالفتوں اور عداوتوں کے باوجود اللہ کا کلام، قرآن پاک، اپنی بلندیوں پر فائز ہے، سارے جہاں پر ضیا پاشی کر رہا ہے، اس کی مخالفت و عداوت کی تمام تر کوششیں ایسی ہیں جیسے کتوں کا آسمان کی بلندیوں کو دیکھ کر بھونکنا۔

پانچویں مثال ○ قرآن ایک پیشین گوئی کرتا ہے کہ ایک خوشحال مستقبل مسلمانوں کا منتظر ہے، اور یہ پیشین گوئی ایسے وقت میں کی جب اس خوش آئند مستقبل کے آثار و اسباب اس کے موافق نہ تھے، پھر اس پیشین گوئی کی حقیقت اور تعبیر قرآن کے بتائے ہوئے فرمان کے مطابق مختصر ترین وقت میں پوری ہوئی، جی ہاں! ہم سورۃ الصافات میں یہ آیت پڑھتے ہیں:

﴿ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ (الصافات: ۱۷۳)

"اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب آئے گا۔"

نیز سورۃ غافر میں فرمایا:

﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ (غافر: ۵۱)

"ہم اپنے رسولوں اور ایمان داروں کے دُنیا کی زندگی میں بھی مددگار ہیں اور اس دن بھی جبکہ گواہ کھڑے ہوں گے۔"

نیز سورۃ النور میں فرمایا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ﴾ (النور: ۵۵)

"اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ انہیں ضرور ملک میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ ان سے پہلوں کو عطا کی تھی اور ان کے لیے جس دین کو پسند کیا ہے اسے ضرور مستحکم کردے گا اور ضرور ان کے

خوف کو امن سے بدل دے گا۔"

حالانکہ جس زمانے میں یہ پختہ عہد نازل ہو رہا تھا اس وقت مکہ اور مدینہ میں رسول پاک ﷺ اور آپ کے اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم طرح طرح کے ظلم و زیادتی اور مصائب و آلام سے دوچار ہو رہے تھے، تاریخی کتابیں اپنے اوراق میں ان داستانوں کو محفوظ کیے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ جب مسلمانوں نے ہجرت کر کے کچھ سکھ کا سانس لیا اس وقت ان کی بڑی آرزو یہی تھی کہ ان کا دین بس محفوظ رہے اور وہ اپنی ہجرت گاہ میں امن و امان سے زندگی بسر کریں۔ جیسا کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت نقل کی ہے کہ: "جب رسول کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ" مدینہ آئے اور انصار نے انہیں جگہ دی تو عرب کے لوگ اُنہیں ستانے لگے، مسلمان بغیر ہتھیار کے رات نہیں گزار سکتے تھے، دن کو بھی ہتھیار بند رہتے تھے، اس پر وہ کہنے لگے کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ تم امن و امان سے زندگی گزارو گے اور رات بسر کرو گے، تم تو اللہ کے سوا کسی ڈرتے نہیں ہو؟ اس پر مذکورہ آیت اُتری۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت براء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیت ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ.... الخ﴾ اس وقت نازل ہوئی جب ہم لوگ شدید خوف و ہراس میں مبتلا تھے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے ان حالات میں اللہ نے ان سے مذکورہ وعدہ فرمایا، پھر دیکھیں کہ وعدۂ خداوندی کس قدر جلدی پورا ہوا جبکہ حالات اس کے منافی اور عام عادت کے خلاف تھے، پھر ان مسلمانوں کو حکومت بھی عطا ہوئی، اطرافِ ارض میں انہیں حکومت دی، شاہانِ قیصر و کسریٰ کا ان کو وارث بنا دیا، اور ان کے دینِ پسندیدہ کو مزید مستحکم کر دیا، اور ان کے خوف کو امن سے بدل دیا۔ یہ ایسی پیشین گوئی تھی کہ عام حالات اس کے یکسر منافی تھے لیکن اللہ کی ذات چاہے تو ایسے خلافِ عادت امور کو پورا کر دیا کرتی ہے۔

جیسا کہ فرمایا:

﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝﴾ (محمد:۷)

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمائے رکھے گا۔"

نیز فرمایا:

﴿وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝﴾ (الحج:۴۰)

"اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا، بے شک اللہ زبردست غالب ہے۔"

چھٹی مثال ○ قرآن پیشین گوئی کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم (جو کہ مدینہ منورہ میں موجود تھے) عنقریب مکہ مکرمہ میں امن و امان کے ساتھ داخل ہوں گے اور حلق و قصر کرائیں گے، جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ﴾ (الفتح:۲۷)

"بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دکھایا کہ اگر اللہ نے چاہا تو تم امن کے ساتھ مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے اپنے سر منڈاتے ہوئے اور بال کتراتے ہوئے بے خوف و خطر ہوں گے۔"

پھر یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، حالانکہ اس وقت کے حالات بطورِ عادت اس کے خلاف تھے، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ قرآن، نہ تو حضور اکرم ﷺ کا ہوسکتا ہے اور نہ ہی کسی اور مخلوق کا، بلکہ یہ صرف اسی ذات قادرِ مطلق کا کلام ہے جو عام عادت سے ہٹ کر بھی اپنی مراد اور مقصد کو پورا کرتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ جیسے وہ اور ان کے اصحاب مکہ میں امن و امان کے ساتھ حلق و قصر کراتے ہوئے داخل ہوئے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اپنا خواب بیان فرمایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور یہ گمان کیا کہ وہ مکہ میں اسی سال جائیں گے، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حالتِ احرام میں ہدی کا جانور ساتھ لیے مکہ تک پہنچے، لڑائی کا کوئی ارادہ نہیں تھا، وہ صرف عمرہ اور عبادت کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ ابھی مقام حدیبیہ تک پہنچے تھے کہ قریش نے ان کو روک دیا اور ان کے ارادے کو پورا کرنے سے انکار کر دیا، اگر آنحضور ﷺ درمیان میں آ کر صلح وصفائی نہ کرواتے تو لڑائی ہوا ہی چاہتی تھی۔ حضور ﷺ نے سلامتی اور مصالحت کو ترجیح دی اور اس شرط پر واپس لوٹ آئے کہ وہ آئندہ سال اپنی عبادت کریں گے، آپ ﷺ نے ایسا صبر آزما صلح نامہ قبول کیا جو آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم پر بڑا گراں بار تھا۔ دوسری طرف منافقین کو موقع ملا کہ مزید ان میں آگ لگائیں اور ریشہ دوانیاں کریں، چنانچہ ان کا سردار عبداللہ بن اُبی کہنے لگا کہ: ہم نے تو نہ حلق کرایا اور نہ قصر کروایا بلکہ ہم نے تو مسجد حرام کو دیکھا تک نہیں۔ لیکن اس طرح کی سازشوں کے باوجود اور قریش کی عہد شکنی اور قطع رحمی کے ہوتے ہوئے بھی مذکورہ آیت کا نزول ہوا جس میں اس بات کا وعدہ کیا گیا بلکہ تین پختہ وعدے کیے گئے کہ مکہ میں بھی داخل ہوں گے، عبادت بھی کریں گے اور قریش کی اذیت سے بھی محفوظ و مامون رہیں گے اور پھر اس طرح احرام کھول کر مدینہ منورہ واپس بھی آ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا، چنانچہ حدیبیہ کے اگلے سال یہ وعدہ مکمل طور پر پورا ہوا۔ ارشاد ہے:

﴿وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّآ أَن يُتِمَّ نُورَهُۥ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُونَ﴾ (التوبہ: ۳۲)

"اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں۔"

ساتویں مثال ○ کفار کے تمام دشمن لشکروں کے شکست سے دوچار ہونے کی پیشین گوئی ایسے وقت میں دینا کہ جب لڑائی کا خیال بھی نہ تھا، چہ جائیکہ دو گروہ باہم ٹکرائیں اور مشرکین کو شکست اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہو جائے۔ سورۃ القمر میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ﴾ (القمر: ۴۵)

"عنقریب یہ گروہ شکست کھائیں گے اور پشت پھیر کر بھاگ جائیں گے۔"

آپ کو معلوم ہی ہے کہ جہاد ۲ ھ میں مشروع ہوا ہے، لیکن قرآن اس کی پیشین گوئی کتنی پہلے دے رہا ہے! لازمی بات ہے کہ یہ قرآن، اس ذات کی جانب سے نازل کردہ ہے جو آسمانوں و زمین کے پوشیدہ امور سے پوری طرح باخبر ہے۔ اگر آنحضور ﷺ نے اس قرآن کو حکیم و علیم ذات سے حاصل نہ کیا ہوتا تو پھر ایک اُمی شخص کیسے اور کہاں سے حاصل کرتا۔

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت کے نزول کے وقت لوگ کہنے لگے کہ یہ شکست کا معاملہ کیسے ہوگا! لیکن جب بدر کا واقعہ ہوا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا۔

آٹھویں مثال ☼ قرآنِ مجید کا مکہ مکرمہ میں اس تاریک مستقبل کی پیشین گوئی دینا جس کے کفار قریش منتظر رہے، پھر اس پیشین گوئی کے مطابق اس کا واقع ہو جانا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان پڑھیے:

﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۝ يَغْشَى النَّاسَ ۖ هَٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ رَّبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ۝ أَنَّىٰ لَهُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ۝ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ۝ إِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلًا ۚ إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ ۝﴾ (الدخان: ۱۰-۱۶)

"سو اس دن کا انتظار کیجئے کہ آسمان دھواں ظاہر لائے جو لوگوں کو ڈھانپ لے یہی دردناک عذاب ہے۔ اے ہمارے رب ہم سے یہ عذاب دُور کر دے بیشک ہم ایمان لانے والے ہیں وہ کہاں سمجھتے ہیں حالانکہ اُن کے پاس کھول کر سنانے والا رسول بھی آ چکا پھر اس سے بھی پھر گئے اور کہا کہ سکھایا ہوا دیوانہ ہے ہم اس عذاب کو تھوڑی دیر کے لیے ہٹا دیں گے تم پھر وہی کرنے والے ہو جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے بیشک ہم بدلہ لینے والے ہیں۔"

ان آیاتِ کریمہ کے نزول کا سبب یہ ہے کہ جب اہل مکہ کی سرکشی اور پیغمبر ﷺ کی نافرمانی حد سے بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے ان کے خلاف بددُعا کی کہ انہیں ایسی قحط سالی میں مبتلا فرما جیسے یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں قحط سالی ہوئی، یعنی ان کو شدید بھوک اور قحط میں مبتلا کر دے۔ اس سے اُمید ہے کہ یہ لوگ توبہ کریں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آئیں، چنانچہ ان آیات کے ذریعہ اللہ نے دُعا قبول فرمائی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں پانچ طرح کی پیشین گوئیاں ہیں:

① اس بات کی خبر دینا کہ شدید بھوک اور قحط میں مبتلا ہوں گے، حتیٰ کہ کوئی شخص آسمان کو دیکھے گا تو اسے اپنے اور آسمان کے درمیان دھوئیں کی طرح کی چیز دکھائی دے گی۔

② اس بات کی خبر دینا کہ یہ لوگ اس مصیبت کے نزول پر اللہ کے سامنے خوب گڑگڑائیں گے کہ یہ دردناک عذاب ہے، اے ہمارے رب! اس عذاب کو ہٹا دیجئے، ہم ضرور ایمان لائیں گے۔

③ اس امر کی خبر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ تھوڑی دیر کے لیے ان سے عذاب ہٹا دیں گے۔

④ اس امر کی خبر دی گئی کہ یہ لوگ دوبارہ اپنے کفر اور سرکشی کی طرف لوٹ جائیں گے۔

⑤ اس بات کی بھی خبر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ بڑی پکڑ یعنی بدر کے دن ان سے ضرور انتقام لیں گے۔

یہ کوئی ایک پیشین گوئی نہیں تھی، اللہ نے یہ تمام پیشین گوئیاں پوری فرمائیں۔ چنانچہ وہ قحط میں ایسے مبتلا ہوئے کہ ہڈیاں تک کھانے پر مجبور ہو گئے، جب کوئی شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو بھوک اور مشقت کی شدت کے مارے اسے اپنے اور آسمان کے درمیان دھوئیں کی سی حالت نظر آتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے بیان کے مطابق وہ گڑگڑائے بھی کہ "یہ دردناک عذاب ہے، اے ہمارے رب! اس عذاب کو ہٹا دیجئے، ہم ضرور ایمان لائیں گے" پھر تھوڑے عرصہ کے لئے اللہ نے ان سے عذاب ہٹا بھی دیا، لیکن وہ دوبارہ اپنے کفر اور عناد میں لوٹ آئے، پھر اس کے بعد بدر کے دن اللہ نے ان سے انتقام بھی لیا، اور ان کی سخت پکڑ فرمائی کہ ان کے ستر

لوگ قتل ہوئے اور ستر ہی قیدی بنے، اس طرح مسلمانوں کو ان کے مقابلہ میں فتح و نصرت حاصل ہوئی۔

غور کریں! کیا اس طرح کا کلام کسی مخلوق سے صادر ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ یہ اللہ عزیز و حکیم کے کلام کی ہی شان ہو سکتی ہے۔

نویں مثال ✿ قرآنِ حکیم کا یہود کے بارے سیاہ تاریک مستقبل کی پوری تاکید کے ساتھ پیشین گوئی کرنا، پھر اس پیشین گوئی کا ایسا ثابت ہونا کہ نزولِ قرآن سے لے کر ہر عہد اور زمانہ کے ہر دن کو اس کا عام و تام ہونا۔

اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھیے:

﴿لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ﴾ (آل عمران:۱۱۱-۱۱۲)

"وہ زبان سے ستانے کے سوا تمہارا اور کچھ بگاڑ نہ سکیں گے اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ پھیر دیں گے پھر مدد نہیں دیئے جائیں گے ان پر ذلت لازم کی گئی ہے جہاں وہ پائے جائیں مگر ساتھ اللہ کی پناہ کے اور لوگوں کی پناہ کے اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اور ان پر پستی لازم کی گئی۔"

غور کیجئے! اس آیت مبارکہ میں کتنی پیشین گوئیاں ہیں! اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح سے بیان کیا کہ جیسے طوق ہوں جو اس مکار قوم کی گردنوں میں ڈال دیئے گئے ہوں، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ یہ یہود، مسلمانوں کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے جنگ کر کے یا قتل اور قید کر کے، صرف عہد شکنی، مکاری، فریب کاری اور استحصال کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اگر بالفرض وہ مسلمانوں سے لڑیں بھی تو میدان سے بھاگ جائیں گے، پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلیں گے۔ آئندہ بھی ان کے فاتح ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ پھر ذلت و رسوائی بھی ان پر مسلط کر دی گئی ہے، جیسے احمقوں کو پتھر مارا جائے تو وہ اس سے بچ نہیں سکتے، ہاں ایک صورت ہے کہ وہ اللہ یا لوگوں کے عہد و امان میں آ جائیں۔ پھر مسکنت یعنی فقر و فاقے کا خوف، بھی ان پر مسلط رہے گا، چنانچہ یہود، فقر و افلاس سے سب سے زیادہ خوف رکھنے والی قوم ہے۔ اسی لیے ساری دنیا میں یہ لوگ سب سے زیادہ حریص و لالچی ہوتے ہیں، قناعت پسندی سے واقف بھی نہیں ہیں اگرچہ دولت کے ڈھیر کیوں نہ پاس ہوں، دُنیا کی نصف دولت کے مالک ہونے کے باوجود گھٹیا سے گھٹیا کام کرنے سے بھی اجتناب نہیں کرتے۔ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھیے:

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ﴾ (الاعراف:۱۶۷)

"اور یاد کر جب تیرے رب نے خبر دی تھی کہ یہود پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو ضرور بھیجتا رہے گا جو انہیں بُرا عذاب دیتا رہے۔"

غور کیجئے کہ آیا اس مبارک فرمانِ الٰہی میں یہ خبر نہیں دی گئی کہ یہ قوم ہمیشہ کے لئے ذلت و رسوائی سے دو چار رہے گی۔

قرآن کریم کے نازل ہونے سے اب تک کتنے قرون اور ایام گزر گئے، اس کا ایک ایک دن اس پیشین گوئی کی صداقت و سچائی کی گواہی دے رہا ہے! ایک بار بھی یہ پیشین گوئی غلط ثابت نہیں ہوئی، بلکہ اس سے قرآن کا اعجاز و تائید بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

اگر اس بارے کوئی تردّد ہو تو جدید اور قدیم تاریخ سے پوچھ لیجیے یا موجودہ المناک حالات کو دیکھ لیجئے، پھر کہیے کہ اللہ نے سچ

فرمایا کہ قرآن، اسی کا کلام ہے اور محمد ﷺ اس کے صرف بندے اور رسول ﷺ ہیں۔ ان یہود کے بارے میں ایک اور مثال پیشِ خدمت ہے جو اعجاز میں بے مثال اور شان دار ہے۔

دسویں مثال ٭ قرآنِ کریم کا خدا کے ان دشمنوں (یہود) کو ایک ایسی بات کا چیلنج دینا جو بظاہر انتہائی آسان سا امر ہے، جو ان کی قدرت اور طاقت کے دائرے میں بھی آتا ہے، پھر بھی وہ اس سے منحرف ہو گئے اور عاجز آ گئے۔ اس چیلنج کو قبول کرنے سے منحرف ہو جانا اور اس سے عاجز آ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن، واقعی اس ذات کا کلام ہے جو دلوں کو پھیر دینے اور زبانوں کو حرکت دینے کی طاقت رکھتی ہے یعنی اللہ وحدہٗ کا کلام ہے۔ اور محمد ﷺ محض ایک بشر ہیں جو غیبی امور سے واقف بھی نہیں ہیں، وہ لوگوں کے دِلوں کو نہ پھیر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی زبانوں کو گرہ لگا سکتے ہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ بذاتِ خود اس امر کا دوسروں کو چیلنج دے رہے ہوں جو بظاہر بہت سہل امر ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ یہود نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ تمام اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ پسندیدہ قوم ہیں اور دارِ آخرت ان ہی کے لئے وقف شدہ ہے اور یہ ان ہی کو ملے گی کسی اور کو نہیں ملے گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں اپنے پیغمبر ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے ان یہود کے اس قول کی تردید کرتے ہوئے ان کو چیلنج کیا، چنانچہ فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۹۴-۹۵)

"کہہ دو اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر خصوصیت کے ساتھ سوائے اور لوگوں کے تمہارے ہی لئے ہے تو تم موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو وہ کبھی بھی اس کی ہرگز آرزو نہیں کریں گے ان گناہوں کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔"

غور کریں کہ اس آیتِ مبارکہ نے یہود کے دعوؤں کو کس طرح رد کیا کہ ان سے ایک ایسے امر کا مطالبہ کیا جو بظاہر بہت آسان ہے، وہ یہ کہ پھر وہ موت کی آرزو کریں اگر وہ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں کہ آخرت کی نعمتیں ان کے لئے وقف ہیں، اب زبان سے یہ کہنا عادۃً ان کی قدرت اور طاقت میں تھا کہ موت کی تمنا اور آرزو کریں تا کہ محمد (ﷺ) کی حجت کو تمام کر کے ان کو خاموش کرا دیتے۔ لیکن وہ اس بات سے منحرف ہو گئے، انہوں نے ایسا نہیں کہا اور وہ اس طرح کہہ بھی نہیں سکتے کہ ہم موت کی تمنا اور آرزو کرتے ہیں، اس طرح سے حجت ان کے خلاف قائم ہو گئی اور ان کی کذب بیانی اور غرور و تکبر ظاہر ہو گیا، اور قرآن نے بھی یہ کہہ دیا کہ وہ کبھی بھی ایسی تمنا نہیں کریں گے۔ ﴿وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا﴾۔

نزولِ قرآن کو تقریباً چودہ صدیاں بیت گئیں مگر ان میں سے کسی نے بھی اس کی آرزو نہیں کی، اگر سچے ہوتے تو کوئی تو کرتا، بلکہ قرآن نے اسی سورت میں بابانگِ دُہل یہ اعلان کیا ہے کہ یہ لوگ دنیا کی زندگی کے بے حد حریص ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (البقرہ: ۹۶)

"اور آپ اُنہیں زندگی پر سب لوگوں سے زیادہ حریص پائیں گے اور ان سے بھی جو مشرک ہیں ہر ایک ان میں سے چاہتا ہے کہ کاش! اسے ہزار برس عمر ملے اور اسے عمر کا ملنا عذاب سے بچانے والا نہیں اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔"

اب یہ بات بھی نبوت کی علامات میں سے ہے کیونکہ آنحضور ﷺ کو ایک ایسے امرِ غیب کی خبر دی گئی ہے جو نہ آپ ﷺ کو پہلے معلوم تھی اور نہ آپ ﷺ کی قوم کو۔ آپ بتائیے کہ کیا یہ بات عقلاً ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ان کے نفس نے اس بات پر آمادہ کیا ہو کہ ان یہود کو اس طرح کا چیلنج بڑے باوثوق اور پُرامن انداز سے دیں کہ اس میں ذرا بھی ان کو تردّد اور مستقبل کا اندیشہ بھی نہ ہو، جبکہ حضور ﷺ کی اس وقت ان کے ساتھ شدید قسم کی خصومت چل رہی تھی۔ کیا حضور ﷺ اس بات سے مطمئن تھے کہ ان میں سے کوئی شخص یہ کہہ کر کہ میں موت کی آرزو کرتا ہوں، جواب نہ دے گا، ورنہ تو پیغمبر ﷺ کی حجت (خدانخواستہ) ختم ہو جاتی اور معاملہ ختم ہو جاتا، آپ کی دعوت ناکامی سے لاچار ہو جاتی اور عجز و بے بسی ظاہر ہو جاتی وہ بھی ایسی قوم کے سامنے جو مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے اور پیغمبر ﷺ کو شکست اور نیچا دکھانے کے بہت ہی زیادہ خواہش مند تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محمد ﷺ جیسے عظیم انسان سے اس چیلنج کا صادر ہونا، پھر ان یہود کا اس سے انحراف کرنا اور جواب دینے سے قاصر ہونا، (حالانکہ یہ چیلنج ایسا تھا کہ ان کا معمولی آدمی بھی اس کی طاقت رکھتا تھا) پھر قرآن کا زمانہ حال میں ان کا حرصِ دُنیا کا پتہ دینا اور زمانہ مستقبل میں کبھی بھی اس تمنا کو نہ کرنے کی خبر دینا، یہ تمام تر امور اس بات کے واضح دلائل ہیں کہ یہ قرآن، اس ذات کا کلام ہے جو علام الغیوب بھی ہے اور مقلب القلوب اور قاہر الالسنۃ بھی ہے، نیز اس امر کی بھی کہ آنحضور ﷺ اس کتاب کا سرچشمہ یا منبعِ فیض نہیں ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ مہبط نزولِ کتاب ہیں اور حکیم وعلیم ذات سے اسے حاصل کرنے والے ہیں۔

گیارھویں مثال ● یہ اس باب کے عجائب میں سے ہے۔ قرآن نے چند ایسے جزدی واقعات کی تعیین لوگوں کے سامنے پیش کی جو کسی متعین شخص کے بارے میں مستقبل میں واقع ہونے والی ہے۔ پھر وہ بات اسی طرح ثابت ہوئی جیسے بتائی گئی تھی۔ یعنی ولید بن مغیرہ، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝﴾ (القلم:۱۶)

"ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔"

مطلب یہ ہے کہ ہم عنقریب اس کی ناک پر ایک علامت اور شناخت لگا دیں گے جس سے وہ پہچانا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ غزوۂ بدر میں ایک شخص نے اس کی ناک پر تلوار ماری تھی جس کا نشان اس پر پڑ گیا اور ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اسی ولید کے بارے میں ہی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝﴾ (المدثر:۱۱)

"مجھے اور اس کو چھوڑ دو کہ جس کو میں نے اکیلا پیدا کیا۔"

اسی طرح اس کے بعد والی آیات بھی اس کے بارے میں اُتریں جو اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں۔ نیز سورۃ القلم کی آیات بھی اس کے بارے میں اُتریں:

﴿وَلَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيۡنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيۡمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلۡخَيۡرِ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍ ۝ عُتُلٍّۭ بَعۡدَ ذٰلِكَ زَنِيۡمٍ ۝ اَنۡ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيۡنَ ۝ اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝ سَنَسِمُهٗ عَلَى الۡخُرۡطُوۡمِ ۝﴾ (القلم: ۱۰-۱۶)

"اور ہر قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا نہ مان جو طعنے دینے والا چغلی کھانے والا ہے نیکی سے روکنے والا حد سے بڑھا ہوا گنہگار ہے، بڑا اُجڈ اس کے بعد بد اصل بھی ہے، اس لیے کہ وہ مال اور اولاد والا ہے، جب اس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ پہلوں کی کہانیاں ہیں، عنقریب ہم اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔"

ہم کفر و عناد اور اخلاقِ بد سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ایمانِ کامل، عملِ صالح اور اعلیٰ اخلاق کا سوال کرتے ہیں۔ (آمین)

ساتویں وجہ کا وضاحتی نوٹ ✿ ہم نے اعجازِ قرآن کی اس ساتویں صورت میں جو تشریح اور مثالیں ذکر کی ہیں، وہ حقیقت میں کئی معجزات ہیں، ایک معجزہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ انبائے غیب میں سے ہر غیبی خبر مستقل معجزہ ہے، اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ ایک وجہ کتنے معجزات کو شامل ہے، غور کرنے سے ان معجزات کا متعدد ہونا واضح ہوگا۔ پھر جب آپ اس پر مزید غور کریں گے کہ ان کثیر معجزات میں کوئی ایک بھی پیشین گوئی ایسی نہیں جو پوری نہ ہوئی ہو، بلکہ اسی طرح سے پوری ہوئی جس طرح سے خبر دی گئی۔ اس سے مذکورہ وجہ اعجاز کی شادابی مزید بڑھ جاتی ہے، کیونکہ اگر کوئی ایک بھی پیشین گوئی پوری نہ ہوتی تو دنیا زیر و زبر ہو جاتی اور اس کے دشمن طبل بجاتے اور خوشی سے رقص کرتے کہ اس شخص کی لغزش اور ناکامی سامنے آئی جس نے ان کو ایسی چیز کا چیلنج کر رکھا تھا جس سے سب عاجز تھے اور جس نے ان کے اور ان کے آباء واجداد کے معبودوں کو کم عقل گردانا تھا۔

اگر بالفرض ایسی کوئی بات ہوتی تو ضرور تواتر سے منقول ہوتی، جب تک اس کے دواعی و اسباب اس کے نقل و تواتر پر دستیاب ہوتے۔ مزید برآں یہ کہ ان غیبی امور اور پیشین گوئیوں کا بتانے والا خود ایک اُمی انسان ہے اُمیوں میں ہی اس نے پرورش پائی ہے، پھر ان غیبی خبروں میں سے بعض چیلنج کے طور پر ہیں اور کچھ اہلِ کتاب کے علماء کے سوالات کا جواب ہیں۔ جیسا کہ اہل کتاب کے علماء نے آنحضور ﷺ سے اصحابِ کہف، ذوالقرنین اور روح وغیرہ کے بارے میں دریافت کیا تھا، آپ ﷺ نے ان کے سوالات کے جواب دیئے، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ کی نسبت سے یہ غیبی امور ہیں، آپ ﷺ کے پاس اس کے جاننے کا کوئی عام ذریعہ بھی نہیں ہے۔ پھر ان اہل کتاب سے یہ بھی منقول نہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ کی کسی بات کی کسی دلیل کی بنیاد پر تردید کی ہو، بلکہ خود آنحضور ﷺ نے ان کی تحریف کردہ امور میں ان کی تکذیب کی اور امرِ حقیقت کی طرف ان کی راہنمائی کی اور مجادلہ کی صورت میں ان کو اس کتاب اور دین کے ساتھ چیلنج کیا جو ان کے پاس موجود ہے۔ اس پر ایک دلیل پیش کی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ یہود نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ ملتِ ابراہیمی پر ہیں، حالانکہ اُونٹ کا گوشت اور دودھ استعمال کرتے ہیں، یہ تو ابراہیم اور نوح علیہما السلام کی ملت و دین میں ہمیشہ حرام رہا ہے؟۔

چنانچہ ان کی تردید میں یہ آیتیں نازل ہوئیں جس میں ان کی کتاب تورات کو پیش کرنے کا چیلنج بھی دیا گیا ہے:

﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰٮةُ ؕ قُلۡ

فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ (آل عمران: ۹۳-۹۵)

"بنی اسرائیل کے لئے سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں مگر وہ چیز جو اسرائیل نے تورات نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کی تھی کہہ دو تورات لاؤ اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو پھر جس شخص نے اس کے بعد اللہ پر جھوٹ بنایا وہی بڑے بے انصاف ہیں۔ کہہ دو اللہ نے سچ فرمایا ہے اب ابراہیم (علیہ السلام) کے دین کے تابع ہو جاؤ جو ایک ہی کے ہو گئے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔"

علاوہ ازیں حضور نبی کریم ﷺ سے بعض اوقات اہم امور میں درست صورت کو مخفی رکھا جاتا تھا، آپ ﷺ اس امر میں توقف فرماتے تھے، جیسا کہ واقعہ اُفک میں ایک عرصہ تک توقف فرمایا پھر جا کر وحی کا نزول ہوا جس میں زوجہ رسول ﷺ اور بنت صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا بتایا گیا۔ آنحضرت ﷺ بسا اوقات اجتہاد فرماتے اور اس میں خطا ہو جاتی، جیسے اسیرانِ بدر کے معاملہ میں ہوا تھا، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

ان باتوں سے معلوم ہوا کہ اگر یہ انبائے غیب خود آنحضرت ﷺ کی ذات کی طرف سے ہوتیں، رب تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتیں تو اس طرح کے اہم امور اور معاملات میں آنحضور ﷺ کو وجہ صواب ضرور معلوم ہوتی۔ جبکہ ان کے بارے میں علم کے اسباب ان غیبی امور کے مقابلہ میں زیادہ سہل و اقرب ہیں جن کے اسبابِ عادیہ عموماً معدوم ہوتے ہیں، نیز اس طرح کے اہم امور و معاملات کے نہ جاننے کے سبب جو مصائب آپ ﷺ کو اٹھانا پڑے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ قرآن حکیم اسی امر کی طرف اشارہ کرتا ہے، ارشاد ہوا:

﴿قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾﴾ (الاعراف: ۱۸۸)

"کہہ دو میں اپنی ذات کے نفع و نقصان کا بھی مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب کی بات جان سکتا تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی تکلیف نہ پہنچتی میں تو محض ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں ایماندار لوگوں کو۔"

جدید سائنس نے چند معجزات کو آشکارا کیا ہے

مذکورہ انبائے غیب سے متعلق ایک عمدہ نوع ایسی ہے جسے دورِ حاضر کے علم نے آشکار کیا ہے۔ اس سے پہلے یہ قسم پردۂ خفا میں مستور تھی، نزولِ قرآن کے معاصرین سے پوشیدہ تھی، جس کی بناء پر خدا کے دشمنوں کو شبہات و اعتراضات کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے الزام تراشی کی، انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی جہالت کسی امر پر حجت و دلیل بننے کے قابل نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ﴾ (یونس: ۳۹)

" بلکہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جسے وہ سمجھ نہ سکے اور ابھی اس کی حقیقت ان پر کھلی نہیں۔"

اس نوع کی تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

① معجزہ، جسے جدید تاریخ نے آشکار کیا

مجلہ "الفتح" کے مصنف وعلامہ لکھتے ہیں: "ہم سورۃ التوبہ کی یہ آیت کریمہ پڑھتے تھے:

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ بْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾ (التوبہ: ۳۰)

"اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ اُن کے مُنہ کی باتیں ہیں وہ کافروں کی سی باتیں بنانے لگے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں اللہ انہیں ہلاک کرے یہ کدھر اُلٹے جارہے ہیں۔"

اس آیتِ کریمہ کا ابتدائی جملہ ﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ بْنُ اللّٰهِ﴾ ایک ایسے تاریخی واقعہ اور حقیقتِ علم پر مشتمل امر کو متضمن ہے جسے نزولِ قرآن کے زمانے میں روئے ارض پر بسنے والے لوگ نہیں جانتے تھے۔ اس لیے کہ عزیر کا لفظ بنی اسرائیل کے ہاں اسی وقت معروف ہوا جب وہ مصر میں داخل ہوئے اور اہل مصر سے ان کا اختلاط ہوا اور ان کے عقائد اور خاص طور سے عقیدہ وثنیت سے واسطہ پڑا۔

لفظِ عزیر کو اہل یورپ اوزیرس (Osiris) اور قدماءِ مصر عوزر بولتے ہیں، قدمائے مصر نے جب سے عقیدۂ توحید کو چھوڑ کر آفتاب پرستی شروع کردی تب سے ان کا اس عوزر یا اوزیرس کے بارے میں یہ اعتقاد رہا ہے کہ وہ ابن اللہ ہیں، بنی اسرائیل کے لوگ بھی قدیم مصر میں آنے کے بعد اس عقیدے کو یعنی عزیر کے ابن اللہ ہونے کے عقیدہ کو مستحسن سمجھتے تھے، بلکہ اوزیرس یا عوزر (عزیر) کا نام ان کے ہاں مقدس ناموں میں شامل تھا جو قدیم مصریوں کے مذہب کی وجہ سے سامنے آئے تھے۔ اور وہ لوگ اپنی اولاد کا نام عزیر رکھنے کو کفر وضلالت خیال کرتے تھے، کیونکہ وہ اسے مقدس سمجھتے تھے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ان پر عتاب فرمایا اور ان کی اس تاریخی واقعہ پر راہ نمائی فرمائی جسے تمام لوگ فراموش کرچکے تھے۔ یہودی لوگ کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کے ہاں عزیر کا لفظ قدیم مصریوں سے میل جول سے پہلے بھی معروف تھا۔ ان کی زبان میں اس لفظِ عزیر کا اصل مادہ "عوزر" ہے، جو الوہیت کے معنی پر دلالت کرتا ہے، عزیر کا معنی ہوگا "مددگار معبود" بالکل یہی معنی عوزر یا اوزیرس کے لفظ کا اس قدیم مصریوں کے ہاں تھا یعنی ان کے ہاں دورِ اوّل میں الٰہ واحد کے معنی میں تھا۔ اس کے بعد وہ اس بات کے معتقد ہوگئے کہ وہ ابن اللہ ہیں جب انہوں نے سورج کی پوجا شروع کردی۔ ان یہودیوں نے ان ہی سے یہ لفظ دوسرے دور میں اخذ کیا جب وہ اس بات کا اعتقاد کرنے لگے کہ اوزیرس ابن اللہ ہیں۔

یہ قرآن کے اسرار میں سے ایک راز ہے، جو عصر حاضر میں ہی منکشف ہوا کہ قدیم اہل مصر حقیقت میں کس عقیدے پر قائم تھے۔ نزولِ قرآن کے وقت دُنیا کو یہ بات معلوم نہ تھی جس کی وجہ سے اعدائے اسلام کو موقع ملا کہ انہوں نے اس تاریخی حقیقت سے جہالت و ناواقفیت کی بناء پر کچھ شبہات واعتراضات بنانے شروع کیے جن سے اسلام کا چہرہ داغدار ہوتا تھا اور قرآن کی آیات پر

اعتراضات کرتے تھے۔

چنانچہ بعض یہودی کہتے ہیں کہ قرآن ہمارے بارے میں ایسی بات کہتا ہے جس کے ہم قائل ہی نہیں ہیں، نہ ہماری کتابوں میں ایسی کوئی بات منقول ہے اور نہ ہمارے عقائد میں شامل ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کے مبلغین نے بھی قرآن، دین اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں طعن وتشنیع اور نازیبا کلمات کہے۔ (بتغییر یسیر)

② معجزہ، جسے جدید میڈیکل سائنس نے آشکار کیا

علامہ ڈاکٹر عبدالعزیز اسماعیل پاشا (مرحوم) "مجلۃ الازہر" میں ایک عنوان "جدید سائنس اور ماہِ رمضان کے روزے" کے تحت لکھتے ہیں: "کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رمضان کے روزے (حالانکہ یہ ارکانِ اسلام میں سے ہیں) روزے دار کے لیے ضرر رساں ہیں کہ اس سے بالخصوص نظام ہضم اور دیگر بالعموم نقصانات پیش آتے ہیں، اور بعض روزے دار اس کی وجہ سے غیظ وغضب جیسی کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ باتیں بالکل غلط ہیں، کیونکہ جو باتیں ایسے لوگ ذکر کرتے ہیں ان کا روزے سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی وہ روزے کی وجہ سے نہیں پیش آتیں بلکہ افطاری اور سحری کے کھانے میں اعتدال کا خیال نہ رکھنے کے سبب پیش آتی ہیں، نیز یہ امور ان لوگوں کو لاحق ہوتے ہیں جو سارا دن معدہ خالی ہونے کے باوجود افطار کے وقت مناسب چیزوں کا اہتمام نہیں کرتے، نیز سحری میں ضروری ہوتا ہے کہ انسان چند لقموں پر اکتفاء کرے، کیونکہ بھوک اپنی ذات میں مضر نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں روزہ بہت سے حالات اور صورتوں میں طبی نقطہ نظر سے مفید ہوتا ہے اور بیماریوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ نیز بہت سے دینی امور ایسے ہیں جن کی حکمت ابھی ظاہر نہیں ہوئی، علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی حکمتیں کھلیں گی۔ میں نے ضروری سمجھا کہ اب تک اس روزے کے جو طبی فوائد معلوم ہوئے ان کو قلمبند کردوں۔ اس سلسلہ میں قرآنی آیات کی توضیح کروں کیونکہ اس طرح کے فوائد اسی شخص پر کھل سکتے ہیں جو جدید سائنس کی روشنی میں ان مسائل کی تحقیق کرتا ہے۔ چنانچہ میں اس کی شروعات روزے سے کرتا ہوں:

روزہ ● روزے کے تین پہلوؤں سے فوائد ہیں:

① سب سے اہم روحانی پہلو ہے، اسے میں چھوڑ دیتا ہوں کہ علمائے دین اور صوفیاء کرام خود ہی بیان کرلیں۔

② دوسرا پہلو اخلاقی ہے، اسے بھی میں علمائے اخلاق کے لیے چھوڑتا ہوں، چند ایک اخلاقی اعتبار سے روزے کے فوائد یہ ہیں: نظم ونسق، قناعت پسندی، اطاعتِ امیر، صبر وضبط، خواہشاتِ نفس کو کنٹرول کرنا، نیک اعمال اور صدقہ وخیرات جیسے اخلاقیات پیدا ہوتے ہیں۔

③ مادی یا صحتِ جسمانی کا پہلو: یہ ہماری بحث کا موقع ہے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ روزہ بہت سے حالات میں مفید ہے، بعض صورتوں میں روزہ ہی واحد علاج ہے، اگر متعدد امراض سے بچاؤ کا واحد علاج روزہ ہی ہو تو یہ بہت اہمیت والا علاج ہوگا۔ درج ذیل امراض میں روزہ کو بطورِ علاج عمل میں لایا جاسکتا ہے:

① معدے کے دائمی عوارض جس میں آلبومین اور نشاستہ کے اجزاء میں اضافہ بھی شامل ہو ایسے موقع پر روزہ اپنا اثر دکھاتا ہے،

خاص طور پر جب دو لقموں کے درمیان پانی نہ پیا جائے یا دو کھانوں کے درمیان طویل مدت کا وقفہ ہو جیسے رمضان کے روزوں میں ہوتا ہے، نیز ابھار پن کی صورت میں مناسب غذا بھی لی جا سکتی ہے، یہ طریقہ آنتوں کی بہتری کے لیے بہت مفید ہے۔

۲ زیادہ کھانے یا کم نقل وحرکت کی وجہ سے وزن کا بڑھنا، اس مرض میں روزہ بہترین علاج ہے جب روزے دار افطار کے وقت اعتدال کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ اور سحری میں پانی پر اکتفاء کرتا ہے۔

۳ ذہنی دباؤ، یہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان ذہنی کام کاج زیادہ کرتا ہے اور ایسی صورت میں رمضان کا مہینہ بڑی نعمت اور برکت کی چیز ہے، بالخصوص جب انسان کا وزن عام قدرتی وزن سے زیادہ ہو۔

۴ شوگر، یہ مرض بھی ذہنی دباؤ کی طرح ہے، شوگر کا مرض آغاز میں اور ظاہر ہونے سے پہلے عام طور پر وزن کے بڑھنے کے ساتھ ہوتا ہے، ایسے موقع پر روزہ سود مند علاج ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شوگر کا لیول موٹاپے کے کم ہونے کے ساتھ کم ہوتا ہے۔ اور عام طور پر شوگر کھانے کے پانچ گھنٹے کے بعد اس درجہ کم ہو جاتی ہے کہ وہ ہلکی شوگر کی حالت میں طبعی اور قدرتی حد تک آ جاتی ہے، اور دس گھنٹے کے بعد طبعی حد سے بہت کم لیول پر آ جاتی ہے، یہ روزہ ضروری غذا کے ساتھ اس مرض شوگر کا بھی بہت اہم علاج ہے۔ یہاں تک کہ انسولین کی ایجاد کے بعد تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

خاص طور سے جب ایک شخص کا وزن طبعی حد سے زیادہ ہوتا تھا تو انسولین سے پہلے اس روزے کے علاوہ اس مرض کا کوئی علاج نہ تھا۔

۵ پرانا دردِ گردہ جس میں سوزش اور ورم ہو۔

۶ ورم زدہ امراض قلب۔

۷ پرانا جوڑوں کا درد، خصوصاً جب اس کے ساتھ موٹاپا بھی ہو۔ جیسا کہ عموماً خواتین چالیس سال کی عمر کے بعد اس مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے، رمضان کے مہینے میں صرف روزے کی وجہ سے زیادہ چلتے ہوئے نظر آتی ہیں باقی عرصہ میں کئی کئی سال مختلف ادویات، انجکشنز، بجلی کے شاک اور جدید طبی طریقوں سے چلنا ممکن ہوتا ہے۔

کوئی شخص سوال کر سکتا ہے کہ بیماری کی ان تمام صورتوں میں بھی تو روزہ رکھنے کے بارے میں ڈاکٹر کی ہدایات کی ضرورت پڑتی ہے، جبکہ مسلمانوں پر جو روزہ فرض کیا گیا ہے، وہ صرف صحت مند لوگوں پر فرض ہے، بیماروں پر تو فرض ہی نہیں ہے؟ یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن ان تندرست لوگوں کے لیے بھی فائدہ ہے، وہ یہ کہ روزہ ان کو ان امراض سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ خاص طور پر نمبر ۱، ۲، ۳، ۷ میں ذکر کردہ امراض سے۔

یہ تمام امراض ایسے ہیں جو ہر انسان میں تدریجی طور پر شروع ہوتے ہیں اس طرح سے کہ مرض کی ابتداء یقینی طور پر معلوم کرنا ممکن نہیں ہوتا، کسی شخص یا ڈاکٹر کے لیے ممکن نہیں کہ وہ مرض کی ابتداء کا پتہ لگا سکے، کیونکہ میڈیکل سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ ان تمام امراض کے اسباب معلوم کیا جا سکیں۔

البتہ طبی طور پر یہ بات طے شدہ ہے کہ ان تمام امراض سے بچاؤ صرف روزے سے ممکن ہے، بلکہ روزہ ان امراض کے پیش آنے سے پہلے بہت زیادہ مؤثر عمل ہے۔ اعداد و شمار سے بھی معلوم ہوا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ موٹاپے کے بڑھنے کے

ساتھ شوگر بھی پیدا ہوتی ہے، نیز اس سے بلڈ پریشر، جوڑوں کے پرانے درد اور دیگر امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اور موٹاپے کے کم ہونے سے ان ہی امراض کے پیدا ہونے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہیں۔

یہ اصل راز ہے اس بات کا کہ انشورنس کمپنیاں ایسے لوگوں کی انشورنس نہیں کرتیں جن کے وزن بڑھ گئے ہوں، اس کے لیے بڑی بھاری شرطیں لگاتی ہیں۔ اب ہر سال صرف ایک ماہ کے روزے رکھ لینا ان تمام امراض سے بچاؤ کا بہترین ذریعہ ہے۔

جوں جوں تہذیب و تمدن اور زندگی میں آسودہ حالی بڑھتی جا رہی ہے ان امراض میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور پھیلتے جا رہے ہیں۔ یورپ میں سب سے زیادہ یہ امراض پھیل چکے ہیں، اور مصر میں شوگر اور بلڈ پریشر کا مرض متوسط اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں میں پایا جا رہا ہے، ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں بہت کم پایا جاتا ہے۔

غالب گمان یہی ہے کہ سابقہ مذاہب کے مقابلہ میں دین اسلام میں روزے کا یہ راز ہے، جو آخری آسمانی شریعت ہے۔ جو ایسے زمانہ میں آیا ہے جب ہم ایسے امراض سے بچاؤ کے زیادہ محتاج ہیں جو آسودہ حال کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں۔

۳ معجزہ، جسے علم معاشرت نے آشکار کیا

مجلہ "الازھر" کے مدیر نے "قرآن کے سائنسی معجزات" کے عنوان کے تحت بڑا جامع مضمون لکھا ہے، ہم اس میں سے چند چیزیں ذیل میں نقل کرتے ہیں: جب اسلام آیا اور اہل اسلام نے علم کا احیاء اور علمی کتب کو اپنی زبان میں نقل کرنا شروع کیا تو انہوں نے قرآن کریم کے اصولِ اوّلیت سے راہ نمائی لیتے ہوئے ہر چیز میں غور و فکر سے کام لیا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ:

﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝﴾ (القمر:۴۹)

"یعنی ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا۔"

نیز ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝﴾ (الحجر:۲۱)

"ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس موجود ہیں اور ہم اسے ایک متعین اندازے سے نازل کرتے ہیں۔"

مسلمانوں نے اس سے یہ بات معلوم کی کہ اس کائنات میں عمومی طور پر ہر چیز کا عمل ایک نظام کے تحت جاری ہے، جیسا کہ بعض مؤرخین خصوصاً ابن خلدون رحمہ اللہ نے اس امر کا ادراک کیا ہے۔ لیکن تمام اقوام کے بارے میں کوئی ایسا علم جو خاص ان کے احوال وغیرہ کے لیے وضع کیا گیا ہو، موجود نہ تھا، پھر یورپ کی ترقی کے دور کے بعد ایسا ممکن ہوا، چنانچہ اللہ نے اس پہل کا سہرا ایک بڑے فرانسیسی فلسفی اوغست کونت (Ayguste Conte ۱۷۹۸-۱۸۵۳) کے سر باندھنا تھا، اس نے فلسفہ کے اصول و قوانین وضع کیے تھے، اسی نے سب سے پہلے علم معاشرت وضع کیا اور اسے تمام انسانی علوم کا سب سے بڑا علم قرار دیا، کیونکہ ایک اعتبار سے اس کا موضوع سب سے اہم اور اعلیٰ ہے، نیز اس لیے کہ یہ علم اسی کے لیے سہل ہے جو ہر علم کو کس طرح حاصل کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ اس کی ابحاث کا مختلف ہونا اور تمام انسانی علوم کی بنیاد ہونا ہے۔ چنانچہ انسانی ایجاد کردہ علوم میں علم معاشرت جدید وضع کردہ علم ہے اس کا

موضوع بھی تمام علوم میں اعلیٰ درجہ کا حامل ہے، اس لیے کہ اس علم کے ذریعہ ہم جان سکتے ہیں کہ جماعتیں کن اصول پر قائم ہوتی ہیں؟ اور کن اصول کے پاس داری سے ان کا وجود باقی رہتا ہے اور ترقی کرتی ہیں اور وہ کیا عوامل کیا ہو سکتے ہیں جن سے ان کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ یہ تمام اعلیٰ درجہ کے احوال و معارف ہیں جو ایک معاشرہ کے لیے نہایت اہم اور ضروری ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح معاشرہ کے افراد کے لیے طب وصحت کے قوانین کا علم ضروری ہوتا ہے۔

پھر انہوں نے علم معاشرت کے چند قوانین کا ذکر کیا ہے کہ: ایک انسان محض اپنی رائے سے معاشرہ کی اصلاح میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتا، البتہ جب وہ تمام لوگوں کو دیکھے کہ وہ اس کی رائے کو درست گردانتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہیں، اس طرح پھر معاشرہ میں ایک نیا رجحان جنم لیتا ہے اور معاشرہ اس جانب رخ کرتا ہے جس جانب وہ اس کا رخ کرنا چاہتا ہوتا ہے، اور اس کی تصدیق بھی قرآن پاک کی اس آیت سے ہوتی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾ (الرعد:۱۱)

"بے شک اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلنا چاہتے ہوں۔"

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو قوم یہ چاہتی ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے معاشرہ کی ناپسندیدہ حالت تبدیل کر دے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود کو تبدیل کرے اگر تو ایسے کرے گی تو اللہ بھی اس کی ناپسندیدہ حالت بدل دے گا اور اسے ان نعمتوں سے نوازے گا جو اس قوم کو پسند ہوں گی، یہ صرف قرآن کا سائنسی معجزہ ہے، اس کے لیے ایک خاص فصل قائم کیے جانا ضروری ہے، اور اس کا خوب تذکرہ کرنا چاہیے کہ قرآن نے اس راز سے پردہ اٹھایا، ہم کو اس قابل بنایا کہ ہم قرآن کی اس تنبیہ کا راز معلوم کر سکیں کہ نیکی کی دعوت اور بدی سے روکنا ہم پر لازم ہے۔

مدیر مجلہ نے کتاب وسنت کے دلائل بیان کرنے کے بعد لکھا کہ اس سے قبل کہ علمائے ارض کے کسی بڑے عالم کو اس علم کا خیال بھی آئے قرآن نے اس علم کے قواعد بیان کر دیئے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ان قواعد کی تعیین اور ان میں پوشیدہ ضوابط کی تلاش وجستجو ہی آج کے علم معاشرت کے ماہرین کا موضوع سخن بنا ہوا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا﴾ (الاحزاب:۳۸)

"جیسا کہ اللہ کا پہلے لوگوں میں دستور تھا اور اللہ کا کام اندازے پر مقرر کیا ہوا ہے۔"

نیز فرمایا:

﴿فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا﴾ (فاطر:۴۳)

"پھر کیا وہ اسی برتاؤ کے منتظر ہیں جو پہلے لوگوں سے برتا گیا پس تو اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔"

نیز ارشاد ہے:

﴿سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا﴾ (الفتح:۲۳)

"اللہ کا قدیم دستور پہلے سے یونہی چلا آتا ہے اور تو اس کے دستور کو بدلا ہوا نہ پائے گا۔"

کتاب اللہ نے صرف ان قواعد پر اکتفاء نہیں کا بلکہ یہ امر بھی طے کر دیا کہ جماعت افراد کی طرح ہوتے ہیں، ان کی ایک مدت متعین ہوتی ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتے، یہ بات علم معاشرت کے ماہرین کو اس وقت پتہ چلی جب یہ ثابت ہوا کہ فرد اور معاشرہ میں وجوہ تشبیہ ایک ہی طرح کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۳۴)

"اور ہر ایک گروہ کے لیے ایک میعاد متعین ہے پھر جب وہ معیاد ختم ہوگی اس وقت نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے اور نہ آگے بڑھیں گے۔"

قرآن کریم کی بہت سی سورتوں میں اس طرح کی بات بار بار آئی ہے۔

جو شخص غور کرتا ہے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے دس صدیوں سے بھی زیادہ بہت پہلے علم معاشرت کے اصول وضع کر دیئے تھے اور اس کا ظہور ایک ایسے شخص کے ہاتھ پر ہوا جو اس دین کا پیروکار بھی نہیں تھا، اسے خوب حیرت ہوگی، اس کی آنکھوں کو یقین نہ آئے گا اور ہم عنقریب سائنسی اصول کو اسی کتاب اللہ سے استفادہ کرتے ہوئے مزید نکھاریں گے، تاکہ سارا عالم جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (الانعام: ۳۸)

"ہم نے کتاب میں کوئی بات نہیں چھوڑی۔"

اس سے مسلمانوں کی ترقی اور عروج کا راز کھل کر سامنے آتا ہے کہ جب انہیں کئی سالوں تک پورے عالم میں علم وحکمت کی سیادت حاصل تھی، اگر آج بھی مسلمان اپنی علمی زندگی کا آغاز اسی نہج پر کرنے لگیں جس پر ہر قوم کیا کرتی ہے تو یہ قومیں کبھی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتیں تھیں جو آج کئی صدیوں سے اس علم کی راہ میں ان سے آگے ہے۔ مسلمان ان ہی عالی اور بلند قرآنی اصول کی راہ نمائی کی بدولت بہت مختصر مدت میں اس اوجِ کمال کو پہنچے جس تک کوئی قوم ایک طویل مدت تک نہ پہنچ سکی۔

آج مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ اس عظیم کام کا ادراک کریں اور مغربی اقوام سے حصول علم کے سلسلہ میں اپنی کتاب کو راہ نما بنائیں تاکہ اس مرتبہ اور مقام کو حاصل کر سکیں جس کو ان کے اسلاف نے دورِ اوّل میں حاصل کیا تھا، بلکہ ان آخری ادوار میں انسانوں کو جو علمی راہ نمائی مل سکتی ہے اس سے بڑھ کر ترقی حاصل ہو۔

آٹھویں وجہ: آیاتِ عتاب

اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں حضور ﷺ کی بعض اجتہادی خطاؤں کا ذکر کیا ہے، جس کی وجہ سے ان آیات میں (محبوبانہ) عتاب کیا گیا، جو بعض اوقات ذرا سخت انداز کا محسوس ہوتا ہے اور بعض اوقات نرم انداز کا!

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان امور سے انصاف پسند عقل لازماً یہ فیصلہ کرے گی کہ یہ اللہ وحدہٗ کا ہی کلام ہو سکتا ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ کا کلام ہوتا تو آپ ﷺ خود اپنے خلاف ایسی خطائیں اور عتابات کو بیان نہ کرتے۔ تمام لوگ ان آیات کی تلاوت

بلکہ تا قیامت ان سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے رہیں گے۔

اجتہادی خطا معصیت نہیں

اس موقع پر ہم آپ کو آگاہ کیے دیتے ہیں کہ ایسی خطا معصیت شمار نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے عصمت رسول ﷺ کا مسئلہ پیدا ہو اور اس سلسلہ میں اس کو قابل اعتراض گردانا جائے، کیونکہ یہ صرف ایک خطأ ہے، بلکہ خطا کی ایسی نوع ہے جس پر صاحب خطا کو اجر دیا جاتا ہے، کیونکہ وہ اس کے اجتہاد سے صادر ہوتی ہے، اور اجتہاد صالح (مسئلہ کی بحث وجستجو اور استنباط میں اپنی بھرپور کوشش صرف کرنا) میں انسان ایک قابل قدر مقصد کی خاطر اپنی محنت شاقہ صرف کرتا ہے، ایسی صورت میں اگر انسان سے اجتہاد کی اہلیت رکھتے ہوئے خطا بھی سرزد ہو جائے تو اس پر اسے اجر وصلہ کا نہ ملنا یا اسے محروم رکھنا قرین انصاف نہ ہوگا۔

اس لیے کہ خطا سے بالکل معصوم و پاک ہونا انسان کے بس سے باہر ہے، بلکہ مجتہد بسا اوقات طلبِ صواب کے لیے اپنی طاقت صرف کرنے کے بعد بھی خاطی ہوتا ہے، حالانکہ اس کی آرزو ہوتی ہے کہ اس سے خطا نہ ہو، بلکہ اسے اس معاملہ میں بہت زیادہ خوف اور ڈر لگا ہوتا ہے کہ کہیں اس سے خطا نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

"اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا۔"

اسی بناء پر ہماری شریعت مطہرہ میں یہ بات قرار پائی ہے کہ مجتہد سے اگر خطا ہو جائے تو اسے ایک اجر ملے گا اور اگر اس کا اجتہاد درست ہوا تو اسے دوہرا اجر ملے گا۔

محدثین کی ایک جماعت نے یہ روایت نقل کی ہے کہ: جب کوئی حاکم کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے اور اس بارے میں درست اجتہاد کرتا ہے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے، اور اگر فیصلہ کرتے ہوئے اس سے اجتہادی خطا ہو جائے تو بھی اس کے لیے ایک اجر ہے۔[1] بلکہ خود نبی کریم ﷺ جیوش اور لشکروں کے امراء کو حق دیا کرتے تھے کہ وہ جو مناسب مصلحت دیکھیں اس کے مطابق فیصلہ کر لیا کریں۔ جیسا کہ ایک امیر لشکر سے آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم قلعہ والوں کا محاصرہ کر لو اور وہ تم سے یہ چاہیں کہ تم ان کو اللہ کے حکم پر اتارو تو تم ان کو اللہ کے حکم پر نہ اتارنا بلکہ اپنے حکم پر اتارنا، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ آیا تم ان کے بارے میں اللہ کا حکم کا ٹھیک فیصلہ کر پاؤ گے یا نہیں۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو مخلوق میں امامت کبریٰ کا مقام حاصل تھا، اس لیے اللہ کی حکمت تھی کہ آپ ﷺ اجتہاد فرمائیں اور اس میں باقی لوگ آپ ﷺ کی اتباع کریں، نیز آپ ﷺ سے اجتہادی خطا ہوتا کہ خطا اجتہادی کا خوف لوگوں کو اجتہاد سے مانع نہ بنے، کیونکہ جو ذات افضل الخلق ہے، ان سے اجتہادی خطا ہو جاتی تو وہ اجتہاد سے نہ رکے بلکہ آپ ﷺ تو ساری زندگی ان امور میں اجتہاد کیا کرتے جن کے بارے میں وحی خداوندی نازل نہ ہوئی ہوتی۔ اس کی حکمت یہ

---

① رواہ البخاری فی الاعتصام (۲۱) ومسلم فی الاقضیۃ (۱۵) وابوداؤد فی الاقضیۃ (۲) والترمذی فی الاحکام (۲)

② رواہ احمد ۵/۲۵۸ ومسلم فی کتاب الجھاد، حدیث (۸۲)، والترمذی فی کتاب السیر (۴۷) وابن ماجہ فی الجھاد (۳۸)

ہی تھی کہ لوگوں کو خوب معلوم ہو جائے کہ کسی مسئلہ میں سب سے پہلے خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت یعنی عقل اور فطرت کی صلاحیت سے استفادہ کیا جاتا ہے۔اور انسانی فکر کو جمود سے آزادی دلائی جائے۔

نیز اللہ کی حکمت اس بارے میں یہ بھی ہوتی ہے کہ جس امر میں پیغمبر ﷺ کو وجہ صواب معلوم نہ ہو، اللہ تعالیٰ خود اس میں اپنے پیغمبر ﷺ کو وجہ صواب سے مطلع کرتے ہیں، تاکہ لوگ جان سکیں کہ پیغمبر ﷺ تمام انسانوں جیسا نہیں ہوتا۔ نہ ہی پیغمبر ﷺ کا اجتہاد عام لوگوں جیسا ہوتا ہے، بلکہ پیغمبر ﷺ کا اجتہاد تو ان کے لیے حجت ہوگا، عام لوگوں کا نہیں۔ کیونکہ پیغمبر ﷺ کی توثیق وتائید پروردگار کی طرف سے ہوتی ہے، وہ اپنے رب سے ہمہ وقت تعلق رکھتا ہے، جس کی وجہ سے رب تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو اجتہادی امور میں خطا پر قائم نہیں رکھتا۔

ایسے موقع پر مومنوں کے ایمان میں بھی اضافہ ہوتا ہے کہ ان کا پیغمبر ﷺ کی ہر بات پر ایمان اور اعتماد بڑھنے لگتا ہے، اور ظہور حق کے بعد پیغمبر ﷺ کی اقتداء کو واجب خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح خود رسول ﷺ بھی اجتہادی خطا کا لوگوں کے روبرو برملا اظہار کر دیتے ہیں، اس بارے میں ان کی کوئی ذاتی وجاہت وعظمت آڑے نہیں آتی، نہ ہی وہ حق کے مقابلہ میں کوئی ملمع سازی کرتے ہیں۔ بلکہ امت کی تربیت، عظمت اور ترقی کا راز پیغمبر ﷺ کی اقتداء میں ہی پنہاں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾﴾ (الاحزاب:۲۱)

"یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ میں بہترین نمونہ ہے ان کے لیے جو اللہ سے اور آخرت کے دن سے ڈرتے ہیں اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں۔"

انسان کی شرافت وعظمت کو مجروح کرنے والی باعث عار بات تو یہ ہے کہ انسان جمود کا شکار ہو، اجتہاد کا عمل نہ کرے، حالانکہ وہ اجتہاد کا اہل ہے، یا کوئی مجتہد خواہ کتنا ہی بڑا ہو اپنی خطا معلوم ہونے کے باوجود اپنی رائے پر اڑا رہے، حالانکہ حق کی طرف رجوع کرنا باعث فضیلت بھی ہے اور باطل میں مبتلا ہونے سے کہیں بہتر ہے۔

کیونکہ کمال مطلق تو اللہ وحدہ کو حاصل ہے۔ نیز حدیث میں بھی ہے:

تمام بنی آدم خطا کار ہیں، اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں۔ ①

پیغمبر ﷺ کی اجتہادی خطاؤں میں ذکر کردہ اسرار وحکمتوں کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے جو بہت قیمتی اور اہم ہے۔ اور وہ ہے رسول ﷺ کی بشریت وعبودیت پر دلالت کرنے والے مادی دلائل کا قائم کرنا۔ جس کی وضاحت یہ ہے کہ ایک پیغمبر ﷺ بھی (باوجودیکہ وہ تمام مخلوق میں علی الاطلاق افضل ترین ہوتا ہے) اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہی ہوتا ہے، جو اعراضِ عبودیت دوسرے بندوں کو پیش آتی ہیں انہیں بھی پیش آتی ہیں۔ جیسا کہ اجتہادی خطا کا معاملہ ہے۔ ان امور کی وجہ سے لوگ، پیغمبر ﷺ کی مدح میں مبالغہ آمیزی کر کے گمراہی میں بھی مبتلا نہ ہوں اور نہ تعظیم میں ایسا غلو اختیار کریں جیسا نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے بارے میں کیا تھا اور گمراہ ہوئے تھے۔

---

① رواہ الترمذی فی القیامۃ (۴۹) وابن ماجا فی الزھد: (۳۰) والدارمی فی الرقائق (۱۸)

خود پیغمبر علیہ السلام نے اس امر پر متنبہ بھی فرمایا کہ: میری تعریف میں ایسا مبالغہ نہ کرو جیسا کہ نصاریٰ نے ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں کیا تھا، میں تو بس خدا کا بندہ ہوں، پس تم یوں کہو، اللہ کا بندہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ ①

نیز فرمایا: میں تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں، اور انسان کا گمان درست بھی ہوتا ہے خطا بھی، لیکن جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ اللہ نے فرمایا: میں اللہ پر ہرگز جھوٹ نہیں بولتا۔ ②

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو ایک انسان ہوں۔ تم میرے پاس اپنا مقدمہ لے کر آتے ہو۔ ممکن ہے تم میں سے کوئی دوسرے سے زیادہ چرب لسان ہو اور میں اسے سچا گمان کروں اور اس کی سماعت کے مطابق فیصلہ کر دوں، پس جس کے لیے میں کسی مسلمان کے حق کا فیصلہ کر دوں تو وہ آتش دوزخ کا ٹکڑا ہے، اب وہ اسے لے لے یا چھوڑ دے۔ ③

حاصل کلام یہ ہے کہ اس مقام پر تین امور ہیں:

① پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خطا، معروف معنی میں خطاؤں کی اس قسم سے نہیں ہوتی جن میں بہت سے پست درجہ لوگ مبتلا ہوا کرتے ہیں، جیسے حکم خداوندی کی صراحۃً خلاف ورزی کرنا، یا قبیح افعال کا ارتکاب کرنا وغیرہ۔ بلکہ ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خطا کا تعلق ان امور سے ہوتا ہے جن کے بارے میں کوئی صریح نص موجود نہیں ہوتی، اس پر وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم غور وفکر کرتا ہے اپنی بھرپور طاقت صرف کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس سے خطا ہو جائے۔

② اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی خطا پر قائم رہنے نہیں دیتا۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں خطا پر برقرار رہنے دیں تو پھر نتیجہ کے طور پر خطا وصواب اور حق و باطل میں برابری لازم آئے گی جبکہ امت، اقوال وافعال میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی اللہ کی طرف سے مامور ہے، نیز اس طرح لوگ التباس میں مبتلا ہوں گے اور جس حق کی اتباع ان پر فرض کی گئی ہے اس سے ان کا گمراہ ہونا لازم آئے گا۔ نیز پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر شدہ امور میں تشکیک کا باعث بنتا ہے، یہ تمام امور اس مفروضہ پر مبنی ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر اجتہاد میں کبھی خطا بھی ہو جائے اور اس میں اللہ تعالیٰ وجہ صواب کی طرف ان کی راہ نمائی نہ فرمائیں، حالانکہ یہ تمام امور لازمہ بالکل باطل ہیں، لہٰذا ملزومات بھی باطل ہونگے، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکیم وعلیم ذات کبھی بھی قدوۂ عظمیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطا پر برقرار نہیں رہنے دیتی، بلکہ وجہ صواب کو ضرور واضح کرتی ہے، اور پھر کبھی ایسے موقعوں پر صرف تکمیل وارشاد کی خاطر ذرا سخت ونرم قسم کا عتاب بھی ہو جاتا ہے۔ کوئی عقوبت یا سزا دینا ہرگز مقصد نہیں ہوتا۔

③ جب اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ صواب کی جانب راہ نمائی کرتے ہیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اس کی طرف رجوع کرتا ہے انہیں اس بارے کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی وہ وحی کے ذریعہ اپنی خطا کے اظہار یا عتاب خداوندی میں کوئی تردّد کرتا ہے، بلکہ اسے واشگاف انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ یہ چیز اس کی عصمت وامانت کی بڑی مضبوط دلیل ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف سے جو کچھ لوگوں تک پہنچا رہا ہے اس میں وہ بالکل سچا ہے، اور قرآن اس کی تالیف وتصنیف نہیں ہے بلکہ یہ عزیز ورحیم ذات کی

① رواہ البخاری فی کتاب احادیث الانبیاء (۴۸)

② رواہ احمد ۱/۱۶۳ وابن ماجہ (۱۵)

③ رواہ مالک فی الاقضیۃ (۱) والبخاری فی الشہادات (۲۷) ومسلم فی الاقضیۃ (۴) وابو داؤد فی الاقضیۃ (۷) والترمذی فی الاحکام (۱۱)

طرف سے نازل کردہ ہے۔

آیاتِ عتاب کی انواع

قرآن حکیم میں پیغمبر ﷺ کو جس عتاب کا سامنا ہوتا ہے، وہ دوطرح کا ہے، ایک عتاب وہ ہے جس میں لطف و نرمی کا انداز ہوتا ہے اور دوسرا عتاب وہ ہے جس میں کچھ سختی اور خشونت ہوتی ہے۔ ہم ان کی تین مثالیں بیان کرتے ہیں۔

پہلی مثال ✿ سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (التوبہ: ۴۳)

"اللہ نے تمہیں معاف کر دیا تم نے انہیں کیوں رخصت دی یہاں تک کہ تیرے لیے سچے ظاہر ہو جاتے اور تو جھوٹوں کو جان لیتا۔"

اس کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ بعض منافقین آنحضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر غزوہ تبوک میں شرکت سے معذرت کرنے لگے، (اور اپنے عذر پیش کرنے لگے) آپ ﷺ نے انہیں اجازت دیدی کہ ٹھیک ہے کہ تم نہ جاؤ! آپ ﷺ نے ان کے عذر قبول فرمائے۔ اس پر ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا اور آپ ﷺ کو کمالِ تحقیق و تفتیش کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان کی ظاہری باتوں سے دھوکہ نہ کھایا کریں، کیونکہ اس کے پس پردہ ان کے بہت پست مقاصد ہیں، اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ وہ کیا کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں لفظ عفو کا استعمال بتاتا ہے کہ پروردگار عالم نے اپنے محبوب پیغمبر ﷺ کو کس قدر لطیف پیرایہ میں عتاب کیا ہے! اور اس عتاب میں نرم انداز اختیار فرمایا ہے۔

دوسری مثال ✿ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (الانفال: ۶۷-۶۹)

"نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں قیدیوں کو رکھے یہاں تک کہ ملک میں خوب خونریزی کر لے تم دنیا کی زندگی کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے، اور اللہ غالب حکمت والا ہے اگر اللہ کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو تم نے لیا اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب ہوتا پس جو مال تمہیں غنیمت میں حلال اور طیب ملا ہے اسے کھاؤ اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

اس کا واقعہ یوں ہوا کہ بدر کے دن ستر رؤسائے قریش مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوئے، حضور ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ان کے بارے میں مشورہ لیا، کسی نے سخت قسم کی رائے دی کہ ان کی بس گردن زنی کرنی چاہیے، کسی نے ان کی حالت پر ترس کھایا اور ان سے فدیہ قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ آنحضور ﷺ کی طبیعت میں رحمت و شفقت بھری تھی، اور آپ ﷺ کو جب بھی دو کاموں میں اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ ان میں زیادہ سہولت والا امر اختیار فرمایا کرتے تھے جب تک کہ وہ کام گناہ نہ

ہوتا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طبیعت کریمہ اور رحمت وسیعہ کے تقاضے کے مطابق ان حضرات کی رائے کو اختیار کر لیا جنہوں نے فدیہ قبول کر لینے کا مشورہ دیا تھا، اس امید پر کہ شاید اس طرح یہ لوگ مسلمان ہو جائیں یا پھر ان کی نسل سے اللہ تعالیٰ ایسے افراد پیدا کر دیں جو صرف اسی ذات کی بندگی اور عظمت کی قائل ہوگی!

نیز مسلمان بھی اپنے عام وخاص امور میں مالِ فدیہ سے فائدہ اٹھالیں گے۔

لیکن ابھی تھوڑا عرصہ نہ گزرا تھا کہ مذکورہ آیات کریمہ نازل ہوگئیں، ان آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خطا اجتہادی کو بیان کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ اگر قرآن حکیم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات پر خطا کاری کو کبھی بیان نہ فرماتے۔

ان آیات میں ایک اور بات بھی بڑی عجیب وغریب پائی جاتی ہے اور وہ ہے "متقابل امور کو جمع کر دینا" ایک انسان کے ذہن میں اس طریقہ پر یہ متقابل امور جمع نہیں ہو سکتے۔

ان آیات کا آغاز ایک عمل کی ناپسندیدگی سے کیا گیا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ﴾ (الانفال:۶۷)

پھر اس کے بعد ایک سخت قسم کا عتاب ذکر ہوا کہ عذاب سے دھمکایا گیا ہے:

﴿تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝﴾ (الانفال:۶۷-۶۹)

پھر اس عتاب واستنکار کے بعد کھانے کی اجازت دے دی گئی اور اسے عیب وحلال کی صفت سے بیان کیا گیا اور کھانے والوں کو مغفرت ورحمت کی خوشخبری بھی دے دی گئی۔

چنانچہ فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝﴾ (الانفال:۶۹)

غور کریں کہ ان متقابلات کو ایک ہی آمر اور ایک ہی مامور کی صورت میں ایک ہی لڑی میں کیسے پرو دیا گیا ہے! کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اس طرح کا کلام بنائے کہ انکار واجازت، مدح وذم اور وعد ووعید جیسے متقابلات کو کس طرح بغیر فصل کے بیان کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان کا حال یہ ہے کہ ایک کام میں مشغولیت اسے دوسرے کام سے غافل رکھتی ہے، دو متقابل امور ایک یہ وقت میں جمع نہیں کر سکتا اور نہ دو متضاد حالات جمع ہو سکتے ہیں جیسے ناراضی اور رضامندی، پسندیدگی اور ناپسندیدگی، بلکہ ایسے متضاد امور دو الگ الگ وقتوں میں یکے بعد دیگرے صادر ہوا کرتے ہیں، جب دونوں میں تقدم وتاخر ہونا لازم ہے تو امر لاحق امر سابق کو مٹائے گا، تو جب اسے مٹا دیا تو اس کے ثبوت وقیام کے معنی باقی نہ رہیں گے، بلکہ فطری بات ہے کہ اس میں ترک اور اعراض لازم آتا ہے، بالخصوص جب امر اوّل میں متکلم کی ملامت، مذمت اور غلطی کا اظہار ہو۔ جیسا کہ اس مقام پر فدیہ کا مال قبول کیا جانا اور اس کا استعمال کرنا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ صورت اعجاز کی دلیل ہے اور اس پر سچی دلیل ہے کہ دراصل دو مختلف نفوس ہیں، ایک نفس

ہے جسے ایک کام کی مشغولیت دوسرے کام سے غافل نہیں کرتی اور جو انسان کی طرح رضا و غضب کی جذبات سے متاثر نہیں ہوتا۔ دوسرا نفس وہ ہے جس کی نسبت دوسرے نفس سے ایسی ہے جیسے مامور کی نسبت ہوتی ہے آمر سے یا مملوک کی نسبت اپنے مالک سے ہوتی ہے۔ چنانچہ مذکورہ آیات کریمہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مالک وعزیز کا اپنے محبوب بندے سے کلام ہو کہ: آپ سے سابقہ کام میں خطا ہوگئی ہے، آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، چلو میں نے معاف بھی کر دیا اور مغفرت بھی کر دی بلکہ آئندہ اس طرح کے عمل کی اجازت بھی دے دی۔

تیسری مثال ✿ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی ۙ۝۱ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ؕ۝۲ وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤی ۙ۝۳ اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ؕ۝۴ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۙ۝۵ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ؕ۝۶ وَ مَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی ؕ۝۷ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی ۙ۝۸ وَ هُوَ یَخْشٰی ۙ۝۹ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ۚ۝۱۰ كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ۝۱۱﴾ (عبس: ۱-۱۱)

”پیغمبر چیں بجبیں ہوئے اور منہ موڑ لیا کہ ان کے پاس ایک اندھا آیا اور آپ کو کیا معلوم شاید وہ پاک ہو جائے یا وہ نصیحت پکڑے تو اس کو نصیحت نفع دے لیکن وہ جو پروا نہیں کرتا سو آپ اس کے لیے توجہ کرتے ہیں حالانکہ آپ پر اس کے نہ سدھرنے کا کوئی الزام نہیں اور لیکن جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ ڈر رہا ہے تو آپ اس سے بے پروائی کرتے ہیں ایسا نہیں چاہیے بے شک یہ تو ایک نصیحت ہے۔“

اس کا واقعہ کچھ یوں ہوا کہ ایک دن آنحضرت ﷺ روسائے قریش کو اسلام کی دعوت دینے میں مشغول تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آ گئے اور رسول اللہ ﷺ سے کچھ دریافت کرنے لگے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نابینا تھے، پہلے سے ہی اسلام سے مشرف ہو چکے تھے، آنحضور ﷺ ان سردارانِ قریش کو دعوت دینے میں مشغول رہے آپ ﷺ کی بہت خواہش تھی کہ وہ کسی طرح ہدایت پر آ جائیں، چنانچہ آپ ﷺ اس امید پر کہ اسلام لے آئیں گے ان کی طرف متوجہ رہے اور ان کو اسلام کی طرف رغبت دیتے رہے۔ اس طرح سارا عرب ان کے اسلام لانے سے ان کی پیروی کرے گا، (آپ ﷺ نے سوچا کہ) یہ صحابی رضی اللہ عنہ کس لیے آئے ہیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ یہ تو مسلمان ہیں، ظاہر ہے انہیں اسلام کے بارے میں کوئی بات تو پوچھنا ہوگی! بلکہ مزید علم وہدایت حاصل کرنا چاہتے ہوں گے!

وہ نابینا صحابی رضی اللہ عنہ عرض گزار تھے کہ کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ مجھے بھی ان باتوں میں سے کچھ سکھا دیں جو اللہ نے آپ ﷺ کو سکھائی ہیں۔

رسولِ پاک ﷺ نے دیکھا کہ میں تو اس وقت سخت قسم کے مشرکین کو دعوت اسلام دینے میں مشغول ہوں اور دوسری طرف ایک مسلمان آدمی ہے جو صرف مزید علم وہدایت کا طلبگار ہے، آپ ﷺ نے اپنا رخ ان روسائے قریش کی طرف ہی رکھا، اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سے بے رخی کی، اس سے آپ ﷺ کی غرض ان کی حقارت یا مذمت نہ تھی بلکہ ان روسائے قریش کی ہدایت کی شدید خواہش تھی کہ کہیں ان کو دعوت اسلام کا میسر موقع ہاتھ سے نہ چلا جائے، اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات اتاریں اور

آپ ﷺ کو سخت قسم کا عتاب بھی فرمایا اور یہ بھی سمجھایا کہ ان روسائے قریش کی ہدایت کی خواہش بھی اس قدر ہونا مناسب نہیں کیونکہ وہ تو آپ ﷺ سے منہ موڑے ہوئے ہیں اور اس کمزور نابینا صحابی رضی اللہ عنہ سے اتنا چیں بجبیں ہونا بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ وہ تو آپ ﷺ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو رہے ہیں۔

میری طرح آپ بھی اس عتاب کی حرارت محسوس کر رہے ہوں گے، جس کا مقصد یہ درس دینا ہے کہ جو اعراض کرتے ہوں تو ان سے اعراض کرنا ہی مناسب ہوتا ہے خواہ وہ کتنے ہی بلند شان کے مالک ہوں اور جو توجہ دیتے ہوں ان کو توجہ دینا مناسب ہوتا ہے خواہ ان کی حالت کس قدر کمزور ہو!

جیسا کہ ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝﴾ (الکھف: ۲۸)

"تو ان لوگوں کی صحبت میں رہ جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی رضا مندی چاہتے ہیں اور تو اپنی آنکھوں کو ان سے نہ ہٹا کہ تو دنیا کی زندگی زینت تلاش کرنے لگ جائے اور اس شخص کا کہنا نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور اپنی خواہش کے تابع ہو گیا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔"

شاید آپ کو بھی میری طرح اس عتاب کے پس پردہ پیغمبر ﷺ کی اپنے دشمنوں کے ساتھ رحمدلی، دعوت میں اخلاص اور ہمدردی، اپنی ذمہ داری کا حد سے زیادہ احساس اور تمام انسانوں کے ہدایت پر آ جانے کی لگن اور تڑپ نظر آ رہی ہو۔[1]

نویں وجہ: انتظارِ طویل کے بعد نازل شدہ آیات

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں اہم امور سے متعلق ایسی بہت سی آیات موجود ہیں جو اہمیت کے باوجود طویل انتظار کے بعد نازل ہوئیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن، اللہ کا کلام ہے، محمد ﷺ کا کلام نہیں ہے، کیونکہ اگر محمد ﷺ کا کلام ہوتا تو اس انتظار کا کوئی مطلب نہیں بنتا۔ کیونکہ انتظار اپنی ذات میں ایک مشقت آمیز چیز ہے، پھر اس کا اہم امور سے متعلق ہونا زیادہ مشقت کا باعث ہوتا ہے، خصوصاً اس عظیم شخص کے لیے جو اپنی قوم کو چیلنج کرنے کے درپے ہو بلکہ سارے جہاں کو چیلنج کر رہا ہو!۔

ہم اس کی توضیح کے لیے پانچ مثالیں دیتے ہیں:

① تحویلِ قبلہ کا واقعہ، یعنی بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی طرف رخ کرنے کا مسئلہ، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ﴾ (البقرۃ: ۱۴۴)

"بے شک ہم آپ کے منہ کا آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں، سو ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ

---

① زادہ اللہ شرفاً علی شرفہ وعزاً علی عزہ، آمین

پسند کرتے ہیں پس اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیجئے اور جہاں کہیں تم ہوا کرو اپنے مونہوں کو اسی طرف پھیر لیا کرو۔“

آپ بھی جانتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو بے حد شوق تھا کہ قبلہ بیت اللہ ہو جائے، اسی لیے آپ ﷺ اپنا چہرہ انور بار بار آسمان کی طرف اس اشتیاق میں اٹھایا کرتے کہ شاید تحویل قبلہ کے بارے میں وحی نازل ہو! آپ ﷺ کو بیت المقدس کی طرف رخ کیے ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا، اگر یہ قرآن، آنحضور ﷺ کا خود ساختہ ہوتا تو حضور ﷺ اپنے اس شوق کو پورا کر لیتے، آپ ﷺ کی قوم بھی اس کا اشتیاق رکھتی تھی، کیونکہ کعبہ، ان کی نظر میں ان کے لیے بھی اور ان کے آباؤ واجداد کے لیے بھی باعثِ افتخار تھا۔

② واقعہ افک، یہ واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے، اس بارے میں قرآن کی آیات تقریباً چالیس دن گزرنے کے بعد نازل ہوئیں، حالانکہ اس مسئلہ کا تعلق پیغمبر ﷺ کی آبرو اور آپ ﷺ کے پہلے دوست صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی عزت سے تھا، نیز ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر بدکاری کی (نعوذ باللہ) تہمت لگ چکی تھی۔ اگر یہ قرآن، محمد ﷺ کا کلام ہوتا تو آپ ﷺ ان آیات کو لانے میں دیر نہ لگاتے جن سے آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کی پاکیزہ اور پاک دامن زوجہ کی عزت و آبرو محفوظ رہتی۔ نیز آپ ﷺ ایسے حقارت آمیز اور قبیح قسم کے الزامات کو ختم کرنے کے لیے ایک دن کا بھی انتظار نہ فرماتے، جن الزامات کو خدا کے دشمن یعنی منافقوں نے پھیلا رکھا تھا۔ آپ سورۃ النور کی آیات:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ﴾ سے لے کر ﴿اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ﴾ (النور: ۱۱-۲۶)

پڑھ لیجیے۔ پھر مجھے بتایئے کہ اگر بالفرض یہ قرآن، آپ ﷺ کا خود ساختہ کلام ہوتا تو کیا حضور ﷺ پر ضروری نہ تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا حکم لگا دیتے، خصوصاً اس وقت جب تمام لوگوں کو بھی اس کا علم ہو گیا تھا! تب تو عزتِ نفس کا دفاع ضروری تھا! پھر بتایئے کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ان آیات براءت میں جو جرأت مندانہ قاطعانہ اور انذار و تبشیر کا اسلوب اختیار کیا گیا اس میں اور پیغمبر ﷺ کی اس واقعہ میں روایت کردہ محتاط اور محافظانہ زبان واسلوب میں کس قدر فرق ہے؟ اگر آپ کسی تردد میں مبتلا ہیں تو آپ کے سامنے یہ آیاتِ براءت بھی ہیں اور وہ کلمات اور الفاظ بھی ہیں جو اس اہم معاملہ میں کہے گئے تھے!

حدیث میں آتا ہے کہ طویل انتظار کے بعد جب کلیجے منہ کو آنے لگے، آنحضور ﷺ نے فرمایا:

”مجھے تو خیر و بھلائی کے سوا کچھ معلوم نہیں۔ نیز ایک حدیث میں آپ ﷺ نے آیات براءت کے نزول کے کچھ دیر پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! مجھے اس طرح اس طرح کی باتیں پہنچی ہیں، اگر تم بے قصور ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور تجھے بَری ثابت کر دے گا اور اگر تم سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے تو اللہ سے معافی مانگ لو۔“①

اب غور کریں کہ کیا کوئی عقلمند انسان یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اس کلام کا اور آیات براءت کا صاحب ایک ہی ہے؟ آپ ان دو اسلوبوں کو بھی چھوڑ دیں، ان دو کلاموں میں دو ممتاز نفسوں میں غور کر لیں، دونوں میں ایسا امتیاز ہے جیسے مالک اور مملوک کے درمیان

---

① رواه البخاری، کتاب الشهادات (۱۵) ومسلم، کتاب التوبة (۵۶)

ہوتا ہے یا عابد اور معبود کے درمیان ہوتا ہے۔

۳ حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ سے اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے پوچھنے والوں سے فرمایا: کل آ جانا میں تم کو بتا دوں گا۔ آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہیں کہا جس کی وجہ سے وحی کے آنے میں تاخیر ہوئی، آپ ﷺ پر یہ بات شاق گزری، قریش مکہ بھی تکذیب کرنے لگے، اور کہنے لگے کہ اس کے رب نے اسے چھوڑ دیا، وہ اس سے ناراض ہو گیا۔ اس پر یہ آیتیں اُتریں:

﴿وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝﴾ (الضحیٰ:۱-۳)

اس کے بعد پروردگار عالم نے حکم فرمایا کہ آئندہ ان شاء اللہ ضرور کہنا۔ سورۃ الکہف میں فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ۝﴾ (الکہف:۲۳-۲۴)

"اور کسی چیز کے متعلق یہ ہرگز نہ کہو میں کل اسے کر ہی دوں گا مگر یہ کہ اللہ چاہے اور اپنے رب کو یاد کر لے جب بھول جائے اور کہہ دو امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے بھی بہتر راستہ دکھائے۔"

پھر جب جبرائیل علیہ السلام تاخیر کے بعد نازل ہوئے تو انہوں نے آپ ﷺ سے وہ بات کہی جو اللہ تعالیٰ نے سورۃ مریم میں نقل کی ہے کہ:

﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝﴾ (مریم:۶۴)

"اور ہم تیرے رب کے حکم پر ہی اترتے ہیں، اس کا ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ ان کے درمیان اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ وحی کا جلدی نزول نہ ہونا اللہ تعالیٰ کے اعراض کی وجہ سے نہیں ہے جیسا کہ یہ لوگ گمان کرتے ہیں، بلکہ کسی حکمت بالغہ کی وجہ سے اس کی اجازت نہ تھی۔

ہم نے کتاب کی پہلی جلد میں قرآن کے تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کے بعض اسرار و حکم بیان کیے ہیں، یہاں پر بس اتنا کافی ہے کہ انصاف پسند انسان اس تاخیر وحی سے استدلال کر سکتا ہے کہ قرآن، عزیز و رحیم ذات کا نازل کردہ کلام ہے، حضور نبی کریم ﷺ کا کلام نہیں ہے۔

۴ حدیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۸۴)

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت گھبرا گئے، کیونکہ انہوں نے اس آیت کا مطلب یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں آنے والے وساوس و خیالات کا بھی محاسبہ کریں گے، خواہ وہ خیالات گھٹیا قسم کے ہوں۔ چنانچہ انہوں نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ یا

رسول اللہ ﷺ! ہم پر ایک ایسی آیت اتری ہے کہ ہم اس پر عمل کی طاقت نہیں رکھتے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ اسی طرح کہو جیسے تم سے پہلے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) نے کہا تھا کہ ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ (البقرۃ:۹۳) (یعنی ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی) بلکہ تم یوں کہو:

﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ (البقرۃ:۲۸۵)

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ کلمات کہنے لگے اور بارگاہِ خداوندی میں گڑگڑاتے رہے حتیٰ کہ اللہ جل شانہٗ نے سورۃ البقرۃ کی آخری آیت ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶) نازل فرمائی۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل مطمئن ہو گئے اور سمجھ گئے کہ ان ہی اعمال کا محاسبہ ہوگا جو ان کے اختیار اور طاقت کے دائرہ میں آتے ہوں جن میں پختہ عزم کے ساتھ کوئی قول و عمل پایا جاتا ہو۔ لیکن وہ وساوس جو دلوں میں آتے رہتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی برے ہوں ان کا احکامِ تکلیفی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ وہ بندے کی قدرت و طاقت میں نہیں ہیں۔

جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

"یعنی اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اسی حکم کا مکلف بناتے ہیں جو اس کی طاقت میں ہو۔"

اب آپ غور کیجیے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے سوال کیا تو حضور ﷺ نے خود ان سے حقیقتِ حال بیان نہیں کی، کیونکہ اس وقت آپ ﷺ پر وحی نہیں کی گئی، اگر قرآن خود آپ ﷺ کی ذاتی وحی (یا کلام) ہوتا جیسا کہ الزام لگانے والے کہتے ہیں تو حضور ﷺ اپنے اصحاب کو آخری آیت سنا کر انہیں مطمئن کر دیتے اور انہیں اس اندیشہ سے نجات دلاتے جس نے ان کے دلوں کو خوف زدہ کر رکھا تھا، خاص طور پر جب وہ حضور ﷺ کے ساتھی اور آپ ﷺ ان کے پیغمبر ﷺ تھے۔ اور حضور ﷺ کی طبیعت میں بھی تھا کہ آپ ﷺ مومنوں پر بڑے مہربان و شفیق تھے جیسے فرمایا:

﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التوبہ:۱۲۸)

اگر قرآن، خود آنحضور ﷺ کا کلام ہوتا تو آپ ﷺ اس کی خود ہی وضاحت فرما دیتے، ورنہ تو آپ ﷺ پر کتمانِ علم کا الزام آئے گا اور ایسا شخص (نعوذ باللہ) رحمت الٰہی سے دور ہوتا ہے۔

پھر تعجب ہے کہ الزام لگانے والے کدھر بھٹکتے جا رہے ہیں؟!۔

⑤ مروی ہے کہ جب رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی فوت ہوا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے اپنے کپڑوں کا کفن دیا اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے: کیا آپ ﷺ اس کے لیے دعائے مغفرت کرنے لگے ہیں اور اس کا جنازہ پڑھنے لگے ہیں حالانکہ آپ ﷺ کے رب نے آپ کو اس سے روکا ہے؟! آپ ﷺ نے فرمایا: میرے رب نے مجھے اختیار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ﴾ (التوبہ:۸۰)

"آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں اگر ستر بار بھی استغفار کریں گے تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہ کریں گے۔"

آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ستر سے زیادہ بار استغفار کروں گا، پھر آپ ﷺ نے اس کا نماز جنازہ پڑھا۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ﴾ (التوبہ:۸۴)

"اوران میں سے جو مر جائے کسی پر کبھی نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہو۔"

اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کا نماز جنازہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ مکمل روایت صحیحین میں پڑھیے۔ ①

اب آپ غور کریں کہ حضور ﷺ نے پہلی آیت کا جو مفہوم سمجھا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فہم کے خلاف تھا، پھر دوسری آیت آئی جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فہم کی تائید اور حضور ﷺ کے فہم کی مغایرت معلوم ہوتی ہے کیا اس کے باوجود کوئی عقل رکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ قرآن، آنحضور ﷺ کا خود ساختہ کلام ہے؟۔

بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اگر قرآن، (بالفرض) حضور ﷺ کا ذاتی کلام ہوتا تو آپ ﷺ اس کی مراد کو تمام لوگوں سے زیادہ جانتے ہوتے اور اس کے الفاظ کی حقیقت سے زیادہ واقف ہوتے اور پیش کردہ کلام حضور ﷺ کے فہم کا مؤید ہوتا، کسی اور کے فہم کا نہ ہوتا! لیکن حقیقتِ امر اس کے بالکل خلاف تھی۔ آنحضرت ﷺ نے سمجھا کہ پہلی آیت میں کلمہ "اَوْ" تخییر کے لیے ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ مساوات کے لیے ہے، نیز آنحضور ﷺ نے کلمہ "سبعین" سے معروف عدد سمجھا یعنی جو دہائیوں میں ساٹھ اور اسی کے درمیان عدد (ستر) ہوتا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عدد کو مبالغہ کے لیے خیال فرمایا نہ کہ کسی خاص تحدید وتعیین کے لیے۔ کیونکہ اس کا کوئی مفہوم ہی نہیں بنتا۔ نیز آنحضور ﷺ نے کلمہ "اَوْ" یا "سبعین" سے جو معنی مراد لیا اور پھر اس سے استدلال کیا اس کی بنیاد ان کلمات کی اصل وضع ہے، بالخصوص اس لیے کہ آپ ﷺ کی طبیعت میں ہر انسان کی رحم دلی اور ہمدردی موجود تھی، خواہ وہ منافق کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ ارشاد تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانبیاء:۱۰۷)

"اور ہم نے تمہیں تمام جہان کے لوگوں کے حق میں رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

دسویں وجہ: نزولِ وحی کے وقت حضور ﷺ کی کیفیت

اس کی توضیح یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ وحی کے ابتدائی زمانہ میں جلدی کیا کرتے تھے، قرآن کی آیات کو جلدی پڑھتے اس سے پہلے کہ امینِ وحی (جبریل علیہ السلام) اس سے فارغ ہوں۔ جس کی وجہ یہ تھی۔ آپ ﷺ اس وحی کو جلدی سے محفوظ کر کے کما حقہ، لوگوں تک پہنچانے کی فکر رکھتے تھے۔ آنحضور ﷺ کو اس کی وجہ سے بڑی مشقت اٹھانا پڑتی تھی جس کا احساس آپ ﷺ کو نزول وحی سے ہوتا تھا حتیٰ کہ آپ ﷺ کی جبینِ مبارک سخت سردی کے دنوں میں بھی پسینہ سے

① صحیح البخاری کتاب الجنائز (۸٤) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ (۲) حدیث (۲۵)

شرابور ہو جاتی، جسم مبارک ثقیل ہو جاتا کہ پاس بیٹھا شخص اس ثقل کو محسوس کرتا، اور چہرہ انور بھی سرخ ہو جایا کرتا اور آپ ﷺ کی آواز سنائی دیتی۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت ذکر کی ہے کہ: آنحضرت ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ ﷺ اس کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہوتے، چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا، اس لیے اللہ کی رحمت نے چاہا کہ اپنے مصطفیٰ ﷺ سے اس مشقت کو دور کر دے، چنانچہ آپ ﷺ پر سورۃ القیامۃ کی یہ آیات اتار دیں:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝﴾ (القیامۃ:۱۶-۱۹)

"آپ (وحی کے ختم ہونے سے پہلے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجیے تاکہ آپ اسے جلدی جلدی لیں بے شک اس کا جمع کرنا اور پڑھا دینا ہمارے ذمہ ہے، پھر جب ہم اس کی قراءت کر چکیں تو اس کی قرأت کا اتباع کیجیے پھر بے شک اس کا کھول کر بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔"

اس کے بعد آنحضور ﷺ کو قلبی سکون حاصل ہوا کہ اب اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سینہ میں جمع کر دینے کی ذمہ داری لے لی ہے، اور وہ لوگوں کو اس طرح مکمل قرآن پڑھائیں گے کہ اس میں کسی کلمہ یا حرف کی کمی نہ ہوگی۔ نیز اللہ تعالیٰ اس کے معنی بھی اس طرح کھول کر بیان کریں گے کہ کوئی گوشہ اس کا مخفی نہ رہے گا۔ جیسا کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعلیٰ میں بھی بیان فرمائی:

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۝﴾ (الاعلیٰ:۶)

"ہم آپ کو پڑھا دیں گے تو آپ نہ بھولیں گے۔"

بلکہ تیسری مرتبہ سورۃ طٰہٰ میں بھی فرمایا:

﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۖ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۝﴾ (طٰہٰ:۱۱۴)

"اور آپ قرآن کے لینے میں جلدی نہ کریں جب تک اس کا اترنا پورا نہ ہو جائے اور کہہ اے میرے رب مجھے اور زیادہ علم دے۔"

غور کیجیے کہ ان تمام امور میں اس بات کی ہدایت موجود ہے کہ قرآن، صرف اللہ کا کلام ہے، محمد ﷺ کا کلام نہیں ہے۔ ورنہ آپ ﷺ کو نزولِ قرآن کے وقت اس قدر مشقت برداشت نہ کرنا پڑتی۔ بلکہ اپنی فکر کی پختگی اور الفاظ کے انتخاب کے لیے اطمینان وسکون کی کیفیت اور خاموشی اختیار کرنا زیادہ مفید ہوتا، نیز اس موقع پر تو پھر ضرورت تو اس امر کی تھی کہ اس کلام کے حفظ وتبلیغ اور اس کے معانی کی تشریح وتبیین کے بارے میں آپ کو اطمینان کی کیفیت حاصل ہوتی۔

اس پر مستزاد یہ کہ یہ کیفیت جو آنحضور ﷺ کو نزولِ وحی کے وقت پیش آتی تھی یہ کیفیت عام طور پر نہ قبل از نبوت کلام پیش کرتے وقت ہوتی تھی نہ بعد از نبوت بلکہ آپ ﷺ کی قوم کے کسی فرد کی بھی یہ عادت نہ تھی، تمام لوگوں کا طریقہ یہی تھا کہ وہ بس اپنا کلام تیار کر کے پیش کر دیتے تھے۔

گیارہویں وجہ: آیتِ مباہلہ

اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن نے مخالفین کو مباہلہ کی دعوت دی: "مباہلہ" ابتہال سے مشتق ہے اور باب مفاعلہ کا مصدر ہے، جس کا معنی ہوتا ہے خوب گرمجوشی سے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانا۔ جب قرآن نے ان کو دعوتِ مباہلہ دی تو نصاریٰ نجران نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور گھبرا گئے اور راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، حالانکہ ان کو صرف یہ تکلیف کرنا تھی کہ وہ اپنی اولاد اور عورتوں کو لے آتے اور ادھر سے رسولِ پاک ﷺ اپنی اولاد اور عورتوں کو لے آتے، پھر ایک جگہ جمع ہو کر خوب گڑگڑاتے ہوئے پوری قوت و اخلاص سے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتے کہ فریقین میں سے جو بھی جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت اور غضب نازل ہو!

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سورۃ آل عمران میں فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (ال عمران: ۶۱-۶۲)

"پھر جو کوئی تجھ سے اس واقعہ میں جھگڑے بعد اس کے کہ تیرے پاس صحیح علم آ چکا تو کہہ دو آؤ ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جانیں اور تمہاری جانیں بلائیں پھر سب التجا کریں اور اللہ کی لعنت ڈالیں ان پر جو جھوٹے ہوں بے شک یہی سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور بے شک اللہ ہی زبردست حکمت والا ہے۔"

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب ان کو مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے کہا کہ ہم غور کرتے ہیں، چنانچہ عاقب نے، جو ان میں صاحب رائے تھا، یہ کہا کہ اے نصاریٰ کی جماعت! خدا کی قسم! تمہیں بھی خوب معلوم ہے کہ محمد (ﷺ) نبیِ مرسل ہیں، اور کسی قوم نے جب بھی خدا کے پیغمبر ﷺ سے مباہلہ کیا ہے تو نہ ان کا کوئی بڑا ہلاکت یا عذاب خداوندی سے بچا ہے اور نہ کوئی چھوٹا۔ اگر تم نے مباہلہ کیا تو ضرور ہلاک و برباد ہو جاؤ گے، اگر تم کو اپنے ہی دین پر قائم رہنا ہے تو ان کو چھوڑ دو اور اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جاؤ۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو دیکھا کہ حضور ﷺ گود میں حسین رضی اللہ عنہ کو لیے ہوئے ہیں اور حسن رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے پیچھے اور علی رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے چلے آ رہے ہیں! اور حضور ﷺ فرما رہے ہیں: جب میں دُعا کروں تو تم آمین کہنا: "نصاریٰ نجران کا لاٹ پادری کہنے لگا کہ اے نصاریٰ کی جماعت! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں، اگر یہ اللہ سے دُعا کریں کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے سرکا دے تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور سرکا دیں گے!۔ تم مباہلہ نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور روئے زمین پر کوئی نصرانی نہیں بچے گا!۔ چنانچہ وہ کہنے لگے! اے ابوالقاسم ﷺ! ہماری رائے یہ ہوئی ہے کہ ہم آپ ﷺ سے مُباہلہ نہ کریں، پھر نبی کریم ﷺ نے دو کپڑوں کے جوڑوں پر ان سے مصالحت فرمائی۔

اس توقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، نصاریٰ نجران پر ہلاکت قریب آ چکی تھی، اگر وہ ملاعنت کرتے تو بندر اور خنزیر کی صورت میں ان کے چہرے مسخ کر دیئے جاتے۔"

مباہلہ کا تعلق اگرچہ حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے منکرین کے ساتھ تھا پھر بھی آپ ﷺ کا اپنے بچوں اور عورتوں کو شریک کرنا اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ آنحضور ﷺ کو اپنی صداقت کا یقین اور اپنے حال پر پورا وثوق واعتماد تھا، تبھی آپ ﷺ اپنے عزیز ترین اور جگر گوشوں کو بھی مباہلہ کے ساتھ لے آئے، حضور ﷺ نے صرف اپنی ذات مبارک کو پیش نہیں کیا اور آپ ﷺ کو اپنے مدِ مقابل کے جھوٹے ہونے کا صرف یقین نہ تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ اگر مباہلہ ہو جاتا ہے تو آپ ﷺ کے مدِ مقابل اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ ہلاک ہوں۔ اور بیٹوں اور عورتوں کو خاص طور سے اس لیے ساتھ لیا کہ یہ آپ ﷺ کو اپنے اہل وعیال میں زیادہ عزیز تھے اور ان سے زیادہ قلبی تعلق تھا، پھر ان کا ذکر اپنی ذات سے پہلے کرنا ان کے مقام ومنزلت اور قرب سے سب کو آگاہ کرنے کے لیے تھا۔

نیز اس واقعہ میں آنحضور ﷺ کی نبوت کی صحت وصداقت کی بھی دلیل موجود ہے، کیونکہ کسی بھی موافق اور مخالف سے یہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے اس دعوت مباہلہ کو قبول کیا ہو! (از تفسیر نسفی)۔

ہم یہ بات کہتے ہیں کہ کیا یہ اس بات کی مادّی دلیل نہیں کہ یہ قرآن، اس ذات کا کلام ہے جو لعنت کے نازل کرنے اور کاذب کو ہلاک کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے، نیز آنحضرت ﷺ کا اس مباہلہ کو قبول کرنا اور آپ ﷺ کے اعداء کا قبول نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ ﷺ کی نبوت کی صداقت ایک معروف بات تھی۔ مخالفین اہل کتاب بھی اس سے واقف تھے اور یہ بات ان کے دلوں میں موجود تھی، ورنہ پھر وہ کیوں اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ گئے اور راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے؟۔

اصل بات یہ ہے کہ کینہ حسد اور بڑائی نے ان دلوں کو تباہ کر دیا تھا، انہوں نے حضور ﷺ سے اس بناء پر حسد کیا کہ اللہ نے ان کو نبوت عطا کی ہمیں کیوں نہیں کی! حالانکہ آپ ﷺ تو اُمّی ہیں اور ہم اہل کتاب ہیں؟! حضور ﷺ پر ایمان لانا اور آپ ﷺ کا تابع دار ہونا ان کے لیے گراں بار ہوا، کہ اس سے ان کی ریاست جاتی رہے گی اور لوگوں کے دلوں سے ان کا مقام ومرتبہ کم ہو جائے گا، یہ حسد اور بڑائی کا مرض ایسے دبیز پردے ہیں جو انسان کی سعادت وخوش بختی کی راہ میں حائل ہو جایا کرتے ہیں۔ حاسد کبھی سیادت نہیں پا سکتا، اور متکبر آخر کار رسوا ہی ہوتا ہے، اسے نہ ہدایت ملتی ہے اور نہ توبہ کی توفیق!۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِيَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِي الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَ اِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ۚ وَ اِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الرُّشۡدِ لَا يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ۚ وَ اِنۡ يَّرَوۡا سَبِيۡلَ الۡغَيِّ يَتَّخِذُوۡهُ سَبِيۡلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوۡا عَنۡهَا غٰفِلِيۡنَ ۝﴾ (الاعراف:۱۴۶)

”پھر میں اپنی آیتوں سے انہیں پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، اور اگر وہ ساری نشانیاں بھی دیکھ لیں تو بھی ایمان نہیں لائیں گے اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اسے اپنی راہ نہیں بنائیں گے اور اگر گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے اپنا راستہ بنائیں گے یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے بے خبر رہے۔“

اے اللہ! ہم آپ کی غضبناکی وہلاکت خیزی سے پناہ مانگتے ہیں، اسی طرح ہر اس چیز سے پناہ کے طالب ہیں جو آپ کی

غضبنا کی اور ہلاکت خیزی کا ذریعہ بنے۔ (آمین)

بارہویں وجہ: پیغمبر ﷺ کا قرآن کا متبادل لانے سے قاصر ہونا

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اعدائے اسلام نے حضور نبی کریم ﷺ سے مطالبہ کیا کہ وہ اس موجودہ قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کریں، آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، جس کی وجہ صرف یہی تھی کہ قرآن آپ ﷺ کا کلام نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ کی طاقت سے خارج تھا، اوپر سے آیا ہوا تھا، اگر یہ قرآن آپ ﷺ کا کلام ہوتا تو آپ ﷺ ضرور کوئی دوسرا قرآن لے آتے اور ان کی فرمائش پوری کرتے ہوئے اس کا متبادل پیش کر دیتے! بلکہ اس طرح سے آپ ﷺ کے اعوان وانصار میں مزید اضافہ ہو جاتا اور جس دعوت کی کامیابی کے آپ ﷺ بڑے دل دادہ تھے وہ بھی بہت رواج پاتی!

• لیکن حضور ﷺ نے ان تمام مطالبات اور فرمائشوں کے پورا کرنے سے اپنی عاجزی کا اظہار کر دیا بلکہ اس بات کا واشگاف اعلان کیا کہ اگر ان کے مطالبہ پر کوئی اقدام کریں گے تو انہیں عذابِ خداوندی کا سخت اندیشہ ہے اور قرآن کی اصل نسبت میں بھی خلل پیدا ہوگا، حالانکہ اس کی اللہ کی طرف نسبت ایک بہت زیادہ قابلِ فخر بات ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ حجت بھی ان پر قائم کر کے ان کو لاجواب کر دیا کہ میری ساری نشوونما تمہارے سامنے ہوئی ہے کہ اس قرآن کے لانے والے کو (اس سے پہلے) نہ میں جانتا تھا اور نہ تم جانتے تھے۔

اس کے بارے میں سورۃ یونس کی دو آیات پڑھیے:

﴿ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قُلْ لَّوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ڮ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (یونس: ۱۵-۱۶)

"وہ لوگ کہتے ہیں جنہیں ہم سے ملاقات کی امید نہیں کہ اس کے سوا کوئی قرآن لے کر آؤ یا اسے بدل دے تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اپنی طرف سے اسے بدل دوں میں اسی کی تابعداری کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جائے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں کہہ دو اگر اللہ چاہتا تو میں اسے تمہارے سامنے نہ پڑھتا اور نہ ہی تمہیں اس سے خبردار کرتا کیونکہ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا پھر تم نہیں سمجھتے۔"

مطلب یہ ہے کہ قرآن تو میری طاقت سے بڑھ کر ہے، میری قدرت سے باہر ہے۔ میں تو اس قرآن کو نقل کرنے والا اور وحیِ الٰہی کی اتباع کرنے والا ہوں، اگر میں نے اس کی نصوص سے کھلواڑ کیا یا کچھ تبدیلی کی تو مجھے اس کتاب کے مالک سے عذاب کا اندیشہ ہے، کیونکہ قرآن اس کا کلام ہے، اگر وہ چاہتا کہ میں تمہارے اور اس کے درمیان رسول ﷺ اور پیامبر نہ ہوں تو میرے پاس کوئی تدبیر نہ ہوتی کہ میں تمہارے سامنے اس کتاب کی تلاوت کرتا اور پھر تم مجھ سے یہ کتاب حاصل کرتے۔ پھر میں تمہارے درمیان پلا بڑھا ہوں اور اس کتاب کے نزول سے پہلے چالیس سال کا عرصہ گزار چکا ہوں۔ (جو ایک طویل عمر ہے) اور تمہیں معلوم

ہی ہے کہ میرے اندر اس قدر اعلیٰ درجہ کی استعداد موجود نہیں ہے اور تم نے مجھ سے ایسا معجزانہ کلام کبھی سنا بھی نہیں ہے، اور تم نے کبھی نہیں دیکھا کہ میں نے کسی بھی شخص سے کبھی جھوٹ بولا ہو تو پھر میں اس طویل عمر کے بعد اللہ پر کیسے جھوٹ باندھ سکتا ہوں!؟۔

﴿اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝﴾۔ اس کلمہ میں جس قدر دوسرے کو شرمندہ کرنے اور سخت روی کا انداز واثر موجود ہے وہ ایسا شخص یہی سمجھ سکتا ہے جو اس کی دلیل کی قوت کو بغور دیکھتا ہو!۔

تیرھویں وجہ: وہ آیات جن سے کلام اللہ کی پیغمبر ﷺ کی طرف نسبت کی نفی ہوتی ہے

آپ قرآن مجید کی تلاوت کریں گے تو اس میں بے شمار آیات آپ کو ایسی ملیں گیں جن میں اس بات کی نفی کی گئی ہے کہ اس قرآن کا کوئی کلمہ یا حرف پیغمبر علیہ السلام کا ہو، بلکہ ان آیات میں یہ بات مذکور ہے کہ آنحضور ﷺ نزولِ کتاب سے قبل اس بات سے واقف نہیں تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا چیز ہے؟ پھر اللہ کا انعام واحسان ہوا کہ آپ ﷺ کو کتاب وحکمت عطا فرمائی، اس سے پہلے آپ ﷺ اس سے دور تھے اور اس کے لیے تیار نہ تھے بلکہ آپ ﷺ کو تو اس کی امید بھی نہ تھی کہ آپ ﷺ کو ایسا چشمہ فیض اور منبع نور کبھی حاصل ہوگا۔

اس پر سورۃ النساء کی یہ آیات پڑھیے:

﴿وَ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمۡ تَكُنۡ تَعۡلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكَ عَظِيۡمًا ۝﴾ (النساء: ۱۱۳)

"اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تجھے وہ باتیں سکھائی جو تو نہ جانتا تھا اور اللہ کا تجھ پر بہت بڑا فضل ہے۔"

نیز سورۃ الشوریٰ کے آخری ارشاد ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِيۡ مَا الۡكِتٰبُ وَ لَا الۡاِيۡمَانُ﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

"اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے قرآن نازل کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔"

نیز سورۃ القصص میں فرمایا:

﴿وَ مَا كُنۡتَ تَرۡجُوۡۤا اَنۡ يُّلۡقٰۤى اِلَيۡكَ الۡكِتٰبُ اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ﴾ (القصص: ۸۶)

"اور تمہیں امید نہ تھی کہ تم پر کتاب اتاری جائے گی بلکہ تمہارے رب کی مہربانی ہوئی۔"

بلکہ حضور ﷺ کا حال یہ تھا کہ اس کے بعد وحی کے اس فیض کے انقطاع کا اندیشہ لگا رہتا تھا، چنانچہ سلسلۂ وحی منقطع رہا تو اس انقطاع پر آپ بڑے مغموم ہوئے اور اس کے اعادہ کے مشتاق ہوئے، آپ ﷺ کا حال یہ ہوگیا کہ پہاڑوں اور گھاٹیوں میں ایسے چلتے جیسے اسی وحی کی تلاش میں ہوں اور اس سلسلہ میں پہاڑ کی چوٹی سے ایک بار گرے بھی، بلکہ آپ ﷺ کو وحی کے بارے میں (شروع میں) اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں کوئی حصہ اس کا چھوٹ نہ جائے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس بارے مطمئن کر دیا (جیسا کہ دسویں وجہ میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے)، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ کو اس بات کا اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ نازل کردہ وحی کو آپ ﷺ کے دل سے نکال نہ لے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَ لَىِٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ۝ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ۝﴾ (الاسراء: ۸۶-۸۷)

"اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تیری طرف وحی کی ہے، اسے اٹھالیں پھر تجھے اس کے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی حمایتی نہ جلے مگر یہ صرف تیرے رب کی رحمت ہے۔ بے شک تجھ پر اس کی بڑی عنایت ہے۔"

اب آپ بتائیں کہ کوئی روئے زمین پر بسنے والا انصاف پسند انسان یہ خیال بھی کرسکتا ہے کہ قرآن، محمد (ﷺ) کا کلام ہے، جبکہ ہم نے آپ کے سامنے مذکورہ آیات بیان کی ہیں جو پیغمبر ﷺ کی وضع وانشاء کی نفی کرتی ہیں، بلکہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ کو تو بعثت سے قبل اپنے اس کتاب کے نزول کی بھی امید نہ تھی اور نہ ہی نزول کے بعد اس کے بقاء کی امید تھی!؟ نیز کیا یہ بات عقلاً درست تسلیم کی جاسکتی ہے کہ کوئی شخص اپنی ذہانت وصلاحیت کے بل بوتے پر ایک چیز ایجاد کرلے جو بہت قابل فخر بھی ہو اور معجزانہ شان بھی رکھتی ہو، پھر وہ ساری دنیا کو صراحت سے کہتا پھرے کہ یہ میرا فخر اور کارنامہ نہیں اور نہ میری خود ساختہ چیز ہے، میرے پاس تو ایسی کوئی چیز پیش کرنے کی صلاحیت بھی موجود نہیں ہے، تم مجھے جانتے ہو اور میری استعداد ولیاقت سے بھی واقف ہو؟

ظاہر ہے کہ ایسی بات عقل اور منطق کے خلاف ہے، عرف وعادت کے مخالف بھی ہے، اور علم نفسیات اور علم معاشرت کے بھی منافی ہے، کیونکہ انسانی نفوس عظیم اور بلند امور میں طبعاً رغبت رکھتے ہیں، انسان کی طبیعت وفطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ہر اس چیز کو پسند کرتا ہے جو اس کی رفعت شان اور دائمی شہرت کا سبب بنے، خصوصاً جب وہ چیز واقع میں اس سے صادر ہوئی ہو اور اس کی ایجاد کردہ ہو!

حال یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ذات ایسی سچی تھی کہ آپ ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا، آپ ﷺ لوگوں کو دعوتِ حق دینے والے تھے اور قرآن سے زیادہ عظیم اور دائمی شہرت والی کوئی چیز بھی نہ تھی جس کے ذریعہ اللہ نے امت کی شیرازہ بندی فرمائی اور اس کے ذریعہ بہترین امت کو قائم کیا اور اسی کی بدولت عظیم ریاست کی بنیاد رکھی تو اگر بالفرض یہ قرآن آنحضور ﷺ کا خود ساختہ کلام ہوتا تو پھر آپ ﷺ کے لیے یہ امر موزوں نہ تھا کہ آپ ﷺ اس لازوال عظمت سے بے رغبتی سے کام لیتے اور اس کلام کی اپنی طرف نسبت کی نفی کرتے، حالانکہ اس کے بالکل برخلاف حضور ﷺ لوگوں کو اس قرآن پر ایمان لانے اور اس کی تعلیمات کو تسلیم کرنے کی دعوت دیتے رہے۔

اب اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ حضور ﷺ نے قرآن کی نسبت اپنی طرف نہیں فرمائی حالانکہ آپ ﷺ صاحب قرآن تھے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ اگر آپ ﷺ وجاہت رفعت شان اور عظمت ومرتبت کے طالب ہوتے تو اس سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ اور بلند صورت نہیں ہوسکتی تھی کہ فرماتے کہ یہ قرآن ان کا کلام ہے؟

اور اگر لوگوں کی ہدایت کے طالب تھے تو لوگوں کے لیے یہ بات خوش کن ہوتی کہ وہ براہِ راست اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں جو اپنے کلام سے جن وانس کو عاجز کر دیتا ہے اور اپنے بیان سے ہر قبیلہ وخاندان کو چیلنج کرتا ہے اور اپنے برہان ودلیل سے ہر مدِمقابل اور متکبر کو مغلوب کر دیتا ہے۔

اور اگر بالفرض یہ قرآن، محمد ﷺ کی تالیف ہوتی تو حضور ﷺ نبوت کی بجائے اپنی الوہیت ثابت کرتے، کیونکہ قرآن ایسا کلام ہے جو خدا تعالیٰ کی ذات سے ہی صادر ہو سکتا ہے، جیسا کہ ہم نے اعجاز کی سابقہ وجوہات میں اس کی وضاحت کی ہے۔ بلکہ ایسی صورت میں الوہیت کا ثبوت آپ ﷺ کی دعوت کی کامیابی میں بڑا مؤثر ہوتا اور اس طرح آپ ﷺ کے مذہب کی ترویج واشاعت کی امید بھی زیادہ ہو جاتی، کیونکہ لوگ، الوہیت کی وجہ سے زیادہ مغلوب ہوا کرتے ہیں بہ نسبت نبوت کے، بجائے ایک پیغمبر ﷺ کے، جو بندگی کے مقام سے کبھی نہ نکلا ہے اور نہ کبھی نکلے گا۔ اور نہ ربوبیت کے مرتبہ پر کبھی فائز ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

العبد عبد وإن تعالى والمولى مولى و إن تنزل

یعنی بندہ بندہ ہی رہتا ہے خواہ کتنا بلند رتبہ ہو جائے اور آقا آقا ہی ہوتا ہے خواہ نیچے اُتر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کے دشمنوں کے لیے یہ بات زیادہ گراں بار تھی کہ وہ اپنے ہی طرح کے ایک آدمی کے تابع دار بن جائیں، انہیں اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ ان ہی طرح کے ایک انسان پر وحی کا نزول ہوا وہ اس بات کی فرمائش کرتے تھے کہ وہ اللہ کو اپنے روبرو دیکھنا چاہتے ہیں یا ان کی آنکھوں کے سامنے فرشتے اُترتے نظر آنے چاہیں!

اگر بالفرض محمد ﷺ خود صاحب تنزیل ہوتے تو مخلوق کے رتبے سے نکل کر الوہیت کے مقامِ بلند پر فائز ہو جاتے اور سارے عالم کو عظمت اور بلندی سے جھانکتے کہ تمام لوگ آپ کے پوری طرح تابع دار ہو جاتے اور معارضین کی ہر فرمائش کو آیات سے پورا کر دیتے، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے ایسے وقت میں بھی اپنی عبودیت کا اظہار اور اعتراف کیا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو معجزات اور خارقِ عادت امور عطا فرمائے تھے حضور ﷺ نے ان کی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی اور سورۃ اسراء میں یہ آیات پڑھیے:

﴿وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۙ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝﴾ (الاسراء: ۹۰-۹۳)

"اور کہا کہ ہم تمہیں ہرگز نہ مانیں گے یہاں تک کہ تو ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دے یا تیرے لیے کھجور، اور انگور کا کوئی باغ ہو پھر تو اس باغ میں بہت سی نہریں جاری کر دے یا جیسا تو خیال کرتا ہے ہم پر کوئی آسمان کا ٹکڑا گرا دے یا تو اللہ اور فرشتوں کو روبرو لے آیا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے کا بھی یقین نہیں کریں گے یہاں تک کہ تو ہمارے پاس ایسی کتاب لے آئے جسے ہم بھی پڑھ سکیں کہہ دو میرے رب پاک ہے میں تو فقط ایک بھیجا ہوا انسان ہوں۔"

چودھویں وجہ: قرآن کی اثر آفرینی

مطلب یہ ہے کہ قرآن اپنی اثر آفرینی میں اس درجہ پر فائز ہے کہ کوئی دوسری خدا اور بندوں کی کتاب عموماً اس مقام پر فائز نہیں ہے، اور ان سننِ الٰہیہ میں موجود تاثیر سے ماورا ہے جو کلام اور غیر کلام میں نفع بخش ہوتی ہے۔

اس امر کی توضیح یہ ہے کہ جو عمومی اصلاح اور عالمی انقلاب اس قرآن نے پورے عالم میں برپا کیا ہے وہ کبھی بھی قدیم اور جدید کسی دورِ تاریخ میں برپا نہیں ہوا کیونکہ اس کی بنیاد ایسے گہرے ایمان اور قوی وجدان پر قائم ہے کہ انسانی نفوس اور اس کے جذبات واحساسات پر اس کا ایسا حکم اور غلبہ پایا جاتا ہے کہ جو لوگوں کو اپنے پرانے طرز کے موروثی عقائد اور مالوف عبادات اور رگ وریشہ میں پیوستہ اخلاق وعادات سے روک دیتا ہے، اور جس نے ان کو اس نئے دین کو قبول کرنے پر آمادہ کردیا جس دین نے ان کی موروثی چیزوں کی عمارات کو منہدم کردیا اور ان کے مذہب کے موافق حالات سے لڑائی لڑی۔

یہ وہ اساس اور بنیاد ہے کہ عموماً ایسی تمام تعلیمی کتب اسے پیش کرنے سے قاصر ہوتی ہیں جنہیں اہل علم واصلاح تالیف کرتے ہیں اور تمام انسانی قوانین اسے وضع کرنے سے عاجز ہوتے ہیں جنہیں قائدین اور قانون ساز لوگ وضع کیا کرتے ہیں، اس لیے کہ ایسی کتب اور قوانین زیادہ سے زیادہ حقائق وفرائض کی تشریح کریں گی، کسی ایمان وایقان پر آمادہ نہیں کریں گی جو اس وحی ایمان پر عمل کا سبب بنتی ہوں۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ اچھی صلاحیت والے ان کتب پر ایمان لے آئیں تو ان کا ایمان اس وقت قوتِ تاثیر سے خالی ہوگا، لوگوں پر عموماً ان کی اثر اندازی نہیں ہوگی، ان کی کامیابی عام قسم کی ہوگی سوائے دو امور کے، ایک یہ کہ زمانہ بچپن سے ہی نوجوانوں کی علمی وعملی طور پر ان کتب کے مطابق تربیت ومشق کرائی جائے، اور دوسرا یہ کہ ایک حاکمانہ قوت ہو جو بڑوں کو اپنے قہر وطاقت سے ان کتب کے احترام پر آمادہ کرے۔ اب بچوں کی اس نہج پر مستقل تربیت کرنا بڑا ناممکن ہے، بلکہ ایسی تربیت تقلیدی ہوگی جس میں دلیل وبرہان موجود ہی نہ ہوگی، اسی طرح بڑوں کو جبر کرنا بھی بہت مشکل ہے کہ اسے مقام ایمان ویقین حاصل ہو۔

لیکن صرف قرآن کریم ایسی کتاب ہے جس نے چھوٹوں اور بڑوں سب میں ایمان کی روح پھونک دی اور انسانوں کو اپنی تعلیمات کے ذریعہ خاص شعور اور فہم عطا فرمایا، اور جس نے اپنی موروثی اور مقدس مانی ہوئی چیزوں سے دست برداری کی تعلیم دی۔ اور انسانوں کو علم وعمل سے اپنی اعلیٰ ہدایت سے آراستہ کیا جبکہ اس قرآن کو لانے والا ایک ایسا اُمّی شخص ہے جس کے پاس نہ حکومت وسلطنت ہے اور نہ مال ودولت اور نہ ہی لشکر وفوج، صرف یقین، رضامندی اور قناعت پسندی جیسی چیزیں موجود ہیں۔

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

"دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے، بے شک ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے۔"

باقی رہا اسلام میں تلوار اور جہاد کی مشروعیت! تو اس کا مقصد کسی دل میں عقیدہ کو زبردستی بٹھانا یا کسی فرد یا جماعت کو عبادت پر مجبور کرنا نہیں ہے، بلکہ تلوار اٹھانے والوں کے ظلم وستم کو دور کرنا اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ دعوتِ حق میں روڑے نہ اٹکائیں، اس کو مطلق آزاد رہنے دیں، تاکہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین خالص اللہ کے لیے ہوجائے۔

اس اساس اور بنیاد کو صرف قرآن نے وضع کیا ہے اور یہی اس کی ترقی کا راز ہے، آپ اس کے بارے میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ قرآن آتشِ انقلاب، نور ہدایت اور اپنی دعوت سے حیات عالم میں جاری وساری رہنے والی روح ہے، اس کا سبب اس کا وہ معجزانہ اسلوب ہے جس نے لوگوں کے نفوس وجذبات کو متاثر کیا اور انسانی قلوب واذہان پر اپنی سلطنت قائم کی، اس قرآن کو ایسی سلطنت حاصل ہے کہ اس کے دشمن نزول کے وقت سے آج تک اس کے رعب وجذبہ سے لرزاں وترساں ہیں، کسی فاتح اور تباہ کن

لشکروں سے اس قدر ڈرتے نہیں جتنا اس کی اثر افرینی اور اس کی کاروائی سے خوف زدہ ہیں، کیونکہ لشکروں اور گروہوں کی قوت انسانی جسم سے متجاوز نہیں ہوتی جبکہ اس کتاب کی سلطنت اور قوت انسان کے نفوس اور ارواح تک اثر انداز ہے، جس کی کوئی مثال کسی بھی میدانِ ترقی میں موجود نہیں ہے۔

قرآن حکیم نے وجوہِ اعجاز کی اس اہم وجہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اسے کبھی روح سے اور کبھی نور سے اور کبھی حیات سے تعبیر کیا ہے: اللہ تعالیٰ کے فرامین پڑھیے!

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (الشوریٰ:۵۲)

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ (المائدہ:۱۵)

﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾ (الانعام:۱۲۲)

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ (النحل:۶۷)

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾ (الانفال:۲۴)

جس حیرت انگیز تاثیر کا ذکر ہم کر رہے ہیں اس کا ادراک واحساس ہمیشہ سے ایسا شخص کرتا رہا ہے جو قرآن کی تلاوت غور و تدبر کے ساتھ اس کے عربی اسالیب کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے تمام ظروف واحوال سے واقف ہو کر کیا کرتا ہے۔ جو لوگ عربی لغت میں خاص مہارت رکھتے ہوں اور اس کے خاص ظروف واحوال سے پوری طرح واقف نہ ہوں ان کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ تاریخ سے پوچھیں کہ یہ کتاب کس قدر قوتِ تاثیر کی حامل ہے جس نے سارے عالم کی صورت ہی بدل ڈالی ہے۔ اور اپنے مخالفین کے دلوں پر پہلی بار ہی ایسی حاوی ہوئی ہے کہ ملکوں کی حدود سے متجاوز ہو گئی ہے، اس کا یہ غلبہ قہر وسحر کے کس قدر مشابہ ہے، کیا انصار اور کیا اعداء اور کیا حلیف اور کیا حریف (سب اس کی تاثیر سے مغلوب ہیں)، جس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنی فطرت سلیمہ کی وجہ سے اس کی بلاغت کی چاشنی لی اور اپنی قوت بیانی کی وجہ سے اس کا اعجاز محسوس کیا، چنانچہ اس کی آتش کی چنگاری، موسلا دار بارش کے نزول اور انوارات کے طلوع ہونے کی وجہ سے اس کتاب نے اپنا برقی اثر لوگوں کے دلوں میں ڈالا۔

دشمنوں پر اس کا اثر

اس کتاب کے دشمن یعنی مشرکین کے بارے میں بھی یہ بات ثابت ہے کہ اس کتاب نے اپنی قوت تاثیر سے ان کو بھی بہت سی صورتوں میں اپنی طرف کھینچا ہے، ہم بطور مثال چند صورتوں کا ذکر کرتے ہیں:

① اس کتاب کے دشمن اس سے نبرد آزما ہونے اور اس کی تعلیمات سے متنفر ہونے کے باوجود رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں نکلتے اور مسلمانوں کو اپنے گھروں میں اس کی تلاوت کرتے سنتے تھے۔ جس کا سبب محض یہ ہے کہ یہ قرآن ان کے دل ودماغ پر چھا چکا تھا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَ اَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ﴾ (المومنون:۷۰)

"بلکہ وہ ان کے پاس حق لے کر آیا اور ان میں اکثر لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں۔"

② مشرکین اور کفار کے سردار رسول اللہ ﷺ کو مسجد حرام، عرب کی مجالس اور بازاروں میں تلاوت قرآن سے روکنے کی خوب کوشش کیا کرتے تھے، نیز مسلمانوں کو اس کے اظہار سے منع کرتے تھے، یہاں تک کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو انہوں نے اپنے گھر کے صحن میں نماز ادا کرنے سے روک دیا تھا کیونکہ ان کے بچے اور عورتیں وہاں جمع ہو کر اس کلام سے لطف اندوز ہوتے تھے اور اس سے متاثر ہوتے اور جھوما کرتے تھے۔

③ مشرکین مکہ اس کے باوجود کہ مسلمانوں کو اس قرآن سے روکتے، ایمان لانے والوں پر ظلم ڈھاتے، پر اس کی تاثیر کی قوت اور دلوں پر اس کے نفوذ وتسلط سے بہت زیادہ گھبرائے ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دوسرے کو تاکید کی کہ اس قرآن کو مت سنو اور جب سنو تو اس میں شور وغل مچا دیا کرو، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴾ (فصلت: ۲۶)

"اور کفار نے کہا کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں شور مچاؤ شاید کہ تم غالب آ جاؤ۔"

④ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مشرکین مکہ کا کوئی جوان بہادر یا سردار جسے اس کا کفر اور سرکشی یا خاندانی بہادری اس پر آمادہ کرتی کہ وہ اپنے گھر سے تلوار سونتتے ہوئے، بدعہدی کا اظہار کرتے اور قرآن اور صاحب قرآن کی دعوت کا خاتمہ کرنے کی نیت سے باہر نکلے تو کچھ ہی دیر کے بعد کہ جب اس کو عنایت وکرم کا کوئی لمحہ اپنی آغوش میں لیتا یا قرآن کی کوئی سورت یا آیت اس کے کان میں پڑ جاتی تو وہ اسی وقت حق کے سامنے زیر ہو جاتا اور جھک جاتا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی کتاب پر ایمان لے آتا اور سرِ تسلیم خم کر دیتا!

اگر اس پر کوئی دلیل چاہتے ہو تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ دیکھ لیں جو بہت مشہور ہے یا پھر قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور ان کے بھتیجے اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے واقعہ اسلام پر غور کر لیں!۔

ہم ذیل میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت اُسید رضی اللہ عنہ کا واقعہ، اسلام اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جس سے بڑا فائدہ حاصل ہوگا:۔

کتبِ سیرت میں یہ واقعہ منقول ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے (ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران) ان اہلِ مدینہ کے ہمراہ جو آنحضور ﷺ کے پاس مکہ میں حاضر ہوئے تھے اور بیعتِ عقبہ کی تھی، دو جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہم روانہ فرمائے۔ تاکہ وہ ان کو اسلام کی تعلیمات بھی دیتے رہیں اور مدینہ میں جا کر اسلام کی نشر واشاعت کا کام بھی کریں، یعنی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ یہ دونوں صحابی اپنے مشن میں خوب کامیاب رہے۔ مدینہ میں انہوں نے ایسا فکری انقلاب یا تبلیغی تحریک برپا کر دی کہ قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بھی ہل کر رہ گئے، انہوں نے اپنے بھتیجے اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم ان دو آدمیوں کے پاس کیوں نہیں جاتے جنہوں نے ہمارے کمزور درجہ کے لوگوں کو بے وقوف بنا کر رکھ دیا ہے ان کے پاس جا کر ان کو ڈانٹ ڈپٹ کرو، ڈراؤ دھمکاؤ! چنانچہ جب اُسید ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس گئے اور جا کر کہا کہ تم ہمارے کمزور لوگوں کو کیوں بے وقوف

بنانے میں لگے ہو؟ اُسید رضی اللہ عنہ نے ان کو دھمکایا بھی! اور کہا کہ تم اپنے مقصد سے کنارہ کشی اختیار کرو! معصب رضی اللہ عنہ سے اللہ راضی ہو! انہوں نے ان کی دھمکی سے چشم پوشی کرتے ہوئے مومنانہ وقار وثبات میں جواب دیا کہ اگر آپ بیٹھ جائیں اور کچھ سن لیں؟ اگر تو آپ کو اچھا لگے تو قبول کر لیں اور اگر اچھا نہ لگے تو ہم آپ کو نہیں روکیں گے۔

پھر حضرت معصب رضی اللہ عنہ نے قرآن پڑھنا شروع کیا اور اُسید سنتے رہے، پھر وہ اپنی مجلس سے اٹھنے سے پہلے ہی مسلمان ہو گئے، اس کے بعد حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس جلدی سے پلٹے اور ان سے کہا کہ: واللہ! مجھے ان دو آدمیوں میں کوئی مضائقہ کی بات نظر نہیں آئی۔ اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور ہیجانی کیفیت میں خود ان کے پاس گئے، چنانچہ حضرت معصب رضی اللہ عنہ نے ان کا استقبال بھی اس طرح کیا جس طرح اُسید کا کیا تھا، آخر کار وہ بھی مسلمان ہو گئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ واپس گئے، اپنا قبیلہ جمع کیا اور ان سے کہا کہ: تم مجھے اپنے قبیلہ میں کیا شمار کرتے ہو! سب نے کہا کہ آپ ہمارے سردار اور ابن سردار ہیں! حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ! جب تک تم سب مسلمان نہیں ہو جاتے تمہارے مردوں اور عورتوں سے کلام کرنا میرے لیے حرام ہے، چنانچہ سب مسلمان ہو گئے!۔

دوستوں کے دلوں پر اس کا اثر

یہ تو قرآن کی تاثیر کی چند صورتیں تھیں جو دلوں پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ جب لوگ اس پر ایمان لے آئے، اُسے تسلیم کر لیا اور اس کے تابع دار اور اس سے محبت کرنے والے بن گئے تو پھر قرآن نے ان پر اپنا کیا اثر ڈالا؟

شاید کہ آپ نہیں بھولے ہونگے کہ قرآن نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت اُسید رضی اللہ عنہ پر اپنا کیا اثر چھوڑا، جن کا ہم نے آپ کے سامنے خاص طور سے ذکر کیا، کیا یہ حضرات اسلام کے بہترین سپاہی اور داعی نہیں بن گئے تھے اسلام قبول کرنے کے دن سے ہی بلکہ اسلام لانے کے وقت سے ہی؟

اس موقع پر اس نوع کی چار مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

① مسلمانوں کا نماز اور غیر نماز میں قرآن حفظ کرنے اور اس کی تلاوت کرنے میں ایک دوسرے سے مسابقت کرنا، حتیٰ کہ مسلمانوں کو یہ بات بہت پسند ہے کہ وہ سحری میں تہجد کے وقت اس قرآن کی خاطر اپنی پیاری نیند کو قربان کر دیں اور رب عزیز وغفار سے مناجات کریں، اور یہ صورتِ حال مسلمانوں میں نادر یا نایاب نہ تھی، بلکہ مروی ہے کہ اگر کوئی شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھروں کے پاس سے رات کے وقت گزرتا تو اسے قرآن پڑھنے کی ایسے آواز سنائی دیتی جیسے شہد کی مکھی بھنبھناتی ہے، ان کے درمیان اس بات میں باقاعدہ مقابلہ ہوتا کہ کون قرآن کی کتنی مقدار حفظ کرتا ہے! ان کی عورت اس بات کو پسند کرتی بلکہ اس پر رشک کیا کرتی کہ اس کے نکاح کا مہر قرآن کی کوئی سورت مقرر ہو جو اس کا شوہر اسے سکھا دے!۔

② صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اپنے تمام معاملات میں قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنا اور ہر اس چیز کو ترک کر دینا جو قرآن کی ہدایت اور تعلیمات کے خلاف یا منافی ہوتی۔ اور یہ چیز وہ اپنے دل کی خوشی سے کرتے۔ دل وجان سے اس پر راضی ہوتے۔ یہاں تک کہ قرآن نے ان کو اپنے ظرف میں ڈھال لیا تھا اور دنیا کے سامنے ایک سلیم العقیدہ مخلوق کی صورت میں پیش کر دیا جو اپنی عبادت، عادات واخلاق اور مقصد کے اعتبار سے بہت معزز، پاکیزہ اور بلندی کردار کے مالک تھے۔

③ مسلمانوں کو قرآن کی نشر واشاعت، اس کے دفاع اور اس سے راہ نمائی لینے کے لیے تیار کرنا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کو پورا کیا، کچھ تو ان میں وہ تھے جو اس قرآن کا دفاع کرتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے اور کچھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے اپنی جان اور مال قربان کرتے ہوئے موت کے منتظر رہے۔

معاملہ اس حد کو پہنچ گیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض نوجوانوں کو جو لڑائی میں جانے کے خواہش مند تھے کم عمری کی وجہ سے واپس بھیج دیتے، بہت سے معذور لوگ ایسے بھی ہوتے جن کو جہاد میں شرکت نہ کرنا اور گھروں میں بیٹھا رہنا تکلیف کا باعث ہوتا، حتیٰ کہ خود رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خاطر داری کے لیے رکنا پڑتا، اور لشکر کو منظم کر کے اور ضرورت کا زادِ راہ دے کر روانہ کر دیتے اور خود ان کے ہمراہ تشریف نہ لے جاتے!۔

امام مالک رحمہ اللہ اور شیخین رحمہما اللہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ مسلمانوں کو دشواری ہوگی تو میں کسی لشکر کے پیچھے کبھی نہ بیٹھا رہتا جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے روانہ ہوتا لیکن میں ان کو سواری دینے کی کبھی وسعت نہیں پاتا اور وہ بھی اس کی وسعت نہیں پاتے اور ان پر یہ بات باعث مشقت ہوتی ہے کہ مجھے چھوڑ کر پیچھے بیٹھیں رہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! میں اس کی خواہش رکھتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور شہید ہو جاؤں، پھر جہاد کروں اور شہید ہو جاؤں، پھر جہاد کروں اور شہید ہو جاؤں۔"①

④ قرآن کریم نے ہدایت عالم کے لیے جو زبردست کامیابی حاصل کی وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل دیگر انبیاء کرام علیہم السلام، مصلحین، علماء، صلحاء، فلاسفہ، علماء اخلاق، حکام اور خود مختار طبقہ میں موجود تھی لیکن کسی کو اس طرح کا عروج میسر نہ ہوا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عقائد و اخلاق، عبادات و معاملات، سیاسیات اور دیگر تمام اصلاح انسانی کے اطراف اور گوشوں میں میسر آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا۔

پھر یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہزار لوگوں کے لیے بھی ممکن نہ تھا کہ اس طرح کا بہترین دستور خود پیش کر سکیں جس نے بیس سال سے بھی کم عرصہ میں امت عربیہ کو موت کے بعد زندگی بخشی، پھر ان میں روح پھونکی گئی جس کی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی وہ سارے عالم کو گمراہی سے بچانے لگے اور قیصر و کسریٰ کی سلطنت کو بھی اپنے زیر فرمان کر لیا، اور ایک پاؤں مشرق میں اور ایک مغرب میں رکھا اور ایک صدی بلکہ نصف صدی سے بھی کم عرصہ میں آدھی دنیا پر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ کیا یہ کوئی سحر و جادو تھا؟ یا کوئی عقلی برہان جسے انصاف پسند لوگوں نے علماء و محققین سے اخذ کیا تھا، اس طرح کی ممتاز اور زبردست کامیابی کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہونا ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب العالمین کی طرف سے رسولِ برحق ہونے کی کافی دلیل ہے!۔

فرانس کا ایک فلسفی اپنی ایک کتاب میں ذکر کرتا ہے کہ: عیسائیت کے مبلغین جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کی طرح اپنی نبوت کی صداقت پر کوئی دلیل یا نشانی پیش نہیں کی، وہ فلسفی اس دعویٰ کی تردید کرتے کہتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بڑے خشوع وخضوع سے قرآن کی تلاوت کرتے تھے، جس کے پڑھنے کا اثر یہ پڑتا کہ لوگ ایمان کی طرف کھنچے چلے

① مؤطا مالک، الجهاد(٤٠)، صحيح البخاری، الجهاد(٧٠)، صحيح مسلم، الامارة(١٠٣)

آتے، یہ بات سابقہ انبیاء کی تمام نشانیوں اور معجزات میں موجود نہ تھی!۔

جی ہاں! اس فلسفی نے بالکل بجا کہا! یقیناً قرآن پاک کا اہلِ عرب کے دلوں پر جو اثر ہوتا تھا وہ تمام انبیائے کرام کے معجزات کی تاثیر کے مقابلہ میں زیادہ تھا۔

اگر آپ کو اس بات کا سادہ سا موازنہ کرنا ہو تو موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس بڑے زبردست معجزات لائے تھے، ایک ان میں عصا بھی تھا جسے وہ زمین پر ڈالتے تو وہ کھلم کھلا اژدھا کی شکل اختیار کر لیتا، اور دوسرا ید بیضاء تھا جسے وہ ظاہر کرتے تو وہ دیکھنے والوں کو روشن دکھائی دیتا، اسی طرح دریا کا دولخت ہونا، پھر اس دریا کا خشک راستہ کی شکل اختیار کر لینا، جس پر بنی اسرائیل اطمینان اور سکون کے ساتھ چلتے ہوئے نجات پا گئے۔

علاوہ ازیں بہت سے دیگر معجزات ہیں جو مصر اور طور سینا میں وادی تیہ میں ایک عرصہ تک رونما ہوئے۔

لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ ان ہدایات نے ان کو اللہ پر ایمان، اللہ کی وحدانیت، دین میں اخلاص اور نصرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں کس قدر متاثر کیا، بلکہ ایک بہت بڑا! خدائی معجزہ دیکھ کر اس دریا سے ابھی باہر نہیں نکلے تھے کہ اپنی آنکھوں سے بت پرستوں کو دیکھتے ہی وہ بات کہنے لگے جسے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں نقل فرماتے ہیں:

﴿وَ جٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۳۸-۱۴۰)

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اُتارا تو ایک ایسی قوم پر پہنچے جو اپنے بتوں کے پوجنے میں لگے ہوتے تھے کہا اے موسیٰ ہمیں بھی ایک ایسا معبود بنادے جیسے ان کے معبود ہیں فرمایا بے شک تم لوگ جاہل ہو یہ لوگ جس چیز میں لگے ہوئے ہیں وہ تباہ ہونے والی ہے اور جو وہ کر رہے ہیں وہ غلط ہے کہا کیا اللہ کے سوا تمہارے لیے اور معبود بنادوں حالانکہ اس نے تمہیں سارے جہاں پر فضیلت دی ہے۔"

پھر جب موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے مناجات کے لیے گئے تھے اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنایا تھا تو بنی اسرائیل کے لوگ اللہ تعالیٰ کو بھول گئے اور انہیں اس بت پرستی اور بیہودہ کاموں کا اشتیاق ہونے لگا جو ان کے دلوں میں موجزن تھا۔

چنانچہ انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی، جیسا کہ سورۃ الاعراف ہی میں اس کا ذکر موجود ہے:

﴿وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ یَرَوْا اَنَّهٗ لَا یُكَلِّمُهُمْ وَ لَا یَهْدِیْهِمْ سَبِیْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ۝ وَ لَمَّا سُقِطَ فِیْۤ اَیْدِیْهِمْ وَ رَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ یَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَ یَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝﴾ (الاعراف: ۱۴۸-۱۴۹)

"اور موسیٰ کی قوم نے اس کے بعد اپنے زیوروں سے بچھڑا بنالیا ایک جسم تھا جس میں گائے کی آواز تھی کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ ان سے بات بھی نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں راہ بتاتا ہے اسے معبود بنالیا اور وہ ظالم تھے اور جب نادم ہوئے اور

معلوم کیا کہ بے شک وہ گمراہ ہو گئے تھے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو بے شک ہم نقصان پانے والوں سے ہوں گے۔"

نیز جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جبارین سے جہاد کرنے اور اس ارض مقدسہ میں داخل ہونے کا کہا جو اللہ نے ان کے مقدر میں لکھ دی تھی تو اس حکم کی بھی خلاف ورزی کر دی، اس سے انکاری ہو گئے اور میدانِ جہاد میں اُترنے اور جابر لوگوں سے لڑنے کی بجائے گھر میں بیٹھے رہنے اور ڈھیلے پن کو ترجیح دی۔

- اس کے بارے میں سورۃ المائدہ کی آیات پڑھیے:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۲۲-۲۴)

"انہوں نے کہا اے موسیٰ بے شک وہاں ایک زبردست قوم ہے اور ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے یہاں تک کہ وہ وہاں سے نکل جائیں پھر اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہوں گے اللہ سے ڈرنے والوں میں سے دو مردوں نے کہا جن پر اللہ کا فضل تھا کہ ان پر حملہ کر کے دروازہ میں گھس جاؤ پھر جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو گے اور اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم ایمان دار ہو کہا اے موسیٰ ہم کبھی بھی وہاں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اس میں ہیں سو تو اور تیرا رب جائے اور تم دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔"

اب غور کریں کہ یہ تھے اصحاب موسیٰ علیہ السلام اور دوسری طرف اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو قرآن سے اس قدر متاثر ہوئے کہ تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے شجرہ رضوان کاٹ دیا تھا، حالانکہ وہ ایک مبارک اور تاریخی درخت تھا جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے، جس کا سبب صرف یہ تھا کہ لوگ اس درخت کو متبرک سمجھنے لگے تھے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اندیشہ ہوا کہ اگر لوگ ایک طویل زمانہ تک اسی طرح کرتے رہے تو ڈر ہے کہ بت پرستی یا اس درخت کی پرستش شروع کر دیں، چنانچہ آپ نے اس درخت کے کاٹنے کا حکم دیا اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر اتفاق کیا۔

اسی طرح تاریخ بتاتی ہے کہ جب غزوۂ بدر کے موقع پر مشرکین کے قتال کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا تو انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس سمندر (بحرِ احمر) کے پاس لے چلیں اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھسیں گے تو ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اس میں گھس جائیں گے تو ہم میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہے گا، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ویسا نہیں کہیں گے جیسا قوم موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کو کہا تھا کہ:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۲۴)

بلکہ ہم یوں کہیں گے کہ آپ اور آپ کے رب جا کر لڑیں ہم بھی دونوں کے ساتھ لڑیں گے۔

ان اصحابِ کرام رضی اللہ عنہم کا جہاد کے میدانوں میں بھی یہی حال تھا کہ وہ موت کو گلے لگانا پسند کرتے تھے اور حصولِ شہادت کی طمع میں جہاد پر قربان ہو جاتے تھے، وہ ایسے موقعوں پر موت کے خواہش مند تھے تو اللہ نے ان کو حیات بخشی انہیں موت کی کاریگری کا پختہ یقین تھا اس لیے بہت سے بادشاہ اور زرہ پوش جنگجو ان کے ماتحت ہو گئے تھے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ۝﴾ (العنکبوت:٦)

"اور جو شخص کوشش کرتا ہے تو اپنے ہی بھلے کے لیے کرتا ہے بے شک اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے۔"

نیز فرمایا:

﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝﴾ (الحج:٤٠)

"اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا بے شک اللہ زبردست غالب ہے۔"

اعجاز کی وجوہ ضعیفہ

بعض اہلِ علم نے اعجازِ قرآن کی بعض دیگر وجوہات بھی ذکر کی ہیں، لیکن ہمارے خیال میں وہ وجوہات ضعیف ہیں، اعتراض سے محفوظ نہیں ہیں، کیونکہ ان میں سے بعض وجوہات ایسی ہیں جو ایک دوسرے میں ہی شامل ہیں، اور کچھ وجوہ ایسی ہیں جو وجوہِ اعجاز میں سے بالکل نہیں ہیں۔

ہم علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ ایسی دس وجوہ کو مثال میں بیان کرتے ہیں:

① قرآن حکیم کا نظمِ بدیع جو دیگر تمام قسم کے نظم سے بالکل جداگانہ ہے۔

② قرآن مجید کا اسلوبِ عجیب جو تمام دیگر اسالیب سے مختلف ہے۔

③ اس کی وہ فصاحت جس کا لانا کسی مخلوق کے بس میں نہیں۔

④ عربی الفاظ کا اس طرح سے استعمال جو کسی دوسرے کے بس میں نہیں۔

⑤ وعدوں کا ایفاء اس طرح سے کرنا جیسے حواس اور آنکھوں سے اس کا ادراک ہو رہا ہو، جیسے مومنوں سے نصرت وغیرہ کا وعدہ کرنا۔

⑥ ان پیش آمدہ غیبی امور کی خبر دینا جن سے آگاہی وحی کے بغیر ممکن نہیں۔

⑦ قرآن کریم کا ایسے بہت سے علوم پر مشتمل ہونا جن پر لوگوں کی بنیاد قائم ہے۔

⑧ قرآن حکیم کا بلیغ حکمتوں پر مشتمل ہونا۔

⑨ قرآن مجید کے معانی و مفاہیم میں اختلاف اور تضاد کا موجود نہ ہونا۔

⑩ قرآن پاک کا روزِ اوّل سے نزولِ قرآن تک کے امور کی خبر دینا اور پھر ایسے شخص سے ان امور کا خلافِ عادت صادر ہونا جو نہ کوئی کتاب پڑھا ہو اور نہ اس نے کسی سے کچھ سکھا ہو اور نہ ہی تعلیم کے لیے سفر کر کے اہلِ کتاب کی صحبت اٹھائی ہو!

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کا اسلوب عجیب اس کی اس فصاحت میں آ جاتا ہے جو کسی مخلوق کی قدرت اور طاقت سے باہر ہے، نیز عربی الفاظ کے اس طرح سے استعمال کو بھی شامل ہے جو کسی اور عربی کے اختیار میں نہیں ہے، اسی طرح غور کرنے

سے پتہ چلتا ہے کہ وعدوں کا ایفاء جو حواس وعیون سے مدرک ہوتے ہیں جیسے مسلمانوں سے نصرت وغیرہ کا وعدہ تو یہ قرآن کے ذکر کروہ اخبارِ غیب کے تحت آ جاتے ہیں، اسی طرح روزِ اوّل سے نزول تک کے واقعات اور امور بھی ان غیبی خبروں کے ضمن میں آ جا تے ہیں۔ نیز غور کرنے معلوم ہوگا کہ قرآنِ حکیم کا حکمتِ بالغہ پر مشتمل ہونا اور اس کے معانی میں عدم تضاد واختلاف، ان میں سے کوئی بھی وجوہِ اعجاز میں شامل نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں بھی حدودِ طاقت سے باہر نہیں ہیں، بلکہ ہم بسا اوقات لوگوں کے کلام کو حکمتوں پر مشتمل بھی پاتے ہیں اور تضاد واختلاف سے محفوظ بھی دیکھتے ہیں۔

بعض لوگ قرآن کے اعجاز کی وجہ صرف اس کی فصاحت بتاتے ہیں، یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ محض فصاحت ہو اور مقتضائے حال کی رعایت نہ ہو تو اس سے کلام قدرتِ بشریہ سے خارج نہیں ہوتا، کیونکہ انسانی کلام اکثر وبیشتر فصیح ہوتا ہے لیکن ان خصوصیات اور اصل مراد پر زائد ان نکات پر مشتمل نہیں ہوتا جو کمتر درجہ کے اعتبار سے بلاغت کا مدار ہے اس کا معجز ہونا تو دُور کی بات ہے۔

قول بالصرفہ کا شبہ

بعض اہلِ علم نے وجہ اعجازِ قرآن میں اس قول بالصرفہ کو اختیار کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرب کو قرآن کے معارضہ سے پھیر دیا تھا کہ ان کے طاقتِ بشری کے معیار سے ہی باہر تھا۔ اس کے لیے وہ ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ: انسان بسا اوقات ایک عمل جو اس کے افعال اختیاری کی جنس سے ہوتا ہے، چھوڑ دیتا ہے، حالانکہ وہ عمل اس کے کسب وقدرت کے دائرے میں آتا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہوتی ہے کہ اس عمل کے اسباب اسے میسر ہی نہیں ہوتے یا پھر کسل مندی یا کوئی مانع پیش آ جاتا ہے جس کی وجہ سے ہمت ہار جاتا ہے یا کوئی ناگہانی امر پیش آ جاتا ہے جس سے اس کے وسائل اور ذرائع معطل ہو کر اس کی قدرت واختیار میں زبردستی حائل ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس کی ہمت وعزم اور ارادہ پوری طرح موجزن ہوتا ہے۔

چنانچہ اسی طرح اہلِ عرب کا معاملہ ہے کہ اُنہیں معارضہ قرآن سے پھیر دیا گیا تھا، اس کا منشا یہ نہیں تھا کہ قرآن بلاغت میں اس حدِ اعجاز پر فائز تھا کہ عادۃً قدرتِ بشریہ کی اس تک رسائی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا منشا اور سبب درج ذیل تین وجوہ میں سے ایک تھا:۔

① معارضہ کے اسباب اور دواعی اُنہیں میسر تھے۔

② صارفِ الٰہی نے اُنہیں معارضہ سے بے رغبت کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کا اس پر ارادہ ہی نہیں ہوا، ان کے عزائم اس کے لیے برانگیختہ نہیں ہوئے چنانچہ وہ کسلمندی کا شکار ہو کر اسباب ودواعی موجود ہونے کے باوجود بیٹھے رہے۔

③ پیش آمدہ عارض نے ان کی قوت بیانی کو معطل کر دیا تھا اور ان کی قدرتِ بلاغیہ سے وہ عارض مانع ہو گیا تھا اور معارضہ کے اسبابِ عادی ان سے سلب کر دیئے تھے باوجودیکہ اس معارضہ کا ارادہ اور عزم وہمت ان میں وابستہ رہی تھی۔

قول بالصرفہ کی مذکورہ توجیہ کی نسبت اہل سنت میں سے ابو اسحاق اسفرائینی، معتزلہ میں سے نظام اور شیعہ میں سے مرتضی کی طرف کی جاتی ہے۔

اگر آپ ان تین مفروضات میں غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے زعم کے مطابق اہل عرب کا قرآن سے

معارضہ نہ کرسکنا قرآن کے بلاغی اعجاز کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ پہلے دو مفروضوں کی بناء پر تھا، یعنی اس معارضہ سے عرب کی بے توجہی اس کا سبب تھا، اگر وہ اس معارضہ کی کوشش کرتے تو ضرور اس کو حاصل کر لیتے، اور آخری مفروضہ کی بناء پر عدمِ معارضہ کا سبب ان کا اس معارضہ سے عاجز آنا ہے لیکن ایک ایسے سبب کی بناء پر جو قرآن سے خارج ہے اور وہ ایک ایسے مانع کا وجود ہے، جس نے ان کو معارضہ سے قہراً روک دیا تھا۔ اور اس مانع سے مراد اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کی معارضین کے معارضہ اور مبطلین کے ابطال سے حفاظت وحمایت کرنا ہے، اگر یہ مانع زائل ہو جائے تو لوگ اس طرح کا کلام لے آئیں، اس لیے کہ یہ چیز ان کی نظم و بلاغت کے معیار سے بلند نہیں ہے۔

قولِ ہذا کی تغلیط

مذکورہ قول بالصرفہ اپنے تمام تر مفروضات اور خود ساختہ شبہات کے ساتھ بحث وتحقیق کے میدان میں پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا اور حقیقت وواقع کے بالکل برخلاف ہے:۔

اس کی پہلی وجہ جو بیان کی گئی ہے وہ تاریخی ریکارڈ کے خلاف ہے، کیونکہ یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ معارضہ کے دواعی اور اسباب وافر میسر تھے، اس کے محرکات بہت اعلیٰ درجہ کے اور مسحور کن تھے، جس پر بہت سے دلائل قائم ہیں:

① قرآن نے کئی بار انہیں چیلنج کیا کہ اس جیسا قرآن لے آؤ، بلکہ اس طرح کی مختصر ترین سورت ہی پیش کر دو، پھر قرآن نے ان مُہر عجز لگاتے ہوئے پُراعتماد زبان میں کہا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے بلکہ آئندہ بھی ایسا ہرگز نہ کر سکیں گے خواہ ان کی مدد میں تمام جن وانس اکٹھے ہو جائیں: اس کے بعد بھی ان کی آتشِ غیرت اس کا معارضہ کرنے کے لیے کیسے نہیں بھڑکی! چاہے وہ اللہ کی بزدل ترین مخلوق کیوں نہ ہوں؟

② قرآن نے جن اہل عرب کو چیلنج کیا تھا وہ تو حمیت وغیرت اور خودداری وغیرہ میں ضرب المثل تھے تو اس تحدی اور اشتعال انگیزی نے انہیں کیونکر نہیں جھنجوڑا؟

③ اہل عرب کی قوتِ بیانی اور بحث وکلام کے میدانوں میں ایک دوسرے سے مسابقہ کی عادت نے اُنہیں اس میدانِ مسابقت میں کیونکر نہیں پہنچایا؟

④ قرآن نے ان کے غیظ وغضب کو بھڑکایا، اور ان کے آباء واجداد کو بے عقل کہا اور ان کے جمود، جہالت اور شرک کا ماتم کیا تو وہ کیونکر اس طعن وتشنیع کے بعد بھی چپ سادھ کر بیٹھے رہے؟

⑤ قرآن نے ان کی عزیز ترین چیز پر کھلی جنگ چھیڑ دی یعنی ان کے وہ عقائد جن میں وہ مبتلا تھے اور ان کی وہ عادات جو ان میں راسخ ہو چکی تھیں تو ایسی صورت میں اس سے بڑھ کون سی چیز ان کے جذبات کو مشتعل کر سکتی تھی اور ان کے عزائم کو متحرک کر کے میدان مقابلہ میں لا سکتی تھی؟

معلوم ہوا کہ اگر ان میں معارضہ کی طاقت ہوتی تو وہ مدمقابل کو جواب دینے کے لیے یہی راستہ اختیار کرتے کہ میدانِ مبارزت سجاتے۔

نیز دوسری وجہ بھی تاریخی حقائق کے خلاف ہے، اور اس کی دلیل بھی ایسی متواتر خبریں اور واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اہل عرب کو معارضہ قرآن کے لیے اسباب میسر تھے اور ان کے عزائم اس مقصد کے حصول کے لیے سرگرم تھے، وہ تو مختلف ذرائع

سے اس قرآنی دعوت کے خاتمہ کے لیے کوشاں رہتے تھے، اس مقصد کے لیے انہوں نے کوئی طریقہ اور کوئی ذریعہ نہیں چھوڑا جو انہوں نے اختیار نہ کیا ہو۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کو اور آپ ﷺ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو طرح طرح کی اذیتیں دیں، برا بھلا کہا، تکلیفیں بھی دیں اور جان سے بھی مارا، جو کچھ ہو سکتا تھا وہ کیا۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے چچا ابو طالب سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بھتیجے کو اس دعوت سے روکیں ورنہ ہم ان سے بھی اور آپ سے بھی مقابلہ کریں گے۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ کا، آپ ﷺ کے معزز خاندان کا ایسا بائیکاٹ کیا کہ انہوں نے خرید و فروخت کرنا، شادی بیاہ کرنا بھی چھوڑ دیا، معاملہ اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ یہ معزز گھرانہ درخت کے پتے کھانے پر مجبور ہو گیا!۔

نیز اس بائیکاٹ کے دوران انہوں نے حضور ﷺ سے کئی مذاکرات بھی کیے اور کئی ایسی اشتیاق انگیز پیش کشیں بھی کیں جن سے لوہا بھی نرم پڑ جائے، مثلاً یہ کہ وہ حضور ﷺ کو اتنا مال دیں گے کہ آپ ﷺ سب سے بڑے مال دار انسان ہو جائیں گے، یا سرداری کا جھنڈا ان کو تھما دیں گے کہ سب ان کے زیر فرمان ہو جائیں گے، اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ہم تاج شاہی پہنا دیتے ہیں، اور اگر کسی وجہ سے کوئی آسیب وغیرہ چمٹ گیا ہے تو اس کا علاج کروا دیتے ہیں، یہ سب کچھ اس خاطر تھا کہ حضور ﷺ جو دین لے کر آئے ہیں اس سے دست بردار ہو جائیں۔ لیکن جب آنحضرت ﷺ نے ان پیش کشوں کو قبول نہ کیا تو پھر انہوں نے یہ تجویز رکھی کہ مصالحت کر لیتے ہیں اور مداہنت سے کام لیتے ہوئے ایک سال کے لیے ہم آپ کے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور ایک سال کے لیے تم ہمارے معبود کی عبادت کرو گے۔ آپ ﷺ نے اس کا بھی انکار کر دیا، اور اس پر یہ آیت بھی اتری:

﴿قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ﴾ (الزمر: ۶۴)

"آپ کہہ دیجیے کہ اے جاہلو کیا تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کرنے کا کہتے ہو۔"

اسی طرح اس پر سورۃ الکافرون بھی نازل ہوئی۔

ان لوگون نے حضور ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو عبادت سے بھی روکنے کی کوشش کی، ایک بدبخت نے تو اٹھ کر حضور ﷺ کی پشت مبارک پر نجاست ڈال دی، جب حضور ﷺ نماز ادا کر رہے تھے، ایک سرکش نے تو گلہ گھوٹنے کی بھی کوشش کی، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر آ کر آپ ﷺ کو چھڑایا اور یہ آیت پڑھی:

﴿اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۭ﴾ (غافر: ۲۸)

"کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس روشن دلائل لے کر آیا ہے، اور اگر وہ جھوٹا ہو تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا۔"

ان دشمنوں نے حضور ﷺ پر کبھی ساحر، کبھی شاعر، کبھی دیوانے اور کبھی کاہن ہونے کی تہمت لگائی! وہ لوگ حضور ﷺ کا تعاقب کرتے، آپ ﷺ ایام حج میں عرب کے قبائل کے سامنے خود کو پیش کرتے تو وہ توگ انجان لوگوں کے سامنے حضور ﷺ پر بہتان والزام لگاتے اور تکذیب کرتے!

جب آپ ﷺ کے پیروکاروں پر زمین تنگ ہونے لگی تو وہ اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے، اپنے دین کو بچانے

کی خاطر اپنے گھر بار اور مال وجائیداد کو قربان کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کی ان دشمنوں کی چال بازیوں سے حفاظت نہ کرتے اور ہجرت کا حکم نہ دیتے تو وہ لوگ تو حضور ﷺ کے خلاف قتل کی، قید کرنے کی اور گھر سے نکالنے کی سازشیں کر چکے تھے۔

بلکہ ہجرت کے بعد بھی انہوں نے اذیت رسانی کا سلسلہ جاری رکھا، چنانچہ حضور ﷺ کے اور ان کے درمیان پچھتر لڑائیاں ہوئیں، جن میں ستائیس غزوات اور اڑتالیس سرایا ہیں۔

کیا ان تمام حقائق کے بعد بھی کوئی ہوش مند انسان یہ کہنا پسند کرے گا کہ: اہل عرب کو معارضۂ قرآن اور معارضہ صاحب قرآن سے پھیر دیا گیا تھا؟ اور وہ اس بارے عاجز اور کسلمند بنا دیے گئے تھے، میدانِ مبارزت میں اُترنے سے بے رغبت ہو چکے تھے؟! نیز کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ لوگ قرآن سے بے غرض تھے اور اسے قابلِ توجہ چیز نہ سمجھتے تھے؟!

اگر قرآن کے معاملہ نے انہیں جھنجوڑا بھی نہیں تھا اور ان کی توجہ اپنی طرف مبذول بھی نہیں کرائی تھی تو یہ سارے مقابلے، الزامات اور تہمتیں کس وجہ سے تھیں؟!

جبکہ ان کا مد مقابل، جن کو وہ اپنا مد مقابل خیال کرتے تھے، اس نے تو ان کے لیے مسافت کم کر دی تھی اور ان کو بتایا تھا کہ اسے لاجواب کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ جو قرآن لائے ہیں اس جیسی ایک مختصر ترین سورت ہی پیش کر دیں۔

کیا یہ اس بات کی مادی دلیل نہیں کہ ان کا معارضہ قرآن نہ کر سکنے کا سبب یہی تھا کہ وہ شعوری طور پر اس معارضہ سے عاجز تھے اور قرآن کے اعجاز کو تسلیم کر چکے تھے۔ ورنہ انہوں نے مقابلہ کو مکالمہ پر اور تلواروں سے باہمی لڑائی کو گفتگو کے ذریعہ معارضہ کرنے پر ترجیح اور فوقیت کیوں دی؟

ایک ناسمجھ انسان یہ سمجھتا ہے کہ ان کی اس خصومت میں جوش وغیرت کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ قرآن کی قوت فصاحت یا اس کے اعجاز کا شعور اور فہم رکھتے تھے بلکہ اس کی وجہ سے محمد (ﷺ) اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم سے بغض وعناد تھا! لیکن یہ خیال بے بنیاد ہے، تاریخی حقائق اس کو جھٹلاتے ہیں، کیونکہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ نزولِ قرآن سے پہلے حضور ﷺ کے اور ان کے درمیان کوئی عداوت موجود نہ تھی بلکہ سب ایک ہی قوم اور قبیلہ کے لوگ تھے۔ رسول اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے دیگر ساتھی اپنے عمدہ اخلاق اور قریبی رشتہ داری کی وجہ سے ان کی نظر میں بڑے محبوب تھے۔

کبھی کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ حضور ﷺ اور ان کے پیروکاروں سے ان کی خصومت اور لڑائی کا منشا محض دینی مخالفت تھی، قرآن کریم کا اعجاز سے اس کا تعلق نہیں تھا یہ خیال بھی بدو وجہ غلط ہے:

① جزیرۂ عرب میں مشرکین کے درمیان یہود بھی آباد تھے، اور اہل کتاب کی ان سے دینی مخالفت موجود تھی، لیکن اس کے باوجود ان مشرکین اور یہود کے درمیان وہ آتش حرب نہیں بھڑکی جو ان مشرکین اور حضور ﷺ کے درمیان بھڑکی۔

② عرب کے اندر ایسے بڑے بڑے خطباء اور شعراء موجود تھے، جو ان کے دین سے الگ تھلگ تھے جیسے امیہ بن الصلت، قس بن ساعدہ وغیرہ، لیکن اس چیز نے ان کے جذبات کو نہ بھڑکایا اور نہ یہ چیز ان کے مابین لڑائی کا سبب بنی۔ بلکہ وہ ان کے آبائی دین کی مخالفت کے باوجود خاموش رہے، مستزاد یہ کہ ان شعراء اور خطباء نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور تقدیس وتمجید میں بڑے اشعار اور کلام پیش کیے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے قرآن مجید میں جو قوت تاثیر پائی تھی اس طرح کی تاثیر انہیں کسی کلام منثور یا

منظوم میں نظر نہیں آئی۔

کیونکہ یہ کتاب اوپر سے آئی تھی اس کی شان نرالی تھی۔ ان خطباء کو اس میں ایک خدائی نشان نظر آیا جس نے اس کو ایسا روح اللہ بنا دیا کہ جو بھی اس کی آواز سنتا ہے ہل کر رہ جاتا ہے اور جو بھی اس کی برق ریزی کو دیکھتا ہے جھوم جاتا ہے۔ اور اس کی تاثیر روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے، لوگوں میں اپنا اثر دکھا رہی ہے، اس میں کوئی توقف نہیں ہوتا۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا کوئی شخص مجھے اپنی قوم کے پاس لے جانے والا نہیں، کیونکہ قریش نے مجھے اس بات سے روک دیا ہے کہ میں ان تک اپنے رب کا کلام پہنچاؤں۔"①

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جملہ "میں اپنے رب کے کلام کو پہنچاؤں" میں غور کیجیے! یہ نہیں فرمایا کہ: انہوں نے مجھے اس بات سے روک دیا ہے کہ میں اپنے رب کے کلام کی تلاوت کروں یا اس پر عمل کروں!۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی دعوت واشاعت کے بغیر صرف تلاوت اور عمل قریش کے لیے اس قدر متاثر کن نہ تھا، ان کی نیندیں جس چیز نے حرام کر رکھی تھیں یا ان کے دلوں میں جو چیز کھٹکتی تھی وہ یہی تھی کہ اب یہ نور پھیلے گا جو لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے ہی والا ہے، انہیں اس کتاب کا اعلان واظہار بے چین کیے ہوئے تھا جس نے لوگوں کے قلوب وافکار کو اپنی طرف کھینچ رکھا تھا۔

قرآن کی تاثیر اور دلوں کو فتح اور زیر کرنے کے بارے میں ہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت اسید رضی اللہ عنہ کے واقعۂ اسلام میں کچھ روشنی ڈالی ہے۔

نیز اس کی تیسری وجہ بھی معروف بات کے متعارض ہے، کیونکہ جب اہل عرب کو قرآن کا مخاطب بنایا گیا تو وہ اپنی فطری عاجزی اور اس کے اعجاز کو تسلیم کرتے ہوئے اس کا معارضہ کرنے سے دست بردار ہو گئے، اگر ان کی عاجزی کسی ایسے عارض کی بناء پر تھی جس نے ان کی قوت بیانی کو معطل کر دیا تھا تو ان سے ضرور یہ منقول ہوتا کہ انہوں نے ان قوی محرکات اسباب کے مطابق اس کے معارضہ کی کوشش کی تھی لیکن انہیں اس سے روک دیا گیا جس کا انہیں گمان نہ تھا۔ نیز یہ امران کے لیے تعجب انگیز بھی ہوتا ہے اور وہ لوگوں میں اس بات کا اعلان کرتے تا کہ لوگ ان کو اس معاملہ میں معذور خیال کرتے اور قرآن کی ذاتی شان گھٹاتے اور اپنے قدیم کلام کی طرف رجوع کر کے قرآن سے اس کا موازنہ کرتے اور اس طرح قرآن کے مقام واعجاز کی شان کو کم کرتے، نیز نزول قرآن کے بعد فصاحت وبلاغت میں کم درجہ ہوتے نزول قرآن سے قبل کی بہ نسبت۔ بلکہ ہمارے لیے اور ہر دور کے ادب عربی کے اہل علم کے لیے بھی یہ ممکن ہوتا کہ وہ اعجاز قرآن کے دعوی کے بارے کذب بیانی کی تحقیق وتفتیش کریں؟ یہ تمام لوازمات باطل اور بے بنیاد ہیں، لہٰذا اس کا ملزوم بھی یعنی قول بالصرفہ بھی اس شبہ مضحکہ خیز کی بناء پر باطل قرار پائے گا۔

پھر کیا خود اعدائے قرآن کی شہادت وگواہی کافی نہیں، جب انہوں نے عناد سے مادرا ہو کر اس کی حقانیت کی گواہی دی تھی، جیسے ولید کی زبان سے اس قرآن کی صداقت کی گواہی صادر ہوئی؟! (فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں)۔

پھر کیا ہم نے سابق میں جو قرآن کے بہت سے وجوہِ اعجاز ذکر کیے ہیں وہ کافی نہیں ہیں؟

جو ہمیشہ سے قائم اور موجود ہیں، جہاں میں جتنے علوم ومعارف اور تجربات ہیں سب کی اس کتاب میں وضاحت موجود ہے!

---

① سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ (۲۰) وسنن الترمذی، کتاب ثواب القرآن (۱۲٤)

مجھے اس قول بالصرفہ پر تعجب ہے، پھر میرا تعجب اور افسوس اس وقت مزید بڑھ جاتا ہے جب اس کی نسبت تین علماءِ مسلمین کی طرف بھی کی جاتی ہے جن سے ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ قرآن کا دفاع کریں گے اور اعجاز قرآن کے بارے میں شبہات کے پیش کرنے سے ان جیسے حضرات کو بے داغ قرار دیتے ہیں۔

علاوہ ازیں مجھے ان بلند علماء کی طرف ایسی کمزور آراء کی نسبت کے بارے میں بھی بہت زیادہ شک وشبہ ہے اور مجھے لگتا ہے کہ ان کی طرف ان اقوال کی نسبت کی بابت الزام لگانا اور یہ کہنا کہ یہ اقوال اعدائے اسلام کے وضع کردہ ہیں یہ بات عقل کے زیادہ قریب بھی اور قوی دلیل بھی ہے، کیونکہ ایک اعتبار سے وجوہ اعجاز قرآن کا ظہور اور دوسرے اعتبار سے ان حضرات کا علم یہ دو ایسے قرینے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان غلط آراء کی ان کی طرف نسبت درست نہیں ہے۔

اعدائے اسلام کی عادت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر، آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم پر اور ائمہ کرام اور دیگر علماء پر بہتان تراشی کیا کرتے ہیں، لہٰذا یہ امر ان کی طرف سے کیوں نہیں واقع ہوسکتا ہے؟ علاوہ ازیں حق بات رجال سے نہیں بلکہ صحت استدلال سے معلوم ہوتی ہے، لہٰذا میزانِ نقد وجرح میں یہ رائے کمزور اور غلط ثابت ہوئی ہے، اس کا قائل کوئی بھی ہو ہم اس کی تردید کریں گے۔

و لیس کل خلاف جاء معتبرا : الا خلاف له حظ من النظر یعنی اختلاف قابل اعتبار نہیں ہوتا سوائے اس اختلاف کے جس میں استدلال کا کوئی حصہ موجود ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کروائی جائے کہ یہ شبہ اعدائے اسلام کا پیدا کردہ ہے اور انہوں نے اس شبہ سے درحقیقت قرآن کے اعجاز کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ ہم اس شبہ کے دفعیہ پر اکتفاء کرتے ہوئے اس شبہ کا اعادہ نہیں کریں گے وہ ان شاء اللہ آئندہ ذکر کریں گے۔

اس موقع پر پیش آمدہ شبہات کا جواب

اگر اسلام کے شکست خوردہ دشمن ہمارے عزیزوں کو گمراہی میں مبتلا نہ کرتے اور جدید تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ ان کے دجل وفریب سے متاثر ہوکر ان ہی گن نہ گاتے اور ہمارے اسکولز اور یونیورسٹیوں میں اپنے شبہات کو ہمارے نوجوانوں کے گوش گزار نہ کرتے اور مختلف مجالس اور مطبوعات کے ذریعہ اپنے فکری انحرافات واعتراضات کا ہمارے لوگوں کے سامنے ذکر نہ کرتے تو قرآن مجید کے مذکورہ چودہ وجوہ اعجاز ہر قسم کے شبہات اور الزامات کے رد اور خاتمہ کے لیے کافی تھے، لیکن ان مذکورہ وجوہات کی بناء پر ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلامی فضا اور ماحول کو ایسے تباہ کن جراثیم اور جارحانہ مطاعن سے خوب پاک کرنے کی خاطر اپنی پوری توانائی لگادیں اور موقع ومناسبت سے صرف وجوہِ اعجاز کا ذکر نہ کریں، البتہ جب بات واضح ہو تو متنبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب ضرورت ہوگی تو اس سے پہلے ذکر کردہ وجوہ کو ہم مکرر لائیں گے لیکن وہ بھی صرف ضرورت کی حد تک، اس سے زیادہ نہیں۔

ہم آپ کی توجہ کتاب ہذا کی جلد اوّل صفحہ ۵۷ تا ۸۴ کی تیسری بحث "وحی کے قائلین اور منکرین" اس میں مذکورہ علمی وعقلی دلائل اور اعجاز قرآن سے متعلقہ دس شبہات کے جوابات کی طرف بھی مبذول کرواتے ہیں اور قرآن کی مکی اور مدنی تقسیم سے متعلق پیدا ہونے والے شبہات کے رد کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں۔ (دیکھیے: ج۱ص ۱۹۸-۲۳۲)

نیز ہم آپ کی راہ نمائی اس امر کی طرف بھی کراتے ہیں کہ ہم نے قرآن کے اسلوب واعجاز پر جن تفصیلات اور توجیہات کی رعایت رکھی ہے ہمارے خیال میں وہ بہت سے شبہات کے دفعیہ کے لیے کافی ہیں، لہٰذا آپ ان ابحاث کو رغبت سے پڑھیے اور پیش

آنے والے اعتراضات کا مضبوطی سے جواب دیجیے:

پہلا شبہ اور اس کا جواب

معترضین کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی بحیرا راہب سے ملاقات ہوئی تھی، آپ ﷺ نے ان سے علم حاصل کیا تھا، قرآن میں جو علوم و معارف بھی موجود ہیں وہ اصل میں اسی تعلیم کا ثمرہ اور حاصل ہے۔ ہم اس شبہ کا کئی طرح سے جواب دیتے ہیں:

① یہ دعویٰ بلا دلیل ہے، اس میں کوئی تحدید اور تعیین نہیں ہے، اس طرح کے دعوے جو مدلل نہ ہوں قابل قبول نہیں ہوتے، ورنہ ہمیں بتایا جائے کہ آنحضور ﷺ نے بحیرا راہب سے کیا کچھ سنا اور حاصل کیا اور کب کیا اور کہاں کیا؟

② تاریخ سے اس سے زیادہ کوئی بات معلوم نہیں ہوتی کہ حضور علیہ السلام نے تجارت کی غرض سے دو مرتبہ شام کا سفر کیا، ایک مرتبہ بچپن میں اور دوسری مرتبہ جوانی میں، اس کے علاوہ آپ ﷺ نے سفر نہیں کیا، نیز ان دو سفروں میں بصرہ کے کسی بازار میں آپ ﷺ کا جانا نہیں ہوا آپ نے بحیرا یا کسی اور سے دین کی کوئی بات بھی نہیں سنی، اور اس موقع پر کوئی بات راز کی بھی نہ تھی، بلکہ پہلی بار تو آپ ﷺ کے ہمراہ آپ ﷺ کے چچا ابو طالب بھی بطور گواہ موجود تھے اور دوسری مرتبہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام میسرہ بطورِ گواہ موجود تھے، ان دنوں حضور ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت لے کر نکلے تھے، اس موقع پر بحیرا راہب نے ایک بدلی دیکھی جس نے حضور ﷺ کو سورج سے سایہ کیا ہوا تھا تو اس نے آپ ﷺ کے چچا کو بتایا کہ اس بچے کی بڑی شان ہوگی، پھر یہودی جو تکلیف پہنچائیں گے اس سے بھی آگاہ کیا، پھر آپ ﷺ کے چچا آپ ﷺ کو ڈرتے ہوئے واپس لوٹے، اور اپنا سفر مکمل نہ کیا، یہ واقعہ متعدد طرق سے اسی طرح مروی ہے جن میں بعض اسانید ضعیف ہیں۔[1] جبکہ ترمذی کی روایت میں بحیرا کا ذکر نہیں ہے۔[2]

نیز کسی روایت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ حضور ﷺ نے بحیرا سے کوئی ایک سبق یا ایک کلمہ بھی پڑھا یا سیکھا ہو، نہ عقائد سے متعلق کوئی بات نہ عبادات و معاملات یا اخلاق کوئی بات سیکھی ہو۔

پھر یہ لوگ کہاں الٹے بہکے جا رہے ہیں؟!

③ نیز یہ محال ہے کہ ایسی تاریخی روایات سے راہب کو حضور ﷺ کا معلم و مرشد ہونے کا مقام حاصل ہو جائے، کیونکہ اس نے تو حضور ﷺ کے چچا کو آپ ﷺ کی نبوت کی خوشخبری دی تھی اور یہ بات عقل کے سراسر خلاف ہے کہ ایک شخص ایک بشارت کو تسلیم کرے پھر خود کو صاحب بشارت کا استاد گردانے لگے جو عنقریب اللہ تعالیٰ سے فیض یاب ہونے والے تھے اور جبریل علیہ السلام سے علم حاصل کرنے والے تھے جو استادوں کے استاد اور مرشدین اور راہنماؤں کی راہ نمائی کرنے والے تھے، ورنہ تو راہب خود متضاد ہوں گے۔

④ اگر بحیرا راہب اس معجزانہ اسلامی فیض کے منبع و سرچشمہ ہوتے تو وہ خود نبوت و رسالت اور اس عظیم الشان منصب کے زیادہ اہل اور لائق تھے۔

---

① اخرجه الحاكم في المستدرك (۲/۶۱۵)

② سنن الترمذي، كتاب المناقب، باب ما جاء في بدء نبوة النبي ﷺ، الحديث رقم (۳۶۲۰)

۵ یہ بات خلاف عادت ہے کہ ایک انسان روئے زمین پر اپنی تعلیم مکمل کرے، پھر وہ اس میں ایسا استحکام پیدا کرلے جو معروف تعلیم کے عادۃً ایسے خلاف ہو کہ وہ سارے عالم کا استاد بن جائے، صرف اس وجہ سے کہ اس کی کسی راہب سے ایک دو بار اتفاقی ملاقات ہوگئی، پھر یہ ملاقات ایسے وقت پر ہو کہ جب کہ دونوں مرتبہ وہ تجارت کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر پایا ہو اور ایسا امی ہو کہ لکھنا پڑھنا تک نہ جانتا ہو اور پہلی بار ایسا چھوٹا بچہ ہو کہ اپنے چچا کا تابع ہو اور اپنی گردن پر بھاری امانت کا بوجھ لادے ہوئے ہو اور دوسری مرتبہ اس امانت کو پوری طرح ادا کرتا ہو یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال تجارت میں اخلاص اور علم کی امانت کو پوری طرح ادا کرتا ہو؟!

۶ بحیرا راہب کا اپنا دین بھی قرآن اور اس کی ہدایت کا منبع اور سرچشمہ بننے سے مانع ہے، خاص طور سے جب اس دین میں تحریف اور تغیر بھی پیدا ہو چکا ہو۔ ہم نے اس سے پہلے قرآن کی تعلیمات اور غیر قرآن کی تعلیمات کے مابین جو موازنہ قائم کیا، اور یہ بتایا تھا کہ صرف قرآن کی تعلیمات انسان کی حاجات کو پورا کرتی ہیں، نیز اس امر کی طرف جو اشارہ کیا تھا کہ قرآن نے اپنے دور میں اہل کتاب کے علوم کی صورت یہ پیش کی تھی کہ وہ محض جہالتوں کا مجموعہ ہے، پھر قرآن نے ان کی تصحیح کی، پھر ان کے عقائد کی صورت پیش کی کہ وہ محض گمراہیوں کا مجموعہ ہے پھر ان کی تصحیح کا بھی فریضہ انجام دیا اور ان کے اعمال کو منکرات اور برائیوں کا مجموعہ بتایا پھر ان کو ترک کرنے کی ترغیب دی، یہ تمام امور بطور دلائل کے کافی ہیں، ان کی طرف مراجعت کریں، پھر غور کریں کہ جو شخص کسی چیز کو کھودے وہ اس کو حاصل نہیں کرسکتا اور غلط چیز درست بات کا سرچشمہ نہیں بن سکتی، کوئی ظلمت اور تاریکی کبھی نور اور روشنی نہیں بن سکتی۔

۷ شبہ کرنے والے ملحدین کہتے ہیں کہ: قرآن وہ واحد تاریخی اثر ہے جو صحیح ترین شکل میں اپنے دور کے جذبہ کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی اس بات میں سچے ہیں تو ہم اس شبہ کا محاکمہ خود قرآن سے کرتے ہیں اور ان کو دعوت دیتے ہیں کہ قرآن کو پڑھیں خواہ ایک بار ہو لیکن عقل و تدبر سے! تا کہ اُنہیں معلوم ہو کہ قرآن کے دور میں دیگر مذاہب، ان کے علماء اور لکھاریوں کے احوال کیا تھے؟ اور تا کہ وہ جان سکیں کہ وہ خود راہنما اور استاد بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے بلکہ خود انہیں کسی راہنما اور استاد کی بہت ضرورت تھی! کیونکہ اگر وہ خود ایسے ہوتے تو خود بھی اور لوگوں کو بھی ضلالت اور گمراہی ہی سے بچا لیتے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت نصیب فرمائے، کیونکہ اصل ہدایت اسی کی عطا کردہ ہدایت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ (النور: ۴۰)

۸ اگر اس الزام میں کوئی صداقت ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم اس پر بہت خوش ہوتی اور بغلیں بجاتی، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوب واقف تھے اور وہ تو بہت چاہتے کہ کسی طرح ان کی تکذیب ہو، ان پر بہتان لگے اور دعوت کے عمل میں زوال آئے، لیکن وہ ان ملحدین کے مقابلہ میں زیادہ اپنے لیے معتبر تھے کہ جب انہوں نے اس بات کا طعنہ دینا چاہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرآن کسی دوسرے سے سیکھا ہے تو انہوں نے یہ بات سوچی بھی نہیں کہ وہ کہہ دیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیرا راہب سے اسے سیکھا ہے جیسا کہ یہ ملحدین کہتے ہیں۔ کیونکہ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی اور ہنسی و مزاح اس کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ ان کو مجبوراً ایسی شخص اختیار کرنا پڑا جس میں کچھ ہنسی و مزاح کی بات موجود ہو، یہاں تک کہ جب انسانی عقل، محال ہونے کی وجہ سے اس کی طرف

استادی کی نسبت کو ناگوار سمجھے گی تو لوگوں کے ذہن اس کی ظرافت کی وجہ سے قبول کریں گے چنانچہ انہوں نے کہا کہ اسے کوئی بشر سکھاتا ہے اور ان کی مراد اس بشر سے ایک رومی لوہار تھا جو اپنے کام میں یعنی لوہارگری میں مشغول ہوتا ہے، سارا دن لوہے کی میل کچیل اور آگ اور دھوئیں میں مبتلا رہتا ہے، مگر اس میں دو ایسے امر جمع ہیں جن کو آپ ﷺ کی قوم نے سمجھا کہ اس طرح ان کی تہمت کا خوب چرچا ہوگا، ایک یہ کہ وہ شخص مکہ میں مقیم ہوگا تو اس اقامت کے دوران محمد (ﷺ) کے لیے اس سے سیکھنا اور ربط وتعلق قائم رکھنا آسان ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ شخص غریب الوطن ہو یعنی عرب سے نہ ہو بلکہ کوئی عجمی ہو، تاکہ اپنی قوم کے دل میں یہ بات ڈال ممکن ہو کہ اس آدمی کے پاس وہ علم ہے جو دوسروں کے پاس نہیں ہے بلکہ ان کے باپ دادا کے پاس بھی نہیں ہے، یوں محمد (ﷺ) کی استادی کی تصدیق بہت آسان اور سہل ہوگی۔

لیکن آپ ﷺ کی قوم کے سامنے یہ بات اوجھل رہی کہ دین حق ایسی چیز ہے کہ اس کا نور ہمیشہ بلند رہتا ہے، جبکہ یہ رومی لوہار تو عجمی ہے، عربی زبان سے اچھی طرح واقف بھی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بات عقلاً ممکن بھی نہیں ہے کہ ایسا شخص اس قرآن کا منبع وسرچشمہ ہو جو نصوص عربیہ میں سب سے بلیغ تر ہے، بلکہ سب سے بڑا معجزہ، عرب کے لیے قابل فخر چیز اور عربی زبان کا ہے، جس کے بارے میں فرمایا:

﴿لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ﴾ (النحل: ۱۰۳)

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

وہ لوگ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے دیکھنے اور سننے کے بارے میں جو خبریں دی ہیں ہمیں ان کی صداقت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ خود آپ ﷺ کی ذات ان اخبار کا سرچشمہ تھی، کیونکہ علمی طور پر یہ ثابت نہیں ہے کہ مادہ کے ماورا کوئی ایسا غیبی امر موجود تھا جہاں سے قرآن کا نزول ہوتا ہو یا وہاں سے کوئی علم یا دین کا فیض جاری ہوتا ہے۔

پھر وہ اس کی ایک مثال بھی بیان کرتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں کہ: پندرہویں صدی عیسوی کی فرانسیسی خاتون (جان ڈارک) (جو اپنے گھر میں ہی رہتی تھی اور تمام سیاسی معاملات سے کنارہ کش رہتی تھی) کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ اس خاتون کا اعتقاد تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے فرستادہ ہے کہ اپنے وطن کو دشمن سے نجات دلائے، نیز وہ یہ اعتقاد رکھتی تھی کہ اسے وحی الٰہی کی آواز سنائی دیتی ہے جس میں اسے جہاد وقتال پر آمادہ کیا جاتا ہے، وہ خاتون اس سے اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے اپنے وطن کے دشمنوں پر حملے کے لیے کمر کس لی۔ اور بذات خود لشکر کی قیادت بھی کی اور دشمن کو مغلوب کرنے کی کوشش بھی کی لیکن خوب لڑائی کے بعد گرفتار ہو گئی اور میدان جنگ میں بہادر کی موت مری، اس خاتون کا ذکر نور اور روشنی بن کر جگمگاتا رہے گا، یہاں تک کہ کیتھولک گرجے نے اس کے مرنے کے بعد ایک زمانے تک اس کی عظمت وتقدس کو قائم کیے رکھا۔؟

ہم اس شبہ کے کئی طرح سے جواب دیتے ہیں۔

① ہم نے کتاب ہذا کی تیسری بحث میں حقیقی وحی الٰہی (نہ کہ خیالی اور نفسانی وحی) کے اثبات پر جو علمی دلائل اور اس پر ہونے والے شبہات کے جوابات دیے ہیں اس کی طرف مراجعت کریں۔

② ہم نے یہاں پر وجوہ اعجاز قرآن کی زیر بحث جو چودہ وجوہ اور دلائل ذکر کیے ہیں، ان میں سے ہر وجہ اور دلیل اس شبہ کا جواب

کافی ہے بشرطیکہ غور وانصاف سے کام لیا جائے۔ اس لیے کہ انسان کو بہت محدود پیمانے پر قوتیں اور صلاحتیں دی گئی ہیں لہٰذا وہ طاقت نہیں رکھتا کہ اس کائنات میں وہ فوق العارت کوئی کا سرانجام دے سکے، جبکہ ہم نے قرآن کے جو جو اعجاز ذکر کیے ہیں وہ اصل میں اس بات پر چودہ دلائل ہیں کہ قرآن نے اس موجودہ کائنات اور اس کے اسرار ورموز پر قاہر وغالب ہو اور جیسے سارے عالم اور اس میں موجود تمام اشیاء پر مطلق سلطنت حاصل ہو اور وہ ذات صرف اللہ وحدہ کی ہے نہ محمد (ﷺ) کی ہے اور نہ کسی اور کی، نہ عقل باطن کی اور نہ ہی عقل ظاہر کی اور نہ نفسانی وحی کی ہے اور نہ ہی اعصابی تاثر کی۔

۴ مذکورہ خاتون کی تاریخ کا علم رکھنے والا جانتا ہے کہ اس خاتون کے اعصاب ان اندرونی تفرقات اور اختلافات کی وجہ سے متاثر ہوئے تھے جس نے فرانس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، وہ ہر روز اپنے گھر اور شہر میں ایسے اختلافات کو دیکھتی اور سنتی تھی، اس کے علاوہ اس کے دور میں ایسی خرافات عام ہو گئی تھیں جس کا اس کی عقل اور دماغ پر بہت برا اثر پڑا تھا، ان ہی خرافات میں سے یہ بھی تھا کہ عنقریب اس زمانے میں ایک کنواری لڑکی مبعوث ہو گی جو فرانس کو دشمن سے نجات دلائے گی، مزید یہ کہ وہ خاتون وہم وخیالات میں بہت مبتلا رہتی تھی کہ بیداری اور نیند میں محو خیال رہتی تھی، وہ جوانی کے دور سے ہی وہمی تھی کہ اسے وہ چیزیں دکھائی اور سنائی دیتی ہیں جو کسی اور کو دکھائی اور سنائی نہیں دیتی۔ یہاں تک کہ یہ بات بھی اس کے خیال میں آئی کہ اسے دعوت دی گئی ہے کہ اپنے علاقے دشمن سے چھڑانے اور تاج شاہی سر پر پہن لے، پھر جب اس کے گاؤں پر حملہ ہوا جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی تو اس کے اس خیال میں مزید پختگی پیدا ہوئی، حتیٰ کہ پھر یہ ایک عقیدہ بن گیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں اس خاتون کے اعصاب ان بدترین سیاسی، حالات کی وجہ سے بہت بری طرح ہیجانی کیفیات سے دو چار ہو گئے تھے، نیز وہ ان بے بنیاد اعتقادات سے متاثر ہو چکی تھی جو اس کے زمانہ میں رواج پا گئے تھے۔

یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے! ہم نے ایسے کتنے پروپیگنڈے کرنے والے دیکھے اور سنے ہیں جن کی بنیاد اسی طرح کے باطل خیالات پر ہوتی ہے، جیسے وہ لوگ جو مہدی منتظر کے نام پر دوسروں کو دعوت دیتے ہیں اور لڑتے ہیں، نیز جیسے غلام احمد قادیانی اور باب بھائی جنہوں نے اپنا بے بنیاد درخت اوہام وخیالات پر کھڑا کیا۔

لیکن ہمارے نبی ﷺ ایسے نہیں تھے کہ انہوں نے کسی اعصابی یا ہیجانی کیفیت سے دو چار ہو کر کوئی دعویٰ کیا ہو، بلکہ آپ ﷺ بڑے باوقار، متوازن العقل، مضبوط دل اور جگر کے مالک اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے، آپ ﷺ کے اردگرد میں موجود بہادر لوگ تو مشتعل ہوتے، خود آپ ﷺ مشتعل نہ ہوتے، دوسرے لوگ تو شطحیات اور اوہام وخیالات میں مبتلا ہو جاتے لیکن آپ ﷺ اپنی محبت ودلیل کے ساتھ موجود ہوتے اور ایسی شطحیات وخیالات کو ناگوار خیال کرتے، بلکہ ایسے توہمات اور اس کے لوازم کے خلاف لڑتے اور ایسے لوگوں کو وہمیات سے نکال کر حقائق کے جہاں میں لا کھڑا کرتے اور عقل سے ان کا محاکمہ کراتے۔

کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جو شعراء خیالات کی سواریوں پر گمراہی کی حد تک سوار رہتے ہیں قرآن ان کی کیسے مذمت بیان کرتا ہے:

﴿وَ الشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝۲۲۴ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝۲۲۵ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝۲۲۶ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا﴾

(الشعراء: ۲۲۴-۲۲۷)

"اور شاعروں کی پیروی تو گمراہ ہی کرتے ہیں کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور وہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں مگر وہ جو ایمان لائے اور نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لیا۔"

نیز غور کریں کہ قرآن نے کیسے اپنے بارے میں بھی شعر ہونے اور رسول اکرم ﷺ کے بارے میں بھی شاعر ہونے کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (یٰس: ۶۹-۷۰)

"اور ہم نے نبی کو شعر نہیں سکھایا اور نہ یہ اس کے مناسب ہی تھا یہ تو صرف نصیحت اور واضح قرآن ہے تاکہ جو زندہ ہے اسے ڈرائے اور کافروں پر الزام ثابت ہو جائے۔"

غور کیجیے کہ صحیح مسلم وغیرہ میں یہ روایت موجود ہے کہ ایک انصاری بچہ جب مردہ حالت میں لایا گیا کہ حضور ﷺ اس کا جنازہ پڑھیں تو اس بچہ کے متعلق اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ کہا کہ: اس بچے کے لیے خوشخبری کہ اس نے کوئی برا عمل نہیں کیا! تو آنحضور ﷺ نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا اے عائشہ رضی اللہ عنہا!

"کیا اس کے علاوہ کوئی اور بات ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا اور اس کے مستحق لوگوں کو بھی پیدا کر دیا ہے، لوگ ابھی اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے اس جنت کو ان کے لیے پیدا کر دیا تھا، (اسی طرح) دوزخ کو پیدا کیا فرمایا اور اس کے حقدار بھی پیدا فرما دیئے اور وہ بھی اپنے باپوں کی پشتوں میں تھے کہ اس دوزخ کو ان کے لیے پیدا کر دیا تھا۔"①

حالانکہ مسلمانوں کے بچے اللہ کے علم کے مطابق جنتی ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں توقف فرمایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کے قطعی حکم لگانے سے منع فرمایا، قبل ازیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے اپنے نبی ﷺ کو باخبر فرمائیں۔

چنانچہ انہیں اجازت نہیں دی کہ وہ کسی غیبی امر کے بارے میں اپنے گمان یا وہم کی بنیاد پر کوئی بات کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی غیب دان ہیں۔

اسی طرح بخاری کی اس روایت میں غور کریں کہ جب عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو ایک انصاری عورت "ام العلاء" نے ان کے بارے میں یہ الفاظ کہے کہ اے ابوالسائب! اللہ کی آپ پر رحمت ہو، میں آپ کے بارے گواہی دیتی ہوں کہ اللہ نے آپ کے ساتھ فضل و کرم کا معاملہ کیا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ نے اس پر کرم فرمایا: کہنے لگیں: یارسول اللہ ﷺ میرے باپ آپ ﷺ پر قربان! تو پھر اللہ کس پر کرم نوازی فرماتے ہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بات تو یقینی صورت میں کہی جا سکتی ہے، خدا کی قسم! میں ان کے بارے میں خیر کی امید رکھتا ہوں، خدا کی قسم! اب کے بعد میں کسی کو مزکّی نہیں کہوں گی، قرآن کریم اسی طرح فرماتا ہے:

---

① اخرجه مسلم فی کتاب، القدر حدیث (۳۱)، ابو داؤد فی السنة، باب (۱۷)

﴿بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ بِیۡ وَلَا بِکُمۡ ؕ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ۝﴾ (الاحقاف:۹)

"آپ کہہ دیں میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ مجھے معلوم کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا، میں تو بس اس وحی کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف کی جاتی ہے اور میں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔"[1]

ان حقائق کی روشنی میں کیا یہ بات معقول ہوسکتی ہے کہ ایک ایسی خاتون جو اپنے خواب وخیالات میں منہمک ہو اور عقل وذہن کے اعتبار سے بھی فروتر ہو اس کا ثابت شدہ حقائق اور قطعی امور سے موزانہ کیا جائے؟۔

④ اس خاتون (جان دارک) نے اپنے اوہام وخیالات جن کو وہ خدا کی وحی خیال کرتی تھی، اس کی سچائی پر کوئی معقول دلیل بھی پیش نہیں کی جبکہ محمد ﷺ کے دعویٰ وحی پر ہزاروں دلائل موجود ہیں، جیسا کہ اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔ تو پھر ثریٰ کا ثریا سے اور ظلمت کا نور سے کیا مقابلہ؟

⑤ نیز اس خاتون کا جو ہیجانی کیفیت سے دو چار تھی، اصلاحی پروگرام سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی تاریخ میں اس کا کوئی اثر ونشان موجود ہے، وہ تو صرف ایسے مقصد کے لیے جو انسان اور حیوان میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے جنگ وجدل پر دوسروں کو آمادہ کرنے والی تھی۔ اور وہ غرض اور مقصد اپنے نفس اور وطن کا دفاع ہے جو زندگی سے محبت کا طبعی تقاضا ہے۔ مزید برآں کہ اس کا یہ جذبہ بھی کچھ ہی عرصہ کے بعد سرد پڑ گیا تھا اور جوش کی آگ بجھ گئی تھی۔

جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے کہ ؎

کأن لم یکن بین الحجون إلی الصفاء — أنیس ولم یسمر بمکة سامر

"گویا کہ حجون سے صفا تک نہ کوئی انسیت بخشنے والا ہے اور نہ ہی مکہ کا کوئی قصہ گو موجود ہے جو قصے کہانیاں سنایا کرے۔"

ایسی مشتعل عورت کی کیا نسبت ہوسکتی ہے اس ذات سے جو افضل الخلق ﷺ ہو اپنی عظیم دعوت اور انسانی مذاہب اور اس کے احکام، اعمال اور اخلاق کی اصلاح میں اپنا لازوال اثر رکھنے کی وجہ سے، نیز اپنے اس جدید دین کے ذریعہ ذلت کے گڑھے میں پڑی انسانیت کو نجات دلانے کی وجہ سے، جس دین نے دنیا کا یا پلٹ دی اور جس کے سبب پورا عالم سعادت وخوش بختی کی اس حد تک پہنچ گیا کہ اگر یہ دین نہ ہوتا تو ساری دنیا اندھیروں میں بھٹکی رہتی اور مُردوں میں ان کا شمار ہوتا۔

جیسا کہ فرمایا:

﴿اَوَمَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰہُ وَجَعَلۡنَا لَہٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِہٖ فِی النَّاسِ کَمَنۡ مَّثَلُہٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡہَا ؕ﴾ (الانعام:۱۲۲)

"بھلا جو شخص مردہ ہو پھر ہم اسے زندگی بخشیں اور اس کو نور عطا کریں جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلتا ہو وہ اس کی طرح ہوسکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو۔"

---

① رواہ البخاری فی الجنائز باب (۳) ومناقب الانصار، باب (۱٤٦)

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

معترضین کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی ورقہ بن نوفل سے ملاقات رہتی تھی، آپ ﷺ ان سے علم حاصل کرتے تھے اور اس سے باتیں سنتے تھے، اور ورقہ اس وجہ سے کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا (جو حضور ﷺ کی زوجہ مطہرہ تھیں) ان کی رشتہ دار تھیں، بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان معترضین کا مقصد اس سے یہ ہے کہ اپنے قارئین اور سامعین کے دلوں میں یہ بات ڈال جائے کہ اس قرآن کے علوم اس بڑے نصرانی سے مستفاد ہیں جو عربی زبان میں مہارت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشا کے مطابق عربی زبان پڑھ بھی لیتا تھا؟

ہم اس شبہ کا جواب بھی اسی طرح دیتے ہیں جیسے اس سے پہلے دیا تھا کہ ان کے پاس اپنے اس وہم وگمان کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے جسے لے کر وہ لوگوں کو وہم میں مبتلا کرتے ہیں، بلکہ خود ان کے خلاف دلیل موجود ہے، کیونکہ صحیح روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ ابتدائے وحی کے موقع پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کو ورقہ کے پاس لے گر گئی تھیں، جب آنحضور ﷺ نے انہیں اپنا پورا قصہ سنایا تو روقہ نے کہا کہ: یہ وہی ناموس (فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا، پھر ورقہ نے اس بات کی آرزو بھی کی تھی کہ کاش! اس میں طاقت اور زندگی باقی رہے کہ جب ان کی قوم ان کو اپنے وطن سے نکالے گی تو میں اس رسول ﷺ کی نصرت ومدد کرسکوں! ان صحیح روایات میں یہ مذکور نہیں ہے کہ ورقہ بن نوفل نے اس موقع پر کوئی درس یا وعظ کہا ہو جس کا تعلق عقائد یا احکام سے ہو، اور نہ یہ بات موجود ہے کہ رسول پاک ﷺ کو کوئی تردد تھا جیسا کہ یہ لوگ خیال کرتے ہیں یا دوسروں کو وہم میں مبتلا کرتے ہیں۔

جب ایسی کوئی بات نہیں تھی تو یہ معترضین نہ جانے کہاں سے ایسی باتیں کرتے ہیں! کوئی بھی انصاف پسند انسان ورقہ کی اس بات کو سن کر یہی سمجھتا ہے کہ اسے اس بات کی تمنا تھی کہ وہ زندہ رہے حتیٰ کہ حضور ﷺ کا شاگرد بنے اور ایسا مخلص سپاہی بنے جو آزمائش کے وقت حضور ﷺ کی نصرت اور آپ ﷺ کا دفاع کر سکے؟ لیکن ان معترضین نے اس کے برخلاف بات کو ہی لیا اور اس پر مصر ہوئے اور حقیقت حال کو بدلنے کی کوشش کی اور کہا کہ ورقہ بن نوفل آنحضور ﷺ کا خاص استاد تھا جس سے آپ ﷺ نے اپنے دین وقرآن کے سلسلہ میں استفادہ کیا۔ ﴿اَلَا سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ﴾۔

چھٹا شبہ اور اس کا جواب

وہ کہتے ہیں کہ! قرآن کا یہ اعجاز کہ لوگ اس کا مثل لانے سے قاصر ہیں، اس سے اس کی قدسیت اور کلام اللہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر صاحب ادب کا ایک خاص اسلوب ہوتا ہے جس کی وہ اپنے ادبی استعداد اور شخصی مزاج میں پیروی کرتا ہے کسی دوسرے شخص کے لیے اس خاص اسلوب کا مثل پیش کرنا محال ہوتا ہے، کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ ہر صاحب ادب کی صلاحیت اور مزاج جداگانہ ہوتا ہے لہٰذا ہر ایسا اسلوب جو دوسرے کے لیے وجہ اعجاز ہو اور ہر ادیب کا دوسرے کے اسلوب کو لانے سے عاجز ہونا ایسے بشری اسالیب ہیں جن سے ان کی قدسیت اور کلام اللہ ہونا ثابت نہیں ہوگا، یہی حال قرآن کا ہے کہ یہ کلام محمد ﷺ ہے، اور یہ لوگ اس طرح اس کے اعجاز کے معترف ہیں؟ ہم اس شبہ کے جواب میں اولاً کہتے ہیں کہ ہم اس سے پہلے قرآن کے اسلوب کے علاوہ دیگر اور بھی وجوہ اعجاز شرح وبسط سے بیان کر چکے ہیں۔

ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ یہ شبہ دراصل ایک مغالطہ پر مبنی ہے، کیونکہ قرآن کی تحدی (چیلنج) کا معنی لوگوں سے اس بات کا مطالبہ

کرنا نہیں ہے کہ وہ بعینہ اس کی کلامی صورت اور خاص منہج وطرز پیش کریں جس کی وجہ سے یہ اپنے اسلوب میں منفرد وممتاز ہے، تا کہ اس طرح کا شبہ پیدا ہو، بلکہ اس تحدی کا مطلب لوگوں سے اس امر کا مطالبہ کرنا ہے کہ وہ اپنے پاس سے کوئی کلام پیش کریں اس کی صورت، مزاج اور منہج وطرز کوئی بھی ہو لیکن شرط بس یہ ہے کہ میزان میں جب اسے اور قرآن کو فصاحت وبیان کے ایک ہی پیمانہ میں تولا جائے تو اس میں کوئی نقص ظاہر نہ ہو اور یہی معلوم ہوتا ہو کہ یہ کلام قرآن کے مماثل ہے یا اس کی خصوصیات میں اس کے مقارن ہے، اگرچہ دونوں کی صورت بیانی ایک دوسرے سے مختلف ہو۔ اس بات کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم خدا نے ان کو چیلنج دیا تھا جس کا بلغاء کے ہاں عام طور پر مسابقہ ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں یا تو وہ ہم پلہ ہوتے ہیں یا درجہ میں متفاوت ہوتے ہیں، جبکہ ہر ایک کا اپنا خاص طرز اور انداز ہوتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ چند لوگوں کا دوڑ کا مقابلہ کروایا جائے جس میں ایک ہدف کو حاصل کرنا طے کیا گیا ہو، ہر شخص کے لیے دوڑ کا ایک خاص راستہ متعین کر کے نشان لگا دیا جائے کہ وہ اپنے اسی متعین راستہ پر چلے گا، کسی دوسرے کے راستہ پر نہیں چلے گا، اپنا قدم بھی اپنے ساتھی کی جگہ پر نہیں رکھے گا بلکہ اپنے راستہ پر اس طرح چلے گا کہ کوئی ایک دوسرے کے مزاحم نہ ہو اور دوڑ کی ابتداء میں اور رخ کرنے میں برابر انداز سے چلے گا اور پھر سب اس مشترک ہدف کی طرف دوڑیں گے، لیکن پھر دوڑ کے دوران کوئی آگے کوئی پیچھے اور کوئی درمیان میں رہ جائے، مگر اس کمی وبیشی کے باوجود ان کے راستوں کا مختلف ہونا ایک دوسرے کے لیے مانع نہ ہو بلکہ ہر ایک نے جو اس مشترک ہدف تک پہنچنے کے لیے جتنا راستہ طے کیا ہے اس کی نسبت سے ان میں تناسب صاف معلوم ہو رہا ہو۔

یہی صورتِ حال ہے میدان فصاحت میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے والوں کا! کہ ہر ایک اپنا طریقہ اختیار کرتا ہے جسے وہ اپنے ذاتی مزاج اور خاص استعداد سے حاصل کرتے ہوئے اس عام بیانی غایت ومقصد تک پہنچتا ہے، اس کے بعد پھر ہر ایک اس بیان وفصاحت کی خوبیوں اور خامیوں کی تکمیل کے مطابق یا تو مساوی درجہ حاصل کرتے ہیں یا متفاوت رتبہ!

چنانچہ جن کو معارضہ قرآن کی دعوت دی گئی اگر بالفرض وہ پیغمبر قرآن کے ہم رتبہ ہیں تو وہ اس پیغمبر کے برابر درجے کا کلام پیش کریں جو وہ لے کر آئے ہیں اور اگر بالفرض اس سے بلند مرتبہ ہیں تو اسے سے بہتر اور برتر کلام لائیں اور اگر اس سے کم درجہ ہیں تو اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ کلام کے قریب قریب کلام لانا تو ان کے لیے دشوار نہ ہوگا اور اس معارضہ میں ہر ایک کا اپنا طرز اور منہج بیان ہوگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تین درجات میں سے کسی درجے کا کلام پیش نہ کر سکے، نہ قرآن کے برابر درجے کا کلام لا سکے، نہ اس سے بلند درجے کا اور نہ اس کے قریب درجے کا، اور نہ ہی سارے قرآن کی نسبت سے، نہ دس سورتوں کے اعتبار سے اور نہ اس کے مثل ایک سورت بھی پیش کرنے کی طاقت رکھ سکے۔

اسی طرح انفرادی صورت میں بھی پیش نہ کر سکے اور اجتماعی شکل میں بھی پیش کرنے سے قاصر رہے، خواہ ان کے ساتھ تمام جن وانس بھی شامل ہو جاتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے، مزید برآں وہ خود فصاحت کے امام وپیشوا اور کلام کے نقاد تھے، وہ بڑے خوددار تھے کہ معارضہ قرآن کے میدان میں اپنے غلبہ کے خواہش مند تھے۔

کیا یہ اس بات کی کافی دلیل نہیں کہ یہ کتاب، عزیز ورحیم ذات کی نازل کردہ ہے نہ کلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہو سکتا ہے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور مخلوق کا کلام ہو سکتا ہے؟

پانچواں شبہ اور اس کا جواب

یہ ملحدین کہتے ہیں کہ: لوگوں کا قرآن کا مثل پیش کرنے سے عاجز ہونا ایسا ہے جیسے کلام نبوی ﷺ کا مثل پیش کرنے سے وہ عاجز وقاصر ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس طرح قرآن کی قدست اور اس کا کلام اللہ ہونا ثابت نہیں ہوگا اسی طرح حدیث نبوی ﷺ کی قدسیت اور اس کا کلام اللہ ہونا بھی ثابت نہیں ہوگا۔!

ہم اس شبہ کے چند جوابات دیتے ہیں۔

① قرآن کی شان اور حدیث کی شان الگ الگ ہے۔ اگر عام لوگ حدیث نبوی ﷺ کا مثل پیش کرنے سے عاجز آتے ہیں تو خواص میں سے تو کوئی شخص اسے پیش کرنے سے عاجز نہ آئے گا خواہ اس کے مثل ایک سطر ہی کیوں نہ ہو، اور اگر بالفرض خواص بھی اس جیسی ایک سطر کے برابر بھی کلام پیش نہ کرسکیں تو اس کے قریب قریب تو ایک سطر پیش کرنے سے عاجز نہ آئیں گے، اور اگر کوئی ایک فرد اس کے مثل ایک سطر لانے سے عاجز وقاصر ہوتا ہے تو اگر اپنے ساتھ کسی دوسرے کو مددگار کے طور پر ملالے تب تو عاجز نہ ہوں گے، وہ مددگار کوئی بھی ہو، اگر بالفرض مددگار کے باوجود عاجز آئیں تو پھر تمام جن وانس مل کر تو اس کا مثل لانے سے عاجز نہ آئیں گے اور قرآن کی رو سے خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں!

یہ تو حدیث نبوی ﷺ کی شان ہے کہ جب اس کی ساتھ معارضہ کیا جائے۔ لیکن قرآن کی شان اس سے جداگانہ ہے، اس لیے کہ کوئی بھی شخص اس جیسی مختصر ترین سورت بھی پیش نہیں کرسکتا، خواہ اکیلا ہو یا کسی دوسرے کے ہمراہ ہو، خواہ تمام جن وانس جمع ہو جائیں۔

ہم نے جو یہ کہا کہ بعض ممتاز درجے کے خواص حدیث نبوی ﷺ کے مثل کلام لانے سے عاجز نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ اور عرب کے بلغاء کے کلام میں تفاوت ایک ایسی چیز ہے کہ عموماً اس طرح کی صورت پائی جاتی ہے کہ بشری طاقت کے مطابق لوگ ایک دوسرے سے کم اور زیادہ ہوتے ہیں، جیسے بلیغ اور ابلغ میں تفاوت، فصیح اور افصح میں تفاوت اور فرق اور حسن اور احسن میں تفاوت! اور یہ تفاوت ایسا امر شاذ نہیں ہے جو نوامیس عادیہ کے اس طرح خلاف ہو کہ پیغمبر ﷺ اور تمام بلغاء کے درمیان ربط وتعلق ہی منقطع ہو جائے، کیونکہ پیغمبر ﷺ کو دوسروں کی بہ نسبت فطرت شاذہ سے نوازا جاتا ہے جو دوسروں کی فطرت کی طرح نہیں ہوتی مگر ایسے جیسے ایک نقیض کی دوسری نقیض یا ایک ضد کی دوسری ضد کی طرف نسبت کی جائے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ قول بدو وجہ باطل ہے:

① یہ بات عقل اور مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ عام انسانی طبیعت ایک جیسی ہوتی ہے، نیز یہ کہ شخصی طبیعتوں میں مشابہت اور مماثلت پائی جایا کرتی ہے ایک چیز میں یا کئی چیزوں میں، زمانہ قریب میں یا طویل زمانوں میں، کلام کی تمام انواع میں یا بعض انواع میں۔

نیز یہ بات کتاب وسنت میں منقول امر کے بھی خلاف ہے کہ بشریت ایک ایسی قدر ہے جو رسولوں اور تمام افراد امت میں مشترک ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بشریت مشترکہ ایک ایسی وجہ تشبیہ ہو جو دونوں کلاموں میں یقینی مماثلت کا سبب بنتی ہو جن میں آپ خاص ربط یا روابط پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے کہ:

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ﴾ (الاسراء: ۹۳)

"آپ کہہ دیں کہ میرے رب کی ذات پاک ہے، میں نہیں ہوں مگر ایک بشر رسول۔"

نیز فرمانِ خداوندی ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ﴾ (الکھف: ۱۱۰)

"آپ کہہ دیں کہ میں تو ایک بشر ہوں تمہاری طرح میری طرف وحی کی جاتی ہے۔"

نیز کیا رسول پاک ﷺ کا یہ ارشاد نہیں ہے کہ: میں تو ایک بشر ہوں اور تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو...الخ۔ ①

اسی طرح ایک دفعہ کسی نے دیکھا تو آپ ﷺ کی وجہ سے مرعوب ہوا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا:

"اپنے آپ پر نرمی کرو، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو ایک قریشی عورت کا بیٹا ہو جو گوشت کے خشک ٹکڑے کھایا کرتی تھی۔" ②

② ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات کلام نبوت اور بعض خواص یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ کے کلام میں مشابہت موجود ہوتی ہے کہ ہمیں ایک حدیث سن کر اشتباہ ہونے لگتا ہے کہ آیا یہ مرفوع حدیث ہے کہ اس کی سند حضور ﷺ تک پہنچتی ہے یا موقوف عندالصحابی ہے؟ یا مقطوع عندالتابعی ہے؟ پھر حدیث کی سند سے ہی اصل قائل تک راہنمائی ملتی ہے۔ جسے قوت بیانہ سے نوازا گیا ہو وہ اس طرح کی مشابہت کا کثرت سے ادراک کر سکتا ہے کہ صاحب بیان کا کلام پیغمبر ﷺ کے کلام سے بڑا قوی درجے کا مشابہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کے کلام میں اس طرح کے عوامل اور اسباب کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فصیح کلام نبوی کلام کے بڑا مشابہ ہوتا ہے، ان کے کلام میں جو اثر پایا جاتا ہے وہ پیغمبر ﷺ کے کلام جیسا ہوتا ہے۔

لیکن قرآن کا حال تو جداگانہ ہے۔ اس کا کیا پوچھنا! اللہ کے کلام کے مشابہ یا اس کی نظیر بھی آپ نہ پائیں گے، اس لیے جس ذات نے اس کلام کو بنایا ہے اس کی شبیہ یا مثال آپ کو کبھی نہ ملے گی! لہٰذا اس موقع پر قرآن کو حدیث پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟ یا دونوں کو ایک ہی پلڑے میں کیسے رکھا جا سکتا ہے؟

③ اگر بالفرض قرآن، حدیث شریف کی طرح کلام محمد ﷺ ہوتا تو ان دونوں کا اسلوب ایک جیسا ہوتا، جبکہ یہ دونوں طرح کے کلام ایک ہی شخص سے صادر ہوتے ہیں جس کی استعداد بھی ایک اور مزاج بھی ایک ہے، لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہے، کیونکہ قرآن کا اسلوب ایک ایسی نوع ہے جس سے الوہیت کی وہ علامات ہویدا ہوتی ہیں جو مشابہت ومماثلت سے دور ہیں اور

① (اخرجه البخاري في الاحكام باب (۲۰) ومسلم الاقضية، حديث (٤) وابو داؤد في الاقضية باب (۷) والترمذي في الاحكام، باب (۱۱)

② رواه البيهقي في دلائل النبوة ٥/٦٩

حدیث نبوی ﷺ کا اسلوب ایک جدا نوع ہے جو مشابہت اور مماثلت سے دور نہیں ہے، بلکہ حدیث نبوی ﷺ، فصاحت وبیان کی فضا میں اس طرح منڈلاتی ہے کہ لوگوں کی اسالیب سے عموماً بلند ہوتی ہے اور کسی صورت میں اعجاز قرآن کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتی۔

اگر آپ فرض کریں کہ حضور ﷺ کے دو مختلف اسلوب تھے، ایک وہ جسے آپ ﷺ بہ تکلف بنا کے پیش کرتے جس کا نام آپ ﷺ نے قرآن رکھا تھا اور دوسرا اسلوب جسے آپ ﷺ بناتے نہیں تھے بلکہ یوں ہی پیش کر دیتے جس کا نام حدیث رکھا تھا۔ اگر یہ بات فرض کریں گے تو اس کے لیے کتاب ہذا کی تیسری بحث میں دسویں شبہ اور اس کے جواب کی طرف مراجعت کریں (یعنی جلد اول صفحہ ۷۸ تا ۸۴)، اس بحث میں ان شاء اللہ آپ کے اس مذکورہ اشتباہ کا حل موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عافیت نصیب فرمائے۔

چھٹا شبہ اور اس کا جواب

یہ لوگ کہتے ہیں کہ: قرآن مجید کی غیبی خبریں قرآن کے وجوہ اعجاز میں شامل نہیں ہو سکتیں کہ ان سے اس کا کلام اللہ ہونا معلوم ہو، بلکہ یہ قرآن کے کلام محمد ﷺ ہونے پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ آپ ﷺ نے ملک شام وغیرہ کے اہل کتاب سے ایسی خبریں حاصل کی تھیں یا پھر آپ ﷺ نے بے سوچے سمجھے کچھ باتیں کر دی تھیں جو اتفاقی طور پر حقیقت کے مطابق ہو گئیں یا آپ ﷺ نے اپنی رائے اور اجتہاد سے کچھ خبریں مستنبط کر کے انہیں اللہ کی طرف منسوب کر دیا تھا؟

ہم اس شبہ کے کئی جوابات دیتے ہیں:

① قرآن کی غیبی خبروں سے تو اہل کتاب اپنے زمانہ سے واقف ہی نہیں تھے۔

② قرآن نے تو بہت سی خبروں اور واقعات کی تصحیح کی ہے، لہٰذا یہ بات خلاف عقل ہے کہ جو قرآن خود ان کی تصحیح کرنے والا ہو وہ ایسی خبریں ان سے حاصل کرے۔

③ اہل کتاب تو اپنے زمانہ میں علم کتاب کے بتانے میں سب سے زیادہ بخیل ہوا کرتے تھے۔

④ اگر اس شبہ میں ذرا بھی صداقت ہوتی تو اہل کتاب خوشی کے مارے اچھلتے، اور اس بات کو لے کر حضور ﷺ اور قرآن کو مورد الزام ٹھہراتے۔ مشرکین بھی بغلیں بجاتے اور رقص کرتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس علمائے اہل کتاب اس قرآن پر ایمان لائے، پھر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ قریش مکہ نے بھی خود کو پورے یقین کے ساتھ ان کے سپرد کر دیا۔

⑤ الزام لگانے والے خود حضور ﷺ کو عظیم انسان قرار دیتے تھے، ایسے عظیم انسان کے بارے میں یہ بات ناممکن ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو بے سوچے سمجھے باتیں کیا کرتے ہیں، خصوصاً جب کہ آپ ﷺ اپنے اور دشمنوں کے درمیان چلنے والی خصومت ولڑائی میں ایک ذمہ دار شخص کی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے آپ ﷺ کے لیے یہ امر مناسب نہیں تھا کہ آپ ﷺ بے تکی باتیں کرتے اور خود کو اور اپنی دعوت کو داؤ پر لگاتے۔ نیز ایسی صورت میں حالات کیسے ہوتے اس کا انسان گمان بھی نہیں کر سکتا۔

⑥ اگر فرض کر لیں کہ آپ ﷺ نے ایسی باتیں اندازے اور اٹکل سے کہی تھیں، کسی دلیل کی بنیاد پر نہیں کہی تھیں تو عادۃً یہ امر محال

ہے کہ تمام پیش کردہ باتیں ثابت بھی ہو جاتیں خواہ کثیر کیوں نہ ہوں، بلکہ ایسا شخص غلطی ضرور کرتا ہے خواہ ایک مرتبہ کیوں نہ ہو! حالاں کہ حضور ﷺ سے زمانہ ماضی، حاضر اور مستقبل کے بارے میں بیان کردہ غیبی خبروں کے بابت ایک بار بھی غلطی نہیں ہوئی، جبکہ وہ خبریں متنوع اور کثیر تھیں۔

⑦ اس قدر غیبی خبریں اپنی رائے یا اجتہاد پر مبنی نہیں ہوسکتیں، جو بات قابل اجتہاد ہوسکتی تھی اس کے بارے میں بسا اوقات آنحضور ﷺ کو بتا دیا جاتا تو آپ ﷺ پھر درست رائے اور اجتہاد کے ذریعہ اپنی رائے میں تبدیلی فرمالیا کرتے تھے۔ اس کے لیے دیکھیے، ہم نے اثبات غیب کے عنوان کے تحت اس بحث کو ذکر کیا ہے، نیز ایک غور کریں کہ ایسے وقت میں رومیوں کا فارسیوں پر اور مسلمانوں کا مشرکین پر غالب اور فتحیاب ہونا کہ عام طور پر اس طرح کے اسباب فتح میسر نہیں آتے! جیسا کہ ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں۔

چھٹا شبہ اور اس کا جواب

معترضین کہتے ہیں کہ: آپ لوگ قرآن کے جتنے علوم، معارف واحکام وقوانین وغیرہ ذکر کرتے ہیں، یہ بھی وجوہِ اعجاز میں سے نہیں ہو سکتے، کیونکہ سولون یونانی (تقریباً ۶۴-۵۶۰ ق،م) ایسا شخص تھا کہ اس اکیلے نے ایسا کامل قانون وضع کیا تھا کہ اسے بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، مگر اس کے باوجود کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس نے کوئی معجزہ پیش کیا یا وہ اس قانون سازی کی بناء پر خدا کا پیغمبر بن گیا؟

ہم اس شبہ کے جواب میں اولاً یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے جو کچھ پیش کیا اور جو کچھ اس سولون نے پیش کیا دونوں میں بہت فرق ہے، ہم انہیں چیلنج کرتے ہیں کہ وہ سولونی قانون کی جامعیت وکاملیت ثابت کریں جس سے اصلاح انسانیت کی انواع واقسام مکمل طور پر اسی طرح معلوم ہوتی ہوں جس طرح سے ہماری سابقہ تشریح کے مطابق قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہیں؟

ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ جن حالات میں ہمارے نبی ﷺ قرآن لے کر آئے اور جن حالات میں سولون نے قانون وضع کیا، ان دونوں میں بھی بہت فرق ہے، نیز اس عظیم فرق کا قرآن کے وجہ اعجاز کے اثبات میں بڑا عمل دخل ہے حضور ﷺ کے اعتبار سے نہ کہ سولون کے اعتبار سے!

اس لیے کہ آنحضرت ﷺ خود بھی امی تھے اور آپ ﷺ کی پرورش بھی امی لوگوں میں ہوئی، جبکہ سولون ایک فلسفی تھا اور اس کی پرورش بھی دیگر فلاسفہ اور طلبہ کے درمیان ہوئی تھی، بلکہ وہ تو ان سات فلاسفہ میں سے ایک تھا جو ساتویں صدی قبل از مسیح میں مرجع خلائق تھا۔ نیز آنحضور ﷺ نے نزول قرآن سے قبل نہ کوئی انتظامی کام کبھی سنبھالا اور نہ کوئی عسکری کام، بلکہ قرآنِ کریم کے نزول سے پہلے آپ ﷺ کو خلوت اور گوشہ نشینی سے لگاؤ تھا، جبکہ سولون قانون وضع کرنے سے پہلے انتظامی اور عسکری مناصب پر فائز رہا، سولون کو تمام جماعتوں کے اتفاق سے ۵۹۴ قبل از مسیح بطور سربراہ منتخب کیا گیا، سب نے اس کو اقتدار مطلق سونپ دیا کہ تمام شہروں کا جس طرح چاہے نظم وانتظام کرے اور اس کے پیش رو زراکوت نے جو قوانین وضع کیا اس میں جیسے چاہے تبدیلی کرے، چنانچہ سولون نے ان کے لیے ایک نیا قانون وضع کیا جسے حکومت اور قوم نے تسلیم کیا اور بیس برس تک برابر اسی پر لوگ عمل پیرا رہے۔

ان حالات وواقعات میں کوئی احمق انسان بھی اس بات کو معقول قرار نہیں دے گا کہ ایک جانب حضور ﷺ میں جو خود امی تھے اور ان کی پرورش بھی امیوں میں ہوئی اور دوسری جانب سولون جیسا فلسفی، حاکم، قائد اور لیڈر ہے جس کی پرورش بھی علم وحکمت اور

تہذیب وتمدن کے ماحول میں ہوئی ہے، ان دونوں میں ایسے زبردست قسم کے فرق کے ہوتے ہوئے دونوں میں کیسے موزانہ یا ایک کو دوسرے پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟

اور ثانیاً ہم کہتے ہیں کہ ایک طرف سولون کا وضع کردہ قانون اس کے اثرات اور اس کی کامیابی کی حد اور انتہاء، اور دوسری جانب قرآن کا جامع قانون، لازوال دستور اور واضح اثرات ونتائج اور معجزانہ کامرانی وکامیابی! نیز اس قانون کی قدر وقیمت دیکھیے جو ان مخصوص حالات کے اثر کے تحت وضع ہوا پھر ایسا مردہ ہوا کہ قصہ پارینہ بن گیا، جبکہ اس کے مقابلہ میں قرآن بالکل اپنے مخالف حالات کے منظر میں آیا اور پھر معجزہ بلکہ معجزات بن گیا، پھر وقتی نہیں بلکہ دائمی حیات سے مشرف ہوا، اور پھر مسلسل مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی حیات، ثابت قدمی اور استقامت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، یہاں تک کہ بہت سی متمدن قومیں بھی اس سے مستفید ہونے لگی ہیں۔ اور عصر حاضر میں عالمی کانفرسوں میں قرآن کو معاصر قانون کے اہم مصادر میں شمار کیا گیا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے اس کے علاوہ مزید امور کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ آپ قرآن کو جس پہلو سے بھی دیکھیں گے آپ کو اس بات پر بلند دلائل اور روشن انوارات ہی دکھائی دیں گے کہ یہ صرف اللہ کا کلام ہے، جس میں کذب اور جھوٹ یا جہل کا کوئی شائبہ یا نشان بھی نہیں ملے گا۔

مجھے ان ملحدین پر بہت تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے ان انوارات سے کیسے چشم پوشی کر رکھی ہے! ان کے اذھان نے کیسے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ حضور ﷺ پر جھوٹ کی تہمت لگائیں اور یہ کہیں کہ قرآن ان کی ذاتی تالیف ہے، ان کے رب کی تالیف نہیں ہے! حالاں کہ جھوٹے شخص کی مکاری ایک دن ضرور آشکارا ہو ہی جاتی ہے اور گمراہ کن انسان ضرور ایک نہ ایک دن ذلیل رسوا ہوا کرتا ہے۔

جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

ثوب الرياء يَشِفُّ عماتحته فاذا التحفتَ به فانك عارِ

"دکھاوے کا لباس جب اوڑھو گے تو ایک دن ضرور پس پردہ چیز آشکار ہوگی اور تو شرمندہ ہوگا۔"

چنانچہ اے آگ سے کھیلنے والو! عقل ومنطق پر مبنی قوانین کا مذاق اُڑانے والو! علم نفسیات اور علم معاشرت کے طے شدہ امور کو عبث جاننے والو! کائنات کے سربستہ رازوں اور تاریخ کے احوال وواقعات سے غافل اور بے خبر لوگو! اور اللہ کے دین اور اس کی کتاب اور رسول ﷺ سے استہزاء کرنے والو! میں تم سے صرف ایک بات کہتا ہوں اسے غور سے سنو! یہ بات عقل کے مطابق ہے کہ ایک جھوٹا شخص اس لیے جھوٹ بولے تا کہ اسے عظمت وبڑائی کے اسباب حاصل ہو جائیں، لیکن یہ بات تو قطعی طور پر حیوانوں کے ہاں بھی خلاف عقل ہے کہ ایک سچا اور امانت دار شخص صرف اس بناء پر جھوٹ بولے تا کہ عظمت وبزرگی کے اعلیٰ مقام سے خود کو دور رکھے، حالانکہ قرآن سے بڑھ کو کوئی چیز زیادہ عظمت وبڑائی والی نہیں ہے! معلوم ہوا کہ اگر بالفرض یہ قرآن حضور ﷺ کا وضع کردہ یا تالیف کردہ ہوتا تو آپ ﷺ اس کی نسبت اپنی طرف کیسے نہ کرتے؟!

اگر میں قسم بھی کھاؤں تو حانث نہ ہوں گا کہ اگر بالفرض محمد ﷺ (خدانخواستہ) کاذب ہوتے تو بھی قرآن کی اپنی طرف نسبت کرنے ہیں کاذب ہوتے!

جبکہ قرآن حکیم آپ ﷺ کا خود ساختہ کلام نہیں ہے، اگر بالفرض کذب بیانی یا افترا پردازی کے ذریعہ آپ ﷺ کو

شرف واعزاز حاصل کرنا ہوتا تو آپ ﷺ اس سے اعلیٰ مقام وشرف حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن ایک صادق وامین شخص بھلا کیوں جھوٹ بولے گا اور مولائے حقیقی نے بھی اس پر وعید فرمائی ہے!

﴿وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝﴾ (الحاقة: ۴۴-۵۲)

"اور اگر وہ کوئی بناوٹی بات ہمارے ذمہ لگاتا تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم اس کی رگِ گردن کاٹ ڈالتے پھر تم میں سے کوئی بھی اس سے روکنے والا نہ ہوتا اور بے شک وہ تو پرہیزگاروں کے لیے ایک نصیحت ہے اور بے شک ہم جانتے ہیں کہ بعض تم میں سے جھٹلانے والے ہیں اور بے شک وہ کفار پر باعث حسرت ہے اور بے شک وہ یقین کرنے کے قابل ہے پس اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو بڑا عظمت والا ہے۔"

ہمارے لیے بہت تعجب کی بات ہے کہ ہم اس طرح کے بے وقعت شبہات اپنے اسلامی ماحول میں ملاحظہ کرتے ہیں جبکہ اس کے برعکس آخری ادوار کے یورپ کے اہل علم قرآن اور پیغمبر ﷺ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد واشگاف انداز میں اعلان کر چکے ہیں کہ محمد (ﷺ) سلیم الفطرت، کامل العقل، عمدہ اخلاق والے، راست گو، پاک دامن، رزق کے معاملہ میں قناعت پسند تھے، مال وزر کی ان میں قطعی کوئی طمع نہ تھی اور نہ ہی سلطنت کے حصول کی خواہش اور رجحان تھا۔ انہیں اپنی قوم کی طرح اپنے کلام وخطبات کو خوش نما بنانے اور شعر گوئی کا اہتمام تک نہ تھا، لوگ جس شرک اور بت پرستی کی خرافات میں مبتلا تھے آپ اس پر برافروختہ ہوتے اور جن بہیمانہ خواہشات میں لوگ باہم مسابقت کرتے آپ ﷺ اسے حقیر جانتے مثلاً شراب نوشی، جوا بازی، لوگوں کے اموال ناجائز طور کھانا وغیرہ۔

ان تمام امور کی بنیاد پر بھی اور بعد از نبوت آپ ﷺ کی سیرت اور یقین وایمان کی بدولت ان اہل علم کو اس بات کا جزم ویقین حاصل ہے کہ آپ ﷺ نے چالیس سال مکمل ہونے کے بعد جو دعوائے نبوت کیا تھا اس میں آپ ﷺ سچے تھے، جیسے آپ ﷺ کا فرشتہ کو دیکھنا، فرشتہ کا آپ ﷺ کو قرآن پڑھانا، اور یہ بتانا کہ وہ قوم کی ہدایت بلکہ تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے اللہ کے مبعوث رسول ﷺ ہیں۔ ان غیر ملکی اسکالرز میں بعض حضرات نے تو اس حقیقت کا اس طرح واشگاف انداز میں اعلان کیا ہے کہ، اگر بالفرض کا کوئی نسخہ جنگل بیابان میں پڑا ہوا ملے اور ہمیں اس کے نام اور مطبع کے بارے میں کوئی نہ بتائے تو ہمیں محض اس کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ یہ کلام اللہ ہے، اللہ کے سوا کسی اور کا کلام نہیں ہوسکتا۔

اختتامی بات

اعجاز قرآن کی بحث کافی طویل ہے اور اعدائے اسلام کے اس بارے میں پیش کردہ تمام شبہات واعتراضات کا حل بھی بہت طویل الذیل ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک ناپسندیدہ رسالہ ملا جس کا انہوں نے "کتاب حسن الایجاز فی ابطال الاعجاز" نام رکھا ہے، میں نے دیکھا کہ بہت سی سنسنی خیز اور جھوٹی خبروں اور مختلف ومتضاد صورتوں کو ایک ہی صحیفہ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہم نے اس بحث میں اور اس کے متعلقہ امور میں شرح وبسط سے جو کلام پیش کیا ہے وہ اس شخص کے لیے پوری طرح کفایت کرتا ہے جو ہدایت کا ارادہ رکھتا ہو، اگر ہم اس طرح کے مذکورہ رسالہ کی

تر دید میں تمام وجوہ کا احاطہ کریں گے تو اس کے لیے ایک بڑی اور مکمل کتاب کی ضرورت پیش آئے گی۔ حالانکہ یہ رسالہ چھوٹی تقطیع کے بائیس صفحات سے بھی زیادہ کا نہیں ہے، لیکن اب ہمیں اس طرح کا طویل اور مبسوط ردّ لکھنے کا موقع کہاں؟

نیز کاغذ کا بحران بھی درپیش ہے اور طباعت کے اسباب ووسائل بھی نادر اور کمیاب ہیں، اس لیے ہم مجبور ہوئے کہ کچھ لکھنے کے بارے میں توقف ہی اختیار کریں۔

ہماری خواہش تھی کہ ایک قدم اور آگے بڑھاتے اور قصص القرآن، امثال القرآن اور جدل القرآن پر بھی بحث وگفتگو کرتے، لیکن قاعدہ ہے کہ ضرورت بسا اوقات ممنوع چیز کو مباح کر دیا کرتی ہے، اور توقع کی جاتی ہے کہ اسی میں خیر ہوگی۔

ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اس بات پر حمد وستائش کرتے ہیں کہ اس ذات عالی نے اس ابتلاء وآزمائش کے موقع پر ہمارے مقدر میں توفیقِ عمل کو لکھ دیا کہ بالآخر ہم نے اس مقصد کو حاصل کر لیا، اور ہم ہر غلطی اور لغزش پر اس سے معافی مانگتے ہیں اور اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، نیز اس کی بارگاہ میں عرض گزار ہیں کہ ہمارے اس عمل کو قبولیت سے بھی نوازے اور مزید نیک اعمال کی بھی توفیق عطا فرمائے اور مصائب کو جلدی دور فرمائے اور ساری دنیا کے تمام مسلمانوں کے حال ومآل کی اصلاح فرمادے۔ (آمین)

ہم اُمید رکھتے ہیں کہ اس کتاب سے مستفید ہوتے ہوئے ہر قاری اپنی نیک دعاؤں میں ہمیں یاد رکھے گا، نیز اس کتاب میں پائی جانے والی اغلاط کی تصحیح یا تلافی مافات پر بھی آگاہ کرے گا کہ ہمارا دین سراپا خیر خواہی ہے اور مسلمان خیر سے وابستہ رہتے ہیں جب تک کہ ایک دوسرے سے ناصحانہ برتاؤ کرتے رہتے ہیں۔

قارئین کرام! یہ بات یادرہے کہ ہمیں اپنے لیے کسی دینی یا علمی کمال کا دعویٰ نہیں ہے، البتہ ہم زیادہ سے زیادہ اس کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں اور آپ کی چاہت کے مطابق اس زندگی میں اپنا پیغام پہنچانے کی سعی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کمالِ مطلق کا سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١١٥﴾﴾ (الانعام: ۱۱۵)

نیز فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿١٨٠﴾ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ﴿١٨١﴾﴾ (الصّٰفّٰت: ۱۸۰-۱۸۱)

وصلى الله على افضل خلقه وخاتم رسله سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وصحبه ومن تبعهم باحسانٍ الى يوم الدين، واصحاب الحقوق علينا اجمعين. (آمين)

(مؤلف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ) ان نوٹس کی طباعت سے ماہ جمادی الآخرۃ ۱۳۶۲ھ/ جون ۱۹۴۳ء کو فراغت ہوئی۔

برائے ضروری یادداشت

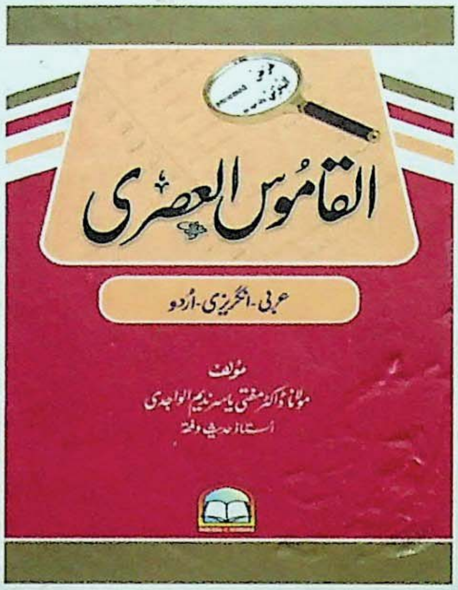

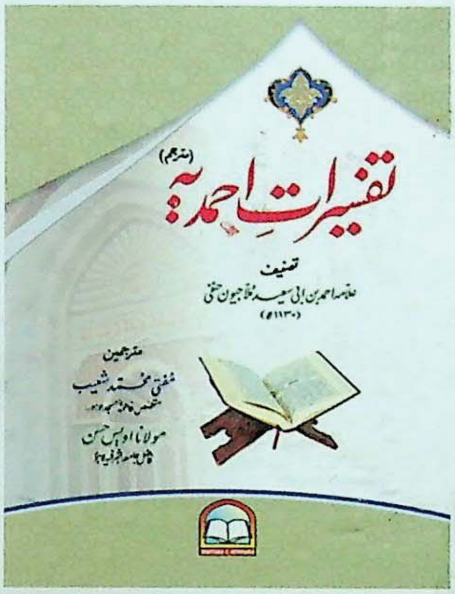

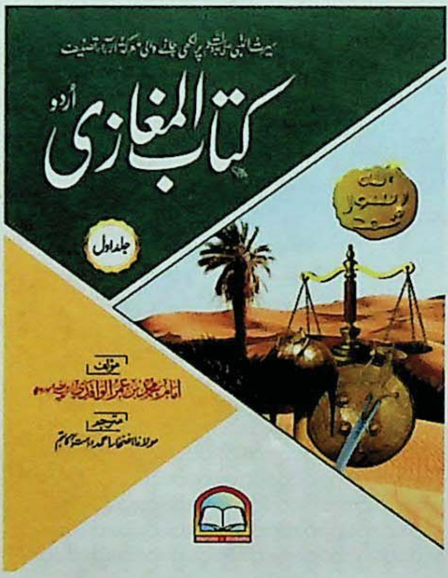

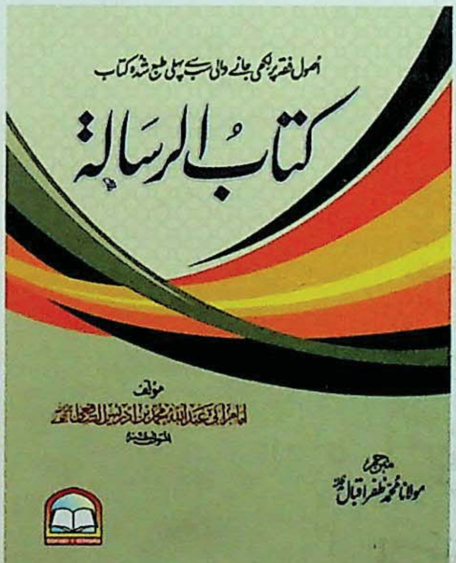

MAKTABA-E-REHMANIA
مکتبہ رحمانیہ (رجسٹرڈ)
اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور
فون: 042-37224228-37355743